

مگر کے ہرگز کے لئے

پاکینہ

مئی 2014

میں

میراج

میں سید اور رفعت میراج کے ناول دلچسپ موڈ پر

آئے ہیں ہم میں سے ہر ایک کے لئے ایک نیا عالم

WWW.PAKSOCIETY.COM

یوٹیوب چینل پر بھی دستیاب ہے



شیم ناز صدیقی 201

خصوصی مضمون

نزهت اصغر 255

شائستہ زریں 268

مستقل عنوانات

ادار 16

مدیرہ 273

عظمیٰ آفاق سعید 286

انجم انصار 290

صغریٰ زیدی 294

پاکیزہ بہنیں 296

پاکیزہ بہنیں 298

ادارہ 299

302

تہجی دست

وہ آج کے تہجی دست...

تہجی دست

دین کی باتیں

بہنوں کی محفل

پاکیزہ ڈائری

جلترینک

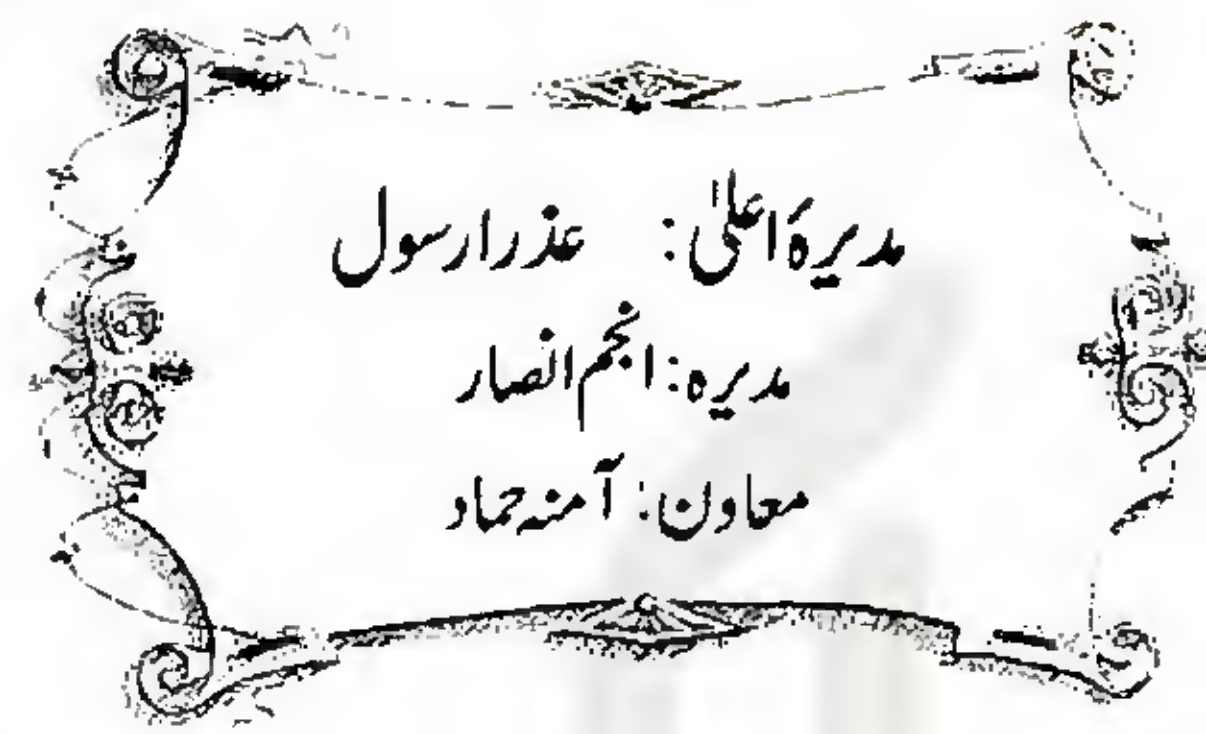
میں اکثر گنتا ہوں

خوش آلقہ

سندھ لے

روحانی مشورے

ہومیوپیتھک



مدیرہ اعلیٰ: عذرار رسول

مدیرہ: انجم انصار

معاون: آمنہ حماد

مکمل ناول

سکینہ فرخ 210

منی ناول

رضوانہ پرنس 118

افسانے

صائہ اکرم 51

رفاقت جاوید 99

عقیلہ حق 139

ارجمند عقیل 175

جے چارلی

شہباز کھٹک

حیات

ہجرت

اداریہ

مدیرہ 15

سلسلے وار ناول

رفعت سراج 18

عنیزہ سید 154

ناولٹ

نایاب جیلانی 60

سیما رضاردا 179

ترک ونا

ستارہ ہیرا

پبلشر پروپرائٹر: ذیشان رسول، مضافات: گراؤنڈ فلور-63 فیروز ایکسپریس، ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

شعبہ: 0333-2256789 نمبر شہزاد خان، نمبر 0333-2168391 محمد رمضان خان
اشعارات: 0332-4214400 نمبر سید ارمین، نمبر 0323-2895528 رائے حمید
ماڈل: دیاشاہ، نمبر 0332-4214400، نمبر 0323-2895528، نمبر 0332-4214400، نمبر 0323-2895528
جلد 42، شمارہ 02، مئی 2014، ڈیسالانہ 700 روپے، قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے
پنا: بوسٹیکس نمبر 662 کراچی 74200، فون: 021-35895313، نمبر 021-35802551، E-mail: jdpgroup@hotmail.com

لہو سے سینچے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
 بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
 جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
 بدن پر سایہ دیوار و در آسان کتنا ہے
 شکست خاک سے لے کر نمویابی کے منظر تک
 ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

امانت

رفعت سرچ

قطع 17

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے،
 زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور..... چاند کی چاندنی
 امانت..... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی
 اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے
 چہار سو اجالا کر دیتی ہیں۔

امانت و خیانت کو واضح کرتی ایک پروردگار عرب صورت نمر



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نور و سرجن تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور رومانہ کے لیے ایک سخت گیر بہن اور ماں تھیں۔ امیل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور معتمد خاص تھا۔ کانتاز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے وہ اور رومانہ بیسٹ فرینڈز ہیں۔ ایس بی شاہ زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریک کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے جو برہان کو ناقابل قبول ہوتا ہے۔ رابی، شاہ عالم کے ساتھ ان کے گھر چلی جاتی ہے۔ مہر جان کو ہوش آتا ہے تو گل جان کو پتا چلتا ہے کہ ان کا ذہن ماضی کی باتیں یاد کر رہا ہے اور وہ حال کو فراموش کر چکی ہیں۔ گل جان، شاہ عالم کو بتاتی ہے کہ وہ مہر جان کا علاج نہیں کرائے گی اور وہ رومانہ کو بھی کچھ دن کے لیے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دیں جس پر شاہ عالم کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ ستارہ، برہان کو فون کر کے بتاتی ہے کہ شینہ کی جگہ اس کی شادی ہوگئی ہے اور وہ اس سے ملنے اس کے گھر آسکتا ہے، گل جان، مہر جان کو اکیلا نہیں چھوڑتی ان کے ہی کمرے میں لیٹ کر ماضی میں گم ہو جاتی ہے۔ ستارہ، برہان کو بتاتی ہے کہ اب وہ اس گھر میں کبھی نہیں جائے گی۔ برہان اسے سمجھاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر مشکل میں وہ اس کے ساتھ ہے۔ صابرہ، ستارہ سے ملنے کے لیے بے چین ہوتی ہے۔ جابر علی، ایس بی سے ویسے کی بابت دریافت کرتا ہے تو وہ اسے جھوٹی تسلیاں دے کر مطمئن کر دیتا ہے۔ رابی، برہان کو دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتی ہے کہ وہ کون ہے۔ رومانہ، شاہ عالم کے گھر آ جاتی ہے۔ ایس بی، جابر علی کو مخ کرنا ہے لیکن جابر علی کہتا ہے کہ جو آرڈر اسے ملا ہے وہ اس پر عمل ضرور کرے گا۔ ایس بی شاہ زمان، وارث علی کو جابر علی کے بارے میں بتاتا ہے۔ ستارہ، وارث علی کی بات پر حیران رہ جاتی ہے۔ جابر علی ستارہ سے اپنے ساتھ چلنے کو کہتا ہے تو وہ منع کر دیتی ہے۔ ستارہ منع کرتی ہے تو جابر علی ستارہ کو گولی مار دیتا ہے۔ برہان کو خبر ملتی ہے تو وہ فوراً اپنے گھر پہنچتا ہے۔ برہان، کانتاز کو پڑھانے نہیں آتا اور نہ کوئی فون کرتا ہے تو شاہ عالم خود فون کرتے ہیں تو موبائل آف ملتا ہے۔ مہر جان، امیل خان کو پچھتی نہیں ہے اور اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کون ہے اور اسے کس نے رکھا۔ ایس بی شاہ زمان، جابر علی سے کہتا ہے کہ وہ مجسٹریٹ کے سامنے وارث علی کا نام نہ لے لیکن جابر علی اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ شاہ عالم اخبار میں گل جان کی خبر میں برہان کا نام پڑھ کر چوکتے ہیں برہان، شاہ عالم کا فون دیکھ کر حیران ہوتا ہے، شینہ، فائزہ کو بتاتی ہے کہ برہان اسپتال میں ہے کیونکہ ابھی ستارہ کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا برہان، شاہ عالم کا فون آنے پر انہیں بتاتا ہے کہ اس کی بہن کا مرڈر ہو گیا ہے وہ اب رومانہ کو نہیں پڑھائے گا۔ شاہ عالم اسے تسلی دیتے ہیں اور اس کا ایڈریس پوچھتے ہیں تاکہ وہ اس کے گھر آسکیں۔ مہر جان اپنے مرحوم باپ کو صدمہ میں دیتی ہیں وہ گل جان سے کہتی ہیں کہ بابا ان سے ملے بغیر کبھی نہیں گئے تو اب کیسے چلے گئے۔ ایس بی، وارث علی کو خبردار کرتا ہے کہ وہ جابر علی کی وجہ سے پھنس بھی سکتا ہے۔ رابی کو برہان کی بہن کے مرڈر کی خبر ہوتی ہے تو وہ سوچتی ہے کہ شاید اب وہ اسے نہیں دیکھ پائے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے گھر جاتی ہے۔ مہر جان امیل خان سے گل جان کے بارے میں پوچھتی ہیں لیکن وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ رابی کو دیکھ کر مہر جان اسے پچھاتی نہیں ہیں وہ ایسا تصور میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی جو ان کی حالت تھی۔ شاہ عالم، رابی کی ہمت بندھاتے ہیں وہ خود برہان کے گھر جاتے ہیں اسے تسلی دیتے ہیں۔ شائستہ بیگم، فائزہ کو کہتی ہیں کہ اب وہ شینہ سے دوستی ختم کرے۔ شینہ، برہان سے جابر علی کے بارے میں پوچھتی ہے تو برہان کہتا ہے کہ وہ اب ان سے نہیں ملے گا۔ رابی، کانتاز اور رومانہ کو برہان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہیں۔ جابر علی کا ماتحت اسے کہتا ہے کہ اگر وہ اس کی کوئی مدد کر سکتا ہے تو بتائے۔ جابر علی کہتا ہے کہ وہ اس کی اس عزت افزائی کو یاد رکھے گا۔ وارث علی، ایس بی سے کہتا ہے کہ جابر علی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اس کی مقتول بیٹی کا شوہر ہے اور ابھی اس کی ایک بیٹی اور بیٹا زندہ ہیں۔ وارث علی، ایس بی شاہ زمان سے کہتا ہے کہ وہ جابر کے قبضے سے وہ فائل نکلوائے۔ ستارہ کی تدفین ہو جاتی ہے۔ رابی شاہ عالم سے کہتی ہے کہ وہ کانتاز کو تادیب کرے کہ اب برہان انہیں پڑھانے نہیں آئے گا تو شاہ عالم کہتے ہیں کہ وہ برہان کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ رومانہ، کانتاز کے ساتھ اپنے گھر جاتی ہے تو مہر جان اسے نہیں پچھانتیں، ایس بی جابر علی سے بات کرتا ہے کہ وہ فائل اسے دے دے مگر جابر علی، ایس بی کی کوئی بھی بات ماننے سے انکار کر دیتا ہے، وارث علی، برہان کو فون کر کے کہتا ہے کہ وہ ایک فائل چاہیے اور اگر وہ فائل اسے نہ ملی تو ان کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ برہان فائل کے بارے میں شینہ سے پوچھتا ہے تو وہ بھی پریشان ہو جاتی ہے، آخر شائستہ بیگم کی اس بات سے بہت ڈپریشن ہوتا ہے کہ فائزہ، شینہ سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ امیل خان، گل جان سے کہتا ہے کہ اب رومانہ اور رابی کو گھر واپس آ جانا چاہیے۔

اب آگے پڑھیں

برہان گھر سے باہر چلا آیا تھا۔ کیونکہ اس گھر کی چہار دیواری میں خود کو یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اس کی روح کو ان دیکھی زنجیروں نے بری طرح جکڑ دیا ہو۔ کوئی خیال دل میں آتا تھا تو اتنا بے معنی اور بے نتیجہ سا کہ وہ ان بے محل خیالات کی بلخار سے تقریباً بدحواس سا ہو گیا تھا۔

شینہ اور صابرہ کے پاس صرف ایک موضوع تھا وہ اسی موضوع پر بات کرتی تھیں اور وہ خود اس موضوع سے راہ فرار اختیار کرنے کی لاشعوری کوشش کرتا تھا۔ اس کے پاس بانیگ نہیں تھی کار نہیں تھی کہ وہ سڑکوں پر دوڑاتا پھرتا۔ بے سمت سا ایک سفر تھا جو اس نے اختیار کیا تھا۔ اور روڈ کے کنارے چلتا چلا جا رہا تھا۔ آس پاس سے گزرتے لوگ اسے سائے کی طرح محسوس ہو رہے تھے، اسے کسی چہرے کسی آواز میں دلچسپی نہیں تھی۔ اسے خود بھی نہیں پتا تھا کہ آخرا ب وہ کرنا کیا چاہتا ہے۔ بس ہر جھکائے چلتا جا رہا تھا۔ عام حالات میں وہ اتنا زیادہ پیدل چلتا تو شاید اب تک اس کی ٹانگیں اس سے مخاطب ہو چکی ہوتیں کہ کیوں ہمیں اتنا تنگ کر رہے ہو۔ لیکن اسے تو جیسے اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔ اس کا ذہن..... وقت اور خلا کے گہرے کنویں سے باہر آ چکا تھا۔ آزاد اور وسیع بیسٹ فضاؤں میں اس کی روح سفر کر رہی تھی۔ مادی جسم روح کی اڑان کے ساتھ سفر کرنے سے قاصر تھا کہ اچانک ہی اسے وقت اور خلا کے جہان میں واپس آنا پڑا اس کی جیب میں پڑا ہوا موبائل وائبرٹ کر رہا تھا پہلا خیال تو اسے یہی آیا کہ شاید..... شینہ یا صابرہ کو اس کا خیال آیا ہوگا وہ جاننا چاہتی ہوں گی کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟

وہ چلتے چلتے رک گیا آس پاس ایک نگاہ غلط بھی نہ ڈالی بس چپ چاپ اپنی جیب سے موبائل نکال کر کار کا نام دیکھنے لگا اور کار کے نام پر نظر پڑتے ہی اس کی ذہنی دنیا پھرتہ و بالا ہونے لگی۔ اسکرین پر وارث علی کا نام بلنک ہو رہا تھا۔

”اس شخص کی کال ریسیو کرنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ وقت کا زیاں ہے۔“

اس نے یہاں تک سوچ کر موبائل mute کر دیا اور جیب میں رکھ لیا۔ وائبریشن مسلسل ہو رہی تھی لیکن برہان نے تو جیسے کھڑے کھڑے قسم کھالی کہ اب وہ کبھی وارث علی کی کال ریسیو نہیں کرے گا۔ موبائل وقفے وقفے سے وائبرٹ ہو رہا تھا اور برہان کے قدم نہ جانے کس نجات دہندہ کی تلاش میں محو سفر تھے۔

☆☆☆

جابر علی لاک اپ میں گھنٹوں میں سرویے بیٹھا تھا شاید اس میں اپنے آس پاس دیکھنے کا حوصلہ نہیں بچا تھا کیونکہ اس کی ایک ایک حس ہر آن اسے یہی بتاتی تھی کہ جو اس کے سامنے کھڑا ہے اور جو اس کے پیچھے ہے اور جو ان میں اور بائیں سے سب اسی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، اس کو بہت برے، برے ناموں سے یاد کر رہے ہیں۔ تو پھر ایسے خالموں کے چہرے دیکھنے کا فائدہ کیا..... اپنی موت کا ہی انتظار کرتا ہے تو وہ آنکھیں بند کر کے بھی کیا جاسکتا ہے لیکن.....

”صاحب آپ نے روٹی کھائی.....؟“ اچانک میرداد خان کی آواز نے اسے چوکا دیا۔

”یاد نہیں شاید کھائی تھی.....“ اس کی یہ پانچلوں والی کیفیت دیکھ کر میرداد خان ایک لمحے کے لیے خوفزدہ ہو گیا کیونکہ بولنے کی جرات تو نہیں تھی..... لیکن دل میں تو دس دفعہ سوچ چکا تھا کہیں جابر علی کا ذہنی توازن تو نہیں مجھڑ گیا تھا۔ اپنی اولاد کے خون سے ہاتھ رنگنا کوئی معمولی بات تو نہیں..... یہ عمل تو صریح دیوانگی کے زمرے میں آتا تھا۔

”تم جا کر اپنا کام کرو میرا دواخان..... میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں..... میں تو اب ساری فکروں سے آزاد ہو گیا ہوں لیکن میرے جانے کے بعد جب بھی سوچنا تو یہی سوچنا کہ میں نے دیانت داری کی خاطر جان دی ہے۔“

”اس میں تو کوئی شک نہیں صاحب..... میں تو آپ کی ایمانداری کی گواہی میں قسم بھی کھا سکتا ہوں۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں آپ جیسا ایماندار افسر نہیں دیکھا۔ لوگ رشوت خوردوں کو برا بھلا کہتے ہیں، میں تو اس وقت حیران ہو جاتا تھا جب آپ کو آپ کی ایمانداری کی وجہ سے برا بھلا کہتے تھے کہ نہ خود کھاتا ہے اور نہ کھانے دیتا ہے گند کرتا ہے۔“ میرا دواخان کے منہ سے اپنی تعریف سن کر جابر علی کی گردن میں لاشعوری طور پر جیسے کلف سا لگ گیا..... اس نے اندر ہی اندر اپنے آپ کو شاباشی دی۔

”چلو کوئی تو میری ایمانداری کو مانتا ہے اور پھر مجھے کسی سے کیا لینا میرے اپنے اندر تو سکون ہے ناں کہ میں نے ہمیشہ ایمانداری سے کام کیا ہے اور آج بھی اپنی ایمانداری کی وجہ سے مصیبت میں پھنس گیا ہوں اور ایک دن اپنی ایمانداری کی وجہ سے جان بھی دوں گا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ میرا دواخان..... تم ایمانداری سے اپنی ڈیوٹی ادا کرو، میں تو سمجھوا اپنے انجام تک پہنچ گیا..... اللہ تمہاری مدد کرے مگر یاد رکھو یہ راستہ بہت مشکل ہے بھی raid پر اور کبھی پھانسی کے پھندے پر..... جان کسی بھی وقت جاسکتی ہے۔“

”صاحب میں آپ کا خادم ہوں، میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اپنی وردی کی لاج رکھوں گا آپ کے نقش قدم پر چلوں گا۔“

جابر علی نے اپنے ماتحت کی یہ بات سنی تو خوشی سے پھولا نہ سایا اس کی انا تسکین پا کر جیسے کسی گھنے درخت کی چھاؤں میں سکون سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ کچھ دیر پہلے کا الجھا، الجھا تاثر چہرے سے مٹ چکا تھا اب اس کے چہرے پر گہرا سکون دکھائی دے رہا تھا۔

”سر..... اگر آپ غصہ نہ کریں تو آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں بے“ میرا دواخان نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں پوچھو، تمہیں کوئی بات کہنے کے لیے میری اجازت کی ضرورت نہیں جو مرضی آئے پوچھو۔“ جابر علی نے بے پناہ درپردگی کا مظاہرہ کیا۔

”سردہ آپ کے گھر سے ابھی تک کوئی نہیں آیا..... آپ کے گھر والے تو اسی شہر میں رہتے ہیں ناں..... کسی نے آپ کے لیے کوئی بھاگ دوڑ نہیں کی۔“

”بھاگ دوڑ.....؟“ جابر علی کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”یہ اس وقت ہوتا ہے میرا دواخان جب بندہ ملزم ہوتا ہے، میں تو مجرم ہوں۔“

”لیکن صاحب ابھی مجسٹریٹ کے سامنے تو آپ کو پیش نہیں کیا گیا ناں..... ابھی آپ کا قبالی بیان تو ریکارڈ نہیں ہوا۔“ میرا دواخان نے پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”وہ بھی ہو جائے گا..... ان لوگوں کی مرضی بھلے مجھے ابھی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کریں..... ایک ہی بات ہے میرے پاس صبح پوچھیں گے تو اقبال جرم کروں گا، شام کو پوچھیں گے تو بھی آدمی رات کو اٹھا کر پوچھیں گے تو بھی۔ بات وہ بدلتا ہے جس کے پاس دس باتیں ہوتی ہیں..... میرے بھائی میرے پاس تو ایک ہی بات ہے۔“ جابر علی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا تھا۔ اتنی دیر سے وہ دیوار سے ٹیک لگائے کافی فاصلے سے میرا دواخان

خان سے ہم کلام تھا جولاک آپ کی سلاخیوں میں دبوچے انتہائی دکھ اور ہمدردی سے جابر علی کو دیکھ رہا تھا اور جو کچھ ذہن میں آ رہا تھا وہ کہہ بھی رہا تھا۔

”صاحب.....! آپ برا نہ مائیں، آپ کو کیا مصیبت آئی ہے کہ قبالی بیان ریکارڈ کرائیں۔ کیس کو الجھا دیں سارا محکمہ آپ کی ایمانداری کی قسم کھاتا ہے کچھ بھی نہیں ہوگا آپ کو.....“

”کیس کو الجھا دوں.....؟“ جابر علی نے بڑے کڑے تیور کے ساتھ اتنی دیر میں پہلی بار میرا دواخان کو گھورا تھا۔

”کیوں الجھاؤں کیس کو.....؟ نہ مجھے زندہ رہنے کی خواہش ہے اور نہ جھوٹ بول کر زندگی کی بھیک مانگنے کی تمنا..... اگر یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے پھانسی چڑھنا چاہیے تو چڑھا دیں..... جھوٹ نہیں بولوں گا۔“

میرا دواخان نے یہ سن کر ایک لمحے کے لیے اپنا سر جھکا لیا۔ جابر علی کی اس بہادری کو از حد عقیدت اور احترام سے محسوس کیا۔

”صاحب.....! آپ میری بات پر غور ضرور کیجیے گا اگر آپ کیس کو الجھا دیں تو زیادہ بہتر ہے۔ برائی کو مٹانے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ آپ تو پھانسی چڑھ جائیں گے لیکن وارث علی جیسا ناسور پلٹا رہے گا، اسے اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کیس کو الجھا دیں۔ ورنہ وہ بیچ نکلے گا اور پھر کسی اور شریف خاندان میں واردات کرے گا۔“

”تم فکر نہیں کرو میرا دواخان میرے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ وارث علی بیچ نہیں سکے گا اور اسے اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے تو میں آج اس حال کو پہنچا ہوں، میری یہ قربانی رائگاں نہیں جائے گی۔“ جابر علی کے انداز میں بلا کا اعتماد اور بے خونی تھی اپنے ماتحت کو تسلی دیتے ہوئے اس کا سر جیسے فخر سے بلند ہو رہا تھا گویا اس دنیا میں سب سے عظیم کارنامہ انجام دینے والا واحد وہی ہو۔

”اس ملک میں بااثر بندے کو کچھ نہیں ہوتا صاحب..... آپ کا تجربہ مجھ سے زیادہ ہے، آپ کو تو یہ بات سمجھ آ جانی چاہیے۔“

”آئی ہے سمجھ میرا دواخان بہت اچھی طرح سمجھ آتی ہے لیکن کچھ کہے بغیر تو میں بھی مرنے والا نہیں۔“ جابر علی کے لہجے میں ایک عزم تھا، قوت ارادی کی مضبوطی تھی اور کچھ کر دکھانے کا پورا یقین تھا۔

☆☆☆

جھٹ پٹے کا وقت تھا، پرندے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ ان کی آوازوں سے یوں لگتا تھا جیسے وہ دن بھر ہونے والی مصروفیات اور پیش آنے والے چھوٹے بڑے حادثات پر تبصرے کر رہے ہوں۔

گل جان سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھی اور سفید ہی چادر سے اس نے اپنا سر ڈھانپا ہوا تھا..... برسوں گزر گئے یہ سفید رنگ اس کی ذات کا حصہ بن کر رہ گیا تھا۔ وہ خال خال ہی کوئی اور رنگ پہنتی تھی۔ شام کے جھٹ پٹے میں سفید لباس میں لپٹا ہوا اس کا وجود بڑا پاکیزہ و مقدس دکھائی دے رہا تھا۔ ہاتھ میں موٹے، موٹے دانوں کی سفید ہی سیج تھی جس پر وہ اپنے معمول کے مطابق یا حی یا قیوم کا ورد کر رہی تھی۔ معاً اس کی نظر اصیل خان پر پڑی..... جو ایک طرف جانماز بچھائے مغرب کی اذان کا انتظار کر رہا تھا۔ گل جان کو اچنبھا سا ہوا۔

”یہ آج مغرب کی نماز گھر پر کیوں پڑھ رہا ہے؟ یہ تو پانچوں نمازیں پڑھنے مسجد جاتا ہے..... اور یہ اس جگہ ہی کیوں جانماز بچھا کر بیٹھ جاتا ہے..... بی بی جان گھر کے اندر سے باہر آتی ہیں تو سب سے پہلے نظر اسی

”بھی دیکھیں.....“

”وہ بہت سکون سے ہیں اصل خان.....“ گل جان نے فوراً اس کی بات کاٹ کر کہا تھا۔

”کتنے دن تک.....؟“ اصل خان کی طرف سے برجستہ سوال ہوا تھا۔

”شاہ صاحب ہمارے پڑوسی ہیں، رشتے دار نہیں ہیں گل جان بی بی۔“

”تم فکر نہیں کرو، میں ان دونوں کو آہستہ آہستہ راہ پر لارہی ہوں اور پھر ایک دن انہیں ساری حقیقت

کھول کر بتا دوں گی..... کچھ نہیں چھپاؤں گی۔“

”ساری حقیقت.....؟“

”ہاں ساری حقیقت.....“ گل جان کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ کھیلنے لگی اصل خان بھی بے معنی

انداز میں مسکرا دیا تھا۔

”کہاں سے شروع کریں گی؟“

”9 اگست 1960ء سے جب بی بی جان نے ایک عظیم الشان حویلی میں جنم لیا تھا۔ میں پورے چھ سال

چھوٹی ہوں ان سے مگر..... میری سالگرہ ان سے ایک مہینے پہلے ہوتی ہے میں 2 جولائی کو پیدا ہوئی اور وہ 9

اگست کو..... بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ ہماری پیدائش میں صرف ایک مہینے کا فرق ہے۔“ اتنا کہہ کر گل جان پھر

بے معنی سا مسکرائی اور اس طرف دیکھا جہاں سے اسے مہر جان کے برآمد ہونے کے اندیشے لاحق تھے۔

”میں 2 جولائی کو اس دنیا میں نحوست پھیلانے کے لیے آئی..... میں تو نحوست کی نشانی ہوں اصل

خان..... آتے ہی ماں کو ہڑپ کر گئی۔“

”ایسا مت بولیں گل جان بی بی..... اللہ کو برا لگتا ہے، ہم اپنی طرف سے کون ہوتے ہیں منحوس اور

مبارک کا فیصلہ کرنے والے یہ تو لکھنے والے کے ہاتھ میں ہے کہ اس نے ہمارے لیے کیا کام لکھے ہیں جو ہمیں

اس دنیا میں آکر کرنے ہوتے ہیں۔“ اصل خان کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

”بہت اچھے کام کیے ہیں ہم نے..... کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسا کیا تھا ہمارے خیروں میں کہ ہمارے

لیے دنیا اور آخرت میں جہنم لکھ دیا گیا۔“

”توبہ، توبہ.....!“ اصل خان نے بے اختیار اپنے کانوں کی لوؤں کو چھوا۔ ”وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔

عیسویوں پر پردہ ڈالنے والا ہے۔ ہمارے گناہ اس کی بخشش سے زیادہ تو نہیں ہو سکتے۔ بندے کو کبھی اپنے رب

سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“ بولتے، بولتے اس کی اس کی آواز سے رقت جھلکنے لگی تھی یوں لگتا تھا وہ بس اب رو

پڑے گا۔ وہ مزید گویا ہوا۔

”میں پھر آپ کو یہ کہوں گا جب تک پردہ پڑا ہے پڑا رہنے دیں بچیوں کو بتایا تو بچیوں پر ظلم ہوگا۔“

”سچائی کو ظلم کا نام مت دو اصل خان، سچ تو ضرور بتاؤں گی اگر سچ بتانا ظلم ہے تو پھر ایک دن یہ ظلم ضرور

ہوگا۔“ یہ کہہ کر گل جان وہاں رکی نہیں تھی گھر کے اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اصل خان کو آگ کے دریا میں

ڈوب کر پھر تیرنے کا حکم دے کر۔

اصل خان اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا تھا کہ وہ اراداً گل جان کی طرف نہ دیکھے مگر بلا ارادہ تو نظر

ایک بار اٹھ ہی جاتی تھی۔

☆☆☆

جگہ پر پڑتی ہے..... اسے منع بھی کیا ہے کہ اپنے کو ارٹریں رہا کرے پھر بھی پتا نہیں کیوں یہ یہاں آکر بیٹھ جاتا ہے۔“ اس کی سوچ جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے لگی۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور بے اختیاری کیفیت میں اصل خان کے قریب چلی آئی۔

”اصل خان خیر تو ہے تم نماز پڑھنے مسجد نہیں گئے؟“ اصل خان نے گل جان کی طرف صرف ایک

سرسری سی نگاہ کی تھی۔

”وہ گل جان بی بی آج میری سیدھی ٹانگ کے گھٹنے میں بہت تکلیف ہے بڑے دنوں کے بعد اس تکلیف

نے تنگ کیا ہے چلنے میں بہت دقت ہو رہی ہے۔“

”تو تم لگ کر علاج کیوں نہیں کراتے..... تو تے کی طرح کیوں پال رہے ہو؟“

اصل خان نے گل جان کی یہ بات سن کر اس کی طرف نہیں دیکھا بلکہ کسی خیال میں کھو گیا..... پھر آہستہ

سے گویا ہوا۔

”گل جان بی بی بس جیسے پہلے ٹھیک ہو گئی تھی۔ اسی طرح اب بھی ہو جائے گی۔ ڈاکٹر کے پاس جاؤ

تو بڑا خرچہ ہوتا ہے پندرہ بیس تو ٹیسٹ ہی کرا لیتے ہیں اور آپ کو پتا ہے کہ ایک ٹیسٹ پر ہی اچھا خاصا پیسہ

اٹھتا ہے۔“

”میسے مجھ سے لے لو.....“ گل جان نے اس کی بات مکمل ہوتے ہی کہا تھا۔

”نہیں جی بس..... ٹھیک ہے..... مہربانی آپ کی، اللہ کرم کرے گا۔“

”اصل خان..... میں اصل میں یہ بات تم سے کہنا چاہتی ہوں کہ تم کیوں یہاں لان میں آکر بیٹھ جاتے

ہو..... بی بی جان کی سیدھی نظر اسی جگہ پر پڑتی ہے اور وہ آکر اپنی باتیں شروع کر دیتی ہیں۔“

”آپ پریشان نہ ہوں گل جان بی بی، خواہ مخواہ کیوں ڈرتی ہیں؟ ڈاکٹر صاحبہ نے اگر مجھے پہچان بھی لیا

تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ اصل خان نے اپنی دانست میں اسے تسلی دی تھی۔

”کچھ برا بھی ہو سکتا ہے اصل خان، ان کی حالت زیادہ خراب ہو سکتی ہے۔ مجھے اپنی بہن کو چند دن ہر غم

سے دور دیکھنے کی تمنا ہے، وہ اب ہنستی بھی ہیں اور مسکرائی بھی ہیں اور ہاں تمہیں ایک بات بتاؤں اصل

خان.....؟“ گل جان کا آخری جملہ سوالیہ ہو گیا۔

اصل خان نے نظریں اٹھانے کے بجائے گل جان کے بولنے کا انتظار کیا۔

”کبھی کبھی میں سوچتی ہوں.....“ گل جان کسی خیال میں کھو کر بول رہی تھی۔ اصل خان نے بالکل نہیں

پوچھا کہ وہ کیا سوچتی ہے۔

گل جان اس کی طرف سے اب قطعی مایوس ہو گئی اور اسے پورا یقین ہو گیا کہ کم از کم اصل خان لب

کشائی نہیں کرے گا۔ اس لیے اسے اپنی بات بلا توقف جاری رکھنی چاہیے۔

”میں سوچتی ہوں اصل خان پاگل پن بہت بڑی نعمت ہے، انسان تمام شرعی، اخلاقی پابندیوں سے

فارغ ہو جاتا ہے نہ رشتے بوجھ بنتے ہیں نہ پرانے دشمنوں سے آنچ آتی ہے۔“ یہ کہہ کر گل جان نے گہری سانس

لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اصل خان یوں خاموش تھا جیسے وہ گل جان سے کچھ مزید سننے کی تمنا رکھتا ہو

لیکن جب گل جان کی خاموشی گہری ہوتی گئی تو اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں آپ کی بات کے سامنے اپنی بات نہیں رکھ سکتا گل جان بی بی..... مگر آپ دو معصوم بچیوں کی طرف

کانتاز، رابی اور روما کو لیے لاؤنج میں بیٹھی تھی اور دو تین بڑے، بڑے سے الہم اس کی گود میں دھرے تھے۔ ایک الہم کھول کر وہ ایک، ایک تصویر پر انگلی رکھ کر اس تصویر کی گویا ہسٹری بھی بتا رہی تھی۔
روما اور رابی دونوں بڑی دلچسپی سے تصویریں دیکھ رہی تھیں۔ رابی کے چہرے پر گہری سوچ اور سنجیدگی تھی۔ وہ تصویریں دیکھتے ہوئے بالکل خاموش تھی جبکہ روما بار بار بول پڑتی تھی۔
”اللہ کانتاز تم اپنی مٹی کی گود میں کتنی کیوٹ لگ رہی ہو۔“ اس نے ایک فوٹو کو بہت شوق اور دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بے ساختگی سے کہا تھا۔ کانتاز نے مسکرا کر روما کی طرف دیکھا۔
”میں کیوٹ لگ رہی ہوں اور میری مٹی؟“

”تمہاری مٹی بھی بہت پیاری ہے مگر یہ تو بہت چھوٹی عمر کی لڑکی لگ رہی ہیں مٹی تو بالکل بھی نہیں لگ رہیں۔“ کانتاز نے روما کی طرف یوں گھورا جیسے اسے اس کی بے وقوفی کا احساس دلا رہی ہو۔
”بے وقوف ایک چھوٹی سی بچی کی مٹی اتنی ہی اتج کی ہوں گی ناں اگر وہ بوڑھی ہوتیں تو اب ہوتیں جب میں بڑی ہو چکی ہوں۔“

”کانتاز ٹھیک کہہ رہی ہے لگتا ہے کہ کانتاز کی مٹی کی شادی کم عمری میں ہو گئی تھی۔“
”ہاں رابی آپا، میری مٹی میرے پاپا سے پورے بارہ سال چھوٹی تھیں۔ یہ مجھے دادا جان نے بتایا تھا۔“
”ہوں..... لگ رہا ہے۔“ رابی نے ایک اور تصویر کی طرف توجہ کرتے ہوئے دہمی آواز میں کہا۔
”اللہ روما تمہارے تو پاپا بھی بہت ہنڈسم ہیں..... لگتا ہے فورس کے بندے کی تصویر ہے looks تو ایسی ہی ہیں۔ کیا وہ بھی فورس میں بھی رہے تھے؟“

”اوہ نو۔“ کانتاز نے روما کی طرف عجیب انداز سے دیکھا۔ ”تمہیں سب کچھ پتا تو ہے۔ بزنس میں تھے میرے پاپا۔“

”اوہ سوری، میں بھول گئی تھی۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے پاپا بزنس میں تھے لیکن وہ جو تمہارے پاپا کی تصویر ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی ہے اس میں اور اس تصویر میں بہت فرق ہے۔“
”یہ میرے پاپا کی بہت پرانی تصویر ہے اور وہ جو ڈرائنگ روم میں تصویر ہے ناں ان کی ڈیڑھ سے کچھ دن پہلے کی ہے۔“ اب ایک دم سے کانتاز کے چہرے پر اداسی اتر آئی تھی جیسے اس کا ذہن ماحول سے ہٹ کر اپنے مرحوم باپ کی طرف یکسو ہو گیا ہو۔
”تمہارے پاپا کو کیا ہوا تھا کانتاز مجھے تو آج تک یہی نہیں پتا؟“

”رابی آپا میرے مٹی، پاپا کی ڈیڑھ ایک ساتھ ہوئی تھی روڈ ایکسیڈنٹ میں۔ پاپا کارڈرائیو کر رہے تھے مٹی ان کے ساتھ تھیں۔ وہ لوگ نوشہرہ فیروز کی تقریب میں جا رہے تھے۔ دادا جان بتاتے ہیں ان کے بزنس.... پارٹنر کی بیٹی یا بیٹے کی شادی تھی.....“

”اوہ گاڈ! رابی کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ ”دونوں ایک ساتھ ہی چلے گئے..... اوہ میرے خدایا.....! دادا جان کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔“

”رابی آپا میرے دادا جان بہت اسٹرائنگ ہیں اور جتنے اسٹرائنگ ہیں اتنے ہی دکھی بھی..... مگر وہ کبھی اپنے چہرے سے دکھ ظاہر نہیں کرتے ہمیشہ مسکراتے رہتے ہیں۔ شاید میری خاطر.....“ کانتاز اب ایک دم سے اداس نظر آنے لگی تھی۔

”چھوڑو کانتاز اب یہ باتیں رہنے دو..... پھر تم رونے لگو گی تو تمہیں سنبھالنا مشکل ہو جائے گا..... رات تک تمہارا موڈ آف رہے گا۔“ روپا نے جلدی سے کانتاز کا ذہن ادھر ادھر کرنے کی کوشش کی، وہ کانتاز کے ہر معاملے میں رابی سے زیادہ تجربے کا تھی اور ایسی سچویشن سے کئی بار نبرد آزما ہو چکی تھی۔
”ہاں..... دادا جان مجھے ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ بیٹا انسان اپنی زندگی اور موت پر قدرت نہیں رکھتا۔ جب اللہ چاہتا ہے دنیا میں بھیج دیتا ہے اور جب چاہتا ہے واپس بلا لیتا ہے۔ نہ کوئی اپنی مرضی سے آتا ہے نہ اپنی مرضی سے جاتا ہے۔ شاید میرے مٹی پاپا کی عمر ہی اتنی تھی۔“ کانتاز ابھی تک اپنی سابقہ کیفیت میں ڈوبی ہوئی کہہ رہی تھی۔

”پھر بھی تم بہت خوش نصیب ہو کانتاز موسٹ لکی..... کم از کم تم اپنے ماما، پاپا کی تصویریں دیکھتی ہو، ان کو یاد کرتی ہو، تمہیں اپنے پاپا کا چہرہ یاد رہتا ہے اور ہمیں دیکھو..... لگتا ہے ہم تو کسی درخت سے ٹوٹ کر گرے تھے۔ آج تک اپنے باپ کی تصویر نہیں دیکھی جب بھی اماں جان سے پوچھا یہی جواب ملا کہ تمہارا باپ اس لائق نہیں کہ اس کا ذکر کیا جائے۔ آئندہ مجھ سے اس کے بارے میں کوئی سوال جواب مت کرنا..... اب تم بتاؤ ہم اماں جان سے اپنے باپ کی بات کس طرح کرتے..... کس طرح ان کا پتا نشان پوچھتے.....؟ مجھے تو خود پر بڑا ترس آتا ہے کہ اتنا سب کچھ ہے پھر بھی کچھ نہیں۔“ رابی کے کسی زخم کے ٹانگے بڑے کچے تھے لمحے لمحے بھر میں ادھر گئے یوں جیسے تازہ تازہ زخم سے خون برسنے لگتا ہے۔

”ہاں جب مجھے رومانے بتایا تھا کہ آپ لوگوں کے فادر کی ایک بھی تصویر گھر میں نہیں ہے تو مجھے بہت حیرت ہوئی تھی۔“

”ہم تو اتنا حیران ہو چکے ہیں کانتاز کہ اب تو حیرت بھی ہمیں حیرت سے دیکھتی ہے۔“ یہ کہہ کر رابی نے ایک ایسا قہقہہ لگایا تھا جس میں واویلوں میں گونجنے والی بانسری کے بیٹھے سر نہیں تھے بلکہ ماتمی دھن کی ابدی اداسی تھی۔

☆☆☆

مہر جان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گل جان اپنی دھن میں کچھ سوچتی ہوئی تیز، تیز قدموں سے ان کے کمرے کی طرف آئی تھی۔ دروازہ کھلا دیکھ کر قدرے چونکی پھر قدموں کی رفتار خود بخود آہستہ ہو گئی اس نے محتاط انداز میں دروازے کی چوکھٹ تھام کر اندر جھانکا تو عجیب سی کیفیت ہو گئی۔

مہر جان ڈرائنگ کے آئینے کے سامنے کھڑی تھیں اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خود کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر بہت نرم اور محبت کی روشنی پھیلاتے ہوئے تاثرات تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بہت حسین خیال میں کھوئی ہوئی ہیں اور اس خیال میں حسن اپنے اس کمال پر تھا کہ جس کمال پر کسی بھی شے کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مہر جان کو رنگ و نور کے ہالے نے اپنے حصار میں لے لیا ہو۔ وہ بہت خوب صورت نظر آ رہی تھیں..... شاید نری میں ہی حسن کا کمال ہے، رعونت بھرے حسن سے تو کبھی ڈرتے ہیں اور جہاں خوف ہوتا ہے وہاں سے محبت سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتی ہے۔

اس سے پیشتر کہ گل جان اندر قدم رکھتی اس کی سماعت سے مہر جان کی آواز نکرائی۔ آواز میں اتنی خوب صورت کھنک تھی کہ دو کہیں جھرنوں کی صدایا آبشار کی جلتی ٹنگ سنائی دے رہی ہو۔
مہر جان کہہ رہی تھیں۔ ”کتنے دن ہو گئے تم نے فون نہیں کیا..... ظاہر تو ایسے کرتے ہو جیسے تمہیں میرے

”امی جان پلیز دروازہ کھولیں، میں وارث علی ہوں، شاید آپ پہچانی نہیں..... آپ کی مرحومہ بیٹی کا شوہر.....“ وارث علی کے انداز میں بلا کی شائستگی تھی بہت مؤدبانہ عرض کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں ہی ایسا کچھ تھا کہ صابرہ کی سابقہ کیفیت خود بخود زائل ہو گئی اور اس نے بلا سوچے سمجھے گیٹ کھول دیا۔ گیٹ کھلتے ہی وارث علی اور صابرہ آمنے سامنے تھے۔

”السلام علیکم..... امی جان!“ وارث علی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا کر بڑی تابعداری سے صابرہ کو سلام پیش کیا۔

”وعلیکم السلام.....“ صابرہ گوگلو کی کیفیت میں تھی..... وارث علی تو ایک افتاد کی طرح اس وقت نازل ہوا تھا۔

”کیا آپ مجھے اندر آنے کی اجازت نہیں دیں گی آخر رشتے داری ہے۔“ شبینہ تو گیٹ کھلتے ہی اوٹ میں چلی گئی تھی۔ وارث علی کے سامنے آنا نہیں چاہتی تھی لیکن وارث علی ماں سے کیا بات کرتا ہے، یہ سننے کا تجسس اسے فطری طور پر لاحق ہو چکا تھا۔

”ہاں..... ہاں آپ تشریف رکھیے۔“ صابرہ نے برآمدے میں پڑی ہوئی پرانی وضع کی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں کہا جیسے کوئی مجبوری کا سودا کر رہی ہو۔

وارث علی تو جیسے اشارے کا منتظر تھا، بڑی سبے تکلفی سے چلتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ صابرہ نے گیٹ بند کیا اور پلٹ کر وارث علی کی طرف دیکھا جو کرسی پر بیٹھنے کے بعد اب صابرہ کے بیٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔

”خیریت تو ہے، آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟“ صابرہ کے انداز میں بلا کا تکلف تھا۔

شبینہ کی ساتھیوں نے انتظار نہیں کیا وہ اپنے آنے کی کیا وجہ بتاتا ہے۔

”میں بہت شرمندہ ہوں امی جان..... آنے میں دیر ہو گئی لیکن آپ کو پتا ہے ناں یہ اتنا بڑا حادثہ ہے..... پولیس جان نہیں چھوڑتی..... پولیس اسٹیشن اور اسپتال کے چکر لگا، لگا کر میں تو خود چکر کر رہ گیا..... شکر ہے کہ اس کی تدفین ہو گئی تو مجھے خیال آیا کہ مجھے اب آپ لوگوں کے پاس جانا چاہیے..... ظاہر ہے جانے والی تو چلی گئی..... لیکن آپ کا اور میرا رشتہ تو ابھی برقرار ہے۔“

”رشتہ.....؟“ صابرہ نے چونک کر وارث علی کی طرف دیکھا..... جابر علی سے قدرے عمر میں کم خضاب سے رنگے ہوئے بالوں کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر مردوں کو والے انداز میں اپنا رشتہ بتا رہا تھا۔

”جی امی جان..... دیکھیے ناں آپ کی بیٹی میرے گھر میں تھی۔ رشتہ تو خود بخود بن گیا تھا اور میں اس رشتے کو کھونا نہیں چاہتا..... برقرار رکھنا چاہتا ہوں.....“

صابرہ کی سمجھ میں خاک نہیں آیا..... بیٹی چلی گئی بچہ کوئی تھا نہیں اب یہ شخص کون سے رشتوں کی باتیں کر رہا ہے۔

”اصل میں میرا بیٹا برہان گھر پر نہیں ہے، بہتر ہے کہ آپ بعد میں تشریف لائیں، میرا مطلب ہے اس وقت تشریف لائیں، میں آپ سے کیا بات کروں..... نہ میں آپ کی بات سمجھ پا رہی ہوں نہ خود سے کوئی بات کرنے کے قابل ہوں.....“ صابرہ نے ٹوٹے ہوئے لہجہ میں بالآخر کہہ دیا۔

شبینہ نے سکون کی ایک گہری سانس لی کہ اس کی ماں نے وقت ضائع کرنے کے بجائے بہت مناسب بات کی۔

بن ایک پل چین نہیں آتا، میرا جی چاہتا کہ تمہیں سامنے بٹھا کر وہ سب کچھ کہہ دوں جو میرے دل میں چھپا ہوا ہے، تم جیسے جاتے ہو تو میں خود سے لڑتی ہوں کہ میں نے تم سے وہ کیوں نہیں کہا جو کہنا چاہیے تھا اور وہ کیوں کہہ دیا جو مجھے کہنا ہی نہیں تھا، کب تک انتظار کروں.....؟“ یہ کہتے ہوئے مہر جان آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھیں ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی نری اور چمک محروم ہو گئی تھی اور چہرے سے گہری اداسی چمکنے لگی تھی۔

گل جان نے کمرے میں داخل ہونے کا ارادہ ترک کر دیا..... اس کا خیال تھا کہ اس وقت اس کی بہن اتنی خوب صورت دنیا میں سیر کناں ہیں جہاں صرف فرشتوں کو جانا چاہیے۔

☆☆☆

شبینہ، صابرہ کے کمرے میں اس کے بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کا سر ماں کے کندھے سے ٹکا ہوا تھا جبکہ صابرہ اپنے ہونٹ یوں بھیجنے ہوئے تھی جیسے اسے خطرہ ہو کہ کہیں کوئی لفظ اس کے ہونٹوں سے پھسل نہ جائے ایسا لفظ جس کا وزن وہ خود بھی نہ سہہ سکے..... طرح، طرح کے خیالات امرتیل کی طرح اس کے وجود سے لپٹے ہوئے تھے۔ دونوں ماں بیٹی شاید برہان کا انتظار کر رہی تھیں جسے گھر سے گئے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔

معا اس جاں نسل سنائے کو گھر میں گونجنے والی ڈور تیل نے توڑ کر رکھ دیا..... دونوں اپنی اپنی جگہ چونک گئیں..... شبینہ ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ماں کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے ماں اسے بتائے گی کہ اس وقت کون آ سکتا ہے۔

”ای آپ بیٹھیں، میں دیکھتی ہوں..... پتا نہیں اس وقت کون آ گیا، برہان بھائی کے پاس تو گیٹ کی چابی ہوتی ہے وہ تو خود ہی گیٹ کھول کر آ جاتے ہیں۔“

”نہیں..... نہیں..... تمہیں گیٹ پر جانے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا..... اللہ جانے کون ہے میں دیکھتی ہوں۔“ صابرہ کو تو اندیشوں کی بیماری ہو گئی تھی اور یہ بیماری وہ ہے جس کا علاج جڑی بوٹیاں نہیں بلکہ وقت کرتا ہے، اس سے پیشتر کہ شبینہ کچھ بولتی صابرہ خود کو سنبھالتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

شبینہ سے رہا نہ گیا وہ بھی ماں کے پیچھے پیچھے چل پڑی لیکن وہ ماں کے پیچھے گیٹ تک نہیں گئی۔ صابرہ گیٹ پر پہنچی تو وہ اس سے قدرے فاصلے پر رک کر انتظار کرنے لگی کہ کس کی آواز آتی ہے اور کھوج ختم ہوتی ہے۔

”کون.....؟“ صابرہ دروازے سے کان لگا کر سوال کر رہی تھی جیسے اگر وہ کان لگا کر نہیں سنے گی تو اسے آواز ہی نہیں آئے گی۔

”جی.....! میں ہوں آپ کا خادم.....“ آواز وارث علی کی تھی..... شبینہ کو وارث علی کی آواز کی پہچان نہیں تھی وہ الجھ کر ماں کی طرف دیکھنے لگی..... لیکن صابرہ نے فوراً پہچان لیا تھا کہ وارث علی کی آواز ہے..... اس نے سہم کر بلا ارادہ شبینہ کی طرف دیکھا تھا۔

”میں پوچھ رہی ہوں..... کون ہے.....؟“ صابرہ نہ جانے کیوں انجان سی بن رہی تھی۔

”جی میں نے عرض کی ناں آپ کا خادم..... وارث علی.....“ بالآخر وارث علی نے اپنا نام بتا ہی دیا۔

”وارث علی.....“ صابرہ کے منہ سے بے اختیار نکلا، اس کی آنکھوں میں اندیشے سرسرانے لگے۔ شبینہ بھی سہم کر رہ گئی تھی حالانکہ وارث علی سے وابستہ کوئی غلط بات یا اسکی نڈل دونوں نے نہیں سنا تھا پھر بھی ان کے دل خوف سے یوں سمٹ گئے جیسے گھر پر وارث علی نہیں آیا ہو کوئی بری خبر آئی ہو۔

صابرہ نے چند لمحے سوچا تو اس وقفے کو وارث علی نے نہ جانے کیا سمجھا اور بڑی بے تابی سے بولا۔

”میں بھی آپ کا بیٹا ہوں..... داماد بھی بیٹا ہی ہوتا ہے۔“ وارث علی نے گھکھیاتے ہوئے دانت نکوسے۔

صابرہ کو نہ جانے کیوں اس سے کراہیت محسوس ہو رہی تھی ساس اور داماد کی عمروں میں کوئی خاص فرق تو نہیں تھا..... ہو سکتا ہے وہ صابرہ سے سال بھر بڑا ہی ہو..... اس کی بیٹی اور داماد کی مسلسل تکرار نے صابرہ کی طبیعت میں ایک عجیب سا کھردر بھر دیا تھا۔ اسے وارث علی کی موجودگی کا ایک، ایک لمحہ یوں لگ رہا تھا جیسے کوہِ ہمالیہ اس نے کندھوں پر اٹھا رکھا ہو۔ معصوم بیٹی کی غیر طبعی اندوہ ناک موت نے تو ویسے ہی ذہن مفلوج کر دیا تھا۔

”میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ برہان کی موجودگی میں تشریف لائیں۔ میں آپ سے کوئی بات نہیں کر سکتی یوں سمجھیں کہ میں بات کرنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔“

”یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں امی جان.....؟“ وارث علی نے پھر سر جھکا کر بڑی عاجزی اور مسکینی سے کہا تھا۔

”آپ برامت مایہ گاہی کے ساتھ رشتے ختم ہو گئے جب بیٹی ہی نہیں رہی.....“

”ایسی باتیں نہ کریں میرے دل پر چوٹ پڑتی ہے۔“ وارث علی نے فوراً صابرہ کی بات کاٹ دی تھی۔

”وہ تو یوں میرے سامنے کھڑی رہتی ہے جیسے میرا سایہ بن گئی ہو۔ میں اسے کبھی نہیں بھلا سکتا..... افسوس کہ یہ خوشی مجھے راس نہیں آئی۔“ وارث علی کے ایک، ایک لفظ سے دکھ یوں ٹپک رہا تھا جیسے ستارہ کے جانے کا سب سے زیادہ دکھ اسی کو ہو۔

شبینہ کم عمر بھی نا تجربے کا رہی۔ انسانوں کے چہروں پر پڑے ہوئے نقاب اور اصلی چہرے میں فرق کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی مگر اسے بھی محسوس ہو رہا تھا جیسے وارث علی وہ نہیں جو وہ ظاہر کر رہا ہے جبکہ وہ اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھ رہی تھی کہ اس کے تاثرات سے ہی کچھ اخذ کیا ہوتا..... لیکن وارث علی کی آواز جیسے ہی اس کی سماعت سے ٹکراتی تھی اس کے دل کو کچھ ہونے لگتا تھا، وہ اپنی جگہ دم سا دھمے کھڑی تھی اور وارث علی کے غم میں ڈوبے ہوئے جملے سن رہی تھی۔

”بس کیا کروں برباد ہو گیا ہوں، اب تو جی چاہتا ہے کہ یہ دنیا چھوڑ کر کسی کونے میں جا بیٹھوں..... میں اسے کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔ وہ بہت اچھی بیوی تھی بہت نیک لڑکی تھی..... آپ یقین کریں جب تک اس کی تدفین نہیں ہوگئی، میں نے کھانا نہیں کھایا..... مجھے نیند نہیں آئی۔“

”بس پھر کیا کہہ سکتے ہیں جب آپ کی یہ حالت ہے تو میں تو ماں ہوں، روز کی موت مر رہی ہوں آپ کو اندازہ نہیں ہوگا کہ اس وقت میری کیا حالت ہے مجھے افسوس ہے میں آپ کی کوئی خاطر داری نہیں کر سکتی آپ کو بیٹھنے کے لیے نہیں کہہ سکتی۔ بہت معذرت کے ساتھ آپ کل تشریف لائے گا اور بتا کر آئیے گا تاکہ آپ کی ملاقات برہان سے بھی ہو جائے۔“ صابرہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

”برہان سے تو میری اسپتال میں کئی بار ملاقات ہوئی۔ اصل میں تو میں آپ دونوں کے پاس تعزیت کے لیے آنا چاہتا تھا۔ آخر میرا فرض بنتا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر اس سے پہلے آپ کبھی ہمارے گھر تشریف نہیں لائے، میں نے آپ سے کوئی بات چیت نہیں کی اس لیے اس وقت مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی۔“ صابرہ نے بڑی بے بسی کی کیفیت میں اور اپنی فطری

سادگی سے کہا تھا۔ وارث علی نے بڑی گہری نظر سے صابرہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے کسی بہترین..... ڈکٹیٹر کی طرح حساب کتاب کر لیا تھا کہ اس عورت کو بے وقوف بنانے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔

”ٹھیک ہے پھر میں اجازت چاہوں گا، اللہ آپ کو بھی اور مجھے بھی صبر عطا فرمائے، آمین۔“

”آپ برامت مایہ گاہیہ سوگ کا گھر ہے، ہم نے تو کئی دن سے چولہا بھی نہیں جلایا۔“ صابرہ نے اٹھتے ہوئے بڑے دل گرفتہ انداز میں معذرت کی۔

”کیوں شرمندہ کر رہی ہیں آپ..... میں یہاں چائے پیئے نہیں آیا تھا..... انشاء اللہ آپ سے بہت جلد ملاقات ہوگی، خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر وارث علی گیٹ کی طرف بڑھ گیا تھا اور صابرہ اتنی بے سکت ہو چکی تھی کہ اسے کرسی سے اٹھنا محال تھا۔

☆☆☆

”ای کیا ہو گیا تھا آپ کو.....؟ آپ نے اسے اندر کیوں آنے دیا.....؟“ برہان بری طرح جھنجھلا رہا تھا..... غم و غصے کی کیفیت میں اپنی مٹھیاں بچھ رہا تھا۔

”بیٹا تمہاری بدنصیب بہن کا شوہر ہے وہ..... اس گھر سے اس کا کوئی تعلق..... کوئی رشتہ تو ہے نا..... تعزیت کے لیے آیا تھا۔“ صابرہ نے اپنی دانست میں برہان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہم کیا جانیں وہ کون ہے؟“ برہان جیسے پھٹ پڑا تھا۔ ”وہ تو خود مشکوک ہے آج تک اس کے کسی گھر والے میرا مطلب ہے فیملی ممبرز سے آپ ملی ہیں؟“

”تمہارے باپ نے اسے کسی قابل سمجھا تھا تو وہ نکاح کرنے آیا تھا بیٹا۔“ صابرہ نے برہان کو جیسے عقل کی بات سمجھائی۔ ”اور بیٹا چار آدمیوں کے سامنے تمہاری بہن کو قبول کر کے لے کر گیا تھا اس گھر سے... غدا خواتین اٹھا کر تو نہیں لے کر گیا تھا..... تم کیوں غصہ کر رہے ہو، پہلے ہی پریشانیاں کیا کم ہیں جو اپنے بوجھ بڑھا رہے ہو، چھوڑو بس آیا تھا..... چلا گیا..... کچھ لے کر نہیں گیا ہم سے۔“

”کیا لے کر جاتا..... پہلے ہی سب ہی کچھ لے گیا، ہمارا سکھ چین، ہماری عزت..... سب ہی کچھ..... یہی وہ شخص ہے جس کی وجہ سے میرے باپ نے ٹھوکریں کھانے کے لیے مجھے گھر سے نکال دیا تھا اور امی جان یہی وہ شخص ہے جس نے ہماری معصوم سی بہن کو ہم سے چھین لیا..... آئندہ اگر وہ آئے، آپ ہرگز گیٹ نہیں کھولیں گی..... چاہے کچھ بھی ہو جائے..... چاہے پولیس بلوائی پڑے۔ سن رہی ہیں ناں امی..... آپ گیٹ نہیں کھولیں گی۔“

”اچھا بیٹا سن لیا..... نہیں کھولوں گی، میں کیا کروں میرا دماغ تو کام نہیں کرتا..... میرا بیٹا..... میرا چاند اپنے ذہن سے سارے بوجھ اتار بیٹھو..... وہ جو دکھ ہمیں ملا ہے وہ اتنا بھاری ہے کہ ہمیں دوسرے بوجھ اٹھانے کی ضرورت نہیں۔“

”شبینہ کہاں ہے؟“ برہان کو ایک دم شبینہ کا خیال آیا کہ شبینہ کے حوالے سے وارث علی اس سے الٹی سیدھی باتیں کر چکا تھا۔ اس کا بی بی اس وقت شوٹ کر رہا تھا اسے یقین تھا کہ وارث علی کسی نئے منصوبے پر کام کرتا ہوا ان کے گھر تک آیا تھا اگر اس نے فون پر برہان کو دھمکیاں نہ دی ہوتیں تو شاید وہ اس کی آمد کو معمول کی آمد سمجھتا۔

”یہیں ہے بیٹا..... ہو سکتا ہے نماز پڑھ رہی ہو، میں دیکھتی ہوں۔“

”اچھا، اچھا ٹھیک ہے، میں نے تو ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔“ وہ بے دلی سے بولتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ صابرہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں۔
”یا اللہ میرے بچوں پر رحم کرنا یہ دکھ تو بوڑھا کر دیتے ہیں۔“

☆☆☆

ایس پی شاہ زمان خان اپنے پسندیدہ ریٹائرمنٹ میں وارث علی کے ساتھ بیٹھا ہوا فریش جوس پی رہا تھا۔
”اس زمین کا مالک تو سالوں سے روپوش ہے اپنی تینوں بیٹیوں کے ساتھ۔ کوئی سن گن کوئی اتا پتا نہیں لیکن یہ سونے کی نہیں ڈائمنڈ کی زمین ہے۔ ever green بس اس کی اور بیکسل فائل پر مٹی کا تیل چھڑک آگ لگانی ہے پھر اس فائل کی راکھ سمندر میں بہانی ہے تاکہ زندگی بھر کے لیے سکون ہو جائے کہ کوئی بھی حکومت آئے اور وقت کتنا ہی بدل جائے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہو۔“ ایس پی جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے یوں ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہا تھا جیسے ایک، ایک لفظ تول رہا ہو۔ اور آئینے کے سامنے کھڑا ہوا اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔

وارث علی کے چہرے پر بھی گہری سوچ کے تاثرات تھے۔ عمر کی چغلی کھاتی ہوئی لکیریں بہت واضح ہو چکی تھیں۔

”دیکھو ناں وہ لوگ زندہ ہیں تبھی تو وہ فائل جابر علی کے ہتھے چڑھی۔“
”لیکن سر آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ فائل جابر علی کے پاس پہنچ گئی ہے؟“ وارث علی کی بات سن کر ایس پی بے ساختہ ہنس پڑا تھا اور معنی خیز انداز میں گویا ہوا تھا۔

”پولیس والوں سے یہ سوال کر رہے ہو وارث علی.....؟“
”پھر بھی سر..... ہمیں بھی تو کچھ پتا چلے..... تھوڑی دیر کے لیے ہمیں بھی پولیس والا بنادیں کیونکہ واقعی مجھے تو بالکل پتا نہیں وہ فائل جابر علی تک پہنچی کیسے اور جس کسی نے بھی وہ فائل جابر علی تک پہنچائی ہے وہ آخر کون ہے.....؟ اگر اس بندے کا بھی پتا چل جائے ناں تو زمین کے مالک کا بھی پتا چل جائے گا..... کہ اس وقت وہ کہاں ہے اس ملک میں ہے یا ملک سے باہر ہے۔“ وہ بڑے راز دارانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”سر جی دیکھیں ابھی تک ہم نے جو کچھ بھی ٹارگٹ کیا تھا یہ ہی ہمارا سب سے بڑا ٹارگٹ تھا۔ اس زمین نے سمجھو ہماری سات پشتوں کے لیے خزانے جمع کرنے ہیں..... لیکن جب تک..... زمین کی وہ اور بیکسل فائل محفوظ ہے ہم بالکل غیر محفوظ ہیں دیوانی مقدمہ تو کسی بھی وقت کھڑا ہو سکتا ہے۔ دس سال بعد بھی اس زمین پر کلیم ہو سکتا ہے..... ہو سکتا ہے اس وقت کی گورنمنٹ ہمیں سپورٹ نہ کرے اور اس وقت ہم انڈر گراؤنڈ ہو چکے ہوں..... پھر تو یہ ساری محنت بیکار گئی ناں سر جی.....“ وارث علی غور و خوض کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”لگتا ہے کوئی خفیہ ہاتھ جابر علی کے کندھے پر تھا جس نے یہ کام کیا ہے۔ وہ تو انسپیکٹر کرامت علی ایک میننگ میں بات کر رہے تھے تو باتوں، باتوں میں انہوں نے بتایا کہ لینڈ مافیا کے قبضے سے ایک بہت اہم زمین آزاد کرانی ہے اور تمہیں تو پتا ہی ہے ناں انسپیکٹر کرامت علی، جابر علی کا جگہری یاد رہا ہے۔ وہ تو شکر ہے اس کی پوسٹنگ ہو گئی ورنہ جابر علی، کرامت علی کے ساتھ نظر آتا تو سمجھو..... کر یا نیم پر چڑھا ہوا تھا..... اچھا چھوڑو یہ فضول کی باتیں، یہ بتاؤ کہ آخر اس فائل کو جابر علی کے قبضے سے نکالنے کے لیے کیا کیا جائے؟“
ایس پی پولیس افسر ہونے کے باوجود وارث علی جیسے ٹل کلاس شخص سے یوں مشورہ مانگ رہا تھا جیسے

بچوں کے سرداروں میں سرداروں کے سرخ (سب سے بڑا سردار) سے بات کر رہا ہو۔
”ہوں.....“ وارث علی نے ہنکارا بھرا..... شاہ زمان خان کے انتہائی فکر انگیز کلام نے اسے خیالات کے سمندر میں اس بری طرح دھکیل دیا تھا کہ وہ باہر آنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا..... مگر کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔
”وارث علی موتیوں کا ہار ٹوٹنے کا تصور کرو کیسے ٹپ، ٹپ موتی گرتے اور بکھرتے ہیں، ایک کیس بھی بن گیا تو ہمارے تمام سیکریٹ باہر آنے لگیں گے..... یا اس جال پانگل کوز بردستی دھمکی دو..... اس کی جوان بیٹی کو اٹھانے کی دھمکی دے دو اور یہ سب کچھ کرنے، میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گا یہ کام تمہیں اور صرف تمہیں کرنا ہے۔“ شاہ زمان نے مسئلے کا حل نکالا اور فیصلہ بھی صادر کر دیا۔

”سر جی یہ اتنا آسان ہوتا تو اتنا بڑا کھیل کرتے بھلا.....؟“ وارث علی نے بڑے ادب کے ساتھ ایس پی کا مذاق اڑایا تھا۔

”دیکھو وارث علی، ہم فائلیں اور نیچے کر دیتے ہیں سمجھو یہ بھی بہت ہے اس سے آگے کا کام تو تم ہی کو کرنا ہے۔“ شاہ زمان خان اپنے فیصلے پر پکا ہو چکا تھا اور وارث علی کو اس کی ڈیوٹی سمجھا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا یہ سب کچھ سننے کے بعد وارث علی کے کیا تاثرات ہوتے ہیں۔

وارث علی نے جب ایس پی کو اپنی جانب بہت غور سے دیکھتا پایا تو خود بخود خیالوں کی زنجیریں کٹ گئیں اور وہ اسی ماحول میں ان ہو گیا۔

”بیٹی اٹھانے کی دھمکی ہی نہیں دوں گا..... اٹھا بھی لوں گا.....“ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ الفاظ ادا کیے تھے اور بڑے دلچسپ انداز میں شاہ زمان خان کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ نظر آئی جو من پسند کامیابی کا مرثدہ سن کر نمودار ہوتی ہے۔

”آدھی گھر والی کو پوری گھر والی بنائیں گے سر اور یہ.....“
”اور کچھ نہیں.....“ ایس پی شاہ زمان نے فوراً وارث علی کی بات کاٹ کر کہا۔
”یہ اور..... اگر مگر..... یا بہت خطرناک ہوتے ہیں مجھے اور سے آگے کچھ نہیں سننا وکٹ تیار ہے..... کھیلتے کیوں نہیں؟ اس سے پہلے کہ بارش ہو جائے میچ ملتوی ہو جائے۔“ ایس پی کی معنی خیز بات پر وارث علی نے مسکراتے ہوئے اپنا جوس کا گلاس یوں اٹھایا جیسے امرت پینے جا رہا ہو۔

☆☆☆

اصیل خان اپنے کوارٹر میں عشا کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد چٹائی پر چٹ لیٹا ہوا چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یوں جیسے چھت نہ ہو کوئی اسکرین ہو اور کوئی بہت اچھی فلم چل رہی ہو..... اس کی محویت کا یہ عالم تھا کہ اس نے کافی دیر سے پلک نہیں جھپکی تھی لیکن اس کا ارتکاز دروازے پر پڑنے والی ہلکی سی دستک نے توڑ دیا تھا۔

وہ صرف چونکا نہیں بلکہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دل انجانے اندیشوں میں الجھنے لگا..... ذہن فوراً مہر جان کی طرف گیا تو اس کے چہرے سے بے بسی کی کیفیت جھلکنے لگی..... ”شاید گل جان بی بی کو نیند آگئی ہے اور ڈاکٹر صاحبہ اپنے کمرے سے باہر چلی آئی ہیں۔“ وہ یہ سوچتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور ہچکچاتے ہوئے دروازہ کھول دیا..... لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی..... اس کے سامنے روما کھڑی تھی۔ ”اس وقت روما یہاں.....؟“ اس کا ذہن متعدد سوالات میں الجھنے لگا۔

امانت

”بیٹا میں ملازم نہیں ہوں مجھے تو آپ غلام سمجھیں غلام کی اپنی سوچ ہوتی ہے نہ زبان..... میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا، مجھے آپ معاف کر دیجیے۔“ اصل خان کے انداز میں کمال کی بے بسی تھی۔

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں..... میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں کہ آپ کچھ نہیں جانتے۔“ روما تو چیخے آج..... تہیہ کر کے آئی تھی اس کے پاس..... اصل خان کا کوئی جواب اسے مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ آج جب سے کاٹناز نے اسے اپنے ماں، باپ کی تصویریں دکھائیں، ان کی ذہیروں باتیں کیں تو جیسے اس کے دماغوں کے ٹانگے ادھیڑ کر رکھ دیے تھے۔

وہ تو روزانہ کے انداز میں معمول کے مطابق سونے کے لیے لیٹ گئی تھی لیکن ایسا ہوتا ہے ناں کہ جب انسان کو بستر پر لیٹنے کے بعد نیند نہیں آتی تو گزرے ہوئے دن کی ساری جھلکیاں آنکھوں میں چمکنے لگتی ہیں..... اچھا، برا سب ہی یاد آ جاتا ہے..... نیند بالکل ہی نہیں آرہی ہو تو آج کے دن کے واقعات کی ترتیب ختم ہوتے ہی برسوں پرانا واقعہ فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے چلنے لگتا ہے..... یہ کچھ اختیار ہی نہیں ہوتا..... جاگتے ذہن کو کوئی کام چاہیے بس.....

اصل خان تو روما کی بات سن کر یوں بدکا تھا جیسے اسے بڑی زور کا کرنٹ لگا ہوا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ... بے ساختہ انداز میں لہرا کر جیسے صاف، صاف انکار کیا تھا کہ وہ کچھ نہیں بتا سکتا اور اس سے مزید کوئی سوال نہ کیا جائے۔

”بابا..... آج میں یہیں بیٹھی رہوں گی، جب تک آپ کچھ بتائیں گے نہیں، آپ جو مرضی کر لیں۔“ روما کے انداز میں عجیب سی ہٹ دھرمی تھی جو اس کی ذات کا حصہ کبھی نہیں تھی..... مگر آج وہ سر سے پاؤں تک ایک اٹل چٹان کی طرح محسوس ہو رہی تھی..... جو کسی قیمت پر اس سے مس ہونے کو تیار نہیں تھی۔

”بی بی آپ گھر کے ایک بے اختیار غلام سے پوچھ رہی ہیں، میری زبان کٹی ہوئی ہے..... کہہ دیا ناں کہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”تو پھر کون بتائے گا؟“ روما نے برجستہ سوال کیا تھا۔

”اماں جان سے جب پوچھا غصہ کرنے لگیں، خالہ جانی سے پوچھا تو رونے لگیں..... وہ بھی تو اماں جان سے ڈرتی ہوں گی..... دیکھیں میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی کہ آپ نے مجھے کچھ بتا دیا ہے۔ بابا آپ مجھے بتائیں پلیز..... کہ میرا باپ کون تھا اور آپ نے اسے دیکھا ہے یا نہیں؟“ روما اسی طرح اپنی جگہ اڑی ہوئی تھی۔

”بیٹا اگر کوئی بتا سکتا ہے تو وہ آپ کی خالہ ہیں اگر وہ بتا دیں تو اچھی بات ہے اگر وہ نہیں بتاتیں تو آپ ضد نہ کریں۔“

”کیسے ضد نہ کروں.....؟“ روما نے فوراً اصل خان کی بات کاٹ کر غصے سے اس کی طرف گھورا تھا۔ اس نے آج تک اصل خان سے اس طرح بات کی تھی جیسے وہ گھر کا بڑا ہو، ملازم نہ ہو لیکن آج تو اس نے مردوت اور لحاظ بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

اصل خان اب بالکل خاموش ہو گیا ایک لفظ نہیں بولا..... روما اس کی خاموشی سے چڑ گئی۔

”اتنا تو بتا سکتے ہیں کہ آپ نے میرے باپ کو دیکھا ہے یا نہیں؟“ اصل خان جواب میں پھر خاموش تھا۔

”بابا میں آپ سے پوچھ رہی ہوں..... آپ نے میرے باپ کو دیکھا ہے یا نہیں.....؟ اور اگر نہیں دیکھا ہے تو یہ بات میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں..... میرے سر کی قسم کھا کر بولیں..... بتائیں، آپ نے میرے باپ کو دیکھا ہے؟“

”خیریت تو ہے بیٹا آپ اس وقت..... وہ شاہ صاحب کو بتا کر آئی ہیں ناں..... ایسا نہ ہو کہ آپ کو وہ گھر میں نہ پا کر پریشان ہو جائیں۔“ اصل خان وہ کچھ بولی گیا جو بولنا نہیں چاہتا تھا اور وہ سوال اندر ہی کہیں سر پٹختا رہ گیا جو لبوں پر آنے کے لیے چل رہا تھا کہ ”آخر وہ اتنی رات کو کیوں آئی ہے؟“

”مجھے راستہ دیں بابا۔“ روما نے عجیب سی کیفیت میں اصل خان سے کہا تھا۔ اصل خان کیوں، کیا سے پہلے ہی ایک طرف ہو گیا..... جس طرح روما کا انداز بے ساختہ تھا اسی طرح اس کے ایک طرف ہونے میں بھی بڑی بے ساختگی تھی۔

”وہ..... بیٹا.....“

”آپ چپ کریں بابا.....! مجھ سے کوئی سوال نہ کریں، میں تو آپ سے سوال کرنے آئی ہوں..... بس میرے سوال کا جواب دے دیں ورنہ مجھے ساری رات نیند نہیں آئے گی۔“ روما کے انداز میں ایسا کیا تھا کہ اصل خان اپنی جگہ پر قہر آ کر رہ گیا اسے عجیب سے خطرے کی بو آنے لگی جیسے کوئی اور نیا امتحان اس کے سر پڑنے والا ہو..... اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا..... روما کی طرف بس دیکھتا رہ گیا۔

”بابا آپ ہمارے گھر کے سب سے پرانے ملازم ہیں، ہیں ناں.....؟“ روما نے اچانک ہی پینٹر ابدل کر جیسے حملہ کر دیا تھا۔ اصل خان جواب میں بالکل خاموش رہا..... بلکہ اس نے اپنی اٹھی ہوئی نظریں جھکا لیں۔

”آپ میری بات سن رہے ہیں ناں بابا.....! آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ اس وقت میری کیا حالت ہے، پتا نہیں کیوں آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں بہت سارا روؤں..... چنچنیں مار مار کر روؤں..... اتنا روؤں اتنا روؤں کہ تھک کے بے ہوش ہو جاؤں مگر میرے آنسو نہ رکیں۔“ اتنا کہنے کے بعد روما ہچکیوں سے رونے لگی۔

”خیریت تو ہے بیٹا ایسا کیا ہو گیا..... میں بوڑھا آدمی ہوں میرا دل بہت کمزور ہے، جلدی سے بتا دیں..... خدا نخواستہ..... کیا بات ہوئی ہے؟“ اصل خان نے اپنا لرزنا کا پتہ ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

”بابا..... مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ میرے فادر کی ڈیڑھ کب ہوئی تھی۔ میرا مطلب جب ان کی ڈیڑھ ہوئی، میں کتنے سال کی تھی۔ مجھے تو ان کی ہلکی سی جھلک بھی یاد نہیں ہے۔ بابا..... آپ نے کوئی گھر ایسا دیکھا ہے جہاں بچوں کے باپ کی تصویر تک نہیں ہو..... اماں جان ان کا ذکر تک برداشت نہیں کرتی تھیں..... بھلا کیوں.....؟ وہ چور تھے؟ ڈاکو تھے؟ اسمگلر تھے؟ آخر ایسی کیا بات ہے جو اماں جان ایک دم اتنی irritate ہو جاتی ہیں۔ نام تو کیا وہ تو ذکر سننا بھی پسند نہیں کرتیں.....“ روما اب دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اصل خان پریشان تو تھا ہی لیکن ایک بڑی الجھن نے اسے چاروں طرف سے ایسے گھیر لیا تھا جیسے کھڑے، کھڑے آگ لگ گئی ہو اور وہ شعلوں میں گھر گیا ہو۔

”بیٹا مجھ سے کچھ نہ پوچھو، میں انہیں نہیں جانتا.....“ اصل خان نے بڑی بے بسی کی کیفیت میں کہا تھا..... روما نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر اصل خان کی طرف یوں دیکھا جیسے نظروں ہی نظروں میں اسے پر لے درجے کا جھوٹا کہہ رہی ہو۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... آپ اس گھر کے پرانے ملازم ہیں، ہمارے پیدا ہونے سے پہلے شاید یہاں ہوں..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو کچھ پتا نہیں ہو..... کیوں چھپاتے ہیں آپ..... اگر میرا باپ بہت برا انسان تھا تو دنیا میں بہت سے باپ بہت برے ہوتے ہیں..... مگر بچوں کو یہ پتا ہوتا ہے ناں کہ یہ ان کے باپ ہیں۔“ روما اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

بجائے کچھ سننے کا منتظر ہوا۔

دوسری طرف سے وارث علی نے کال ریسیو ہوتے ہی بولنا شروع کر دیا تھا وہ کہہ رہا تھا۔ ”ارے آپ نے فوراً ہی فون بند کر دیا۔ فون کرنے والے سے اتنا تو پوچھ لینا چاہیے کہ اس نے کیوں فون کیا ہے؟ آپ کی ای سوری ہیں، بھائی بھی سوری ہیں تو کیا ہوا..... آپ سے تو بات ہو سکتی ہے۔ آخر آپ سے رشتے داری ہے ہم تو چاہتے ہیں یہ رشتے داری ای طرح چلتی رہے ویسے آپ کی آواز مرحومہ کی آواز سے بہت ملتی ہے۔ مرحومہ کی آواز بھی بہت پیاری تھی کانوں میں گھنٹیاں ہی بجنے لگتی تھیں۔ آپ کی آواز سنی تو اپنی مظلوم شریک حیات کا چہرہ نظروں کے سامنے گھومنے لگا..... بہت برا ہوا بے چاری کے ساتھ بلکہ ہم سب کے ساتھ لیکن جو قسمت میں لکھا تھا وہ ہو گیا..... آپ کے گھر گیا تو آپ سامنے ہی نہیں آئیں..... لیکن مجھے اندازہ ہے کہ آپ بھی ستارہ کی طرح بہت خوب صورت ہوں گی..... ستارہ کے جانے سے میرا گھر تو قبرستان بن گیا ہے..... سوچتا ہوں کہ اس وحشت سے چھٹکارا پانے کے لیے کیا کروں..... پھر خیال آیا ستارہ کا نعم البدل تو اس کی بہن ہی ہو سکتی ہے..... آپ اگر میرا ساتھ دس تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے دیکھیں ناں..... غم منانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے کل کو آپ کی بھی کہیں نہ کہیں شادی ہونی ہی ہے تو پھر نئے رشتے کیوں آزمائے جائیں جو رشتے بن چکے ہیں انہی کو نبھاتے رہیں۔ وقت کی بھی بچت ہے اور پیسے کی بھی جو کچھ آپ کی بہن کو دیا تھا وہ آپ ہی کا تو ہے..... آپ کچھ بولیں گی نہیں؟ میں ہی بولے جا رہا ہوں۔ لگتا ہے کہ آپ بہت کم بولتی ہیں۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ آپ میری بات سن رہی ہیں۔“ وارث علی کو بولتے، بولتے اچانک خیال آ گیا تھا کہ دوسری طرف بالکل خاموشی چھائی ہوئی ہے جبکہ لائن بھی منقطع نہیں ہوئی..... جس کا واضح مطلب ہے کہ دوسری طرف سے اس کی بات بہت توجہ سے سنی جا رہی ہے۔

برہان کی شریانوں میں تو جیسے خون کے بجائے شعلے متحرک تھے۔ وہ کمال ضبط سے کام لے رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا فوری رد عمل یا فوری جواب کیا ہونا چاہیے۔ ذہن بالکل برف کی طرح جم چکا تھا..... سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت مفقود ہو رہی تھی، آنکھوں کے سامنے نیلے، پیلے، ہرے، لال دائرے ناچ رہے تھے۔ بصارت، سماعت سب ہی کچھ متاثر تھا۔

”اچھا ہوا آپ نے فون اٹینڈ کر لیا، آپ اپنے بھائی اور والدہ صاحبہ کو سمجھائیں کہ مجھ سے ٹکر لینے کی حماقت نہ کریں ابھی چھوٹا نقصان ہوا ہے..... پھر بڑے، بڑے ہو جائیں گے۔ اگر آپ نے میرا ساتھ دیا تو سب لوگوں کو آرام مل جائے گا اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے والد کی ضمانت میں نکراؤں گا..... کچھ بولے ناں..... کمال کی بات ہے اتنی دیر میں آپ کی طرف سے ایک لفظ سننے کو نہیں ملا۔ محبت سے نہیں بول سکتیں تو نفرت ہی سے بول دیجیے۔“ وارث علی خباثت سے ایک، ایک لفظ چبا، چبا کر بول رہا تھا یوں جیسے محبت کی زبان میں خوفناک دھمکیاں دے رہا ہو۔

”میں تمہاری ساری بکواس سن چکا ہوں۔“ بالآخر برہان پھٹ پڑا اور برہان کی آواز سن کر وارث علی کے سر پر بم پھٹا تھا ایک لمحے کے لیے تو اس جیسا ڈھیٹ اور بے ضمیر انسان بھی چکرا کر رہ گیا۔

”اب تم فون بند کرو آرام سے سو جاؤ اور ہاں سنو یہ ہماری طرف تمہارا آخری فون تھا..... کیا سمجھے آخری فون..... یاد رکھنا۔“ برہان نے یہ کہہ کر ریسیور رکھنے کا ارادہ کیا تو برہان کی سماعت سے وارث علی کی آواز نگرانی۔

”ٹھہرو، ٹھہرو ایک منٹ رکو۔ پہلے میری بات سن لو اس کے بعد فیصلہ ہوگا کہ یہ فون آخری تھا یا اس کے

بعد بھی بات چیت جاری رہے گی۔“

”ٹھیک ہے تم اپنی بکواس مکمل کرو میں سن رہا ہوں۔ اس وجہ سے تاکہ تم رات بھر فضول میں گھنٹیاں نہ بجاتے رہو۔“

”دیکھیے مسٹر برہان! آپ ہمارے برابر کے نہیں ہیں۔ اپنے قد و قامت اور اپنی حیثیت کو دیکھ کر بات کریں۔ آپ جیسے بندوں کو تو ہم ایک گلاس ٹھنڈا پانی سمجھ کر پی جاتے ہیں۔ پتا بھی نہیں چلتا کہ کدھر گئے..... بات سمجھ آ رہی ہے ناں.....!“ وارث علی کے لہجے میں ایک دم درندہ خزانے لگا اور اس نے اپنی بھرپور اصلیت کا مظاہرہ کیا۔

”آپ مجھے ایک گلاس پانی سمجھ کر ہی پی جائیں مجھے یہ سودا منظور ہے۔“ یہ کہہ کر برہان نے ریسیور رکھنا چاہا تو اسے محسوس ہوا اتر پٹیس سے آواز آرہی ہے۔

”ہیلو، ہیلو..... مسٹر برہان فون رکھنے سے پہلے میری ایک بات سن لیں ورنہ میں اسی وقت آپ کے گھر آ کر بات کروں گا۔“

برہان نے چند لمحے سوچ کر ریسیور پھر کان سے لگا لیا۔ بہر حال وہ یہ تو نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی منحوس صورت لے کر یہاں آ جائے۔

”دیکھو برہان جب ایک بہن میرے گھر میں آ سکتی ہے، رہ سکتی ہے میرے ساتھ گزارہ کر سکتی ہے تو تمہاری دوسری بہن بھی میرے گھر میں خوش رہ سکتی ہے۔ انکار، اقرار کی تو بحث ہی نہیں..... فضول بات کرو گے تو آج ہی اسے اٹھا کر لے آؤں گا“ خدا حافظ۔“ وارث علی نے فون بند کر دیا تھا لیکن ریسیور ابھی تک برہان کے کان سے لگا ٹوں، ٹوں کی آواز سن رہا تھا۔ پوری کائنات گول گول دائروں میں یوں گھومنے لگی جیسے وہ کوئی ریت کا نظر نہ آنے والا ذرہ ہو جو کائنات کے اس چکر میں چکراتا پھر رہا ہو۔ اس نے بڑی بے اختیاری کیفیت میں پیچھے مڑ کر دیکھا تھا اس کا اندازہ درست نکلا۔ شبینہ چند قدم کے فاصلے پر ابھی تک کھڑی تھی شاید اسے بھی اندیشے ستارہ تھے اور وہ صرف یہ جاننے کے لیے کہ برہان کی وارث علی سے کیا بات ہو رہی ہے وہاں رکی ہوئی تھی۔

برہان نے ایک گہری سانس لے کر ریسیور کرڈل پر رکھا اور ہلکی روشنی میں پرانی وضع کی دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ شبینہ نے اب برہان سے کوئی بات نہیں کی اور چپ چاپ سر جھکا کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

”ایک منٹ شبینہ میری بات سنو۔“ برہان نے جاتی ہوئی شبینہ کو آواز دے کر روکا۔ شبینہ رک گئی اور سوالیہ نظروں سے بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہ..... تم..... اپنے دو تین سوٹ اپنے بیگ میں رکھو، تمہیں اسی وقت میرے ساتھ کہیں جانا ہے۔“ برہان بالکل عام سے انداز میں طوفان اٹھا رہا تھا۔ شبینہ نے آنکھیں پھاڑ کر برہان کی طرف دیکھا تھا۔

”بھائی اس وقت؟ اس وقت مجھے لے کر آپ کہاں جائیں گے.....؟“ اس کا دل خوف سے لرزنے لگا۔ پہلا خیال تو یہی آیا کہ برہان بھی اس وقت جا بر علی کے قالب میں ڈھل گیا ہے اور اسے وارث علی کے ہاتھوں میں دینے جا رہا ہے۔

”شبینہ بالکل بھی وقت نہیں ہے ای گہری نیند سو رہی ہیں، دو تین گھنٹے سے پہلے ان کی نیند نہیں ٹوٹے گی۔“

”لیکن بھائی مجھے یہ تو بتا دیں کہ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں.....؟“

”شبینہ اس وقت سوال جواب کا وقت نہیں ہے اس طرح کے کرمٹل لوگ راتوں کو جاگتے ہیں اور دن کو سوتے ہیں ان کے سارے ضروری کام رات کو ہوتے ہیں۔ اب میں کوئی خطرہ منول نہیں لے سکتا..... ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں کہ وارث علی کے سامنے میری اس وقت کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ کوئی چھوٹا موٹا مجرم نہیں ہے بہت بڑا کرمٹل ہے۔ اتنا بڑا کرمٹل کہ اس ملک کے بااثر لوگوں کی گود میں بیٹھتا ہے۔ یہ وہ چور ہیں جو ایک دوسرے کو سپورٹ کرتے ہیں۔ وہ ہلاک ہیں جو مل کر کرپشن کی آسمان تک اونچی دیوار تعمیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں..... جلدی کرو شبینہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

”لیکن بھائی مجھے یہ تو بتا دیں کہ مجھے لے کر کہاں جا رہے ہیں.....؟“

”میں تمہارا بھائی ہوں تمہاری حفاظت کرنا میرا فرض بھی ہے اور ذمے داری بھی..... ای اٹھ جائیں گی تو ای بھی تمہارے پاس آ جائیں گی۔ لیکن میں تمہیں صبح تک اس گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ پلیز..... شبینہ میں جو کہہ رہا ہوں ویسے ہی کرو۔“

شبینہ نے بڑی بے بسی کی کیفیت میں دیکھا پھر چاروں طرف یوں نظریں دوڑائیں جیسے ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے اس ٹھکانے کو خدا حافظ کہہ رہی ہو۔

برہان کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بے بسی کی انتہا پر آ کر اسے بھائی کی بات ماننا ہی تھی۔ وہ من، من بھر کے قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی جبکہ برہان اسی طرح اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا..... اور بار بار غیر ارادی طور پر فون سیٹ کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔

☆☆☆

”روما آخر بتاؤ تو سہی کیا ہوا ہے؟ رورور کر آنکھیں سو جی ہوئی ہیں۔ تم اتنی رات کو گھر کیوں گئی تھیں؟ کیا مسئلہ ہے؟ بولتی کیوں نہیں؟“ کانناز بہت پریشانی سے روما کی طرف دیکھتے ہوئے سوال پر سوال کیے جا رہی تھی جس کے جواب میں روما کی طرف سے بالکل خاموشی تھی۔

”روما پلیز مجھے بتاؤ ورنہ میں جا کر رابی آپا کو اٹھاتی ہوں وہ ہی تم سے پوچھیں گی۔“ اب روما نے ایک دم کانناز کی طرف دیکھا تھا پھر گلوگیر لہجے میں گویا ہوئی۔

”نہیں کانناز! رابی آپا کو مت اٹھاؤ۔ میں تو بس ویسے ہی خالہ جانی سے ملنے گئی تھی۔“

”مگر اتنی رات کو؟“ کانناز نے تیزی سے اگلا سوال کر دیا۔ روما پھر خاموش ہو گئی۔

”کیا پوچھ رہی ہوں میں۔ اتنی رات کو تم خالہ جانی سے ملنے کیوں گئی تھیں؟ کوئی تو وجہ ہوگی ناں؟ اگر سبیل سی کوئی بات ہوتی تو ظاہر ہے تم صبح چلی جاتیں لیکن تمہاری آنکھوں سے لگتا ہے کہ تم بہت روئی ہو۔ میں بہت پریشان ہو رہی ہوں روما..... تم مجھ سے کچھ نہیں چھپاتیں..... اب کیا مسئلہ ہے؟“ کانناز از حد پریشانی کی کیفیت میں مبتلا ہو چکی تھی ایک بے چینی تھی جو اس کے دل کو لاحق تھی اور بے چینی کی ہر لہر اسے سوال کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

”تم سو جاؤ کانناز بہت رات ہو گئی ہے۔ صبح کالج بھی جانا ہے۔ تم میری فکر نہ کرو میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

”اوہ.....“ کانناز پھر جھنجھلا گئی۔ ”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے روما..... میں تم سے یہ پوچھ رہی ہوں کہ آخر تم کس بات پر اتنا روئی ہو کہ تمہاری آنکھیں سو جی ہوئی ہیں؟“

”میں نے کہا ناں کوئی بات نہیں ہے کانناز..... پلیز تم سو جاؤ۔“

”میں تو نہیں سوتی جب تک تم میری بات کا جواب نہیں دو گی۔ میں بھی نہیں سوؤں گی چاہے صبح ہو جائے..... تمہارے ساتھ جاگتی رہوں گی۔“ کانناز نے اپنا حتی فیصلہ سنا دیا اور اپنے گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا گھیرا باندھ کر گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔ اس کی طرف سے یہ اعلان خفگی تھا۔

رومانے بڑی بے بسی کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحے کچھ سوچا پھر آہستہ آواز میں گویا ہوئی۔

”کانناز بس پتا نہیں کیوں مجھے نیند نہیں آرہی تھی، آج تم نے اپنے ابو کی تصویریں دکھائیں ناں ان کے بارے میں باتیں کیں پتا نہیں میرے دل کو کیا ہوا۔ میرا دل چاہا کہ میں گھر جا کر اصل بابا سے پوچھوں کہ میرا باپ کون تھا۔ میری ماں، باپ کے ذکر پر ناراض کیوں ہو جاتی تھیں..... اگر وہ برا آدمی بھی تھا تو ہمیں اتنا تو پتا چلنا چاہیے ناں کہ وہ کون تھے؟“

”اوہ مائی گاڈ.....“ کانناز نے اب اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ ”تو یہ بات تھی..... میرا ذہن تو اس طرف جا ہی نہیں سکتا تھا۔ یا را تم اتنی بڑی ہو گئیں..... آج تک تمہیں اپنے والد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں..... تو بس اب باقی دن بھی چپ چاپ گزار لو۔“

”باقی دن.....؟“ رومانے کانناز کی طرف دیکھا۔ ”باقی دن کا کیا مطلب ہوا؟“

”میرا مطلب یہ ہے بھئی کہ اب جتنی عمر رہ گئی ہے وہ بھی اسی طرح گزار لو۔ اگر پتا چلنا ہوتا تو پتا چل جاتا..... کون بتا سکتا ہے بھلا..... تمہاری اماں جان بتا سکتی ہیں یا خالہ جانی..... اچھا اصل بابا نے تمہیں کیا بتایا۔ یہ تو تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔ یقیناً انہوں نے بھی تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ اگر بتا دیا ہوتا تو تم مجھے بتاتیں اور سکون سے سو جاتیں..... ہے ناں؟“ کانناز چھوٹی عمر میں بہت بڑی بات کر رہی تھی۔ شاید دوست کے دکھ نے اس کے ذہن کو آنا فانا بہت اونچی اڑان دے دی تھی اور ان راستوں پر سفر کرا دیا تھا جو اس سے پہلے اس کی نظروں سے اوجھل تھے۔

”ہاں، بابا نے تو کچھ نہیں بتایا..... البتہ یہ ضرور بتا دیا کہ انہوں نے میرے بابا کو دیکھا تھا۔“

”اچھا.....“ کانناز کی آنکھیں اب حیرت اور خوشی سے چمکنے لگیں۔

”تھینک گاڈ اتنا تو پتا چلا..... کوئی تو ہے جو کہہ رہا ہے کہ اس نے تمہارے والد کو دیکھا ہے لیکن تم نے پوچھا نہیں کہ ان کا انتقال کیسے ہوا تھا یا انتقال سے پہلے تمہاری اماں جان کی اور تمہارے والد کی separation ہو گئی تھی؟ وغیرہ وغیرہ..... ویسے کوئی تو مسئلہ رہا ہو گا بھی تو تمہاری اماں جان کو ان کے ذکر پر بھی غصہ آ جاتا ہے..... لگتا ہے کہ شادی فلاپ ہو گئی ہوگی۔“ کانناز اب اندازوں کے گھوڑے دوڑانے لگی۔

”کچھ بھی تھا مگر یہ تو بتا دیتیں کہ ہمارا باپ کون ہے؟ اس کی کوئی تصویر تو دکھا دیتیں۔ یقین کرو مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ساری زندگی باپ کا چہرہ تلاش کرتے کرتے گزر جائے گی دیکھو ناں کانناز ہر انسان چاہتا ہے کہ اسے اس کے ماں باپ کے بارے میں سب کچھ پتا ہو۔“

”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو روما۔ ہر انسان اپنے parents کے بارے میں بہت حساس ہوتا ہے۔ تمہارا دکھ واقعی بہت بڑا دکھ ہے۔ اس لیے کہ تم نے تو آج تک اپنے ابو کی کوئی تصویر تک نہیں دیکھی..... جانتی ہوں کہ تم اکثر ان کے بارے میں سوچتی ہوگی۔“ کانناز نے بڑے مدبرانہ انداز میں بات کی۔

”اکثر..... ہاں شاید پہلے کبھی اتنا خیال نہیں آیا لیکن..... اب سوچتی ہوں کہ آخر ایسی کیا بات ہے کہ میری

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم والٹی مارل کوالٹی، کمپیوٹر کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فوراً سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ماں میرے باپ کا ذکر سنا تک پسند نہیں کرتی اور نہ ہی ان کے بارے میں کچھ بتاتی ہے..... اب دیکھو..... گزشتہ زندگی کی طرح یہ رات بھی گزر جائے گی کوئی کچھ نہیں بتا رہا۔
”تو تم اپنا ذہن بنا لو..... اور پرسکون ہو جاؤ پلیز روم اب اتنا مت رونا، تمہاری آنکھیں دیکھ کر میرا دل چاہ رہا ہے میں بھی روؤں۔“
”کاناز میں رونا نہیں چاہتی تھی، پتا نہیں اتنے سارے آنسو کہاں سے آگئے۔“ بولتے بولتے روم کی آواز پھر بھرانے لگی۔ کاناز نے بے اختیار روم کا سراپے سینے سے لگا لیا اور اس کے بالوں پر یوں ہاتھ پھیرنے لگی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو بڑی شفقت سے بہلانے کی کوشش کر رہی ہو۔

☆☆☆

”شبینہ ٹیکسی آگئی ہے۔ جلدی سے آ جاؤ۔“ برہان نے گیٹ پارکر کے شبینہ کو آہستہ آواز میں اطلاع دی تھی۔ شبینہ بھی جیسے اس کی آواز ہی کی منتظر تھی۔ اپنے کمرے سے نکل کر باہر آگئی۔
”بھائی وہ ایک نظرائی کو دیکھ لوں سورہی ہیں یا جاگ چکی ہیں۔“ شبینہ نے کہا تو برہان نے بے ساختگی کے انداز میں فوراً کہا تھا۔
”اللہ نہ کرے کہ امی ابھی جاگیں..... بس تم جلدی سے آ جاؤ انہیں دیکھ کر میں ٹیکسی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور دیکھو تم اپنی ضرورت کی تمام چیزیں رکھ لینا..... ٹھیک ہے۔“
”ٹھیک ہے بھائی لیکن آپ یہ تو بتاویں ہم اتنی رات کو اس وقت جا کہاں رہے ہیں؟“ وہ سرگوشی کے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”شبینہ سوال جواب کا وقت نہیں ہے جیسے میں تمہیں کہہ رہا ہوں، کرو۔ یوں سمجھو کہ بہت ایمر جنسی ہے تمہیں اب اس گھر میں ایک پل نہیں رکنا۔ جلدی سے آ جاؤ۔“ برہان یہ کہتا ہوا بڑی جلدی سے گیٹ پارکر گیا۔
شبینہ نے ایک گہری سانس لی، آگے بڑھ کر صابروہ کے کمرے کے دروازے سے اندر جھانکا..... صابروہ نیند کی گولی کے زیر اثر سوئی ہوئی تھی۔ شبینہ کے دل کو جانے کیا ہوا کمرے کے اندر چلی آئی اور سوئی ہوئی صابروہ کے چہرے پر نظریں دوڑانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے دل چاہا کہ جھک کر ماں کی پیشانی کو بوسہ دے مگر اس خیال سے کہ ماں کی نیند نہ ٹوٹ جائے اس نے یہ خواہش اپنے دل میں ہی دبالی اور بے پاؤں جلتے پیر کی لمبی بنی کمرے سے باہر نکل آئی۔

اپنے کمرے میں جا کر اس نے ایک چھوٹا سا بیگ اٹھایا جس میں اپنے کپڑے اور کچھ ضرورت کی چیزیں رکھی تھیں۔ بیگ اٹھا کر کمرے سے باہر آئی کمرے کا دروازہ بند کر کے گھر پر یوں نظر دوڑانے لگی جیسے گھر کی ایک، ایک شے کو خدا حافظ کہہ رہی ہو۔ حالانکہ برہان نے اس سے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ اس گھر میں... دوبارہ نہیں آئے گی پھر بھی وہ جو کہہ رہا تھا سمجھ میں تو نہیں آ رہا تھا بس احساسات کچھ اس طرح کے ہو گئے تھے جیسے وہ اس گھر کو ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ رہی ہو۔

☆☆☆

امیل خان لان میں ایک سنگی منیچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ پاؤں اٹھا کر اس نے منیچ پر رکھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو یوں بہہ رہے تھے جیسے جھڑی لگی ہوئی ہو، وہ رو رہا تھا اور خود کلامی میں مبتلا تھا۔ اس لیے کہ اس وقت اس کے پاس کوئی ایسا نہیں تھا جس سے وہ اپنے اوپر پڑنے والی افتاد کو کسی داستان کی طرح بیان کر سکے۔

اس کے دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں بلند ہوئے اور اب سسکیاں لیتے ہوئے وہ اپنے پروردگار سے ملتی تھا۔
 ”یا اللہ مجھ پر رحم کر..... میں اپنی ہی اولاد کو یہ نہیں بتا سکتا کہ میں بد نصیب گناہ گار تمہارا باپ ہوں۔ وہ لوگ جو اپنی اولاد کو اپنے گناہ کی نشانی سمجھ کر زمین کا پیوند بنا دیتے ہیں، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ میرے مالک میں اپنی بچیوں کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی بیٹیوں کو صبح، دوپہر، شام دیکھنا چاہتا ہوں ان کے معصوم چہرے دیکھ کر میرے دل کو جو سکون ملتا ہے وہ ہی سکون تو اب میری ساری جمع پونجی ہے۔ میں اپنی اس جمع پونجی سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ ورنہ کب کا یہاں سے چلا جاتا اور دنیا سے منہ چھپا کر زندگی گزار دیتا..... یا اللہ میں اس آس پر اپنی اولاد کے لیے تجھ سے دعا مانگتا ہوں، رحم و کرم کی بھیک مانگتا ہوں کہ میں گناہ گار سہی پر ایک باپ بھی ہوں شاید ایک باپ کی دعا اولاد کے حق میں قبول ہو جائے کوئی قبولیت کی گھڑی میرا نصیب بن جائے۔ آسمان سے فرشتے اتریں اور میری بچیوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیں۔“ اس سے زیادہ اصیل خان بول نہیں پایا۔ آنسوؤں کے پھندے گلے میں یوں پھنس گئے کہ آواز منہ سے نکالنا ممکن نہ رہا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے اور بلک، بلک کر رونے لگا..... اس کے پورے وجود پر لرزہ طاری تھا۔ یوں لگتا تھا کہ آنسو صرف اس کی آنکھ سے نہیں بہہ رہے بلکہ اس کے جسم کے ایک، ایک خلیے سے خون کے آنسو ٹپک رہے ہوں۔

جانے وہ کتنی دیر تک بچیوں سے اسی طرح روتا رہا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب گل جان حسب معمول پورے گھر کا چکر لگاتی ہوئی بالکونی میں آکھڑی ہوئی ہے۔ اس کی نظریں اصیل خان پر تھیں۔ وہ بتا چکیں جھپکائے..... اصیل خان کو آنسو بہاتے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گل جان کے ہونٹوں پر ایک اداس مگر مسرور سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ایک گہری سانس لی پھر اصیل خان کی طرف دیکھتے ہوئے یوں بڑبڑائی..... جیسے باقاعدہ وہ اس سے ہم کلام ہو۔

”اصیل خان! ہمارے اجداد..... نے ترک اولیٰ کیا..... آنسوؤں کے سمندر بہائے اللہ سے دعا کی۔ اے اللہ ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ اگر تو نے ہم پر رحم نہ کیا تو ہم گھانا پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ خسارہ ہمارا مقدر ہوگا۔ اللہ کی رحمت جوش میں آگئی مگر گندم کی سزا آج تک باقی ہے۔ شاید ہم بھی اسی طرح مرتے دم تک سزا سے دوچار رہیں گے اس لیے کہ سزا پاک کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ اگر جانے سے پہلے پاک ہو جائیں تو کیا بات ہے۔“ اس نے اصیل خان کی طرف سے نظریں ہٹا کر پللیں جھپک جھپک کر آنے والے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی..... سینے سے ایک نہیں کئی ٹھنڈی آہیں نکلیں اور بیٹوبے کر اس فضا میں گم ہو گئیں۔
 ”لوگ کھٹ سے مر جاتے ہیں..... یا اللہ ہماری موت اب ہم سے کتنی دور رہ گئی ہے۔“

☆☆☆

شاہ عالم کا گارڈ نیند بھری آنکھوں میں از حد حیرت سمونے برہان اور شبینہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے تو یہ مغالطہ ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔

”ماسٹر صاحب آپ! آپ.....؟“

”ہاں میں..... خان اندر کا تنازنی بی کو بتاؤ کہ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔“ برہان، گارڈ سے مخاطب تھا اور شبینہ حیران پریشان برہان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ماسٹر صاحب! کا تنازنی بی کو بتاؤں یا صاحب کو.....؟“ گارڈ اب قدرے نیند کے حواس سے باہر آچکا تھا۔

”نہیں نہیں، شاہ صاحب کو نہ جگانا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دوائیں لیتے ہیں، مریض ہیں اور مریض کو رات کو اچانک ایسے نہیں اٹھانا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے جی، کیا بولوں کا ناز بی بی کو کہ ماسٹر صاحب آئے ہیں آپ سے ملنے کے واسطے؟“

”ہاں، ہاں..... بھئی یہ بولو..... جلدی کرو۔“

”ایک منٹ صاحب میں ابھی آتا ہوں۔“ گارڈ شینہ اور برہان کی طرف حیرت اور الجھن سے دیکھتا ہوا اپنے کیمین میں لگے ہوئے انٹرکام کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس نے انٹرکام پر گھنٹی بجا کر دوسری جانب سے ریسپور اٹھائے جانے کا انتظار کیا۔ کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے پلٹ کر برہان کی طرف دیکھا ریسپور حوزہ اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔

”لگتا ہے صاحب، بی بی بہت گہری نیند سویا ہے۔ اس واسطے وہ بات نہیں کرتا۔“

”تم دوبارہ گھنٹی بجاؤ..... انھیں گی.....“ برہان نے دونوں بات کی۔ شینہ اسی طرح الجھی ہوئی اپنی جگہ کھڑی تھی۔ گارڈ نے دوبارہ اندر رنگ دی اور انتظار کرنے لگا۔ آخر تیسری بار گھنٹی بجانے کے بعد کا ناز نے ریسپور اٹھا لیا تھا..... شاید وہ گہری نیند میں تھی۔ برہان اور شینہ گارڈ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جو کہہ رہا تھا۔

”بی بی، ماسٹر صاحب آئے ہیں ان کے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہے۔ ہمارے کو نہیں پتا وہ کون ہے؟ ماسٹر صاحب بولتے ہیں آپ سے ملنا ہے۔“

کا ناز نے جانے اس سے کیا کہا۔ اس نے گردن ہلائی اور انٹرکام بند کر دیا۔

”ماسٹر صاحب! آپ اندر جا کر بیٹھو، بی بی آپ سے ملتا ہے۔“ گارڈ نے اجازت ملنے پر برہان کو اندر کا راستہ دکھایا۔ برہان نے شینہ کی طرف دیکھا اور زمین پر رکھا ہوا بیگ اٹھا کر اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اندر کی طرف جا رہے تھے۔ گارڈ اسی طرح فکر اور پریشانی کی کیفیت میں ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی تو ساری نیند ہوا ہو چکی تھی پھر اس نے اپنے ہاتھ کو حرکت دیتے ہوئے خود کلائی کے انداز میں کہا۔

”پتا نہیں اس ٹیم کون سا پڑھائی ہوتا ہے.....؟“

☆☆☆

کا ناز بدحواسی کے انداز میں اپنے بستر سے اتر چکی تھی بار بار گھنٹی بجنے کی وجہ سے روما کی نیند بھی ٹوٹ گئی تھی۔

”کس کا فون تھا کا ناز؟“

”کسی کا فون نہیں تھا روما..... گارڈ انٹرکام وے رہا تھا..... وہ سر برہان آئے ہیں۔ وہ کہہ رہا ہے کہ وہ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔“

کا ناز کا اتنا کہنا تھا کہ روما نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں جیسے وہ سوئی ہی نہیں تھی۔

”کیا کہہ رہی ہو؟ سراس وقت تم سے ملنے آئے ہیں۔ ارے، یہ گارڈ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا..... پتا نہیں کون آ گیا ہے۔“

”نہیں، نہیں روما..... گارڈ انہیں اچھی طرح پہچانتا ہے۔ سر کوئی ایک دو دفعہ تو نہیں آئے تھے روز آ رہے تھے۔ ظاہر ہے گارڈ سے گزرے بغیر تو کوئی اندر نہیں آ سکتا ناں وہ سر کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ میں تو پریشان ہو رہی ہوں کہ وہ اس وقت کیوں آئے ہیں اور ہاں پتا ہے ان کے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہے۔“

”ہائے میں مر جاؤں۔“ روما نے ایک دم سینے پر ہاتھ رکھ لیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”لڑکی.....؟ سر کے ساتھ..... کا ناز سر کیس لڑکی کو لے کر آ گئے؟ اور تم سے ملنے کیوں آئے ہیں.....؟“

”مچھاپس..... ابھی پتا چل جاتا ہے..... تم آرہی ہو میرے ساتھ؟“ وہ تیزی سے باہر جاتے، جاتے روما کی طرف دیکھ کر گویا ہوئی۔

”ہاں، ہاں..... ظاہر ہے میری تو حالت خراب ہو رہی ہے۔ سر کس لڑکی کو اٹھا کر لے آئے ہیں؟“

”اب یہ تو ان سے ملنے کے بعد ہی پتا چلے گا کہ لڑکی کون ہے؟ اٹھا کر لائے ہیں یا خود چل کر آئی ہے؟“ کا ناز بولتی ہوئی پریشانی کی کیفیت میں باہر نکل گئی۔ روما نے ایک طرف پڑا ہوا دوپٹا اٹھایا گلے میں اٹکایا اور سلپر پاؤں میں پھنسانی ہوئی بھاگنے کے انداز میں کمرے سے باہر نکلی تھی۔

برہان اور شینہ صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ برہان بار بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھ رہا تھا اور بے قراری سے اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے اسے کا ناز کے آنے کا پورا، پورا یقین تھا اور پھر ایسا ہی ہوا..... کا ناز اور روما گرتی پڑتی لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ برہان کو شینہ کے ساتھ دیکھ کر دونوں آنکھیں پھاڑ کر یوں اپنی جگہ جم گئیں جیسے پاؤں اٹھانے کی سکت ہی نہ رہی ہو۔ برہان اور شینہ دونوں نے ان کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ برہان نے ان دونوں کی حیرت توڑنے کے لیے ہی شاید آہستہ آواز میں سلام کیا تھا۔

”السلام علیکم!“

شینہ ہکا بکا..... دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”جی سر..... جی السلام علیکم سر.....“ روما سے پہلے کا ناز سنہل گئی اور حیرت سے شینہ کی طرف دیکھنے لگی..... برہان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”کا ناز میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا، یہ میری چھوٹی بہن شینہ ہے یہ آج رات آپ کے پاس رکیں گی۔ صبح آپ دادا جان کو بتا دیجیے گا کہ میں انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ باقی بات صبح آکر شاہ صاحب سے خود کر لوں گا، اوکے؟“

”لیکن سر، یہ آپ کی چھوٹی بہن.....؟“

”بھئی یہ میری چھوٹی بہن ہے سگی بہن میری جس بہن کی ڈھچھ ہوئی تھی ناں یہ اس سے بڑی ہیں لیکن مجھ سے چھوٹی ہیں..... ٹھیک ہے؟“ پھر شینہ کی طرف متوجہ ہوا۔

”شینہ دیکھو گھبرا نا نہیں، تم سمجھو کہ تم بہت محفوظ جگہ پر ہو یہاں نہ لائے سیدھے فون آئیں گے نہ کوئی الٹے سیدھے فون کرنے والا کبھی یہاں آ سکتا ہے تمہیں بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں صبح ای کے ساتھ یہاں آؤں گا..... ٹھیک ہے؟ باہر کیسی میرا انتظار کر رہی ہے کیونکہ میں نے اس سے آنے جانے کی بات کی تھی۔“ پھر وہ کا ناز کی طرف مڑا۔ ”ٹھیک ہے کا ناز میں اب چلوں گا۔ پلیز شینہ کا خیال رکھیے گا۔“

”سر وہ..... دادا جان کو اٹھاؤں کیا؟“

”نہیں..... نہیں قطعاً نہیں، پہلے ہی وہ مریض ہیں انہیں اس طرح رات کو اچانک نہیں اٹھانا چاہیے۔ صبح بات کر لینا اور میں بھی آکر ان سے تفصیلی بات کروں گا..... اوکے..... خدا حافظ۔“ برہان بڑی عجلت کے انداز میں یہ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔ شینہ چند لمحے جاتے ہوئے برہان کی طرف دیکھتی رہی پھر آہستہ، آہستہ اس نے اپنی نظروں کا رخ ان دونوں کی طرف موڑا۔



جے چاری

صائمہ اکرم

بہت ہی ٹھنڈی ہے.....“ زیبا بھابی نے اتنے گرم موسم میں بڑی سرد آہ بھری۔
”کیوں میری قسمت کون سا اللہ تعالیٰ نے کسی برف کے کارخانے میں بیٹھ کر لکھی ہے.....“ یہ جملہ صرف وہ سوچ سکتی تھی کہنے کی صورت میں نقص امن کا اندیشہ تھا۔ اس نے غصے سے اپنی چپل اتار کر بھابی کے خزانہ سے مرغے کو ماری جو بالکل کسی تھانے

”تمہاری نند بے چاری کا کچھ بنا.....؟“
جیسے ہی یہ جملہ بندیا کی سماعتوں میں پہنچا، اس نے ہاتھ میں پکڑی جھاڑو، زمین پر پٹی، تیوری چڑھا کر بھابی کی بہترین دوست شمیم آرا کو دیکھا جو اس وقت بلاشبہ روح افزا شربت کا تیسرا گلاس غٹا غٹ چڑھا رہی تھی جبکہ جنگ انہوں نے گو میں رکھا ہوا تھا۔
”آئے ہائے، اس بے چاری کی قسمت بھی

نظر ملتے ہی کانٹا تیزی سے اس کے قریب آگئی اور شبینہ کے دونوں ہاتھ تھام کر بولی۔
”آپ ہمارے کمرے میں آجائیں کیونکہ مجھے سمجھ ہی نہیں آرہی کہ میں اس وقت آپ کو..... کون سے کمرے میں لے کر جاؤں صبح دیکھتے ہیں۔ آپ بھی تھکی ہوئی لگ رہی ہیں آرام کریں۔ ویسے کیا آپ لوگ کہیں گئے ہوئے تھے یا کوئی مسئلہ ہو گیا تھا راستے میں..... آج کل حالات بھی تو ایسے ہی چل رہے ہیں ناں؟“
کانٹا زبوں لے جا رہی تھی اور روم اپنی تمام حسیات کو اکٹھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے شبینہ کے چہرے سے کچھ بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس میں شاید اتنی اہلیت نہیں تھی کہ وہ کچھ اخذ کر سکتی۔
”نہیں، نہیں کانٹا زہم اپنے گھر سے آرہے ہیں۔ راستے میں کچھ نہیں ہوا۔“
”گھر سے؟“ دونوں نے بیک وقت چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”ہاں..... میں آپ لوگوں کو زیادہ کچھ نہیں بتا سکتی۔ بس یہی بتا سکتی ہوں کہ بڑا مسئلہ ہو رہا تھا۔ وہ..... ہمیں کوئی شخص بہت تنگ کر رہا ہے threat دے رہا ہے۔ شاید ہمارے باجان کی اس سے کوئی دشمنی ہے۔“
”threat دے رہا ہے.....؟“ اس مرتبہ کانٹا زہم کے بجائے روم کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ کانٹا زہم بس منہ کھول کر رہ گئی۔
”جی! مجھے یہ تو نہیں پتا کہ اس نے کیا کہا، برہان بھائی نے البتہ مجھے یہ بتایا کہ وہ دھمکیاں دے رہا ہے۔ شاید کوئی بلیک میلر ہے۔“
”او گاڈ.....“ کانٹا زہم نے خوف زدہ انداز میں شبینہ کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔
”پھر تو واقعی مسئلہ ہے۔ اچھا کیا سر آپ کو یہاں لے آئے۔ آپ لوگوں کے کوئی رشتے دار نہیں ہے ناں اس شہر میں.....؟“ کانٹا زہم نے پوچھنی سوال کر دیا تھا۔
”نہیں..... اگر ہمارا کوئی رشتے دار اس شہر میں ہوتا تو شاید ہم لوگ وہاں جاتے، یہاں نہیں آتے۔“
”چلیں خیر کوئی بات نہیں، ہمیں اپنا رشتے دار ہی سمجھیں، ہم تو سر کے جانے سے ویسے ہی پریشان ہو گئے ہیں آپ یہاں رہیں گی تو سر بھی ہماری پڑھائی مکمل کروادیں گے۔“ کانٹا زہم کو ہاتھ کے ہاتھ اپنی پریشانیاں بھی یاد آگئی تھیں جنہیں بیان کرنا بھی اس نے ضروری خیال کیا تھا۔
”کانٹا زہم آؤ ناں کمرے میں لے کر چلتے ہیں کب تک انہیں لے کر کھڑی رہو گی۔“ روم ابھی ابھی کیفیت میں یوں بولی جیسے ذہنی طور پر وہ کہیں اور پہنچی ہوئی ہو۔
”ہاں، ہاں اوہ سوری..... آپ کا نام.....؟“ کانٹا زہم نے شبینہ کا ہاتھ تھام کر اب بڑے پیار سے پوچھا تھا۔
”شبینہ۔“ اس کے تو اوسان ہی خطا تھے۔ عاقب و ماغی کی کیفیت میں اس نے نام بتایا۔
”ہاں..... ہاں سوری، وہ ابھی سر نے آپ کا نام تو لیا تھا۔ میں بھول گئی۔ چلیں آئیں آج آپ ہمارے ہی کمرے میں سوئیں گی پھر دیکھتے ہیں کہ صبح کو کیا ہوتا ہے..... ٹھیک ہے۔“ کانٹا زہم، شبینہ کو لے کر آگے چل پڑی۔ روم ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔
”ہم تو سمجھتے ہیں ساری دنیا میں جیسے ہم ہی پریشان ہیں لیکن لوگ تو اتنے پریشان ہیں کہ اتنی رات کو اپنے گھر سے نکل جاتے ہیں اپنے گھر میں بھی لوگوں کو خوف محسوس ہوتا ہے۔ بڑی عجیب بات پتا چلی۔“

جاری ہے

بے چاری

پھر تو ”بے چاری“ کا ٹھپا مجھ پر پکائی لگ گیا۔ زہر لگتا ہے یہ لفظ مجھے.....“ بندیا کو آج نہ جانے کیوں بہت غصہ آ رہا تھا۔

”بھئی لوگوں کو کیا پتا، یہ لفظ میرے دل پر کیسی چھریاں چلاتا ہے.....“ سونیا ہنسی۔

”ہاں اب تو دل کرتا ہے جو بھی یہ لفظ میرے لیے منہ سے نکالے، اس کی گردن پر چھرا چلا دوں.....“ بندیا کا غصہ عروج پر تھا۔

”اچھا چل، دفع کر اس قصے کو، یہ بتا، کل اپنے پرانے اسکول میں ”مینا بازار“ ہے، وہاں چلے گی.....؟“ سونیا کو اچانک یاد آیا۔

”چلی تو جاؤں لیکن کل جمعہ ہے اور کپڑے دھونے کے لیے مشین بھی لگانی ہے.....“ بندیا کو اپنی ذمے داریوں کی لسٹ اچھی طرح یاد تھی۔

”یار، کل شام کو آ کر لگا لینا، اب تیرے بغیر وہاں مجھے کیا خاک مڑہ آئے گا.....“ سونیا نے اپنی واحد دوست کا ہاتھ پکڑ کر بھرپور اصرار کیا تو بندیا بھی زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکی۔ بھائی اور بھابی کا زیادہ مسئلہ نہیں تھا کیونکہ انہوں نے کبھی بندیا پر غیر ضروری پابندیاں نہیں لگائی تھیں، یہی وجہ تھی کہ جب اس نے صبح بھائی سے اجازت مانگی تو اجازت کے ساتھ ہی اسے پانچ سو کا نوٹ بھی مل گیا۔ وہ ایک دم خوش ہو گئی۔

”یہ لے، یہ جھمکے پہن لے، لڑکیوں والے تو تیرے کوئی شوق ہی نہیں.....“ بھابی نے پرانے لوہے کے ٹرنک سے اپنے سنہری جھمکے بھی لا کر تھما دیے۔

”بھابی ایسے ہی ٹھیک ہے.....“ اس نے سامنے لگے شیشے میں گلابی لان کے سوٹ میں دمکتا ہوا اپنا وجود دیکھا۔ دہلی چلی تو وہ تھی ہی، رنگ بھی صاف اور نین نقش تھکے تھے، جو بھی پہن لیتی اس پر اچھا لگتا۔

”اوں..... ہوں..... تھوڑا خیال رکھا کر اپنا، آج کل لوگ بس دکھا دے پر ہی مرتے ہیں۔ تھوڑی

کروہ آرام کرنے کے لیے جو لیٹی تو پھر شام چار بجے ہی آنکھ کھلی۔ باورچی خانے میں داخل ہوتے ہی اسے بھابی پر بے اختیار پیار آ گیا۔ دوپہر کے کھانے کے سب برتن دھلے ہوئے ریک میں لگے ہوئے تھے۔ اس نے شام کی چائے کے لیے پانی چولہے پر رکھا تو پڑوس میں رہنے والی اس کی واحد سہیلی سونیا، اپنا لمبا سا پراندہ ہلاتی ہوئی آن پہنچی۔

☆☆☆

”دنیا میں مجھے ایک لفظ سے سخت نفرت ہے.....“ سونیا کے ساتھ چائے کا کپ اٹھائے وہ چھت پر آ گئی، دونوں سہیلیاں اب آسمان پر اڑتی ہوئی رنگ برنگی پتنگوں کو دیکھ رہی تھیں۔

”مجھے معلوم ہے، وہ لفظ کون سا ہے.....“ سونیا نے چھت کی چھوٹی سی منڈیر پر رکھے چائے کے کپ میں کیک رس بھگوتے ہوئے مزے سے کہا۔

”کون سا لفظ ہے وہ؟“ بندیا نے چڑ کر پوچھا۔ ”یہ ہی ”بے چاری“.....“ سونیا کھلکھلا کر ہنسی۔ ”قسم اللہ پاک کی دل کرتا ہے اردو کی لغت سے یہ لفظ ہی نکال دوں.....“ بندیا نے برا سامنہ بنایا۔

”وہ کیوں.....؟“ سونیا نے مزے سے اپنی بچپن کی سہیلی کا سرخ چہرہ دیکھا۔

”دیکھ ناں، جب میں پیدا ہوئی، اماں مر گئی، سارے محلے والوں نے کہنا شروع کر دیا، تابندہ بے چاری کو ماں کی گود ہی نصیب نہ ہوئی.....“ بندیا شروع ہو چکی تھی۔

”اچھا..... پھر.....؟“ سونیا نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”اس کے بعد آٹھ سال کی تھی کہ دادی فوت ہو گئی۔ سب کہنے لگے، ہائے بندیا بے چاری پھر تنہا ہو گئی.....“ بندیا نے ناک چڑھا کر مزید بتایا۔

”ہاں یہ تو ہے.....“ سونیا نے چائے کا کپ منہ سے لگا یا۔

”اس کے بعد جب جوان ہوئی تو ابا چل بے

”دفع کر دو ان منحوسوں کو، اس کم بخت کی چار تو خراٹ قسم کی کنواری بہنیں ہیں۔ تمہاری منہ.....“ بے چاری کا جینا حرام کر دیں گی وہ.....“ شمیم آرانے اپنے دوپٹے سے پٹکھا جھلٹے ہوئے ناک چڑھا کر بتایا۔ جسے سنتے ہی زیبا بھابی تڑپ اٹھیں۔

”ارے نہیں، بندیا بے چاری کا کیا قصور ہے۔ ایک تو شمیم، مسکین بچی، اوپر سے منہ میں زبان تو نہ ہونے کے برابر، اتنی میری اس نے خدمت کی ہے۔ میں اس کا برا کیوں سوچوں۔“ بھابی کی خدا خونی پر اسے کبھی شک نہیں ہوا تھا۔ دنوں کے تعلقات بلاشبہ بہت اچھے تھے۔ اس میں زیادہ ہاتھ بھابی کی اچھی طبیعت اور بندیا کے دوستانہ مزاج کا تھا۔ اس نے کبھی بھی بھابی کی کسی بات پر نہ کرنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی، وہ اسے اپنے چاروں بچوں کی طرح ہی سمجھتی تھیں۔

”ارے واہ زیبا، تیرے جیسی بھابی تو پوری دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی.....“ شمیم آرانے کھلے دل سے سراپتے ہوئے ایک دفعہ پھر شربت گلاس میں ڈالا۔

”میرے جیسی کا تو پتا نہیں، بس مجھے تو اللہ کا خوف ماردیتا ہے۔ کسی کے ساتھ برا کر کے اپنی قبر ضرور کالی کر دیتی ہے۔“ انہوں نے اب اور ک کا ثنا شروع کر دی تھی۔

”پھر بھی یہ خوف ہر کسی میں کہاں ہوتا ہے، لوگ تو خود خدا بنے پھرتے ہیں۔“ شمیم آرا اب نئے موضوع پر ایک لمبی تقریر کرنے کو تیار تھیں۔

بندیا نے جلدی، جلدی سائن پکنے کے لیے چولہے پر چڑھایا اور ساتھ ہی آٹا گوندھ لیا۔ اگلے ایک گھنٹے میں وہ کھانا پکا کر فارغ بھی ہو چکی تھی۔

بھابی اور ان کی سہیلی کے لیے کھانا ٹرے میں نکال کر رکھا تو اس کے چاروں بھتیجے اور بھتیجیاں اسکول سے شور مچاتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔ ان چاروں کو کھانا کھلا

دار کے اسٹائل میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ لکڑے بھی اس حملے پر احتجاجی چیخ ماری تو بھابی نے کھا جانے والی نظروں سے بندیا کو دیکھا۔

”بھابی یہ کیاری میں لگا آپ کا پودینہ کھا رہا تھا.....“ اس نے دن دیہاڑے لکڑ پر جھوٹا الزام لگایا جو اپنی سرخ کلنی کو ہلاتے ہوئے اسے کینہ توڑ لگا ہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”یار تمہارا سر غا تو بالکل ساٹھ بیٹا پھر رہا ہے کون سا دیسی گھی کھلا رہی ہو اسے.....؟“ ایسی گستاخی بھابی کی شمیم آرا ہی کر سکتی تھیں۔

”یہاں اس گھر میں دیسی گھی کے بس خواب ہی دیکھے جاسکتے ہیں۔ بنا سیتی ہی مشکل سے ملتا ہے، تم کون سی دنیا کی باتیں کر رہی ہو۔“ بھابی کے سارے ہی دکھ ایک دم جاگ اٹھے تھے۔ اس کے بعد ان کو چپ کروانا انتہائی مشکل کام تھا۔

”تمہیں پتا تو ہے بندیا کے بھائی کا چائے کا چھوٹا سا کھوکا ہے، گرمیوں میں اس کی آمدن نہ ہونے کے برابر ہو جاتی ہے۔“

”ہاں تو سردیوں میں وہ کھوکا کون سا فانیو اشار ہوٹل کی طرح چلتا ہے.....“ بندیا یہ جملہ بھی بس سوچ ہی سکتی تھی۔ اس نے بھابی کی اٹکوتی دوست کے کھانے کے لیے پیاز کاٹنی شروع کر دی تھی کیونکہ یہ تو طے تھا شمیم آرا دوپہر کا کھانا کھائے بغیر یہاں سے ملنے والی نہیں تھیں۔

”کیا پکانے لگی ہو.....؟“ شمیم آرا کی رال ابھی سے ٹپکنے لگی۔

”جی مرغیوں کے پوٹے اور کیلی.....“ بندیا نے بیزاری سے انہیں اطلاع فراہم کی جسے سنتے ہی شمیم آرا کا منہ بن گیا۔

”شمیم، وہ جو تم پا پڑکی فیکٹری میں کام کرنے والے لڑکے کا رشتہ بتا رہی تھیں۔ اس کا کیا پتا.....؟“ بھابی نے لہسن چھلٹے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

انسانی کمالات

انسانی کمالات کیا ہیں اور وہ کس طرح حاصل ہوتے ہیں؟ ایک شخص ایک مرتبہ نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔۔۔۔۔ اور اس نے چند اہم اور ضروری سوالات کیے۔ وہ سوال کرتا جاتا اور حضور اقدس ﷺ ہنس خوشی اسے جوابات سے مطمئن کرتے جاتے تھے۔ اس شخص نے آپ ﷺ سے دریافت کیا۔

☆ ”اے اللہ کے نبی ﷺ میری خواہش ہے کہ میں بڑا عالم بن جاؤں۔“ آپ نے ارشاد فرمایا۔ ”تو اللہ سے ڈرتا رہے جس بڑا عالم بن جائے گا یعنی اللہ کا خوف اور اس کے احکام پر عمل۔۔۔۔۔ علم و حکمت کے خزانے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔“ ☆ ”میں چاہتا ہوں دولت مند بن جاؤں۔۔۔۔۔؟“ آپ نے فرمایا تو قناعت اختیار کر مالدار ہو جائے گا۔“ ☆ ”سائل نے کہا۔“ میری خواہش ہے کہ سب سے بہتر شخص بن جاؤں؟“ آپ نے فرمایا۔ ”سب سے بہتر شخص وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہنچائے۔“ ☆ ”سائل نے کہا۔“ میں سب سے عادل شخص بننا چاہتا ہوں؟“ آپ نے فرمایا۔ ”اگر تو سب کے لیے دی پسند کرے جو تو اپنے لیے پسند کرتا ہے تو سب سے زیادہ منصف اور عادل شخص بن جائے گا۔“ ☆ ”سائل نے پوچھا۔“ میں اللہ کے دربار میں مقرب بننا چاہتا ہوں؟“ آپ نے ارشاد فرمایا۔ ”ذکر الہی میں مصروف رہ، تیری خواہش پوری ہو جائے گی۔“ ☆ ”میں اللہ کے دربار میں محسنوں اور نیکو کاروں میں اپنا نام درج کرانا چاہتا ہوں؟“ آپ نے ارشاد فرمایا۔ ”اللہ کی عبادت اس طرح کر، گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر یہ خیال رکھ کہ وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے۔“ ☆ ”میں چاہتا ہوں کہ میرا ایمان مکمل ہو جائے۔“ آپ نے فرمایا۔ ”اپنے اخلاق درست کر لے، تیرا ایمان مکمل ہو جائے گا۔“ ☆ ”میں اطاعت گزاروں میں سے بننا چاہتا ہوں؟“ آپ نے فرمایا۔ ”اپنے فرائض ادا کرتا رہ، تیرا شمار مطیع افراد میں ہوگا۔“ ☆ ”میں اللہ کے سامنے اس حال میں حاضر ہونا چاہتا

ہوں کہ تمام گناہوں سے پاک ہوں۔“ آپ نے فرمایا۔ ”تو غسل واجب فوری ادا کیا کر۔۔۔۔۔ اس کی برکت سے روزِ جزا گناہوں سے پاک اٹھے گا۔“ ☆ میری خواہش ہے کہ میں حشر میں نور کے ساتھ اٹھایا جاؤں؟“ آپ نے فرمایا۔ ”کسی پر ظلم نہ کر، قیامت کے دن نور کے ساتھ اٹھے گا۔“ ☆ ”میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر رحم کرے؟“ آپ نے فرمایا۔ ”تو اپنی جان اور خلق خدا پر رحم کر، اللہ تجھ پر رحم کرے گا۔“ ☆ ”میں چاہتا ہوں کہ میرے گناہ کم ہوں؟“ آپ نے فرمایا۔ ”تو کثرت سے استغفار پڑھ لیا کر، تیرے گناہ کم ہو جائیں گے۔“ ☆ ”اس نے کہا۔“ میں بزرگ بننا چاہتا ہوں؟“ آپ نے فرمایا۔ ”مصیبت میں اللہ کی شکایت بندوں سے نہ کیا کر، بزرگ ہو جائے گا۔“ ☆ ”میں چاہتا ہوں کہ میرے رزق میں وسعت ہو؟“ آپ نے فرمایا۔ ”تو ہمیشہ با وضو رہا کر، تیرے رزق میں برکت ہوگی۔“ ☆ ”میں چاہتا ہوں اللہ اور اس کے رسول کا دوست بن جاؤں۔“ آپ نے فرمایا۔ ”جو چیزیں اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں ان کو پسند کر اور جن سے اللہ اور اس کے رسول کو نفرت ہے ان سے نفرت کر۔“ ☆ ”کون سی نیک اللہ کے نزدیک افضل ہے؟“ آپ نے فرمایا۔ ”مصیبتوں پر صبر اور اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر خوشی کا اظہار۔“ ☆ ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑی برائی کیا ہے؟“ آپ نے فرمایا۔ ”بدترین اخلاق، بخل اور کینوسی۔“ ☆ ”سائل نے پوچھا۔“ کون سا مکمل اللہ کے غضب کو روکتا ہے؟“ آپ نے فرمایا۔ ”پوشیدہ طور پر صدقہ دینا اور قربت داروں کا حق ادا کرنا اور ان سے حسن سلوک اور احسان سے پیش آنا۔“ ☆ ”جہنم کی آگ کو کون سی چیز بجھائے گی؟“ آپ نے فرمایا۔ ”نماز اور روزہ صرف خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نہ کر یا کاری کی عبادت۔۔۔۔۔“

نتیجہ: آپس میں سب اپنا اپنا محاسبہ کریں کہ ان میں سے کون سی باتوں پر ہم عمل پیرا ہیں۔

مرسلہ: بخدا در بلوچ، بلوچی، بلوچستان

”یہ کیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمہیں دیکھ رہی تھیں۔۔۔۔۔“ سونیا نے باہر گلی میں آتے ہی ناگواری سے کہا۔ ”اب میں کسی کے دیکھنے پر پابندی تو نہیں لگا سکتی ناں۔۔۔۔۔“ بندیا نے مسکرا کر جواب دیا تو وہ تجسس بھرے انداز میں پوچھنے لگی۔

”ویسے یہ تھیں کون۔۔۔۔۔؟“

”اللہ جانے، بھابی کی ملنے والی ہوں گی، تمہیں پتا تو ہے ان کا حلقہ احباب کتنا وسیع ہے۔۔۔۔۔“ ”لیکن پہلے تو کبھی نہیں دیکھا۔۔۔۔۔“ سونیا کی تسلی ہی نہیں ہو پارہی تھی۔

”چلو اب تو دیکھ لیا ناں۔۔۔۔۔“ بندیا نے ہنستے ہوئے رکشا روکا تو دونوں سہیلیاں اس پر سوار ہو گئیں۔ مینا بازار میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا، جب وہ دونوں واپس آئیں تو دوپہر کے دو بج رہے تھے، سامنے زیبا بھابی اور جلیل بھائی بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ کچھ ہی فاصلے پر رشتہ کروانے

”یہ زیبا کا گھر ہے ناں۔۔۔۔۔؟“ گرے رنگ کے برقع میں ملبوس ایک موٹی سی عورت نے بندیا کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی۔۔۔۔۔ جی یہ انہی کا گھر ہے۔۔۔۔۔“ بندیا نے نرمی سے جواب دے کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔

”تم اس کی منہ ہوناں۔۔۔۔۔؟“ اس عورت نے تجسس بھرے انداز سے پوچھا تو بندیا نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے سونیا کو دیکھا، جو اس وقت مہمانوں کی اچانک آمد کی وجہ سے خاصی کوفت کا شکار لگ رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ بے چینی سے کھڑی بار بار وقت دیکھ رہی تھی۔

”آپ لوگ اندر چلی جائیں۔ بھابی سامنے برآمدے میں کپڑے استری کر رہی ہیں۔“ بندیا نے دروازے سے نکلتے ہوئے انہیں اطلاع دی تو دونوں خواتین نے ایک وقفہ پھر مسکرا کر غور سے بندیا کو دیکھا اور ایک دوسرے کو بڑا معنی خیز سا اشارہ کیا۔

لینا۔۔۔۔۔“ بندیا نے اسے چھیڑا تو وہ اچھا خاصا برا مان گئی۔ ”ظاہر ہے تمہارے گھر کے اونچے نیچے فرش پر بندہ گرے گا نہیں تو اور کیا کرے گا۔ کم از کم کالا فرش ہی ڈالو لو۔۔۔۔۔“ سونیا محن میں لگے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر بولی، وہ اب گھوم گھوم کر خود کو ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔

”جب میرا بھائی بھی تیرے بھائی فراز کی طرح دبی چلا جائے گا تو ہم بھی کالے فرش کی جگہ ٹائلیں لگوا لیں گے۔۔۔۔۔“ بندیا نے دوپٹا اچھی طرح سے لیتے ہوئے اسے چھیڑا۔

”اچھا، اچھا، زیادہ باتیں نہ کر۔۔۔۔۔ پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔“ سونیا نے اپنے چمکیلے سیاہ پرس سے سیل فون نکال کر افراتفری میں وقت دیکھا تو بوکھلا سی گئی۔ دونوں سہیلیاں جلجت بھرے انداز سے ایک دوسرے کے پیچھے دروازے سے نکل ہی رہی تھیں کہ سامنے آنے والی دو خواتین سے ٹکرائیں۔

سی لپ اسٹک بھی لگا لے، چہرے پر رونق آ جائے گی۔“ بھابی نے ایک پرانی سے گلابی لپ اسٹک لاکر اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ ”آپ کو پتا تو ہے، مجھے ان چیزوں کا کہاں شوق ہے۔۔۔۔۔“ اس نے سادہ سے لہجے میں کہا تو بھابی مسکرا دیں۔

”ہاں، ہاں پتا ہے تیرے اندر بڑھی روح گھسی ہوئی ہے، تجھ سے زیادہ تو تیری وس گیارہ سال کی بھتیجیاں چہرے پر لیپا پوتی کیے رکھتی ہیں۔“ بھابی کی ناگواری میں بھی ہلکا سا پیار چھپا ہوا تھا۔ بندیا مسکرا کر لپ اسٹک لگانے لگی۔

”ہائے اللہ، تو ابھی تک تیار نہیں ہوئی، میں نے کہا بھی تھا نوبے بچے نکلنا ہے۔“ سونیا اور نج کلر کے شیٹون کے سوٹ میں گولا گنڈا بنی، اونچی جیل میں ڈالتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ”دھیان سے، کہیں گر کر کوئی گوڑا گٹا نہ تڑوا

والی خالہ اکبری بیٹھی تھیں۔

”لو بھی زیبا، تمہاری نند بے چاری کی بھی سنی ہی گئی.....“ اپنی طرف سے خالہ اکبری نے مرغی کی ٹانگ جھنجھوڑتے ہوئے بڑا خوشگوار جملہ کہا تھا لیکن لفظ ”بے چاری“ سنتے ہی بندیا کا دل چاہا کہ وہ خالہ کی گردن ہی مروڑ دے۔

”ارے خالہ، میری بہن کیوں بے چاری ہونے لگی، اللہ اس کی قسمت اچھی کرے.....“ جلیل بھائی کے منہ سے نکلنے والے اس جملے نے بندیا کے جلنے والے دل پر ٹھنڈے پانی کی پھوار ڈالی تھی۔ وہ خالہ کو سلام کر کے بھابی کے پاس ہی چارپائی پر ٹک گئی تھی۔

”ماشاء اللہ، ساجد کی جامع کلاتھ میں اپنی اتنی بڑی کپڑے کی دکان ہے، ماں باپ سر پر نہیں، بہنیں پیاہی گئیں۔ اللہ اللہ تے خیر صلا، جھجھوا پٹی بندیا کی تو قسمت جاگ اٹھی۔“ خالہ اکبری، بندیا کو دیکھتے ہی ایک دفعہ پھر شروع ہو گئیں۔

”اور تو اور دو بڑے بھائی اور وہ پہلے سے علیحدہ، لڑکے کا اپنا گھر، کاروبار..... اور کیا چاہے ہوتا ہے کسی لڑکی کو.....؟“ خالہ اکبری نے کھانا کھا کر بڑے اطمینان سے اپنی چادر سے ہاتھ پونچھے۔

”جانبٹا، بھاگ کر ایک دودھ پتی کا کب بنالا میرے لیے، کھانا کھا کر چائے نہ پیوں تو دل بچا، کچا رہتا ہے۔“ خالہ اکبری کی فرمائش پر بندیا کو....

بادل ناخواستہ اٹھنا پڑا، ورنہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ رشتے کی ساری تفصیل سن کر ہی اٹھے۔ اس محلے میں اس کی ہم عمر ساری لڑکیوں کی شادیاں اور منگنیاں ہو چکی تھیں اور جب سے سو فیہ کی بات بھی اپنی خالہ کے ہاں پکی ہو گئی تھی، بندیا کے دل میں یہ خواہش زور پکڑنے لگی تھی کہ اس کا بھی کوئی اپنا گھر ہو۔ وہ بھی اپنے منگیتر کی باتیں سہیلیوں کو بتائے۔

”بہت اچھا رشتہ لائی تھیں آج خالہ.....“ رات کو بھابی اس کے پاس ہی باورچی خانے کے فرش پر

آکر بیٹھ گئیں اور سبزی کاٹنے لگیں۔

”لڑکے کی بہنوں کو تم بہت پسند آتی ہو، وہ ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی ہیں.....“ بھابی خاص خوش دکھائی دے رہی تھیں اس لیے اس کے سوال جواب کے بغیر ہی شروع ہو گئیں۔

”مجھے تو خود یہ رشتہ بہت دل کو لگا ہے، اچھا ہے ٹائم سے اپنے گھر کی ہو جاؤ گی تو پھر میں تمہاری بھتیجیوں کے لیے جہیز اکٹھا کرنا شروع کروں گی۔ روز بروز قد نکالتی جا رہی ہیں۔“ بھابی اب باریک باریک دھیما کتر رہی تھیں۔

”لڑکا کتنا پڑھا ہوا ہے بھابی.....؟“ بندیا نے دیہی میں چبچ چلاتے ہوئے کچھ جھجک کر پوچھا۔

”ماشاء اللہ پوری بارہ جماعتیں پاس ہے۔ ویسے بھی لڑکوں کی تعلیم نہیں ان کی کمائی دیکھی جاتی ہے۔ اس کی تو اپنی ذاتی دکان ہے۔“ بھابی کے جواب سے بندیا کا دل حد تک مطمئن ہو گئی تھی۔ وہ خود بھی میٹرک پاس تھی اور اس کی خواہش تھی اس کا منگیتر کم از کم میٹرک پاس تو ضرور ہو، کہیں سونپا کے منگیتر کی طرح آٹھ جماعتیں پڑھ کر کسی اور دکان پر کام کرنے والا ورک نہ ہو۔ اس کی یہ خواہش تو کم از کم پوری ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

اگلے دن بھائی اور بھابی دونوں لڑکے کے گھر سے آئے تو ان کے چہرے خاصے پرجوش تھے۔ خاص طور پر بھائی کے چہرے پر اطمینان ٹھاٹھیں ماری ہو ادکھائی دے رہا تھا۔ بندیا بھانے بھانے سے ان کے ارد گرد گھوم رہی تھی تاکہ تازہ ترین رپورٹ حاصل کر سکے لیکن ان دونوں نے بھی لگتا تھا آج اس موضوع پر بات نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی، شام کو بندیا کے صبر کی انتہا ہو گئی تو اس نے خود ہی ڈھیٹ بن کر پوچھ لیا۔

”بھابی، کیسا لگا آپ کو یہ رشتہ.....؟“

”ہائے ہائے بندیا، میں تجھے تو بتانا ہی بھول گئی۔“ بھابی نے ماتھے پر ہاتھ مار کر خود کو سزا دینی

بھلاؤ ہو گئی ہوں میں، بس سوچوں میں گم تیری شادی کا حساب کتاب لگانے میں لگن تھی۔“ بھابی کی غیر ضروری تفصیل اسے ناگوار تو گزر رہی تھی لیکن اسے سنے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

”مت پوچھ.....“ بھابی نے اپنے تکیہ کلام سے بات کا آغاز کیا۔ ”مت پوچھ لڑکے کا گھر کتنا اچھا تھا، پورے پانچ مرلے کا ڈبل اسٹوری اپنا گھر، صحن میں سفید اور کالے خانوں والی چپیں اور کمرے سامان سے بھرے ہوئے.....“ بھابی کی یہ تفصیل اب اسے اچھی لگ رہی تھی۔

”لڑکا، ماشاء اللہ اونچا، لمبا، جوان، جامع کلاتھ میں اپنی دکان، یوں سمجھ تیری تو لائری نکل آئی۔“ بھابی کی بات پر بندیا کے چہرے پر اتنی چمک پھیلی کہ بھابی خود بات بھول کر اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”اے بندو، آج کل منہ پر کیا لگا رہی ہے.....؟“ بھابی کو جب بھی اس پر پار آتا تو اسے بندیا کی جگہ ”بندو“ کے نام سے پکارنے لگتیں۔

”کچھ بھی نہیں بھابی.....“ وہ ایک دم ہی گھبرا گئی، حالانکہ آج کل وہ غسل خانے میں تھوڑی سی ملائی کسی برتن میں ڈال کر لے جاتی اور اس میں تھوڑی سی ہلدی اور چند لیموں کے قطرے ڈال کر خوب چوری چوری چیزے کا مساج کرتی۔

”اچھا تیرا چہرہ تو سفید بلب کی طرح لائیں مار رہا ہے، ایویں تو نہیں ساجد کی بہنیں تجھ پر فدا ہو گئیں، اس دن تو لگ بھی تو اتنی پیاری رہی تھی۔“ بھابی کے لہجے میں چھپا پیا اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ اس لیے اس نے صرف سر جھکانے پر ہی اکتفا کیا۔ اسی شام وہ سونپا کو یہ خبر سنانے اس کے گھر پہنچ گئی۔

”میسنی، مٹنی، مجھے اب بتا رہی ہے.....“ سونپا نے اپنا بھاری بھر کم ہاتھ اس کے کندھے پر مار کر مصنوعی ناراضی کا اظہار کیا۔

”جب بات پکی ہوئی، تو تب ہی بتانا تھا، کیا

دعا کرنے کی فضیلت

خدا سے دعا کرتے رہنا بھی عبادت ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرمایا۔

تم یہ نہ کہو کہ میں خدا سے دعا نہیں کرتا کیونکہ جو کچھ میری قسمت میں ہے وہ تو بہر صورت مجھے مل کر رہے گا۔ خدا سے دعا اور سوال کرتے رہنا ایک اچھا عمل ہے۔ یقیناً اللہ دعا کے بعد بخشش کرتا ہے۔ دعا کرنے سے ایمان و یقین میں بختگی آتی ہے اگر اللہ تمہاری کسی دعا کو فوراً قبول نہیں کرتا تو اس سے آزرہ خاطر نہ ہو۔ تیری دعائیں اور سوال تیرے لیے دنیا و آخرت میں کام آئیں گے۔ حدیث نبوی ہے کہ مومن کے اپنے نامہ اعمال میں قیامت کے دن بعض ایسی نیکیاں بھی نظر آئیں گی جو اس نے کی ہی نہ ہوں گی۔ یہ نیکیاں اصل میں وہی دعائیں اور سوالات ہوں گے۔ یہ اللہ کی طرف سے ہوں گی کیونکہ اللہ سوال کرنے والے کو یاد رکھتا ہے اور حق دار کو اس کا حق ضرور دیتا ہے۔“

مرسلہ: نفیہ آراء، یواے ای

پہلے سے اعلان شروع کر دیتی.....“ بندیا نے اپنا کندھا سہلاتے ہوئے منہ بنا کر جواب دیا۔

”اچھا، چل دفع کر، دیکھ ہر چھ ماہ بعد ایک اچھا سا جوڑا اپنے میاں کی دکان سے لے کر میرے گھر پہنچ جایا کرتا، اب کپڑے کی دکان کا ہمیں بھی تو کوئی فائدہ ہو۔“ سونپا کا فرمائش پر وگرام شروع ہو چکا تھا لیکن اس کی یہ شرارتیں اب بندیا کو بری نہیں لگ رہی تھیں۔ اگلے ہی دن اس کی سسرال والے شادی کی تاریخ لینے پہنچ گئے، جو ایک مہینے بعد کی رکھی گئی تھی۔ بندیا کے جہیز کی ساری چیزیں تیار تھیں، فرنیچر لینے

سے ساجد نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”ارے قسمت ہو تو بندیا جیسی.....“ پڑوس خالہ نے اس کی مہندی والے دن رشک بھرے انداز میں سب کو سنایا۔

”بے چاری نے دکھ بھی تو اتنے سہے ہیں، ماں باپ، سر پر نہیں، ایک ہی بھائی، ساری زندگی اس بے چاری نے بھاوج کی خدمت کی۔“ دوسری پڑوس کے منہ سے اپنے لیے بے چاری کا لفظ بندیا کے دل پر کسی تازیانے کی طرح لگا تھا۔

”پھل، اللہ نے اس بے چاری کی بھی سن لی.....“ خالہ اکبری نے پان پر چونا لگاتے ہوئے اپنے دانتوں کی نمائش کی۔

”بس خالہ، اب میری شمع کے لیے بھی ایسا ہی رشتہ ڈھونڈ دے.....“ سامنے والی پڑوس نے اکبری خالہ کے گھٹنے پکڑ کر فوراً ہی منت کی تو خالہ کی گردن فخر کے احساس سے تن گئی۔

”خالہ تو ایسے مغرور ہو رہی ہے جیسے ساجد اس کی فخریہ پیشکش ہو.....“ سونیا نے اپنی دوست کے ہاتھوں پر مہندی کے نقش و نگار بناتے ہوئے شرارت سے کہا تو بندیا کے لیے اپنی ہنسی کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا۔

شادی والے دن بندیا پر روپ بھی خوب آیا تھا۔ میروں رنگ کے لہنگے میں وہ خوب دمک رہی تھی، اتنے میں برات کے آنے کا شور برپا ہو گیا۔ سب عورتوں نے باہر کی طرف دوڑ لگائی تو بندیا پٹنگ کے ساتھ ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھ گئی۔ دو لہا سبھی کو بہت پسند آیا تھا، نکاح اور کھانے کے بعد چار بجے کے قریب تابندہ عرف بندیا رخصت ہو کر اپنے گھر سرال آ گئی تھی۔ اس کا جملہ عروہی بڑے خوب صورت طریقے سے سجایا گیا تھا۔

اپنے بیڈ پر بیٹھی ٹیک لگائے وہ سرالی خواتین کے نرنغے میں تھی۔ اڑوس پڑوس کی خواتین اسے دیکھنے کو اڑی پڑی تھیں۔ بندیا کو سانس لینا

محال لگ رہی تھی، حالانکہ موسم خوشگوار تھا لیکن عورتوں کے ہجوم کی وجہ سے کمرے میں جس کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔

”چلو، ساجد بے چارے کا بھی گھر بس گیا.....“ ایک بزرگ خاتون نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا لیکن تابندہ کے دل میں لفظ ”بے چارہ“ کسی تیر کی طرح لگا لیکن یہ بولنے کا موقع نہیں تھا، اس لیے زبان دانتوں تلے دبا کر رہ گئی۔

”اور کیا، پیدا ہوا تو ماں مر گئی، بڑی بہنوں نے پالا پوسا، بے چارے نے ماں کا پیار بھی نہ دیکھا.....“ ایک اور عورت نے بلند آواز میں تبصرہ کیا۔ ”لیکن ساجد نے تو بہت چھوٹی عمر میں ذمے داریاں سنبھال لی تھیں خالہ، بہت محنتی ہے اپنا ساجد.....“ ایک اور رشتہ دار خاتون کی آواز بندیا کے کانوں سے ٹکرائی۔

”ہاں تو بے چارہ کیا کرتا، بھابیوں نے کون سا اچھا سلوک کیا تھا، اس کے ساتھ.....“ کسی کا دل جلا تبصرہ بندیا کے دل میں آگ لگا گیا۔

”آف..... ایک اور بے چارہ.....“ وہ دکھ کے گہرے احساس کے ساتھ ایک طرف کو لڑ جھک گئی۔ دل نہ جانے کیوں بھر آیا تھا۔

”ہائے ہائے دلہن کو کیا ہو گیا۔ چلو بھی چلو، کمر خالی کرو، ساری کی ساری تو اس بے چاری کے سر پر سوار ہو.....“ ایک جی دار خاتون نے فوراً ہی کمر خالی کروا کے پنکھا قفل کروایا۔ ایک گھنٹا ریٹ کر کے وہ اٹھی تو دل خاصا بوجھل بوجھل سا تھا، کوئی بھی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی، اس کا دو لہا کمرے میں آچکا تھا۔

”یہ تو کہیں سے بھی ”بے چارہ“ نہیں لگ رہا.....“ بندیا نے گھونگٹ کی آڑ سے اسے کن اکھیں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ دراز قد، قدرے صحت مند جسم کا حامل ساجد خاصے صاف رنگ کا مالک تھا، اس لیے دووہیا سفید رنگ کے بوسکی کے سوٹ میں خوب

لہکارے مار رہا تھا۔

”مجھے تو باہر سب خواتین نے ڈرا ہی دیا.....“ وہ پاس بیٹھتے ہوئے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا تو بندیا نے سر اٹھا کر اپنی کا جل بھری آنکھوں سے اپنے مجازی خدا کا جائزہ لیا، وہ گھنی سیاہ موچھوں تلے بڑا مکمل کر مسکرا رہا تھا۔

”پوچھو گی نہیں، کیوں.....؟“ اس نے ہلکا سا اس کا ہاتھ دبا کر شرارت سے کہا تو بندیا کا دل..... بے اختیار دھڑک اٹھا لیکن وہ دانستہ خاموش رہی۔

”سب کہہ رہے تھے، دلہن بے چاری تو بہت نازک مزاج ہے.....“

”خبردار، مجھے بے چاری مت کہیے گا.....“ اس نازک مزاج دلہن کے منہ سے نکلنے والی پاٹ دار آواز نے ساجد کو ایک لمحے کو ڈرا ہی دیا۔

”اللہ خیر کرے، کیا ہو گیا.....؟“ وہ جلد ہی خود کو سنبھال چکا تھا۔

”زہر لگتا ہے مجھے یہ لفظ، پچھلے بیس سالوں سے یہ لفظ سن کر میرے کان پک جکتے ہیں۔ اب تو اس لفظ کو سنتے ہی مجھے وحشت ہونے لگتی ہے.....“ بندیا ساری شرم بالائے طاق رکھ کر فوراً ہی شروع ہو گئی۔ ساجد اس کی بات پر ہلکا سا چونکا پھر ہنسا اور ہنسا ہی چلا گیا۔

”میں نے کون سا لطیفہ سنا دیا ہے، جو آپ ایسے ہنس رہے ہیں.....“ وہ ٹھیک ٹھاک برا منا چکی تھی۔ اپنی چھوٹی سی ناک پیزاری سے اوپر چڑھائے اپنے تیکھے تیکھے مین نقش کے ساتھ وہ پہلی ہی نظر میں ساجد کے دل کو چھو گئی تھی۔

”نیگم صاحبہ، میں اس لیے ہنس رہا ہوں کیونکہ یہی لفظ سن کر تو میں نے آپ سے شادی کا فیصلہ کیا تھا.....“ ساجد کی بات پر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ بڑی، بڑی آنکھیں کھولے حیرت سے اپنے مجازی خدا کو دیکھ رہی تھی، جو بڑی شان سے اس کے دل کی سرزمین کو فتح کر چکا تھا اور اس وقت آپ، آپ کر

کے اسے خوب عزت دے رہا تھا۔

”بھئی رشتہ کرانے والی خاتون نے جب بتایا، لڑکی بے چاری کے والدین وفات پا چکے ہیں اور وہ بے چاری اپنے بھائی اور بھابی کے ساتھ رہتی ہے تو اس ”بے چارے“ نے سوچا، ہم دونوں کے حالات تو خاصے ملتے جلتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو جو ایک بے چارہ اور بے چاری مل جائیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور ایک خوب صورت زندگی گزار سکتے ہیں، کیا خیال ہے.....؟“ ساجد کے منہ سے نکلنے والے اس جملے نے بندیا کے لبوں پر مسکراہٹ کے کئی شگوفے ایک ساتھ کھلا دیے۔

”یقین مانیں اس لفظ بے چاری کی گردان کی وجہ سے ہی آپ یہاں ہیں.....“ ساجد کی اس بات نے بندیا کے دل پر بڑی کئی سالوں کی گرد کو ایک لمحے میں اڑا دیا۔

”اب بتائیں، یہ لفظ، اچھا ہے یا برا.....؟“ اس کے شرارت بھرے انداز پر بندیا شرما گئی۔ اسی لمحے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

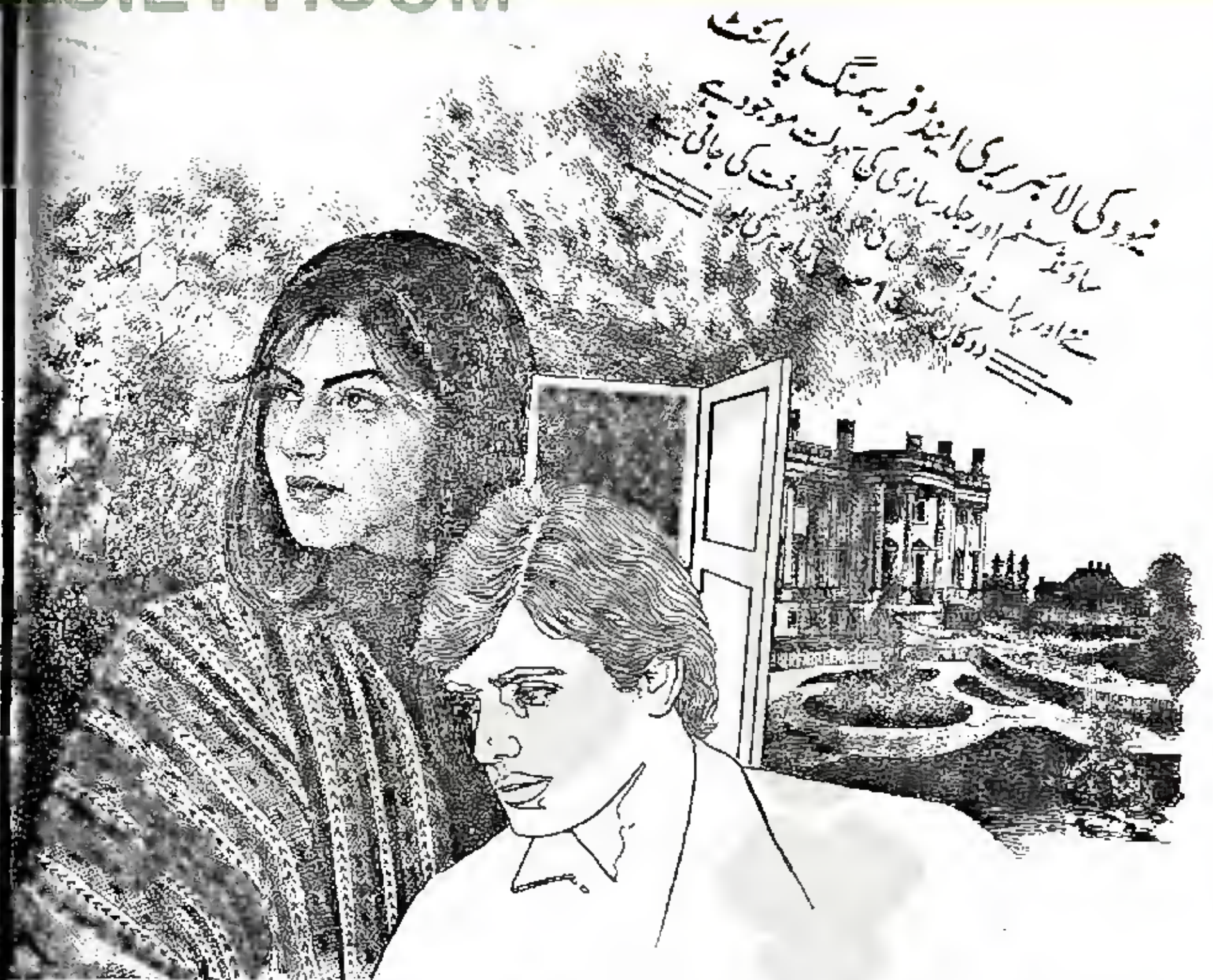
دونوں چونک گئے، ساجد نے فوراً جا کر دروازہ کھولا تو سامنے ہی اس کی آپا کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے تھا۔

”کتنے بھلکھو ہو تم ساجد، دلہن بے چاری کی منہ دکھائی تو اسٹور کی الماری میں ہی بھول گئے.....“ آپا کی بات پر ساجد قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”وکیہ لیں بندیا، آپا کیا کہہ رہی ہیں۔“ ساجد کی شوخی پر بندیا کے منہ سے نکلنے والی ہنسی بڑی..... بے ساختہ تھی۔ آپا نے خوشگوار حیرت سے یہ منظر دیکھا۔

”ارے آپا، کیوں ساجد بے چارے کو تنگ کر رہی ہیں، انگوٹھی دے کر واپس آئیں.....“ ساجد کی چھوٹی بہن بھی ان کے پیچھے پہنچ گئی۔ اس کے منہ سے نکلنے والی اس بات پر ساجد نے شرارت بھری نگاہوں سے اپنی دلہن کو دیکھا اور دونوں ”بے چارہ“ اور ”بے چاری“ ہنستے ہی چلے گئے۔





فیو کی لائبریری اینڈ فرسٹنگ اپوائنٹ
سائنس سسٹم اور جلد سازی کی ہولٹ موجود ہے
متن اور پائے ڈیزائن کی خدمات بھی
دکان

ناولٹ



تیرک ونا

نایاب جیلانی

چوتھا حصہ

ڈبل روم میں پہنچ کر وہ ایک مرتبہ پھر حیران ہوئی تھی۔ سوزی بیڈ کے ایک کونے میں سکڑی سمٹی سو رہی تھی۔ سائنڈ ٹیبل پر دودھ کا گلاس رکھا تھا، یقیناً دودھ مالا کے لیے رکھا تھا۔ تاہم اس کا دودھ پینے کو ہرگز دل نہیں چاہ رہا تھا۔
”دھو یا مون چلی گئی!“ اس کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے آرام سے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اب وہ پرسکون ہو کر سوزن اور مون کے

بارے میں سوچ سکتی تھی۔ ان کے رویے، جھگڑے اور سوزن کے آخری الفاظ..... این فارخ.....؟ تو جب سوزن، گروسی وغیرہ اس کی پیاری اردو کو سمجھ اور بول سکتی تھیں تو پھر مالا کیوں نہیں زبان سیکھ سکتی؟ اس نے ارادہ کر لیا تھا..... من ہائیم پہنچ کر جرمن سیکھنے کا..... ان لوگوں کے رویے سمجھنے کے لیے ہم زبان ہونا بہت ضروری تھا۔

”بھلا مون نے سوزن سے کیا کہا؟ یہ جھگڑا کیوں کر رہی تھیں؟ پھر سوزن نے کیا کہا.....؟“ وہ یہی باتیں سوچتی نیند کی گہری داوی میں اتر گئی تھی۔ نیند بھی قدرت کا حسین تحفہ ہے، ایک تھکا دینے والے دن کے بعد رات کا پہلا انعام، نیند جو ذہن کو سکون دیتی ہے، آرام پہنچاتی ہے، اعصاب کی تھکن جوڑ لیتی ہے۔ مالا پر سکون نیند میں گم ہو چکی تھی۔ وہ گزشتہ رات سو نہیں پائی تھی مگر آج رات بہت مطمئن اور پرسکون نیند لے رہی تھی۔ وہ پوری رات اطمینان سے سوئی رہی..... جب اس کی نیند پوری ہوئی تب فجر کے قریب اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ بستر سے اٹھی تو سوزن اسے اپنے برابر کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ مالا واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ وضو کیا، نماز پڑھی، اگرچہ جائے نماز کہیں نہیں تھی مگر مالا نے قالین پر ہی نماز ادا کر لی..... وہ سلام پھیر کر دعا مانگنا چاہتی تھی مگر بائیں طرف کاؤچ پر مون بیٹھی تھی اس کی ہلکی سی چیخ ابھری مون وہی سلک کی پھولی فراک پہنے، سفید انگلیوں کو گھماتی ہوئی وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی بلکہ ونڈو کے جالی دار ٹائیلوں کے پردے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کب اندر آئی تھی؟ اور کتنے آرام سے اندر آئی تھی۔ مالا کو ذرا سی آہٹ نے بھی نہیں چونکا یا تھا۔ یقیناً مون بہت دبیز چپل پہنتی تھی۔ انتہائی نرم، چلنے کی آواز تک نہیں آتی تھی۔ وہ لمبی کی چال چلنے والی لڑکی مالا کو آخر ہر اس کیوں کرنا چاہتی تھی۔ دبے پاؤں کمرے میں آنے کا

مقصد آخر بھلا کیا تھا..... یقیناً مالا کو خوفزدہ کرنا تھا۔ عام حالات میں بھی جب بندہ کمرے میں اکیلا ہو اور کسی کی بھی موجودگی کا گمان نہ ہو تو اچانک کوئی دبے قدموں اندر آجائے ایسی صورت میں پہلا احساس بھیاںک خوف کا ہوتا ہے تو یقیناً مون اسے خوف زدہ کرنا چاہتی تھی۔ مالا کو یہ خبر نہیں تھی وہ اس کی زندگی میں بھیاںک خوف بن کر ہی داخل ہوئی تھی۔

”یہ کس وقت کی نماز پڑھ رہی ہو؟“ اس کی چیخ کا نوٹس لیے بغیر وہ بڑے آرام سے پوچھ رہی تھی۔ آج اس کا لہجہ اتنا کھردرا نہیں تھا۔ مالا جو چیخنے کے بعد قدرے گم صم اٹھ کھڑی ہوئی تھی بے دم ہو کر اسے دیکھنے چلی گئی۔

”تم نے بتایا نہیں۔“ وہی سرد قسم کا پراسرار لہجہ۔ وہ اب بھی اسے دیکھے بغیر ٹائیلوں کے پردے کو دیکھ رہی تھی۔ آج مالا نے اسے بہت غور سے دیکھنے کی کوشش آخر کر ہی لی تھی۔ یہ چہرہ آج اس کے بہت قریب تھا اور حیرت انگیز طور پر مون کے نقوش عیسیٰ سے خاصے ملتے جلتے تھے۔ یوں لگتا تھا اللہ پاک نے مون کا چہرہ اور اس کے ایک، ایک نقش کو کسی خاص قسم کے سانچے میں رکھ کے بنایا ہے۔ نفیس اور انتہائی خوب صورت خدوخال، گل جام جیسا چہرہ، چنبیلی جیسی رنگت، مکھن جیسی چہرے پہ پھیلی چکناہٹ وہ کنول تھی؟ گل بکاؤلی تھی؟ گوہر تاب تھی؟ یا گنگوٹ تھی؟ اس کے موتی جیسے چمکیلے ہاتھ، سنہری نائل سرخ بال، چیری میں دھلے ہونٹ قدرے بھرے بھرے اور نرم دار، وہ سفید پھولوں کے باغات کا سب سے حسین شگفتہ، تروتازہ اور مغرور ترین پھول تھی۔ وہ عیسیٰ جیسی تھی مگر عیسیٰ سے انتہائی مختلف۔ بھلا اتنے حسین چہرے کو دیکھ کر کوئی خوف زدہ ہو سکتا ہے؟ کبھی حسن بھی خوف میں مبتلا کرتا ہے مگر مالا کے ساتھ یہاں آکر بڑے انوکھے واقعات پیش آرہے تھے۔ وہ اتنے حسین اور طبع چہرے سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔

لوگ بد صورتی سے ڈرتے ہیں۔ جلے چہرے، بیماری سے مس شدہ چہرے، بد صورت چہرے، بھیاںک چہرے سے خوف کھاتے ہیں اور مالا ذوالفقار کتنی عجیب لڑکی تھی وہ ایک حسین چہرے سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔ وہ مون حبیب سے ڈر گئی تھی۔ اس کے دل میں ہی نہیں اس کی آنکھوں میں بھی خوف منجمد ہو گیا۔ وہ اس کے چہرے پر سے نگاہ ہٹا ہی نہیں پائی تھی۔

علی عیسیٰ کے نقوش دیکھ کر اس سے محبت کرنے کو دل کرتا تھا اور مون کے چہرے کو دیکھ کر خوف آتا تھا، آخر ایسا کیوں تھا؟ اسے کسی تجسس کی طرح ساکت دیکھ کر مون نے پھر سے بنا اس کی طرف دیکھے عجیب انداز میں کہا۔ وہ اسے دیکھ نہیں رہی تھی پھر بھی اس کے تاثرات ازبر کر رہی تھی۔

”مجھے حفظ کر لیا ہے تو میری بات کا جواب دو۔“ مون نے سابقہ سرد کاٹ دار لہجے میں اپنی بات دہرائی تھی۔ مالا کا پورا وجود کپکپا گیا تھا۔ اس نے ہکلاتے لہجے میں کہا۔

”فجر..... فجر کی نماز۔“ اس کی ہکلاہٹ نے مون کو کچھ اور سرد کر دیا تھا حالانکہ مالا اپنا خوف اس پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی مگر اس لڑکی میں مقناطیس کی سی کوئی کشش تھی۔ مالا اس کے سامنے اعتماد سے کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے خود کو مون کے سامنے بے بس پایا تھا۔ یہ بے بسی کیوں تھی، وہ اتنی خوف زدہ کیوں تھی؟

”فجر کی نماز؟“ مون زیر لب بڑبڑائی۔ ”مگر یہ فجر کی نماز کا وقت نہیں۔“ تو گویا مون نماز کے تمام اوقات کا رے واقف تھی مگر یہ فجر کا وقت کیوں نہیں تھا؟ مالا نے گھڑی کی طرف دیکھا پھر اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ ابھی رات کا ڈیڑھ بجنا تھا تو پھر رات کے ڈیڑھ بجے سوزن کہاں گئی تھی؟ مالا تو سوزن کی غیر موجودگی کو محسوس کر کے وضو کرنے لگی تھی۔ اس نے وقت دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں

کی تھی۔ سوزن کے اٹھنے کا مطلب یہ تھا شاید صبح ہو گئی۔ وہ بہت سویرے اٹھتی تھی۔ صبح صادق کے وقت..... مالا اسی وجہ سے بنا وقت دیکھے واش روم کی طرف بڑھ گئی تھی اور اب اس وقت مون بتا رہی تھی کہ فجر کا وقت ابھی دور ہے۔

”سبس..... سوزن کہاں ہے؟“ مالا نے اپنی تریشانی کو بغیر چھوئے ہکلائے سے لہجے میں کہا تھا۔ سوزن کی موجودگی میں اس کے دل کو کتنی ڈھارس تھی تبھی وہ سب کچھ بھلائے گہری نیند سو گئی تھی اور سوزن کی غیر موجودگی نے کیا ستم ڈھایا تھا، وہ صاف محسوس کر سکتی تھی۔

”شاید باہر گئی ہے۔“ اسے امید نہیں تھی کہ مون جواب دے گی مگر اس نے جواب دے دیا تھا اور اب وہ ٹائیلوں کے پردے سے نگاہ ہٹا کر سامنے دیوار کو دیکھ رہی تھی۔ مالا نے پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں کو دیکھا تھا۔ جانے اس کی آنکھوں کا رنگ کیا تھا؟ سبز، سرخی، ہیزل، گہرا ہر مالا کو سمجھ ہی نہ آئی مگر جوں ہی مون نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر اپنی ساحتانہ آنکھیں اس کے وہی، معصوم، لٹھے کے مانند سفید چہرے پر گاڑیں تب لمحے بھر کے لیے مالا کو لگا وہ منجمد ہو گئی ہے۔ وہ مون کی آنکھوں کی تیز لک سے ساکت ہو گئی تھی۔ دو عجیب تر آنکھیں لٹھے کے ہزارویں حصے میں مالا کے دماغ میں گھس گئی تھیں۔

”تم عیسیٰ سے محبت کرتی ہو؟“ لپکتا ہوا سوال آیا تھا مالا کا سر اثبات میں ہل گیا۔ وہ بے بس کسی مکڑی کے مانند تھی۔ جسے عجیب ترین آنکھوں والی اس لڑکی نے جالے تان کر قید کر لیا تھا۔ اب وہ ان جالوں کو بھانڈ نہیں سکتی تھی۔ ان جالوں کو ہٹا کر بھاگ نہیں سکتی تھی۔

”تم محبت کرتی ہو تو کیا ہوا؟ سوزی بھی تو عیسیٰ سے محبت کرتی ہے۔ کیا سوزی کو عیسیٰ مل گیا، نہیں ناں؟ تو پھر تمہیں کیسے مل سکتا ہے؟“ سامنے کھڑی ساحرہ

مئی 2014ء کے شمارے کی ایک جھلک

سمرگزشت

ماہنامہ

عقل نشیں

ایک معروف سائنس دان کی داستان حیات جس نے ثابت کرنا چاہا تھا کہ انسان بندر کی اولاد ہے

شہرگزشت

بھولے بسرے کراچی کے ایک دن کا احوال جب اس شہر میں محبت و افریقہ تھی

تاریخ عکس

تصویر بتاں نے، ترقی کی منزلیں کیسے طے کیں

منی

ماہ کی میں رونما ہونے والے اہم واقعات و سماجیات

دماغی توازن

محبت حد سے بڑھ جائے تو تباہی لاتی ہے

ادبی حلقہ

لہو کی گردش تیز کر دینے والی طویل داستان، سراب، فلمی دنیا کی بھولی سری یادوں سے نئی فلمی الف لیلہ تاریخی واقعات سچے قصے اور انوکھی سچ بیابانیاں

اگر آپ علم و دانش بھرے مضامین، ادب، تاریخ اور سبق آموز سچ بیابانیاں پسند کرتے ہیں تو آپ ہی کے لیے یہ شمارہ ترتیب دیا گیا ہے جس ایک بار پڑھ کر دیکھیں آپ خود ہی گرویدہ ہو جائیں گے

باتیں کر رہی تھی۔ "مالا کے دل میں نیزہ سا چبھتا تھا۔ "تم مون کی باتوں پر توجہ مت دیا کرو، وہ تو پاگل ہے یوں سمجھو۔" سوزن نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں، مون یہاں نہیں آئی تھی، تمہیں وہم ہوا ہے۔ مون رات کو واپس انسٹی ٹیوٹ چلی گئی تھی۔" سوزن نے نگاہ چرا کر اس کا خوف کم کرنے کی کوشش کی تھی مگر مالا کا خوف کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا تھا۔

"نہیں، وہ ابھی یہاں آئی تھی۔ میرا وہم نہیں..... اس نے مجھ سے اتنی باتیں کیں۔" مالا نے مضطرب لہجے میں کہا تھا۔ وہ اسے یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی مگر سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یقین آخر دلوائے کیسے؟ اور سوزن شاید یقین کرنے والی بھی نہیں تھی۔

"اچھا..... مون نے تم سے کیا کہا؟" سوزن نے کسی خدشے کے تحت محتاط انداز میں پوچھا تھا اور اس کی توقع کے عین مطابق مالا نے بے چاری سی صورت بنالی تھی۔ اسے مون کی بکواس یکسر بھول چکی تھی حالانکہ کچھ دیر پہلے اس کے ذہن پر کچھ دھندلے، دھندلے منظر کھڑے تھے۔ مون کا سیاہ ریشمی زمین کو چھوتا نراک، اس کی اونچی پونی میں جڑے گئینے، سر کے عین وسط میں رکھا یا قوت اور ہیرے کا کراؤن، اس کے سرخ ریشمی بال مگر اب ذہن صاف سلیٹ کے مانند ہورہا تھا۔ ہر بوجھ اور ہر نقش سے آزاد۔ وہ قدرے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ پہلے والی بے چینی اور اضطراب اندر کہیں نہیں تھا۔

"تم نے بتایا نہیں؟" سوزن نے ایک مرتبہ پھر محتاط سے انداز میں پوچھا تب مالا نے بے چارگی کے عالم میں بے ساختہ کہا تھا۔

"یار! میں بھول گئی ہوں، جانے کیا کچھ بول کے گئی ہے مگر وہ آئی ضرور تھی۔" دوپٹے کو نماز کے اسٹائل میں سر پر لپیٹے مالا کتنی معصوم، کتنی پاکیزہ اور

"مجھے کیا ہوتا تھا، میں ایک دم ٹھیک ہوں۔" مالا نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ ایک دم فریش اور تروتازہ تھی مگر سوزن کے چہرے کو دیکھ کر کہیں لگتا تھا کہ وہ کچھ ٹھیک یا فریش تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" مالا نے نرمی سے پوچھا۔ اتنے تھوڑے سے وقت میں سوزن اس کے بہت قریب آ گئی تھی۔ مالا اس کی تکلیف یا کسی بھی پریشانی کو محسوس کر سکتی تھی۔ شاید یہی ہمدردانہ احساس دوستی کی سیڑھی کا پہلا قدم تھا۔

"آں..... ہاں، کچھ نہیں۔" وہ گڑبڑا سی گئی۔ "تم مون کا ذکر کر رہی تھیں ناں۔" مالا کو خیال سا گزرا پھر کچھ دیر پہلے کا منظر ذہن میں روشن ہوا حالانکہ منظر روشن کہاں تھا، دھندلا، دھندلا سا تھا۔ شاید وہ اور مون اسی کمرے میں کھڑی تھیں؟ جانے مالا نے نیند میں مون کو دیکھا تھا یا وہ حقیقت میں یہاں آئی تھی؟ وہ شک میں مبتلا ہو گئی یا وہم میں پڑ گئی۔ اسے لگ رہا تھا مون اس کے حواسوں پر سوار ہوتی جا رہی ہے۔ دھندلا سونے سے پہلے وہ مون کے متعلق سوچ کر سوئی تھی تبھی تو مون..... مگر مون تو یہاں موجود تھی کچھ دیر پہلے۔ وہ اس سے کیسی باتیں کر رہی تھی؟ عجیب، فضول، خوف ناک بھلا عیسیٰ اور سوزن..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ اسے دھمکیاں دے رہی تھی۔ عیسیٰ کی زندگی سے نکل جانے کا کہہ رہی تھی۔ یہ ممکن تھا کیا؟ مون پاگل تو نہیں تھی یا کوئی نفسیاتی مریض؟

"کس ابجھن میں ہو؟" سوزن نے دھڑکتے دل کے ساتھ مالا کو مخاطب کیا۔ وہ واقعی کسی ابجھن میں تھی۔ سوزن کو بتانے لگی۔

"ابھی مون آئی تھی کچھ دیر پہلے..... یہ دیکھو گھڑی کا وقت بدل گئی۔ پہلے دوپڑ سوئی تھی پھر پانچ پر کر گئی۔ خیر اب تو چھ بج رہے ہیں۔" مالا نے کچھ بے ربط سے انداز میں کہنا شروع کیا تھا۔ "اتنی عجیب

تھی۔ سوزن کے چہرے پر اسے خاموش دیکھ کر سراسیمگی پھیل گئی تھی پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال کوئٹے کی طرح لگا۔

"اوہ..... نو، یہ مون تھی ناں۔" وہ گویا لمحوں میں ساری کہانی سمجھ گئی پھر اس نے ایک خاص انداز میں مالا کو بڑے نرم لہجے میں مخاطب کیا۔

"تم کیا محسوس کرتی ہو مالا؟" اس کے سوال کو جادو اثر بھی کہا جاسکتا ہے۔ وہ کسی ٹرانس کے عالم میں سوزن کے سوال کا خود بخود جواب دیتی گئی۔ مون کی خوف ناک باتوں سے لے کر ایک، ایک گرہ کھولتی گئی۔ جو مون نے کہا، وہ سب کسی الہامی یا خیالی کیفیت میں اس نے سوزن کے گوش گزار کر دیا تھا۔ اس کی پوری بات سن کر سوزن زرد پھیکے بھول کے مانند کھلا گئی۔ اس کی آنکھیں پانی کے نمکین قطروں سے بھر گئی تھیں۔ وہ افسردگی کی تہوں میں دب گئی مگر سوزن نے خود کو سنبھالنا تو تھا ہی۔ اسے امید نہیں تھی۔ مون اس کے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی یہ سب بکواس مالا سے کر دے گی اور جس طرح وہ اس پر سحر پھونک کر کر گئی تھی سوزن کو سو فی صد یقین تھا وہ اپنا کوئی نیا تجربہ کر کے گئی ہے۔ اس نے آخر کار تمام موجوں کو جھٹک کر بالا کی طرف رخ کیا تھا۔ اسے مالا کی ذہنی کیفیت کو بحال کرنا تھا۔

"تم اب بہت اچھا اور خود کو تروتازہ محسوس کر رہی ہو مالا..... ایک دم فریش اور ہلکا پھلکا، ہے ناں؟" سوزن کے لفظوں میں ایسی مٹھاس بھی کہ تھر نی مالا کے بے جان مکڑی جیسے بت میں جان پڑ گئی تھی۔ اس نے جھٹکا کھا کر پاس کھڑی متفکری سوزن کو دیکھا تھا۔ وہ گویا کسی خواب یا بھیانک نیند سے جاگی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہوناں...؟" سوزن نے بہت محبت سے مالا کو مخاطب کیا۔ تب وہ بڑی حیران، حیران سی اسے دیکھے گئی تھی۔

مقدس لگ رہی تھی۔ سوزن کو اس لمحے مالا پر رشک آیا۔ اگر علی عیسیٰ مالا کو اس کیفیت میں دیکھ لیتا تو عمر بھر کسی اور کی طرف نگاہ نہ ڈالتا۔ اسے مالا کی معصومیت، سادگی اور بھولپن پر ٹوٹ کر پیار آ گیا تھا۔

”این فارخ پوپے۔“ سوزن نے بے ساختہ اس کے گال کو چھوا تھا اور نرمی سے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ مالا دنگ رہ گئی تھی۔

”این فارخ پوپے۔“ یہ لفظ اب مالا کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ تاہم سوزن کے منہ سے سن کر اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ ان کے معنی سوزن سے پوچھ سکتی تھی مگر چونکہ عیسیٰ نے منع کیا تھا سو اسے خود ہی ان الفاظ کو کھوجنا تھا۔ وہ ابھی انہی الفاظ پر غور کر کے سابقہ بہت سی باتوں کو نظر انداز کر رہی تھی جب سوزن اسے نیچے آنے کا کہہ کر باہر نکل گئی تھی۔ کچھ دیر بعد مالا بھی سر جھکتی نیچے آ گئی تب ایک مرتبہ پھر گروسی نے اسے آواز دے کر بلایا تھا۔

”آزوف۔“ ان کی آواز اور اشارہ سمجھ کر مالا جھٹ پٹ فون تک آ گئی تھی۔ اسے یقین تھا عیسیٰ کا فون ہوگا اور وہ اسے لینے کے لیے آنے والا ہوگا مگر فون کے دوسری طرف حبیب چاچو تھے جو بڑے ہی بے قرار اور مضطرب لگ رہے تھے۔

”وہ مالا آتی تمہیں ادھر ہی چھوڑ کر آ گیا ہے۔ میں نے خوب کلاس لی ہے اس کی۔ صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ تم تیاری پکڑو، عیسیٰ کو بھیجتا ہوں اگرچہ وہ رات سے اسپتال ہی میں ہے۔“ وہ اپنی غلٹ پسندی کے باعث تیز، تیز بول رہے تھے اور مالا کو عیسیٰ کی مصروفیت کے متعلق بتا رہے تھے۔ کہنی کے کچھ ورکرز از حد زخمی تھے۔ ان کی حالت تشویش ناک تھی تو پھر بھلا عیسیٰ ان کو چھوڑ کر کیسے آ سکتا تھا؟

”اور تم وہاں پریشان رہی ہوگی، گروسی تو بہت ناکس ہیں جبکہ روسی (تانتے) خاصی بد مزاج ہے۔“ حبیب چاچو کی تیز گفتگو میں بھی اپنائیت کی مہک

محسوس ہو رہی تھی۔ مالا کو لگا وہ اپنے ڈیڈ سے ہم کلام ہے۔ اس کا من اندر تک شانت ہو گیا تھا۔

”نہیں چاچو، میں پریشان نہیں رہی۔ یہاں سب نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔“ مالا نے بے دل سے حبیب چاچو کو یقین دلانا چاہا تھا پھر محض انداز میں آس پاس دیکھا۔ گروسی کہیں نہیں تھیں مالا اپنے جانوروں کی سیوا کرنے چلی گئی تھیں۔

”اچھا۔“ وہ بے ساختہ خوش ہو گئے۔ ”گروسی بہت اچھی ہیں، عیسیٰ سے بہت پیار کرتی ہیں اور عیسیٰ کے حوالے سے تم بھی انہیں بہت پیاری ہوگی مگر وہ روسی اور سوزن؟“ وہ بولتے بولتے پھر سے اٹک گئے تھے۔ مالا کے ذہن میں ان کے اٹکنے سے جھماکا سا ہوا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے سن ہو گئی۔ یوں لگا تھا ذہن کی اسکرین پر سے کوئی دھندلا سا پردہ کھٹکا ہے۔ اسے اچانک مون کی باتیں یاد آ گئی تھیں۔ جیسے برت در برت، تہ در تہ کوئی انکشاف سا ہوا تھا، کوئی گرہ سی کھلی تھی۔

”روسی اور سوزن۔“ یقیناً انہیں عیسیٰ کی خالہ اور کزن کی طرف سے کوئی خدشہ تھا۔ یہی کہ وہ شاید عیسیٰ کی بیوی کو برداشت نہ کر سکیں مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ سوزن تو بہت ہی اچھی تھی جبکہ تانتے نے بھی محض رکھائی دکھانے کے علاوہ کوئی بد مزگی نہیں پھیلانی تھی مگر مون کی کہی باتیں جو اس نے ایک مرتبہ پھر مالا کے کمرے میں زبردستی کھس کر رکھی تھیں وہ نظر انداز نہیں کی جاسکتی تھیں۔ آخر مون نے اپنی تمام تر جلن اور کھولن باہر نکال ہی دی تھی۔ تو گویا مون کی اصل ناراضی کا سبب صرف یہی تھا مگر وہ کتنی کم فہم تھی اتنی سی بات سمجھ نہیں پائی کہ مقدور کا لکھا بھی نہ مٹ سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے تو پھر جب عیسیٰ کے ستارے سوزن کے ساتھ کبھی مل نہیں سکتے تھے پھر زبردستی یہ کیسے ملا سکتی تھی؟ مگر بعض لوگ تقدیر کے فیصلوں سے ٹکرانے کھڑے ہو جاتے ہیں یہاں تک

کہ تقدیر ان کا پانسہ پلٹ دیتی ہے۔ شاید مون انہی کم فہموں میں سے ایک تھی۔ اس کی سوچوں کو رکنا جب پڑا جب چاچو کی حلیم آواز سنائی دی۔

”میری بیٹی کے بغیر گھر بہت سونا لگ رہا ہے۔“ چاچو کی محبت نے مالا کے اندر چہار گنا۔۔۔ خوشگواریت اتار دی تھی۔ اس کی آنکھیں ان کی محبت پر چمکنے لگیں۔

”چاچو میں خود بھی گھر آنا چاہتی ہوں۔“ مالا نے سرشاری کیفیت میں کہا تھا۔ چاچو کی آواز اس لمحے ڈیڈی کی آواز سے مشابہ ہو گئی تھی۔ ڈیڈی جیسی نرمی، محبت، حلاوت اس کا دل اپنے باپ کی یاد سے بھر بھر آیا مگر کمالی ضبط سے خود پر قابو پائی رہی تھی۔

”دیپے چاچو، میری یہاں مون سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔“ ہر چند کہ مون سے ملاقات کوئی خوشگوار ماحول میں نہیں ہوئی تھی پھر بھی اس نے مون کا ذکر کرنا مناسب سمجھا تھا۔ مون چاچو کی اگلی بیٹی تھی اور مالا کی کزن بھی پھر اسے مون کے ساتھ کوئی پر خاش بھی نہیں تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ مون اسے قطعاً پسند نہیں کرتی۔ مون کا ذکر مالا کے لبوں سے سن کر چاچو فطری محبت سے مغلوب ہو گئے تھے۔ مالا نے محسوس کیا جب چاچو نے بولنا شروع کیا تو ان کے لہجے میں ڈھیروں پیارا تر آیا۔

”مون تم سے ملی، اس نے کچھ کہا تو نہیں؟“ جانے وہ کیوں مجھس بلکہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ ان کا انداز کھوجی، سرانگی قسم کا تھا۔ گویا وہ کچھ جانچتا اور پوچھ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ کچھ ایسا جو غیر فطری یا غیر متوقع ہو سکتا تھا۔

”کچھ نہیں کہا بلکہ اچھے طریقے سے ملی تھی۔“ مالا ان کے خدشات کی تہ میں بٹنا ان کے کچھ کہے چکے سے اتر گئی تھی حالانکہ عام روٹین میں چاچو بلا کے تفریح طبع، ہنسوز اور فرحت مزاج تھے تاہم یہ مون کا ذکر تھا جس نے انہیں کچھ اپ سیٹ کر دیا تھا۔

”جانے مون کے حوالے سے کیسی بھول ہوگی مجھ سے۔“ وہ گویا خود سے ہم کلام تھے اور اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے۔ اپنی ناکردہ خطا، قصور یا لغزش پر وہ دل برداشتہ تھے۔ وہ خود کو ہی مجرم ٹھہرا رہے تھے حالانکہ ان کا بھلا قصور کیا تھا؟ ہر بچہ اپنی فطرت پہ پیدا ہوتا ہے۔ عیسیٰ بھی تو انہی کا بیٹا تھا، فرمانبردار، نیک، ذہین۔۔۔ اگر مون کچھ الگ یا منفرد تھی تو اس میں بھی چاچو کا قصور کہاں نکلتا تھا۔

”مون نے ایسا کیا کر دیا؟“ اس کے لبوں سے غیر ارادی طور پر پھسل گیا تھا حالانکہ یہ سوال وہ کم از کم چاچو سے نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اب بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ زبان سے نکلی بات پلٹ نہیں سکتی تھی۔ ویسے بھی اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے غیر ارادی طور پر یہ بات کہی تھی۔

”آں۔۔۔۔۔“ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے تھے۔ جانے کیا سوچنے لگ گئے تھے یا انہیں مون کی شخصیت کے بارے میں بات کرنا کچھ مشکل لگ رہا تھا۔

”وہ بہت مختلف ہے بیٹا۔۔۔۔۔ شاید عام لوگوں سے بہت ہی مختلف۔“ یقیناً وہ اس سے اچھی کوئی اور وضاحت اپنی بیٹی کے لیے نہیں دے سکتے تھے جبکہ مالا ان کی بیٹی کے لیے بہت اچھی اور بہت جامع وضاحت محض چند الفاظ میں بیان کر سکتی تھی اور شاید وہ مون کی ہر بات کو نظر انداز بھی کر دیتی مگر جو وہ مالا کو اچانک ہراساں کرنے بیٹا اجازت کمرے میں کھس آتی تھی۔ ان باتوں کو سوچ کر مالا کے اندر گرہ سی پڑ گئی تھی۔ دراصل مون کے غیر اخلاقی اقدام نے مالا کے اندر حد درجہ خوف و ہراس بھر دیا تھا۔ جانے مون کے مقاصد کیا ہیں؟ تاہم مالا اتنا جان پائی تھی کہ مون اسے خوف زدہ کرنا چاہتی تھی اور اس نے مون کی شخصیت کی تشریح ایک طرفہ انداز میں کچھ اس طرح سے کی تھی۔

”چاچو! آپ کی بیٹی تو ساحرہ ہے اللہ کی قسم!

بولتی ہے تو سحر پھونک دیتی ہے۔“ اس کے نرم الفاظ نے دوسری طرف چاچو کے وجود پر کیسا بارود گرایا تھا یہ محض آنکھوں سے دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ کسی کٹے ہوئے شہتر کے مانند ڈھے گئے تھے جبکہ مالا.... بے چاری نا سچی کے عالم میں ہیلو، ہیلو کرتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

لاسٹ شاید ڈراپ ہو گئی تھی۔ مالا نے بے دلی سے فون رکھ دیا اور پلٹ کر کیوخ کی طرف بڑھ آئی مگر کیوخ کی خاموشی اور کھٹ پٹ کی نہ آنے والی آوازیں بتا رہی تھیں کہ سوزن یہاں نہیں۔ میز پر ناشتے کا سامان رکھا تھا۔ اناس کی فلاشے رس سے بھری تھی۔ ایک پلیٹ میں پیرنے کے قتلے کٹے ہوئے پڑے تھے۔ انڈے اور سلاکس بھی تھے۔ مالا نے اناس کا بس رس پیا تھا حالانکہ سبز لوسپے کا سالن بھی موجود تھا اور میدے کا پراٹھا بھی۔ سوزن نے ہمیشہ کی طرح ناشتے پر خاصا اہتمام کیا تھا۔ وہ جوں پی کر سوچ رہی تھی کہ عیسیٰ کو فون کرے۔ اسی اثنا میں سوزن چلی آئی۔

”گرس گوٹ۔“ اس نے بواریا کا مخصوص سلام پیش کیا تھا۔۔۔ جیسے انگریزی کا گڈ مارنگ اور اردو کا صبح بخیر۔ سوزن کے ساتھ اتنے مختصر وقت میں مالا نے بہت کچھ نہ سہی تھوڑا بہت سیکھ لیا تھا۔ جیسے کوئی فون کے لیے بلاتا تو وہ سمجھ کے فوراً آ جاتی۔ جیسے گرس گوٹ یعنی پورے دن کی سلامتی کے لیے دعا۔ عیسیٰ نے کہا تھا وہ لوگوں کے لفظوں اور باتوں کی طرف توجہ دیا کرے تاکہ اسے لفظ سمجھنے میں آسانی ہو۔ کوئی بھی زبان مشکل نہیں ہوتی اگر اسے سمجھ لیا جائے تو اور یہ علی عیسیٰ کی خاص ہدایت تھی پھر مالا اسے کیسے نظر انداز کر دیتی۔

ادھر سوزن اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اب گرس گوٹ کے جواب میں جانے کیا بولتے تھے؟ مالا کو کچھ سمجھ نہ آیا تو اس نے بڑے

جذب کے ساتھ ”وعلیکم السلام“ بول کر سوزن کی سلامتی کو لوٹا دیا۔ مالا کے اس انداز پر سوزن کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی تھی پھر اس نے اسٹول پر بیٹھ کر مالا کی طرف کیا۔ اب وہ اپنی سوتی روک سمیٹ کر مالا کے قریب بیٹھ گئی تھی اور مالا اسے اتنے قریب سے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

”بھلا علی عیسیٰ نے سوزن پر اسے کیوں ترجیح دی؟ کیا خوب صورتی کی بنا پر مگر عیسیٰ نے تو مالا کو دیکھا ہی نہیں تھا تو پھر آخر کیا وجہ تھی؟ شاید چاچو کی محبت یا اصرار؟ ہاں، شاید یہی ٹھوس وجہ ہو سکتی تھی مگر جو بھی تھا مالا اس انداز میں سوچ کر بھی سوزن سے حسد محسوس نہیں کرتی تھی اور نہ ہی اسے علی عیسیٰ کے اپنے ساتھ رشتے پر مان جانے کی کسی بھی خاص وجہ کو جاننے کے متعلق تجسس تھا۔ گویا وہ علی عیسیٰ کو پا کر ہی سرشار تھی۔ وہ اسے کیوں ملا، کیسے ملا اور یہ شادی کس طرح ہوئی؟ مالا کو یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے لیے اہم یہ تھا کہ علی عیسیٰ سفید پھولوں کی مالا سے بے انتہا محبت کرتا ہے اور جب وہ اس سے محبت کرتا تھا تو باقی چیزیں قطعاً فضول اور بے معنی تھیں۔ مالا کے لیے یہی احساس پوری زیست کا سرمایہ تھا۔ مون کیا چاہتی تھی؟ تانتے اور سوزن کی کیا خواہش تھی؟ یہ پوری کہانی مالا کے یہاں آنے سے پہلے کی تھی اور مالا کو ماضی کریدنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلے اتار چڑھاؤ کو ملاحظہ کر کے سوزن نے اسے سوچوں کے گرداب سے باہر نکالا۔

”عیسیٰ کا فون آیا تھا، وہ آج بھی نہیں آسکے گا۔“ سوزن کے الفاظ نے مالا کی رنگت پل بھر میں زرد کر دی تھی۔ اس کی سانس رک سی گئی چونکہ سوزن اس کے بہت قریب بیٹھی تھی اور مالا کا چہرہ بھی کھلی کتاب جیسا تھا سودہ اس کے تاثرات کا فوراً جائزہ لے کر نرمی سے بولی۔

”گھبراؤ مت، عیسیٰ نے مجھے کہا ہے کہ میں

تمہیں اسٹیشن تک چھوڑ آؤں۔ وہ تمہیں آگے سے پک کر لے گا۔ وہ بہت پریشان ہے اور انکل بھی تمہارے لیے اداس ہیں۔ میں نے آفاق کو بلایا ہے اگر اس کی کلاس نہ ہوتی تو تمہیں من ہائیم چھوڑ آئے گا۔ اگرچہ عیسیٰ کو یہ پسند نہیں مگر میں چاہتی ہوں تم اکیلے سفر نہ کرو۔ آفاق بہت اچھا لڑکا ہے۔ پاکستانی ہے، یہاں جاب کرنے آیا ہے آج کل ڈنچ سیکھ رہا ہے ادھر اسٹی ٹیوٹ میں۔ آفاق کے ساتھ جانے میں دشواری نہیں ہوگی۔ وہ تمہاری بات سمجھے گا اور تم اس کی ہم وطن ہونا پردیس میں ایک نعمت ہے۔“ سوزن نے سابقہ نرمی اور حلاوت سے کہا تھا۔ مالا جہاں اپنے واپس جانے کا بہت خوش ہو کر پروگرام سن رہی تھی وہیں آفاق کے نام پر ٹھنک گئی۔ اس پوری گفتگو کے دوران اسے صرف ایک بات چونکا گئی تھی۔ ”اگرچہ عیسیٰ کو یہ پسند نہیں۔“ عیسیٰ کو کیا پسند نہیں؟ آفاق کے ساتھ جانا یا پھر کسی کے ساتھ بھی سفر کرنا؟ اس نے کہا تھا وہ اکیلی چلی آئے۔ عیسیٰ آگے سے پک کر لے گا تو پھر کسی بھی آفاق کے ساتھ جانا بیکار اور فضول تھا جبکہ سوزن آفاق کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ وہ شاید اس کا تذبذب سمجھ چکی تھی۔

”آفاق بہت شریف جوان ہے۔ بہت نیک اور ایمان دار ہے۔ پہلے ہمارے گھر میں ہی رہتا تھا۔ اب ادھر قریب ہی ایک گھر کراپے پر لیا ہے اس نے۔ آفاق کے ساتھ جانے میں کوئی پرالہم نہیں، میں عیسیٰ کو بتا دوں گی ویسے وہ بھی آفاق کو جانتا ہے۔ تم یہاں اجنبی ہو، ڈنچ سے ناواقف ہو میرا نہیں خیال کہ اکیلے سفر کر پاؤ گی۔“ سوزن بلاشبہ بہت ہمدرد اور احساس کرنے والی لڑکی تھی۔ اسے مالا کی پریشانی کا خیال تھا مگر مالا، سوزن کی بات بھلا کیسے مان لیتی جب عیسیٰ نے کہا تھا وہ اکیلی آجائے۔ اگر وہ چاہتا تو کہہ دیتا کہ کوئی اسے چھوڑ جائے۔ وہ کتنی

پریشان اور تذبذب کا شکار ہو چکی تھی۔ سوزن کچھ دیر کے لیے چپ سی ہو گئی پھر اندر سے اپنا موبائل اٹھالائی۔ اس نے عیسیٰ کا نمبر ملا کر پہلے پندرہ منٹ عیسیٰ سے خود بات کی شاید اسے سمجھانی رہی تھی کہ مالا اس ملک میں اجنبی ہے اور اکیلے سفر نہیں کر سکتی پھر کافی لمبی گفتگو کے بعد اس نے موبائل مالا کو پکڑا دیا تھا۔ مالا نے سیل فون کان سے لگایا تو عیسیٰ کی متفکر آواز سنائی دی۔

”مالا! میں خود تمہیں لینے آ جاتا مگر بورٹ (ارکان کمیٹی) کے دو لوگ مرچکے ہیں۔ یہاں خاصا لمبا چوڑا کام ہے۔ حادثے کے باعث ایک دو کی مزید حالت تشویش ناک ہے۔ پایا کو ڈاکٹر نے ڈرائیونگ سے منع کر رکھا ہے ورنہ وہ خود تمہیں لینے پہنچ جاتے۔ میں نے بہ مشکل روک رکھا ہے انہیں۔ سوزن تمہیں اسٹیشن تک چھوڑ جائے گی، تم آفاق کے ساتھ آ جانا۔ بہت اچھا لڑکا ہے تم ڈنچ سے ناواقف ہو راتے میں پریشانی ہو سکتی ہے۔ دھیان سے آنا، اپنا خیال تم اچھی طرح رکھ سکتی ہو۔“ وہ عجلت میں مگر محتاط سا بول رہا تھا۔ اس کے آخری الفاظ میں ایک پوشیدہ سی تنبیہ تھی۔ اس تنبیہ کو مالا اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ وہ نہ بھی کہتا تب بھی مالا اپنا خیال بہت اچھی طرح سے رکھ سکتی تھی۔ اپنا وقار، نسوانی پندار، عزت اور آبرو کی حفاظت کرنا اسے خوب آتا تھا۔ ایک یہی تو خاص تربیت تھی جسے ان کی مشرقی مائیں کٹھنی میں پلا دیتی تھیں۔ فون بند ہو گیا تھا اور شاید فیصلہ بھی ہو چکا تھا۔ اسے سوزن کی بات اب ماننی ہی تھی کیونکہ عیسیٰ نے آفاق کے ساتھ چلے آنے کی اجازت دے دی تھی سو مالا کو اب اپنی چیزیں سمیٹنا تھیں جو تقریباً پہلے سے ہی سمیٹ رکھی تھیں پھر بھی تھوڑی بہت پکینگ سوزن نے کروادی تھی پھر مالا، گردی سے ملنے ان کے جانوروں والے باڑے میں پہنچ گئی۔ یہاں گوبر کے بھبھکوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ تانتے مشین میں

چارہ کاٹ رہی تھی۔ ایک سخت دل، روکھے مزاج کی محنت کش عورت۔ اس نے پہلی مرتبہ تانتے کو کام کرتے دیکھا تھا۔ تانتے گھر میں کم کم نظر آتی تھی۔ بھینا اس کا زیادہ وقت باڑے میں گزرتا تھا۔ یہاں پنیر اور تازہ دودھ کی بانس تھی۔ گردی اور تانتے اسے دیکھ کر کام چھوڑ کر حیران کھڑی تھیں پھر تانتے تو نہیں البتہ گردی اس کے قریب آگئیں۔ انہوں نے اپنے کھر درے سفید ہاتھ کو اس کے سر پر رکھا تھا پھر گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا۔

”کیا ہوا تو ختر (بہنی)؟“ گردی کی سبز گدلی بہت کشادہ آنکھوں میں سوال تھا تب مالا کو سمجھ نہ آئی کہ وہ انہیں کیسے بتائے، وہ جارہی ہے اور ان سے ملنے کے لیے آئی ہے۔ اس کی مشکل سوزن نے آسان کر دی۔ وہ اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔ بھینا سوزن جان گئی تھی مالا، گردی سے ملنے باڑے تک گئی ہوگی۔ گردی نے سوزن کی بات سن کر کچھ کہا تھا شاید یہی کہ وہ کچھ اور دن ان کے پاس رک جائے۔ گردی کی محبت پر مالا کو کوئی شک نہیں تھا تاہم اتنا وہ جانتی تھی کہ تانتے اس کے جانے کا سن کر بہت خوش ہوگی۔ سوزن کی بات سن کر تانتے نے مشین کا ہینڈل گھما کر اندر کی طرف رخ کر لیا تھا۔ مشین خود بخود چارہ کاٹ رہی تھی اور تانتے کا یوں مالا کو دیکھ کر اندر چلے جانا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ کیا وہ تانتے کو اتنی ہی بڑی لگتی تھی کہ ملتا تو دور اس نے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ مالا کا کالج سادل ٹوٹ ہی گیا۔ اب اگر عیسیٰ نے سوزن سے شادی نہیں کی تھی تو اس میں بھلا مالا کا کیا تصور تھا؟ گردی سے مل کر اور ان کی دعائیں سمیٹ کر جوں ہی وہ پلٹی تب تک تانتے دوبارہ باڑے تک آگئی تھی۔ سوزن نے اشارے سے مالا کو رک جانے کا کہا تھا۔ اب وہ حیران نظروں سے تانتے کو دیکھ رہی تھی جس نے ہاتھ میں ایک شون روک پکڑ رکھی تھی۔ پھول داری خوب صورت

اسکرت جس پر دھاگے کا کام تھا پھرتا تانتے نے اس کی حیرانی سے پھٹی پڑتی آنکھوں کو دیکھے بغیر ایک انتہائی نفیس آرمبائٹ مالا کی کلائی میں پہنا دیا تھا۔ اگرچہ آرمبائٹ (برسلٹ) نفی ٹیکنوں سے سجا تھا مگر انتہائی خوب صورت اور نفیس تھا۔ یہ تانتے اور گردی کی طرف سے تحفے تھے۔ مالا کی خوشی کے مارے آنکھیں بھرا آئیں۔ اسی روکھے مزاج والی۔۔۔ بد اخلاق تانتے نے گردی کے انداز میں مالا کو پیار کر کے اچھی قسمت کے لیے دعاوی تھی۔

”فیل گلوک۔“ تانتے نے سابقہ انداز میں کہا تھا پھر واپس باڑے کی طرف چلی گئی۔ گردی اسے باہر تک چھوڑنے آئی تھیں۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ۔۔۔ گردی اور سوزن کی محبت سمیٹ کر اور تانتے اور منوں کو سمجھے بغیر واپس جانے والے راستوں پر رداں دواں تھی۔ سوزن اس کے ہمراہ آئی تھی۔ اب وہ جنگلی پھولوں کی پاڑ پھلانگ کر ایک ہاؤس فراؤ کے گھر کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ وہیں سوزن نے آفاق کو آواز دے کر باہر بلایا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک ہینڈ سم جوان خوب تیار شمار ہو کر منتا مسکراتا باہر آیا تھا۔ اس نے خوب رگڑ رگڑ کر شیو کر رکھی تھی۔ گورا چٹا، کالی آنکھیں، کالے بال۔۔۔ شکل سے ہی مالا کا ہم وطن لگ رہا تھا۔ آتے ساتھ بڑا گرم جوشی بھرا سلام کیا۔ حال احوال پوچھا اور محض پندرہ منٹ کے اندر اندر لاہور سے لے کر یہاں تک کا سفر نامہ سنا ڈالا۔ انتہا کا باتونی یہ لڑکا آفاق تھا۔ اس کا تعلق بھی لاہور سے تھا۔ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی، مستقبل سنوارنے کی خواہش لیے جرمنی آیا تھا۔ اپنی ماں اور بہنوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ اسے بہنوں کی شادیاں کرنا تھیں، ماں کو حج کروانا تھا اور داوی کو سونے کے کنگن بنوا کر دینے تھے۔ اس کے علاوہ آفاق پر اپنے دو بہنوئوں کو جرمنی لے کر آنے کی ذمہ داری بھی تھی اور ایک بہنوئی کو کاروبار سیٹ کر کے دینا تھا۔ اس کی اکیلی جان بے شمار سیاپوں

میں پھنسی ہوئی تھی اور پھر بھی فی الحال کوئی اس سے خوش نہ تھا۔ وہ پچھلے آٹھ ماہ سے جرمنی میں تھا۔ سوزن کے اسٹور میں کام کرتا تھا ساتھ ساتھ یہاں کی زبان بھی سیکھ رہا تھا۔ یہ تمام گفتگو ٹھیکہ پنجابی میں آفاق نے مالا کے گوش گزار کی تھی۔ وہ مالا کی توقع سے بھی زیادہ ہنس کھ اور زندہ دل تھا۔ اس کی چلتی زبان کے جوہر دیکھ کر سوزن نے برجستہ کہا۔

”اہل بواریا کی زعمہ ملی آفاق کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔“ سوزن کے منہ سے آفاق کو مسکرانے پر مجبور کر گئے۔ وہ اب مالا کو بتا رہا تھا۔

”آہ، بواریا کا حسن۔۔۔ تم ساری دنیا بھی دیکھ لو تب بھی بواریا کے حسن کا سحر ایسا نہیں جس سے خود کو آزاد کر پاؤ گی۔“ وہ دور تک پھیلی ہریالی کو دیکھتا، سبزے پھولوں، پہاڑوں، چشموں، جھیلوں کی داستان سنا رہا تھا۔ جو آس پاس بکھرے پڑے تھے۔ یہاں سفید مرغابیاں بھی کثرت سے پانی جاتی تھیں۔ اس وقت سورج پکھل رہا تھا۔ ہر چیز روشن اور چمک دار تھی۔ وہ لوگ اسٹیشن تک ایک منی بس کے ذریعے آئے۔ مالا ایک گاؤں میں عالیشان سا چمکتا دمکتا اسٹیشن دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ انتہائی صاف شفاف، ایک طرف بڑے۔۔۔ بڑے ڈیپاڑمنٹ اسٹورز تھے۔ جس روڈ پر بس رکی تھی وہاں پیٹرول پمپ اور سی این جی اسٹیشن بھی تھا۔ دو تین ہوٹلز اور گیسٹ ہاؤسز بھی تھے۔ یہ ایک چھوٹے سے معمولی گاؤں کی ترقی کا حال تھا۔ مالا کی آنکھیں جانے کیا کچھ دیکھ کر حیران ہوئیں۔ بھی ایک ٹرین کے آنے کی دہلی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین قریب آگئی۔ مسافر سوار ہونے لگے تھے۔ مالا نے دھندلی آنکھوں سے سوزن کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اپنی زندگی کا ایک اور خوب صورت انتہائی یادگار تھوڑا سا وقت یہاں گزار کر واپس جارہی تھی۔ وہ سوزن کو کبھی بھلا نہیں سکتی تھی۔ اس کی محبت، ایثار اور پیار کا کوئی مول

نہیں تھا۔ مالا نے فرط محبت سے اسے گلے لگایا تھا جو اب سوزن نے بھی اسی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ”میں آج کل خاصی غریب ہوں، تمہیں کوئی تحفہ نہیں دے سکی۔ مگر تحفہ تمہارا ادھار رہا۔“ اس کے گال پر بوسہ دے کر سوزن نے سرگوشی کی تھی۔ تب مالا اسے منع کرنا چاہتی تھی مگر اچانک دسل سنائی دی۔ آفاق نے چیخ کر اسے بلایا اور مالا عجلت میں ہاتھ ہلاتی ٹرین میں سوار ہو گئی۔ اس کی آنکھیں سیٹ پر بیٹھنے کے بعد بھیگ رہی تھیں۔ وہ سوزن کی محبت کو کبھی بھلا نہیں سکتی تھی۔ وہ سوزن کے ساتھ گزارے وقت میں اس قدر محو تھی کہ اپنے ساتھ آئے آفاق کو بھی بھول چکی تھی۔

”جس دن میں بواریا چھوڑوں گا، مجھے بھی ایسا ہی دکھ ہوگا۔“ آفاق نے اس کی افسردگی محسوس کر کے آہستگی سے کہا۔ ”یہ بواریا۔۔۔ یہ ہے ہی ایسا۔ اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ بندے کو اپنی طرف مقناطیس کی طرح کھینچتا ہے۔ یہاں کے لوگ بہت سادہ طبیعت، ہمدرد، مخلص اور مذہبی ہیں۔ میں نے اہل مغرب میں اس علاقے جیسے لوگ کہیں نہیں دیکھے۔ لگتا ہے، یہاں افسانوی کردار بستے ہیں۔“ وہ باتونی لڑکا بالآخر سوں، سوں کرنی مالا کو اپنی طرف متوجہ کر ہی چکا تھا۔ مالا نے اس کی بات سے۔۔۔ بے خیالی میں اتفاق کر لیا۔

”میں یہاں بس ایک مہینے تک ہوں پھر من ہائیم میں جاب ڈھونڈوں گا۔“ وہ بولے جانے کے خطبہ میں مبتلا تھا۔ جواب نہ پا کر بھی بولے چلا جاتا تھا۔ اسے خاموش رہنا گویا پسند نہیں تھا۔

”عیسیٰ بہت اچھا ہے، اس نے میری بہت مدد کی تھی۔ بھینا میرا کورس مکمل ہونے کے بعد جاب بھی ڈھونڈ دے گا۔“ وہ اب عیسیٰ کی تعریفوں میں رطب اللسان تھا اور عیسیٰ کی تعریف ایک ایسا موضوع تھا جو مالا کو اندر تک سرشار کر دیتا تھا۔ وہ گویا جی جان سے

آفاق کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اسے عیسیٰ کے بارے میں کسی سے بھی کچھ سننا بے حد پسند تھا۔

”میرا انسٹی ٹیوٹ میں مون نے فری ایڈمیشن کروایا تھا۔ یہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ ہمدرد اور مخلص خصوصاً ان لوگوں میں سب سے زیادہ سوزن انتہائی مخلص اور ایثار کرنے والی لڑکی ہے کاش کہ وہ عیسائی نہ ہوتی۔“ بولتے بولتے اچانک وہ ایک دم رک گیا تھا۔ زیادہ بولنے کا ایک یہی نقصان ہوتا ہے جو کچھ زبان بول دیتی ہے وہ پھر واپس نہیں پلٹ سکتا۔ وہ بھی قدرے خاموش اور شرمندہ ہو گیا تھا مگر مالا نے گویا اس کی بات پکڑ لی تھی یعنی انسانی خطری تجس۔ حالانکہ وہ اجنبی لوگوں سے زیادہ تو کیا کم بھی بے تکلف نہیں ہوتی تھی اور اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ آفاق سے بالکل بات نہیں کرے گی مگر یہ آفاق کی سادگی، خلوص یا اپنائیت بھرا انداز تھا جو مالا کو رکھائی دکھانے سے روک رہا تھا۔ وہ چاہ کر بھی بد اخلاقی نہیں دکھا سکتی تھی اور نہ ہی آفاق سے بدتمیزی کر سکتی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک تمیزدار، بااخلاق اور شائستہ اطوار لڑکا تھا۔

”وہ عیسائی نہ ہوتی تو؟“ مالا نے اس تمام گفتگو میں ایک جملہ بالآخر پکڑ ہی لیا تھا۔ آفاق ایک دم جھینپ سا گیا تھا پھر شاید بات بنا کر بولا تھا۔

”یقیناً گفتگو کو کسی بھی موڑ سے اپنے حق میں کرنے کا ہنر اسے آتا تھا۔ مالا سراپے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔“

”سوزی بہت اچھی لڑکی ہے۔ کسی بھی انسان کا آپڈیل، ویسے میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اگر وہ عیسائی نہ ہوتی تب بھی عیسائی ہی ہوتی، اپنے مذہب پر جان دیتی ہے۔ میں نے بہت کم مغربی لڑکیاں سوزی کی طرح، سوزی کے مزاج والی، سوزی جیسے کردار والی دیکھی ہیں۔“ آفاق یقیناً سچ بول رہا تھا۔ سوزی ایسی ہی تھی، قابل تعریف، محبت کرنے والی، ایثار لوانے والی۔ کچھ دیر بعد آفاق پھر سے سوزی کے متعلق گفتگو

کو بڑھا رہا تھا۔

”مجھے سوزی کے ہم سفر پر رشک آتا ہے۔ یقیناً وہ خوش قسمت انسان ہوگا جسے سوزی پسند کرے گی۔“ آفاق کے لہجے میں حسرت سی در آئی تھی۔ مالا ایک مرتبہ پھر سے ٹھٹھکی بھلا اس حسرت آمیز لہجے کا مفہوم کیا تھا۔

”سوزی بھی میری طرح سیلز گرل ہے یعنی میں سیلز بوائے، وہ سیلز گرل۔ یہ جاب بڑی مشکل سے مجھے ملی ہے ویسے میں کبھی کبھی حیران ہوتا ہوں بلکہ مجھے رشک آتا ہے۔“ اس نے اپنا کندھے پر لٹکایا لیڈر کا بیگ کھول کر اس کے اندر تانکا جھانکی شروع کر دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک چپس کا پیکٹ کھول کر مالا کی طرف بڑھانے لگا۔ مالا جھجک سی گئی تھی اس نے چپس کا پیکٹ نہیں پکڑا تھا۔

”شکریہ، میرا موڈ نہیں ہے۔“ اس نے انکار کر دیا۔ آفاق نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا تھا۔ وہ پہلے جیسی بے تکلفی کے ساتھ مسلسل بول رہا تھا اور برابر چپس کھائے جا رہا تھا۔

”تم نے پوچھا نہیں، مجھے رشک کس پر آتا ہے؟“ اب وہ مالا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ جس کی مسلسل خاموشی شاید آفاق کے لیے اچھے کا باعث تھی۔

”کس پر رشک آتا ہے؟“ مالا نے میکا کی انداز میں پوچھا تھا۔ دراصل وہ زیادہ بولنے کی عادی نہیں تھی اور اسے آفاق کا بلا تکان بولنا بھی گراں گزر رہا تھا۔

”علی عیسیٰ پر۔“ آفاق نے لمحوں میں چپس کا پیکٹ خالی کر کے گول مول سا گولا بنایا اور اسے ایک چھوٹی کورپ (ڈسٹ بن) میں اچھال دیا۔ شاید وہ اسی لیے ایک کندھے میں لٹکائی گئی تھی۔

”اچھا“ مالا کی دلچسپی دیدنی تھی۔ ”بھلا وہ کیوں؟“ اب وہ حیرانی سے بول رہی تھی۔

”وہ اس لیے کہ علی عیسیٰ بہت اچھا ہے، بہت

امیر ہے۔ اس نے کچھ بھی محنت سے نہیں بنایا۔ اسے سب بتا دیا ملا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک ہمدرد دل رکھتا ہے۔“ آفاق کی کچھ باتیں مالا کو اچھی اور کچھ بڑی لگی تھیں۔ وہ چپ ہوا تو مالا بولی۔

”اس کے باپ نے تو بہت محنت کی ہے ناں اور اسی بزنس کو عیسیٰ نے مزید وسعت دی ہے۔ ہمارے پچھلے، اگلوں کے لیے کچھ نہیں کرتے، اسی لیے پیچھے رہ گئے ہیں۔“ مالا نے بے ساختہ جواب دیا تھا اسے آفاق کی بات بھائی نہیں تھی۔

”ہاں، یہ تو میں بھی کہتا ہوں۔ ویسے حبیب انکل جیسا انسان بھی کوئی نہیں..... مگر مون کی خود سری نے انہیں بیمار کر ڈالا ہے۔ تم جانتی ہو گی وہ ہارٹ پیسٹ ہیں۔ انہیں دوسرا ایک تمہاری شادی سے کوئی ایک مہینہ پہلے ہوا تھا۔ تبھی تو انہوں نے عیسیٰ کی جھٹ پٹ شادی کر دی تھی۔“ آفاق اپنی رد میں بولتا جا رہا تھا اور مالا کی گویا سانس سینے میں اٹک گئی۔

”کیا چاہتے تھے سخت بیمار تھے؟“ مالا کو اس انکشاف نے حیران کر ڈالا تھا۔ وہ اندر تک آزرہ ہو گئی۔

”بیمار تھے نہیں، بیمار ہیں۔“ آفاق نے اپنی بات پر زور دے کر کہا تھا پھر مالا کی نم آنکھوں اور ڈھیروں رنجیدگی کو محسوس کر کے قدرے گڑبڑا گیا۔

”ارے..... اب تو وہ بالکل ٹھیک ہیں۔“ آفاق کو سمجھ نہ آئی کہ اسے تسلی کیسے دے۔ مالا کی آنکھیں ٹپ ٹپ برسنے لگی تھیں۔ اسے اب پتا چلا تھا کیوں چاچو نے آنا فانا عیسیٰ کی شادی اس کے ساتھ کر دی تھی۔ یقیناً وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چلے تھے۔

”ویسے عیسیٰ کی جلدی شادی کا موجب یہی تھا۔ وہ تو پہلے مون کی شادی کرنا چاہتے تھے مگر وہ مانی نہیں۔“ آفاق ان کی فیملی کو اتنے قریب سے جانتا تھا۔ یہ مالا کو پہلے نہیں پتا چل سکا تھا۔ وہ تو ان کے گھر کی بہت پرسنل باتوں کو بھی جانتا تھا تو پھر وہ مون

کے متعلق بھی جانتا ہوگا۔ عیسیٰ اور سوزن کے نام نہاد رشتے کو بھی جانتا ہوگا اور مون کی ساحری، جادوگری کے فن سے بھی واقف ہوگا۔ مالا اپنے بھٹے سے آفاق کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اس سے کچھ پوچھنے اور نہ پوچھنے کی کشمکش میں مبتلا تھی اسی اثنا میں بارش گارڈ ٹکٹ فروخت کرنے آ گیا۔ اس غریب بے تکلف لڑکے نے فوراً ڈکٹ خرید لیے تھے۔ اب ٹرین گلابوں کے نگر سے گزر رہی تھی۔ وسیع پھولوں سے سجے فیلڈ تاحہ نگاہ پھولوں کی رنگ برنگی تو س قزح پھیلی تھی۔ ایسا مہکیلا، جان فزا منظر تھا کہ کچھ بل کے لیے آفاق بھی بولنا بھول گیا تھا حالانکہ وہ ایک منٹ بھی چپ رہنے والا نہیں تھا ادھر مالا پھولوں کی مالاؤں پر نگاہ جمائے آفاق سے کچھ پوچھنے کے لیے لفظوں کو توڑ مروڑ رہی تھی۔ دراصل اسے گفتگو کی ابتدا کے لیے کوئی مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ بھلا وہ کیسے اتنی اہم بات انجان لڑکے سے پوچھ لیتی۔ ویسے بھی جس طرح مون نے دو دفعہ مالا کو اچانک ہراساں کیا تھا اس بات سے کبھی ناواقف تھے اور سوزن تو مانتی ہی نہیں تھی کہ مون ان کے گھر اچانک آئی تھی بلکہ گھر نہیں، مالا کے کمرے میں..... سوزن کا خیال تھا مون اس کے کمرے میں نہیں آئی جبکہ مالا کو پورا یقین تھا وہ اسے پہلی شب کی طرح ہراساں کر کے گئی ہے۔ اب جانے آفاق کو بتانا مناسب تھا یا نہیں۔ وہ اسی کشمکش میں مبتلا بات بدل کر بولی تھی۔

”کیا تم جانتے ہو کبھی عیسیٰ اور سوزن کا رشتہ یا متعلق وغیرہ ہو چکی ہے؟“ مالا نے حتی المقدور لہجے کو سرسری بنایا تھا تاکہ آفاق کو شک بھی نہ گزرے۔

”آں.....“ آفاق پھولوں کے حسن سے نگاہ چرا کر فوراً چونکا۔ ”متعلق.....“ اسے بھی اچھنچا ہوا۔ وہ دائیں بائیں سرنگی میں ہلا کر ایک مرتبہ پھر اپنا لیڈر کا بیگ کھولنے لگا تھا۔ اب کے اس نے جوس کا ٹن نکالا تھا۔ پہلے مالا کی طرف بڑھایا پھر کچھ سوچ کر فوراً

آزادی نسوان

مغربی عورت نے، مرد کے شانہ بشانہ گھر گرہستی چھوڑ کر ہر قسم کی صنعت میں کام کیا اور معاشی طور پر مستحکم، آزاد، خوشحال اور خود مختار ہوئی۔ اب شوہر اس کی مجبوری صرف خرچے کے لیے نہیں رہے، مردوں نے بھی آزادی کی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کیونکہ اس میں ان کا ہی فائدہ تھا۔ آہستہ آہستہ خاندانی بندھن ٹوٹنے لگے اور تصور خاندان بکھر نے لگا۔

single parenty خاندان کا رواج عام ہوا۔ آج مغربی معاشرے میں عورت کی نسوانیت کی تلاش ہے، جو عقلاً ہو چکی ہے۔ تکتہ در اس سوال پر غور کر رہے ہیں کہ جہاں عورت مکمل طور پر آزاد اور مشرقی ماحول کے بالمقابل نہایت پر اعتماد ہے پھر اس قدر عدم تحفظ کا شکار کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب آج تک آزادی نسوان کی کوئی تحریک نہیں دے سکی اور نہ ہی مغرب کا وہ طبقہ دے سکا جو مسلم عورت کی "آزادی" کے لیے بھی سرگرم عمل رہتا ہے۔

مرسلہ عربستان کوٹلی

محبت کی امر بیل

محبت کی امر بیل میں ہمیشہ ستم کے پھول کھلتے ہیں، ستم کا پھول جس کی پتھریوں پر تاسف کے آنسو ٹپکتے ہوتے ہیں جس کی تھلیں جلد سے جدائی کی خوشبو آتی ہے۔ ستم کے پھول کی کہانی سنی ہے کبھی تم نے یہ لودھ کے پھول کی داستان ہے، ایک ایسا پھول جس میں محبت کا مدفن ہوتا ہے، دیوتا ابالو اور دینس کی محبت بادام کے شکوفوں کی طرح معطر نازک مگر ہر خوب صورت چیز تمام خوب صورت لمحے صرف چند روزہ کیوں ہوتے ہیں دینس کی قبر پر اپالو کے اتنے آنسو گرے کہ اک دن اس میں سے اک پودے نے سر نکالا اور اس میں ایک پھول کھلا ارغوانی رنگ کا یہ ستم کا پھول تھا، ستم کا پھول بچھتاوے کا پھول محبت کا مدفن اس کی ہر ایک پتھری پر لکھا ہوتا ہے انوس صد انوس۔

بالو قد سیر کی تصنیف امرتیل سے انتخاب

پلندہ: ماہ نور قیصر، راو پنڈی

ہوئی ماں کے سامنے خود کو سرخرو سمجھنے لگا تھا۔ اس کا منہ مطمئن ہو گیا۔ دراصل وہ انکل کی بیٹی کو چاہتا تھا یعنی تمہیں..... بہت پہلے سے انکل نے کہہ دیا تھا کہ عیسیٰ کی شادی مالا سے ہوگی یعنی تم سے..... سو اس کے ذہن میں تمہارا خیال تھا۔ "آفاق پرت در پرت انکشافات کی بو چھاڑ کر رہا تھا۔ اس باتونی نے اس کی حیران آنکھوں میں جلتی جوت کو دیکھ کر شرارتا کہا تھا۔

"تم سوچتی ہوگی اتنی اندر کی باتیں مختصر سے آٹھ، نو مہینوں میں مجھے کیسے پتا چلیں؟" آفاق نے چپ رہنا کہاں سیکھا تھا۔ مالا کو اس لمحے آفاق کا بہت بولنا بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ آفاق یوں ہی بنا اس کے کچھ پوچھے بولتا رہے۔

"ایکچوٹی مجھے یہ سب سوزن نے بتایا تھا اور سوزن کبھی جھوٹ نہیں کہتی۔" آفاق کے لہجے میں واضح سچائی تھی۔ مالا پور پور قائل ہو گئی پھر اس نے بہت خوف زدہ انداز میں مون کا ذکر خیر چھیڑا تھا تب مالا کی طرح آفاق بھی مون کے ذکر پر قدرے سہم گیا۔

"اس کی بات نہ ہی کرو، پوری جادو گرئی ہے، اللہ کی قسم مجھے بہت ڈر لگتا ہے مادام مون سے۔" آفاق نے سہم کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "اور میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ مون کے بارے میں زیادہ کھوج اور تفتیش میں نہ پڑنا۔ جس کا پیچھا لے لیتی ہے اس کی سانسیں کھینچ کے دم لیتی ہے۔ من ہائیم کی سحر ہے۔" آفاق کے اگلے الفاظ نے مالا کے چڑیا جیسے دل کو بری طرح سہا دیا تھا۔

☆☆☆

"تم بہت اچھے ہو آفاق۔" اسٹیشن پر اترنے سے پہلے مالا نے تہ دل سے اپنے احساسات آفاق تک پہنچا دیے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اجنبیوں سے اتنی جلدی بے تکلف نہیں ہوتی تھی مگر آفاق میں کچھ بہت ہی انفرادیت تھی۔ اس کی شخصیت میں کچھ

اندر پھڑ پھڑاتے سوال مزید بڑھ گئے۔ وہ آفاق سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی تھی مگر اسے خدشہ تھا کہ آفاق یہ نہ سمجھے کہ وہ اپنی فیملی سے اتنی انجان ہے۔ "پھر؟" مالا کے ہونٹ بے آواز پھڑ پھڑائے۔ "ایکچوٹی، عیسیٰ نے شرط رکھی تھی شاید میری آنٹی کی خواہش سے متاثر ہو کر اس نے آخری شرط بتائی کہ سوزن اسلام قبول کر لے۔ تب وہ اپنی ہما کی خواہش پوری کرتے ہوئے سوزی سے شادی کر لے گا۔" آفاق نے بنا کوئی خاص تاثر دیے مالا کے ہر سوال کا جواب دینا شروع کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ سادہ سا تھا یقیناً وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ مالا کے مزید کچھ بھی بولے بغیر وہ خود ہی بتانے لگا۔ بہت باتونی ہوتا شاید اسی کو کہتے ہیں، وہ چپ نہیں رہ سکتا تھا اور مالا کے لیے اس کا بولنا بہت ضروری تھا۔

"تب سوزی نے انکار کر دیا۔ وہ عیسائیت کے عشق سے نکلنے والی نہیں تھی۔ اس نے کہا تھا، وہ دنیا کے لیے آخرت نہیں ختم کر سکتی۔ وہ عیسیٰ کے لیے عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب اور ان سے عشق کو نہیں چھوڑ سکتی مگر وہ علی عیسیٰ سے محبت کرنا بھی ختم نہیں کر سکتی۔ بے چاری کو وقت نے دوار ہے پرلا کھڑا کیا تھا۔" آفاق کے الفاظ میں سچائی کے ساتھ سوزی کے لیے بے انتہاد کھ اور کرب تھا۔ وہ اس چھوٹی سی لڑکی کے لیے دل میں بہت نرم جذبات رکھتا تھا۔ وہ یہ بات کسی سے تو کیا خود سے بھی سیر نہیں کر سکتا تھا۔ سوزی اس کی محنت تھی اور احسان کرنے والوں کے دلوں کو نہیں نہیں پہنچاتی جاتی۔ ادھر مالا اس انکشاف پر دم بخود رہ گئی تھی۔

"سوزی نے علی عیسیٰ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا؟" مالا کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ اسے سوزی اس لمحے بہت عظیم لگی تھی۔ اس نے مذہب پر محبت کو قربان کر دیا تھا۔ اس کے لیے محبت اہم نہیں تھی، مذہب اہم ترجیح تھا۔

"ہاں، تب عیسیٰ مطمئن ہو گیا۔ وہ اپنی مری

بولی۔ "یقیناً تمہارا موڈ نہیں ہوگا۔" وہ گویا پورے وثوق سے کہہ رہا تھا جیسے مالا فوراً انکار ہی تو کرنے والی تھی۔ مالا کو اس سے ایسی صاف گوئی کی امید نہیں تھی۔ تبھی جوس کاشن پکڑ کر بولی۔

"میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔" اس کی حیرت سے باہر نکلی آنکھوں میں دیکھے بغیر اس نے آرام سے جوس پکڑ کر پینا شروع کر دیا تھا۔ آفاق نے مسکراہٹ دبا کر اپنی زنجیل میں پھر سے منہ دے دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک اور جوس کاشن نکالے منہ سے لگا کر گھونٹ، گھونٹ پی رہا تھا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" مالا کو جواب جاننے کی بے چینی تھی اور آفاق کو جوس پینا۔ فی الحال جواب دینے سے زیادہ ضروری لگ رہا تھا پھر جوس کاشن خالی کر کے ڈسٹ بن میں اچھالنے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"اگر ہم اپنے ملک میں بھی ایسی صفائی کا خیال رکھیں تو پاکستان جنت نہ بن جائے۔" آفاق درمیانے سائز کے ڈسٹ بن دیکھ کر خود کو ملامت کر رہا تھا اور پھر اچھی طرح خود کو اور اپنی عوام کو سننے کے بعد مالا کی بات کے متعلق سوچنے لگا۔

"ممکن تو نہیں، البتہ میری آنٹی (عیسیٰ کی ماما) کی خواہش تھی سوزن ان کی بہو بنے۔" آفاق کچھ سوچ، سوچ کر بول رہا تھا۔ یہ باتیں خاصی پرانی تھیں مگر آفاق کو پھر بھی پتا تھا۔ یقیناً وہ گروسی کے گھر میں ایک فرد کی طرح رہتے ہوئے بہت کچھ جان گیا تھا۔

"تو پھر؟" مالا کی آنکھوں میں بے چینی اتر آئی تھی۔ "پھر یہ کہ میری آنٹی اور عیسیٰ کی یہ بھی خواہش تھی کہ اگر سوزن اسلام قبول کر لے ویسے میں نے یہ بھی سنا تھا عیسیٰ، سوزن سے رشتے پر تیار نہیں تھا۔ مطلب وہ سوزی کے لیے ایسے جذبات نہیں رکھتا تھا کہ اس سے شادی کر لیتا۔" آفاق نے اس کی... بے چینی محسوس کیے بغیر سادگی سے بتا دیا تھا۔ مالا کے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں نہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڑیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور ایچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کی کاپی رائٹ، کپی رائٹ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفیری انکس، انکس کو میسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

مگر آفاق کا جواب قطعاً مختلف تھا۔
 ”میں تمہیں من ہائیم تک چھوڑنے آیا
 کسی اور بس یا ٹرین سے فوراً ہی واپس چلا جا
 گا۔“ آفاق کے سادگی سے بتانے پر مالا اس
 احسان مند ہو گئی تھی یعنی وہ اپنا تمام کام، مصروف
 چھوڑ کر آیا تھا۔ مالا کے دل میں اس کی جگہ بن
 گئی۔ اچھے لوگ خود بخود دلوں میں اپنی جگہ
 کرتے تھے۔ آفاق بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔
 کچھ ہی دیر بعد ٹرین اپنے مقررہ وقت
 اسٹیشن کی حدود میں رک گئی تھی۔ آفاق نے دور
 ہی عیسیٰ کو دیکھ کر آواز لگادی تھی۔ پاکستانی کہیں
 چلیں جائیں۔ خود کو بدل نہیں سکتے۔ ایک مصروف
 اسٹیشن پر ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں بھی ذرا
 شور مچانے یا بدظنی نہیں تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آفاق
 کی اونچی چکار نے بہت سارے لوگوں کو ان
 طرف متوجہ کر دیا تھا مگر وہ ڈھٹائی سے بولتا، مسکرا
 کھٹکھٹاتا عیسیٰ سے بھینچ بھینچ کر مل رہا تھا۔ وہ حد
 زیادہ بے تکلف قسم کا لڑکا تھا جبکہ عیسیٰ اس اتفاق
 ایک دم بوکھلا گیا تھا پھر کچھ دیر بعد سنبھلنے کا موقع
 ہی عیسیٰ نے آفاق کا شکریہ ادا کیا تھا اور آفاق
 ٹوٹی پھوٹی ڈچ میں جانے عیسیٰ سے کیا کچھ کہہ
 تھا۔ آفاق کو رخصت کرنے کے بعد عیسیٰ اس
 طرف متوجہ ہوا تھا جو آفاق کے محبت بھرے ڈالہا
 مظاہروں پر دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی۔
 ”یہ ایسا ہی ہے۔۔۔ تم حیران
 ہونا۔۔۔ جہاں موقع ملتا ہے میرے ساتھ ڈچ بولنے
 کی پریکٹس کرتا ہے۔“ عیسیٰ نے مسکراتے ہوئے
 کا بیگ پکڑا اور اس کے برابر چلنے لگا۔ ”تمہارا
 ساتھ ڈچ بول کر ڈیجیٹس تو نہیں مارتا رہا؟“ اچانک
 خیال آنے پر عیسیٰ نے مسکرا کر پوچھا تھا۔ مالا اس
 برابر چلتی ہوئی نفی میں سر ہلانے لگی۔
 ”میرے ساتھ تو پنجابی اور اردو میں

خاص قسم کی اہمیت تھی۔ کوئی بھی بندہ اس سے
 رکھائی یا غیریت برت ہی نہیں سکتا تھا۔ سوزن نے
 ٹھیک کہا تھا، آفاق قطعاً بے ضرر قسم کا بندہ تھا۔
 پُر خلوص، سادہ اور انتہائی باتوئی۔۔۔۔۔۔ مالا کو آفاق سے
 بات کر کے بہت ساری ایسی باتوں کا بھی پتا چلا تھا جو
 عام حالات میں عیسیٰ ہرگز اسے نہ بتاتا۔ اگرچہ وہ
 فطرتاً ہی گہرائی میں اترنے والی کھوجی قسم کی لڑکی
 نہیں تھی مگر پھر بھی ایک ہلکا سا تجسس نما مادہ ضرور
 اپنے اندر رکھتی تھی سوائی تجسس کے تحت وہ مون کے
 رویے کی ابھی گہروں کے بارے میں بھی جاننے
 کے لیے تجسس تھی۔ اگرچہ آفاق نے اسے پرت در
 پرت رویہ رکھنے والی مون کے متعلق دلچسپی رکھنے
 سے منع کیا تھا مگر مالا کنویں میں سے مٹی نکالنے کو۔۔۔
 بے تاب ضرور ہو گئی تھی۔
 نی الوقت آفاق، مالا کی بات سن کر کورنش
 بجالایا تھا۔ مالا کی تعریف نے اسے بواریا کے سیوتی
 پھولوں کی طرح مہکا دیا تھا۔ وہ اپنی تعریف پر بہت
 خوش نظر آیا پھر اس نے اپنے لیدر بیگ میں سے ایک
 چاکلیٹ نکال کر مالا کی طرف بڑھائی۔
 ”اسی بات پر منہ میٹھا کریں۔“ آفاق خود
 کینڈی کارپیر چھاڑ کر منہ میں رکھ رہا تھا۔ وہ بچوں
 جیسی سرخوشی کے ساتھ دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا۔
 ”کیا یہ تعریف تم نے دل سے کی ہے؟“ آفاق نے
 کسی خدشے کے تحت ذرا خوف زدہ ہو کر پوچھا تھا۔
 مالا نے فوراً شد و مد سے سر ہلایا۔
 ”ہاں، دل سے۔“ اس کے جواب نے آفاق
 کو اور بھی خوش کر دیا تھا پھر اس نے اپنی رسٹ وایج
 پر نگاہ ڈال کر مالا کو الٹ کر دیا تھا کہ وہ اترنے کے
 لیے تیار ہو جائے۔ مالا نے اپنا چھوٹا سا بیگ گود میں
 رکھ لیا تھا پھر آفاق کو مخاطب کر کے بولی۔
 ”کیا تم من ہائیم میں ہی رکو گے؟“ مالا سوچ
 رہی تھی شاید وہ اپنے بھی کسی کام کے سلسلے میں آیا ہوگا

”ایک مرتبہ پھر اسی طرح بولوناں کئی کیوٹ لگ رہی ہوتی، روٹھی روٹھی سی۔“ عیسیٰ نے بڑی محبت سے اصرار کیا تھا۔ مالا بجائے کچھ بولنے کے۔۔۔ بے ساختہ ہنس پڑی اور اسے مسکراتا دیکھ کر عیسیٰ بھی ہنسنے لگا تھا پھر کچھ دیر مزید بلاوجہ ہنسنے کے بعد عیسیٰ نے کس قدر حسرت سے کہا تھا بلکہ اتنے عرصے کے دوران پہلی مرتبہ ایک عجیب بات کہی تھی۔

”پتا ہے، میری بڑی خواہش تھی مون کے ساتھ میری اچھی فرینڈ شپ ہو سکے۔ وہ ڈھیروں کے حساب سے ہنستی رہے۔ مجھ سے فرمائشیں کرے، کبھی روٹھ جائے، کبھی مان جائے، کبھی ہنسے، کبھی روئے، ہم مل کر آؤنگ پر پورا جرمنی گھومیں مگر میری یہ خواہش کبھی نہیں پوری ہو سکی تھی، مجھے فطری طور پر ایک عجیب بہن ملی ہے جو غیر معمولی ذہن رکھنے والی، بہت عجیب سی لڑکی تھی، آوم بیزار قسم کی۔ جب تک ممانہیں سب ٹھیک رہا مگر ماما کے چلے جانے کے بعد اس کی شخصیت میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ وہ مجھ سے اور پاپا سے ہمیشہ دور رہی تھی مگر ماما کی وفات کے بعد گویا صدیوں کی دوریاں درمیان میں حائل ہو گئیں۔ وہ پھر کبھی ہمارے قریب آئی نہ سکی۔“ عیسیٰ کا حسرت زدہ لہجہ گہرے کرب میں ڈوب گیا تھا۔ جانے کس جذباتی لمحے اس نے مالا سے مون کا رویہ شیئر کر لیا تھا ورنہ وہ بہت گہرا سا بندہ تھا۔ اتنی جلدی کھلنے والا نہیں تھا اور اسے شاید اپنے دکھوں کی تشہیر بھی پسند نہیں تھی حالانکہ اپنوں سے دل کی باتیں کرنا اپنا نیت کو مزید بڑھا دیتا ہے مگر عیسیٰ کے اس معاملے میں اصول کچھ اور قسم کے تھے۔ وہ سمجھتا تھا جو پریشانی، دکھ یا تکلیف اس کا اکیلا وجود سہہ سکتا ہے پھر وہ اپنے پیاروں کو کیونکر اس تکلیف میں حصے دار بنائے۔ اس نے ہمیشہ اپنی تکلیف، دکھ یا کسی بھی قسم کی پریشانی کو خود اپنے تک ہی محدود رکھا تھا اور وہ اپنے اس اصول پر بہت مطمئن بھی تھا۔

کر رہا تھا۔“ مالا نے بھی مسکرا کر وضاحت کی تھی تب علی عیسیٰ اسے آفاق کے متعلق بتانے لگا تھا۔ ”پہلے یہ بولنے سے گھبراتا تھا، آفاق کہتا تھا اسے کبھی یہ اونچی بولگی زبان نہیں آ سکتی مگر اب اچھا خاصا ایکسپرت ہو چکا ہے۔ عمو ماراہ کیروں سے بھی علیک سلیک کر لیتا ہے۔ اسے زبان و بیان پر عبور حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ ڈیج بولنے کا یہی ایک طریقہ سمجھ میں آیا ہے۔“ عیسیٰ اسے تفصیلاً بتاتا اپنی لاڈلی benz تک لے آیا تھا۔ اس کا سامان رکھ کر وہ مالا کے لیے فرنٹ ڈور کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”اسی لیے تو کہتا ہوں، تم بھی روزمرہ کے جملوں پر غور کیا کرو، ٹی وی دیکھتے ہوئے، میوزک سنتے ہوئے، شاپنگ کرتے ہوئے، مجھے امید ہے تم بھی جلد ہی یہاں کی زبان سیکھ جاؤ گی۔ جہاں رہنا ہو، وہاں کی زبان ضرور سیکھنی چاہیے۔“ عیسیٰ اسے نرمی سے بتا رہا تھا۔ تب مالا نے قدرے حلقی سے جواب دیا تھا۔

”نہ سلام دعا، نہ حال نہ احوال پوچھا آتے ساتھ گچ مچ سیکھنے پر لپکھ کر دینا شروع کر دیا۔ مجھے نہیں آ سکتی یہ فضول قسم کی زبان۔“ مالا کے بے تکلفی بھرے روٹھے، روٹھے ناراض لہجے کو ملاحظہ کر کے عیسیٰ بے ساختہ حیرت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ گرون موڑے بڑے ہی شگفتہ تاثرات کے ساتھ مالا کے پھولے، پھولے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور ہنسی تھی کہ اس کے لبوں پر پھول مہکائے جا رہی تھی۔ اسے۔۔۔ بے ساختہ ہنسنے دیکھ کر مالا کا منہ کچھ اور پھول گیا تھا۔

”اس طرح کیوں ہنس رہے ہیں؟ میرے منہ پر کیا لطیفہ لکھا ہے؟“ مالا کچھ چڑکھائی سے بولی تھی حالانکہ یہ خفگی قطعاً مصنوعی تھی۔ اسے علی عیسیٰ کو ہنستا دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا اور پھر وہ خاص الخاص مالا کے لیے ہی تو ہنس رہا تھا۔ اسی کی باتوں کو انجوائے کرتا مسکرا رہا تھا۔

فی الحال وہ مزید مون کے بارے میں گفتگو سے اجتناب کرتے ہوئے ذرا ہلکے پھلکے خوشگوار لہجے میں کہہ رہا تھا۔ دراصل اسے فوری طور پر احساس ہوا تھا کہ اس نے مون کا ذکر بالکل بھی ٹھیک وقت پر نہیں چھیڑا تھا۔ یہ معاملہ کچھ ایسا تھا کہ مالا اس پر سوال بھی اٹھا سکتی تھی مگر عیسیٰ نے الوقت اس کے کسی بھی سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھا سو گفتگو بدلتے ہوئے ذرا چھیڑنے والے انداز میں بولا۔

”تو جناب! اب بتائیں کیا حال احوال ہے آپ جناب کا۔ بڑے عرصے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ شاید تین یا چار سو سال بعد..... اس دوران ایک مرتبہ بھی خط کتابت پر رابطہ نہیں ہو سکا۔ نہ آپ نے کوئی ٹیلی فون کیا، نہ مجھے فون کال کرنے کی فرصت مل سکی۔“ علی عیسیٰ کی کھلکھلاتی مسکراہٹ نے مالا کی ہنسی کے سرگامی میں بکھیر دیے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر تک ہنستی رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں شفاف پانی کی ٹھنی مٹی بوندوں سے لبالب بھر گئیں۔

”آپ بھی کمال کے بندے ہیں۔“ مالا بہ مشکل ہنسی روک کر بول سکی تھی۔

”کہاں مجھ میں کمال رکھا ہے..... ایک پر وہ سا ڈال رکھا ہے۔“ عیسیٰ کچھ شاعرانہ موڈ بنا کر بولا تھا۔

”تو کیا شاعری سے بھی شغف ہے؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

”جی، کیوں نہیں آپ کچھ سننا پسند فرمائیں گی؟“ علی عیسیٰ گویا نہال ہو گیا تھا۔ اسے مالا کے چھوٹے، چھوٹے سوال بہت پسند تھے۔ اسے مالا کا بولنا، ہنسنا اور ہنسنے چہنٹے آنکھوں میں پانی بھر آنا بہت پسند تھا۔ علی عیسیٰ کو لگتا تھا، پاپا اس کے لیے پاکستان سے دنیا کا حسین ترین تحفہ اٹھالائے تھے اگرچہ وہ خوب صورت تھی مگر ایسی حسین بھی نہ تھی کہ عیسیٰ دیوانہ ہوا تھا۔ یہ تو اس کے چہرے کی ملاحظہ، سادگی اور

معصومیت تھی جس نے پہلی نگاہ میں علی عیسیٰ کو اپنا کر لیا تھا اور نہ بوار یا کی عورتوں سے بڑھ کر پورے خطے میں کوئی حسین عورت نہ تھی۔ صحت مند، دلکش حسین اور انتہائی ہنس مکھ.....

”یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ یوں فضا مہکی کے بدلا میرے ہم راز کا رنگ“ علی عیسیٰ نے فوراً ہی اس کی فرمائش پوری کر دی تھی۔

”سایہ چشم میں حیراں رخ روشن کا جمال سرخی لب میں پریشاں تری آواز کا رنگ“

من ہائیک کے سارے تالابوں پر سفید مرغابیاں اتر آئی تھیں۔ سنہری پریوں نے من ہائیک کے دیوتا کی پچارن کو دیکھ کر رقص کرنا شروع کر دیا تھا۔ تتلیاں رنگ بدل رہی تھیں، اکسوں کے موتی بکھر رہے تھے یا قوت کی بوندیں گر رہی تھیں۔

”بے پیے ہوں اگر لطف کرو آخر شب شیشہ سے میں ڈھلے صبح کے آغاز کا رنگ“ علی عیسیٰ کی انگلیاں اسٹیرنگ ڈھیل پر حرکت رہی تھیں۔ وہ بن پے ایک نئے، ایک سرور میں تھا۔ جیسے بلوریں فجائوں میں انگوکارس قطرہ قطرہ، بوند بوند گر رہا تھا۔

”اک سخن اور کہ پھر رنگِ تکلم تیرا حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ“ فضا نے سانس روک لی تھی اور ہون مونس کے جنگل میں مورنیوں نے باجماعت عشقیہ سلام پڑھے تھے۔ اس کا دل diskothek جرمین پب کی طرح کا ایک حیرت کدہ تھا جس میں دل کے سازوں کی موسیقی برابر جیتی چلی جا رہی تھی۔ کبھی نہ رکنے کے لیے، کبھی نہ تھمنے کے لیے۔ یہ قرین (سورج اور چاند) کے طمن کی خوشی میں سنگیت چھیڑے گئے تھے۔ یہ دلوں کے قلیب (کنویں) میں محبت کے معجزاتی چشمے پھوٹ پڑنے کے اعزاز میں سر بکھر رہے تھے اور فیمس (سمندر) میں طوفانی گرم

جوش لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ یہ فردوس کے جلوے تھے جواہر زمیں کو معتبر کر رہے تھے۔

benz کی بھینی مہک والی فضا کا ظلم بھی بالآخر ٹوٹ گیا تھا۔ علی عیسیٰ کے خاموش ہونٹ اس ظلم کو پاش پاش کر چکے تھے۔ مالا کو لگا وہ کسی خواب کی میٹھی نیند سے اچانک بیدار کر دی گئی ہے۔ اس نے کچی نیند سے بھری گلابی آنکھوں سے علی عیسیٰ کا مسکراتا چہرہ دیکھا تھا۔

”کیسی لگی یہ مدھوش کن غزل؟“ علی عیسیٰ نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”میں حیران ہوں اور کچھ محروم بھی۔“ اس نے بنا جبک کے پہلی ہی خواب آگئیں کیفیت میں کہا۔

”کس لیے؟“ عیسیٰ کو اچنبھا ہوا۔

”فیض کی غزل کے لیے۔“ مالا مسکرائی تھی۔

عیسیٰ نے گہری سانس خارج کی۔

”کیا مجھے فیض کی غزل یاد نہیں ہو سکتی؟“ اس نے آنکھیں میچ کر پوچھا۔

”امید تو نہیں تھی مگر.....“ مالا نے نچلا لب دانٹوں میں دبا کر شرارتی لہجے میں کہا۔

”مگر.....؟“ عیسیٰ نے بھوئیں اچکائیں۔

اگرچہ وہ اس کی شرارت کو سمجھ رہا تھا تاہم جان بوجھ کر اسے بولنے کے لیے اکسانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”مگر آپ نے حیران کر دیا۔“ مالا کے ساتھ عیسیٰ بھی گہری سانس لے کر مسکرا دیا پھر سامنے اشارہ کر کے بولا۔

”میڈم مالا، گھر آ چکا ہے۔“ اس نے احتیاط سے موڑ کاٹ..... کر انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ benz کو کیراج میں لا کھڑا کیا تھا اور مالا اپنے گھر کی جنت میں پہنچ کر گویا شانت ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”مالے! تم تو مجھے بھول ہی گئیں۔“ یہ چاچو کی آواز تھی بالکل ڈیڈی سے مشابہ آج کتنے عرصے بعد

کسی نے اسے ڈیڈی کے سے انداز میں مالے کہہ کر پکارا تھا۔ شاید چاچو نے تازہ ترین ڈیڈی کے منہ سے مالے سنا تھا پھر اس کے خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ڈیڈی، بندی اور مٹی کی کتنی ہی فون کالز آئی تھیں۔ اس کے بوار یا سے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی ڈیڈی کا فون آیا تھا۔ وہ اپنی مالے کے لیے شدید اداس تھے اور مالا نے سب سے پہلے پاکستان اپنے گھر والوں سے فون پر بات کی تھی اور اب کھانے کی میز پر چاچو کی بے قراریاں ملاحظہ کر رہی تھی۔ عیسیٰ کو بھی چاچو کا طرزِ مخاطب یعنی ”مالے“ بہت پسند آیا تھا اور وہ کتنی ہی ٹیٹھی نظر سے دیکھتا دھیرے دھیرے زیر لب بڑبڑایا تھا۔

”مالے۔“ اس کی بڑبڑاہٹ اتنی اونچی ضرور تھی کہ برابر بیٹھی مالا اور اس کے دوسری طرف سربراہی کرسی پر بیٹھے چاچو بھی سن لیتے۔ جہاں مالا اس شہد آگئیں طرزِ مخاطب پر گڑبڑاتی تھی وہیں چاچو نے علی عیسیٰ کی گت بنا دی تھی۔

”آلام فرتر کے مصنف گوئے کی شارلوت کے عاشق! مالے صرف ہماری ہے۔ تم اپنے لیے کوئی اور رنگ نیم سوچ لو۔“ جس طرح چاچو نے اس کی بڑبڑاہٹ سن کر آڈے ہاتھوں لینے کے بعد بڑا میٹھا طنز کیا تھا وہیں مالا کو علی عیسیٰ کی ایک پرانی بات یاد آئی تھی جس کو بتاتے ہوئے علی عیسیٰ نے کہا تھا کہ ہم دونوں باپ بیٹا خاصے منہ پھٹ ہیں اور مالا کو یقین تو پہلے بھی آچکا تھا اب کچھ اور یقین ہو چلا تھا۔ مالا جہاں چاچو کی لطیف گفتگو پر جھینپ رہی تھی وہیں علی عیسیٰ نے زوردار قسم کا قہقہہ لگایا تھا۔

”آں..... ہاں، آپ غلطی کر رہے ہیں پاپا۔ میں گوئے کی شارلوت کا عاشق نہیں جسٹ ایک فین ہوں اور ویسے بھی گوئے جیسا دل پھینک نہیں ہوں۔“ وہ احتجاجا چیخا تھا۔

”جو بھی ہو، ایک بات یاد رکھنا مالے! یہ صرف ہمارا حق ہے۔“ حسیب چاچو اسے سخت قسم کی

خوابوں جیسی باتیں

بھولی لڑکی

مت اس خواب کے پیچھے بھاگو

پتھر بن کے رہ جاؤ گی

تیز بہت ہے وقت کا دریا

تم بھی اس میں بہہ جاؤ گی

نشر جیسی یہ رسوائی

بولو، کیسے سہہ پاؤ گی

کیا بچوں جیسی باتوں سے

تم سب کو بہلا سکتی ہو؟

کیا تم اپنے من کی منطق

دنیا کو سمجھا سکتی ہو؟

خوابوں جیسی باتیں کر کے

کیا تعبیریں پاسکتی ہو؟

جس گھر میں پروان چڑھیں تم

اس کو چھوڑ کر آ سکتی ہو؟

ایسی باتیں ناممکن ہیں

تم اپنی تنہائی میں

بھر کے گیت ہی گاسکتی ہو

از: سیمارضاردا، کراچی

یہ حقیقت بہت مشکل مرحلہ تھا مگر مالا کو یہ سب کرنا ہی تھی۔ اپنے لیے نہیں..... محض علی عیسیٰ کے لیے۔

یہاں قریب ہی ایک ٹائز شو لے بھی تھا یعنی ڈانس سکھانے والا اسکول۔ مالا کے گھر سے کچھ

فاصلے پر ہی تھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے بچے اپنی

ماؤں کے ساتھ آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔ مالا کو

بچوں کے ساتھ خصوصی لگاؤ تھا مگر وہ ان بچوں کو

مخاطب نہیں کر سکتی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ آتے اور جاتے

وہ اسے کئی دفعہ کلیمز اور کنسرٹس، فیشن شوں بھی

دکھانے لایا تھا۔ ایک مرتبہ سینما میں مووی بھی دیکھی

تھی۔ جسے سمجھنے کے لیے اسے پورا ایک سال بھی لگ

جاتا تب بھی سمجھ نہ آتی۔ وہ یہاں کی مشہور جھیلوں کی

سیر کر کے بھی آئی تھی۔ مختلف پارکس اسٹورز،

شاہراہیں، گارڈنز چھان مارنے کے بعد ایک مرتبہ

پھر زندگی پر جمود طاری ہونے لگا تھا۔ محض اس وقت

تک، محض اتنی ہی دیر تک جب مردانہ بوٹوں کی

دھمک سنائی نہ دیتی۔ عیسیٰ کے آتے ہی زندگی کے

رنگ بدل جاتے تھے۔ مالا کا دل۔ گھڑی کی ٹک ٹک

کے ساتھ چلتا تھا۔ جہاں گھڑی آخت، نوٹن کے

ہند سے پہ آئی اس کا دل پتکھ لگا کر اڑنے لگتا تھا۔ وہ

سنہری ہندسوں پر نگاہ جما کر بیٹھ جاتی تھی۔

وہ ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے وقت سے

پہلے ہی گھر پہنچ جاتا تھا اور مالا کا بنا میک اپ، بنا ہار

سنسکار والا سادہ چہرہ اس کی نگاہوں میں عکس بنانے

لگتا۔ کچھ ایسے ہی محبت سے گندھے رشتے میں وہ

دونوں ہمیشہ کے لیے بندھ گئے تھے۔

علی عیسیٰ نے مالا کا ایڈمیشن ایک چھوٹے انسٹی

ٹیوٹ میں کروا دیا تھا۔ اسے مصروف رہنے کے لیے

ایک اور جواز مل گیا تھا۔ اب وہ گھر کے کاموں سے

فارغ ہو کر انسٹی ٹیوٹ چلی جاتی تھی حالانکہ جرمن

زبان سیکھنا کم از کم مالا کے لیے آسان نہیں تھا۔ اسے

پہلی کلاس میں پہلے جرمنی کے تعارف پر رونا آ گیا

تھا۔ وہ اگلے دس دن تک بھی یہ ملک جرمنی ہے کو صحیح

جرمن تلفظ کے ساتھ ادا نہیں کر سکتی تھی۔

”یہ ملک جرمنی ہے اور میں پاکستانی ہوں۔“

ٹیچر فرولائن ایکس کی ہزار مرتبہ بتائی ایک لائن کو بھی

مالا ٹھیک سے بول نہیں پاتی تھی تب اسے رونا

آ جاتا۔ عیسیٰ کہتا تھا وہ سیکھنا چاہے تو سیکھ سکتی ہے مگر

مالا کو یہ کام انتہائی مشکل لگتا تھا۔ وہ گھر آ کر ننھی کے

ساتھ ایک ایک لائن کی سیکڑوں مرتبہ مشق کرتی تھی۔

رکھنے تک سب چھوٹے بڑے کام خود کرتی تھی۔

چاچو نے کہا تھا اب وہ اس گھر کی ہاؤس فراڈ ہے۔ یہ

گھر مالا کا ہے سوائے اپنے گھر اور گھر والوں کا خود

ہی خیال رکھنا تھا۔ ننھی اب بھی صفائی ستھرائی کے

لیے آتی تھی مگر اس کا کام بہت مختصر ہو گیا تھا۔

علی عیسیٰ کے کپڑوں سے لے کر چاچو کا لباس

تیار کرنے تک مالا بہت دل جمعی سے دھیان رکھتی

بڑی محبت سے کپڑے پر پس کرتی، الماریوں

میں لٹکانی حالانکہ چاچو اور علی عیسیٰ منع بھی کرتے تھے

مگر مالا کو یہ مصروفیت دل و جان سے بے حد پسند

تھی..... اور جہاں اس کے لباس کی بات آتی

تھی وہیں عیسیٰ ہمیشہ خود اس کے لیے کپڑے منتخب

کرتا۔ اسے کون سا لباس سوٹ کرتا تھا، اسے کیسے

کپڑے پہننے چاہیے اور یہاں آج کل کیسا فیشن چل

رہا تھا! عیسیٰ کی انفارمیشن اس حوالے سے بہت اب

ڈیٹ تھیں۔ وہ اس کے لیے خوب شاؤنگ کرتا، اکثر

اسے آؤٹنگ پر لے جاتا۔ بعض ایسی جگہوں پر جہاں

ہنگامے، شور کی وجہ سے وہ خود جانا پسند نہیں کرتا تھا مگر

اسے لگتا تھا مالا ہنگاموں اور شور و غل کو بہت پسند کرتی

ہے حالانکہ وہ پہلے ایسی نہیں تھی مگر یہاں آ کر اکثر گھر

کی خاموشی سے گھبرا جاتی تھی۔ اپنے گھر میں اس کی

چھوٹی بہن بندیا اور شامی بہت ہنگامہ مچائے رکھتے

تھے۔ ذیشان اور ذی شاہ مزاج مختلف تھے مگر بندیا اور

شامی کی موجودگی میں ان کے گھر ہمہ وقت ہنگامہ

مچا رہتا تھا۔ سو یہاں کے سنائے اکثر اسے پریشان

کر دیتے تھے۔ خصوصاً جب چاچو آرام کر رہے ہوتے

تھے تب ننھی اخبار پڑھتی یا پی وی دیکھتی۔ مالا اس کی

بات سمجھ نہیں سکتی تھی اور رات تک خاموش رہ، رہ کر

اس پر اکتاہٹ سوار ہو جاتی۔ گھر میں اتنا کام نہیں ہوتا

تھا۔ بس پاکستان فون کالز کرتی یا بے مقصد پی وی کو

گھورے جاتی۔ ہاں، جب عیسیٰ گھر آ جاتا تھا تب گویا

زندگی پھر سے دھڑک جاتی تھی۔

چڑچڑاہٹ میں مبتلا کر رہے تھے اور وہ بری طرح چڑ

بھی رہا تھا۔

”آپ بھی یاد رکھیے، مالے صرف میری

ہے۔“ دونوں باپ بیٹا حد سے زیادہ جذباتی تھے۔

اب بھی علی عیسیٰ نے جذباتی پن کی انتہا کر دی تھی۔

مالا اس نوک جھوک سے محفوظ کیا ہوئی الٹا شرمندہ

ہوئے جارہی تھی۔ چاچو کی موجودگی میں علی عیسیٰ کے

بے باک جملے اسے بے حد شرم دل رہے تھے۔

”اچھا، اچھا..... حوصلہ کرو۔“ اب جان بوجھ

کے چاچو اسے پچکار رہے تھے۔ اسی دل فریب نوک

جھوک اور خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا تھا پھر ننھی

کانی بنا لائی تھیں کانی کا طویل تر دور چلا تھا۔ ان

دونوں باپ، بیٹے نے کانی کے بعد گرین ٹی بھی پی

تھی پھر آخری مرتبہ اٹھنے سے پہلے قہوہ بھی مالا سے

بنوا کر پیا۔ اس دوران انہوں نے دنیا جہان کی باتیں

کر لی تھیں۔ آفیشل گفتگو کے علاوہ گھریلو، سیاسی،

سماجی ہر قسم کا موضوع زیر بحث لائے تھے۔ گروسی

کے گھر سے لے کر یہاں تک مالا سے بھی چیدہ، چیدہ

باتیں پوچھی تھیں پھر عیسیٰ نے چاچو کو دوا کھلائی اور

انہیں کمرے تک چھوڑنے چلا گیا۔

مالا نے اگلے بہت سارے دنوں میں بہت سی

باتیں نوٹ کی تھیں۔ سب سے پہلے یہ کہ عیسیٰ کو چاچو

سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ ان کا خیال اپنے ہر

ضروری کام کو ادھورا چھوڑ کر بھی رکھتا تھا۔ چاچو کی

بہترین خوراک، جوسز، دودھ، فروٹس وہ ان کا

ڈائنٹ چارٹ بنا کر گھر سے لگتا۔ کس وقت انہیں

جوس دینا ہے، دودھ دینا ہے یا ٹھوس غذا دینی ہے۔

اس طرح ان کی صبح، دوپہر اور شام والی دوا میں بھی

الگ، الگ رکھ کے جاتا تھا بعد میں ننھی وقت پر سب

کچھ ایک روٹین کے مطابق دے دیتیں مگر اب مالا

نے یہ ساری ذمے داری غیر محسوس طریقے سے

سنجھال لی تھی۔ وہ کوئنگ سے لے کر چاچو کا خیال

بھج رہا تھا۔

دل چاہ رہا تھا وہ نعلی گینوں سے سجا برہ سلیٹ اٹھا کر اس چرب زبان، شاطر لڑکے کے منہ پر مار آئے اور ایسی بے نقط سنا کر آئے کہ اپنی ساری تیزی طراری اور چرب زبانی بھول جائے۔ اس کے دل میں آفاق کے خلاف کچھ ایسا ہی غصہ اور نفرت ابھر رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کوئی تیزاب سے بھری بوتل ہو تو مالا متاج کی پروا کئے بغیر اس کے منہ پر الٹ آئے۔ آفاق نے مالا کو تھوچ کر کچھ ایسا ہی گناہ تو کیا تھا حالانکہ یورپ میں تحائف کے لین دین کو بہت اچھا سمجھا جاتا تھا اور گفٹ دے کر یا لے کر کوئی غلط قسم کا خیال یا وسوسہ بھی دل میں نہیں پنپتا تھا مگر مالا جس معاشرے سے آئی تھی جس وطن سے تعلق رکھتی تھی یا جس سوسائٹی سے اٹھ کر آئی تھی وہاں انجان لوگوں کی طرف سے ملنے والے خفے کیسی، کیسی قیامت ڈھا دیتے ہیں۔ وہ گفٹ لینے اور دینے کے معاملے میں بہت محتاط تھی۔ اس کی کوئی غیر ضروری سہیلیاں بھی نہیں تھیں۔ یہاں پر بھی وہ صرف سوزن کے ساتھ دوستانہ جوڑنے کی خواہش مند تھی مگر یہ آفاق نہ جانے بچ میں کہاں سے ٹپک آیا تھا۔ محض چار گھنٹے کے سفر کا فائدہ اٹھا کر اپنی چرب زبانی کا مظاہرہ کر کے مالا کی ذہنی سطح پر مثبت تاثر چھوڑنے کے بعد اب جانے کیسے تعلقات بحال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تو شرارے پھوٹنے لگے تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ آفاق کا منہ طمانچوں سے رنگ دے مگر وہ اپنے کسی بھی ارادے کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتی تھی۔ اس وقت صورت حال بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ مالا کو اپنا آپ انتہائی کمتر لگ رہا تھا۔ بھلا اس کے بارے میں حبیب چاچو کیا سوچے؟ علی عیسیٰ کے دل میں کس قسم کے خیال آسکتے تھے؟ وہ ایسی کردار کی ہلکی یا مرووں سے فری ہونے والی تھی جو چار پانچ گھنٹے کے سفر میں ایک غیر مروت سے دوستانہ جوڑ چکی تھی جس

گفٹ۔ تم بوار یا آئیں اور چلی گئیں مگر تمہاری یادیں کبھی مٹ نہ پائیں گی۔“ مالا سے سلب کے نیچے لکھا نام پڑھا نہ گیا تھا کیونکہ سلب عیسیٰ نے محتاط سے انداز میں بے ساختہ مالا کے ہاتھ سے اچک لی تھی۔ مالا کو لگا اس کا ذہن ایک دم گول، گول گھومنے لگا ہے۔ ”کیا کچھ غلط ہونے والا تھا؟“ مالا کا چڑیا جتنا دل سہم، سہم گیا۔ ایک خوف کی بھیا نک لہر تھی جس نے مالا کو کپکپا کر رکھ دیا تھا۔ چکنی خوب صورت سلب اسے کسی اڑوھے کے مانند لگ رہی تھی اور مون کی نگاہوں میں شارک جیسی شکاری تیز لپک اس کے وجود میں آر پار ہو رہی تھی۔ ”کیا ہونے والا تھا؟ اور کیوں ہونے والا تھا؟ کیا ضروری تھا بوار یا کے چھوٹے سے قصبے میں رہنے والا کوئی بھی فرد اسے پارسل بھیجتا؟ ابھی چند دن پہلے ہی تو وہ بوار یا سے آئی تھی پھر کسے اس کی یاد اس قدر شدت سے آئی، جس نے گھر کے پتے پر گفٹ بھیج دیا تھا اور پھر اس چکنی بھیا نک سلب پر لکھے الفاظ ”تم بوار یا آئیں اور چلی گئیں مگر تمہاری یادیں کبھی مٹ نہ پائیں گی۔“ مالا کی گویا سانسیں رکنے لگی تھیں۔ ان الفاظ کے نیچے بھلا کس کا نام ہو سکتا تھا؟ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھا گیا۔ ”سوزن؟ تانتے؟ گردی مگر ان لوگوں کو گفٹ بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر بھلا پارسل بھیجنے والا کون تھا؟ جس کی طرف مالا کی چھٹی حس اشارہ کر رہی تھی وہ اس کے بارے میں کم از کم اس کنڈیشن میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ آفاق؟“ اس کا دل خوف کے عالم میں پھڑپھڑانے لگا اور جسم سے گویا جان نکلنے کے قریب تھی۔ یہ نام اس کے لیے اب اجنبی نہیں تھا۔ وہ آفاق کو اتنا جان گئی تھی جتنا کسی بھی اجنبی کو جانا ضروری تھا مگر سوال تو یہ تھا کہ آفاق نے اسے تحفہ کیوں بھیجا۔ آفاق کی بھلا ایسی جرات کیوں ہوئی؟ اس کا آفاق سے رشتہ ہی کیا تھا جو وہ اتنی دیدہ دلیری سے اسے گفٹ

کرنا نہیں چاہتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ بھیکتی ہوئی مہکی ہوئی یہ انوکھی شام ان کے خوب صورت گھر میں اتر آئی تھی۔ مالا نے آج تانتے کی وی ہوئی خوب صورت روک پہنی تھی۔ آج اس نے خوب دل سے میک اپ بھی کر رکھا تھا پھر چاچو نے اس کی خوب تعریف بھی کی۔ وہ آج ایک مکمل ہاؤس فراؤ لگ رہی تھی۔ ننی کے تعریفی جملے اور پھر علی عیسیٰ کی میٹھی نگاہوں نے مالا کو بتا دیا تھا کہ آج کی محنت وصول ہو گئی ہے۔ کچھ دیر بعد مون بھی چلی آئی۔ ریشمی سلک کا لمبا فراک پہنے، وہ نزاکت، وہی حسن، وہی دلکشی کے ساتھ غرور سے تنی گردن، اس کے بلونڈ۔۔۔ (سنہرے بال) آج بھی کھلے تھے۔ نیچے سے کھلے اور اوپر گینوں سے سجی پونی میں جکڑے۔ سر پہ تاج نما کلب بالوں میں کھسپا ہوا تھا۔ یہ کراؤن اس کے غرور کو کچھ اور واضح کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں آج بھی جھکی تھیں۔ عجیب تر آنکھیں اور حسین تر آنکھیں۔ ہمیشہ کی طرح مالا کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ آج علی عیسیٰ بھی بہت خوش تھا گویا اس کی فیملی آج کی شام مکمل ہو گئی تھی۔ یہ چھوٹا سا گھریلو فنکشن تھا۔ ایک کتنے کے بعد مالا اور ننی ڈنسر و کر رہی تھیں جب ایک اجنبی گھنٹی نے ان سب کو چونکا دیا تھا۔ علی عیسیٰ بڑی ترنگ کے عالم میں گیٹ تک گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہو گئی تھی۔ عیسیٰ کے ہاتھ میں ایک خوب صورت گفٹ پیک تھا۔ اس نے مالا کی طرف وہ پیکٹ بڑھا دیا۔ مالا کچھ حیران اور کچھ متوحش ہو رہی تھی بھلا عیسیٰ نے اسے پیکٹ کیوں پکڑا دیا تھا؟ اب سب کی نگاہیں خود پر جمی دیکھ کر مالا کو گفٹ پیک کھولنا پڑا تھا۔ پیکٹ میں سے ایک نعلی گینوں کا برہ سلیٹ نکلا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چکنی خوب صورت سلب بھی تھی۔ خالصتاً اردو میں لکھی گئی۔ ”پیاری میڈیشن مالا! تمہارے لیے حقیر سا

ہوئے اس کی واحد مصروفیت بس یہی تھی۔

شروع میں علی عیسیٰ اسے خود چھوڑنے اور لینے آتا تھا مگر اب وہ خود ہی پیدل آتی جاتی تھی۔ انٹی ٹیوٹ چونکہ قریب ہی تھا۔ پہلے کچھ دن ننی ساتھ آ جاتی تھی مگر اب مالا۔۔۔ گو گھر کے راستے ازبر ہو چکے تھے۔ اس کی عادت تھی، وہ جس چیز کو سیکھتی، جس لفظ کو یاد کر لیتی اسے ڈائری میں لکھ لیتی تھی اور واپس آنے تک اسے ذہن میں ڈھراتی رہتی۔ مالا نے ابتدائی جملوں کے بعد ایک خاص قسم کا جملہ سیکھا تھا۔ ”اش لیے دن۔“ وہ اس جملے کی کئی مرتبہ مشق کرتی تھی تاکہ اسے بھولے نہیں۔ اسے ڈیج میں یہ لائن بولنا بہت پسند تھا۔ جس کے معنی تھے میں تم سے پیار کرتا ہوں یا تم سے پیار کرتی ہوں۔ مالا نے سوچ رکھا تھا جس دن عیسیٰ کا برتھ ڈے ہوگا وہ اسے کسی انوکھے طریقے سے وش کرے گی۔ وہ عیسیٰ کی سالگرہ کے دن کا شدت سے انتظار کر رہی تھی پھر یہ دن پورے تین ہفتوں بعد بالآخر آ ہی گیا تھا۔ اس نے اور حبیب چاچو نے پورا دن چپکے چپکے تیاری کرنے میں گزار دیا تھا۔ وہ دونوں عیسیٰ کو سر پر ابرو دینا چاہتے تھے۔ چاچو کی خواہش تھی کہ اس موقع پر مون بھی شامل ہو مگر مالا کو امید نہیں تھی کہ مون ان کی خوشیوں میں شریک ہوگی مگر وہ چاچو کو روکنا نہیں چاہتی تھی۔ چاچو نے خوشی، خوشی مون کو فون کال کی تھی پھر جانے اس نے کیا کہا تھا جو چاچو بے ساختہ خوش ہو گئے تھے۔ ان کی خوشی محسوس کر کے مالا کو اندازہ ہو گیا تھا مون نے یقیناً آنے کی ہامی بھر لی ہے۔ وہ اگرچہ حیران تھی کہ مون نے کیسے آنے کی ہامی بھر لی؟ مگر وہ اپنی حیرت چاچو پر واضح نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ بھی حقیقت تھی کہ مون کے آنے کا سن کر کہیں اندر اس کے دل میں خوف پنپنے لگا تھا لیکن وہ اپنے اس خوف کو بھی چاچو پر منکشف

نے چند ہی دن بعد۔۔۔ تجدید تعلقات کے لیے پہلا وفد بھیج دیا تھا؟ مالا کا شرم کے مارے برا حال تھا۔ ایک لمحے میں جانے اس پر کیسی، کیسی قیامتیں گزر گئی تھیں۔ شاید سے بدلنے والا تھا اور اس پر مہربان ہوئی تقدیر اپنا پانسہ الٹ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی مکھیں ایسی طاقت ور نہیں تھیں جو بدلتے سے کی نبض جان جاتیں۔ زندگی مالا فو الفقار پر شاید تنگ ہونے والی تھی مگر جانے کیسے اس کی سماعتوں نے کچھ ایسا سنا جو اس کی سوچوں سے قطعاً الگ اور انوکھا تھا۔ وہ حیرت سے منجمد ہوتی حسیب چاچو کو ٹکڑے ٹکڑے دیکھنے لگی۔ حسیب چاچو یہ کیا بول رہے تھے؟ یا مالا کے وجود میں نئی روح پھونک رہے تھے یا سانس کھینچ رہے تھے۔

”تمہارا اس شہر میں کون سا ایسا دوست ہے جس نے تمہیں برتھ ڈے گفٹ بھیج دیا؟“ چاچو بہت حیرانی کے عالم میں علی عیسیٰ سے مخاطب تھے اور مالا کو لگا تھا اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہے۔ جانے اب علی عیسیٰ کون سا جواب دینے والا تھا؟ مالا ابھی تک سن کھڑی تھی۔

”یہ عورتوں والا بریسلٹ میرے لیے نہیں آیا۔“ علی عیسیٰ نے سلف ایک مرتبہ پھر مالا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر؟“ چاچو حیران ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر اچھنکھا تھا۔

”یہ گفت مالا کے لیے آیا ہے شاید سوزن نے بھیجا ہے۔ اپنا نام لکھنا بھول گئی۔“ علی عیسیٰ اب وضاحت کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ پہلے کی طرح نارمل تھا۔ وہاں برہمی کے آثار نہیں تھے۔ علی عیسیٰ کا جواب سن کر جہاں چاچو اور مالا کے اندر سکون کی لہر س اٹھی تھیں وہیں مالا نے غور کیا تھا کہ مون پہلو بدل کر رہ گئی ہے۔ اس کے چہرے پر پہلے تاثرات سمجھنا آسان نہیں تھا۔ عموماً مون کا چہرہ سپاٹ ہوتا تھا ہر قسم

کے تاثرات سے عاری۔

مالا کو حیرانی اس وقت زیادہ ہوتی تھی جب سون، چاچو اور عیسیٰ کو جو بھی کہتی وہ بلا چوں و چرا مان جاتے۔ اکثر وہ دعویٰ کرتے کہ اب مون آئی تو اسے زبردستی روک لیں گے مگر جب اس سے روبرو بات کی جاتی تو وہ ان دونوں باپ بیٹے پر کوئی ایسا سحر پھونکتی تھی کہ دونوں ایسے بے بس ہو جاتے گویا کبھی اس کے سامنے بول ہی نہ پائیں گے۔ نہ بولنے کی جرات کر سکیں گے۔ نہ اپنی بات کبھی مون سے منوا سکیں گے۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی بہت سارے دن چاچو ایسے ہی بے بس رہتے۔

مومن کی ایک اضافی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ باپ اور بھائی سے جھگڑا نہیں کرتی تھی۔ چھٹی تھی نہ چلائی تھی۔ نہ غصے کا اظہار کرتی تھی۔ شاید مالا کے آنے سے پہلے وہ ایسا بھی کرتی رہی ہو مگر فی الحال ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ، روک ٹوک، دھمکی، ملامت، غصہ اور بدزبانی کے بجائے لفظوں کے تیز چھینکتی تھی وہ بھی شہد میں ڈبو ڈبو کر۔ ویسے بھی جو شیرینی سے گھائل ہونے والے تھے انہیں زہر بھلا کیا دینا تھا۔ اسے مقابل کو تنگ، عاجز، لاچار۔۔۔ اور رنج کرنا بخوبی آتا تھا۔ وہ کم بولتی تھی دوسروں کی طرف کم دیکھتی تھی عموماً لوگوں سے ملتی بھی نہیں تھی۔ یہ حقیقت میں مالا کی زندگی میں آنے والا بے انتہا عجیب کردار تھی۔

پاپا نہیں جانتے تھے، عیسیٰ نہیں جانتا تھا بلکہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا مون کس قدر انا پرست، خود پسند، متم مزارع، کینہ پرور اور حاسد لڑکی تھی۔ کوئی اس کے باپ کی اور بھائی کی محبتوں میں جھسے دار بن آیا تھا۔ وہ بھی اس کی مرضی اور چاہت کے بغیر..... بھلا یہ کوئی معمولی بات تھی؟ اس کے اندر لگی آگ کے نعلے آہستہ آہستہ باہر آرہے تھے۔ وہ غیر محسوس ریختے سے اب آگ کا کھیل رچانے والی تھی۔

اسے آگ سے کھیلنا پسند تھا چاہے خود جلتی یا دوسروں کو جلاتی۔ بعض لمحے خنجر کی دھار جیسے ہوتے ہیں۔ غلط فیصلہ ہو جائے تو ان کی کاٹ سے نہ جان بچتی ہے اور نہ ایمان بچتا ہے اور اب چاہے بازی جان کی لگتی یا ایمان کی وہ اپنے فیصلے سے ہنسنے والی نہیں تھی۔

دراصل خود کو ہر لحاظ سے عظیمند، ہوشیار اور چالاک سمجھنے والے ہی اکثر خطا کھاتے ہیں اور جان سے بھی جاتے ہیں۔ شاید مون انہی لوگوں میں سے تھی بغیر نتائج کی پروا کیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے والی..... مون چونکہ فطرتاً غیر معمولی ذہانت رکھنے کے ساتھ بہت عجیب لڑکی تھی اور اس کی قوت مشاہدہ بھی کمال کی تھی سو وہ ایک ہی نظر میں بندے کے اندر کا احوال پڑھ آتی تھی۔ اسے ذہن کھوجنے میں انتہا کی حد تک کمال حاصل تھا۔ مون نے کہیں پڑھا تھا کہ انسان کا بہترین مطالعہ، انسان ہی کا مطالعہ ہے جانے یہ لفظ اس کی سوچ میں کہاں سے آ کر جم گئے تھے۔ شاید اسی ایک لمحے کی گرفت مضبوط ہونے پر اس نے کتابیں آرام سے اٹھا کر اپنے باپ اور بھائی کے کتب خانے میں سجادی تھیں۔ اس نے کتاب کا مطالعہ چھوڑ کر انسانوں کے ذہن پڑھنے شروع کر دیے تھے۔ اسے غیر فطری کاموں میں مزہ آتا تھا حالانکہ علم کی طلب عبادت اور اس کی تلاش جہاد ہے جب اس نے عبادت اور جہاد کے مفہوم پر غور کرنا چھوڑ دیا تب وہ منزل، منزل بھٹکنے لگی۔

جیسی اس غیر فطری عجیب لڑکی نے اس حسین
شام کے اس سنہرے پل دو لوگوں کے ذہنوں کو لمحے
کے ہزاروں حصے میں چھانی کی طرح چھان لیا تھا
تب اس پر ایک برا سا انکشاف ہوا یعنی اعتبار کا
انکشاف، اعتماد کا انکشاف اور شاید محبت کا بھی تو گویا
ایک لاوارث پارسل ملنے پر اس کا بھائی بڑے
اطمینان سے جواب پیش کر رہا تھا۔

”شاید سوزن نے بھیجا ہے، اپنا نام لکھنا وہ

ترک وفا

بھول گئی۔“ علی عیسیٰ کے اعتبار کی کوئی حد بھی تھی۔ اتنا اعدھا اعدا، ایسی اندھی محبت تو گویا بواریا کے چھوٹے سے قصبے میں دو راتیں گزارنے والی علی عیسیٰ کی بیوی کو کوئی بھی اجنبی اپنا نام لکھے بغیر تحفہ ہی نہیں بھیج سکتا تھا۔ یہ علی عیسیٰ کے اعتبار کی انتہا تھی۔

پھر یوں ہوا کہ یہ سنہری شام بننا بد مزگی کے
بہت مضبک خرامی سے گزر گئی۔ کھانے کے بعد ہمیشہ
کی طرح مون نے مصروفیت کے کئی بہانے کیے اور
چاچو بے چارے بے بس مون کو جاتا دیکھتے رہے۔
عسکی اسے روکنا چاہتا تھا مگر روک نہیں پایا۔

وہ گفت والا پارسل رات بھر مالا کے ذہن میں کھلبلی مچائے رہا تھا حالانکہ چاچو اور عیسیٰ نے دوبارہ کوئی سوال نہیں اٹھایا تھا بلکہ سوزن کے بھیجے تھنے کی خوب تعریف بھی کی تھی۔ تاہم مالا اپنے ذہن اور دل کو مطمئن نہیں کر پائی تھی۔ اس کا ذہن کئی حصوں میں الجھا ہوا تھا۔ کبھی خیال آتا محض دو ہفتے گزرنے کے بعد سوزن کو گفت بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ کبھی وہ دل کو تسلی دے لیتی کہ یقیناً سوزن نے ہی گفت بھیجا ہو گا مگر رات بھراتی خوشگوار شام گزرنے کے باوجود بھی اسے ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

بڑی مضمحل سی صبح طلوع ہوئی تھی، عجیب سی
پڑمردگی سے بھری۔ انتہائی ست، ست..... مالا کا
بستر چھوڑنے کو دل نہ چاہ رہا تھا مگر وہ علی عیسیٰ کو آفس
بھیجنے کے لیے تیاری میں مدد کروانا بھی چاہتی تھی
گو کہ عیسیٰ نے کبھی اسے فورس نہیں کیا تھا نہ تنگ کیا تھا
کہ وہ اپنی نیند خراب کر کے عیسیٰ کو ناشتا بنانا کر دے یا
دوسرے چھوٹے موٹے کام کرے۔ یہ سب مالا کے
پنے دل کی خوشی تھی۔ وہ عیسیٰ سے اتنی محبت کرتی تھی
کہ اس کا بس چلتا تو رات کو بھی نہ سوتی بلکہ چپکے،
چپکے قریب بیٹھ کر اس کے نقوش حفظ کرتی رہتی اور
عیسیٰ بھی نیند میں گم رہتا۔

نے اسے بوکھلا دیا تھا۔

”مالے! کیا تم بھی عیسیٰ کے ساتھ چلی گئیں؟“ چاچو کی شوخ آواز سن کر وہ دوڑتی ہوئی واپس لاؤنج میں آئی تھی۔ چاچو گلاسز لگائے اخبار پڑھنے میں مصروف نظر آ رہے تھے مگر ان کا دھیان مالا کی طرف ہی تھا جو انہیں کچھ ابھی ابھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے وہ مسکرا کر چھپڑ رہے تھے۔

”میں سمجھا تھا کہ عیسیٰ نے تعریفی ڈائیلاگز کچھ طویل کر دیے ہیں! ابھی میری بیٹی واپس آتا بھول گئی۔“ ان کے چہرے پر صاف شرارت نظر آ رہی تھی۔ وہ اسے دن بھر میں کئی طرح سے ستاتے اور تنگ کرتے تھے خصوصاً اس وقت جب وہ پورے دل سے عیسیٰ کے انتظار میں گھڑی پر نگاہ جمائے بیٹھی ہوتی تھی اور چاچو آتے جاتے اسے جتنا نہ بھولتے تھے۔

”ابھی تین گھنٹے رہتے ہیں مالے، اتنی دیر میں کوئی فیشن شو ہی دیکھ لو۔“ گھڑی کی طرف بڑھتا اس کا انہماک دیکھ کر وہ کچھ نہ کچھ ضرور بولتے تھے اور مالا بڑی طرح جھینپ جاتی تھی۔ کبھی بھی وہ اس قدر ٹائم ٹیس پر نگاہ جما کر کھو جاتی تھی کہ چاچو اندر سے الارم والا گھنٹا اٹھالاتے تھے پھر چاچو کی ہنسی اور مالا کی شرمندگی کا دورانیہ طویل ہو جاتا تھا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ چاچو اس کی حرکتوں سے خامسے محفوظ ہوتے ہیں تب مالا نے گھڑی پر چپکے، چپکے نگاہ رکھنی شروع کر دی تھی اور اس کے علاوہ مالا نے نئی انتظار کی مصروفیت ڈھونڈ لی تھی یعنی لاؤنج سے گیٹ تک کے بے مقصد چکر اور یہ کام وہ چاچو کے سامنے بھی کر لیتی تھی حالانکہ چاچو کی زیرک نظروں سے کچھ بھی چھپا نہ رہتا تھا۔ نہ اس کی بے ثباتی، نہ اس کی بے قراری۔ سو وہ بھی نئے نئے انداز سے مالا کو زچ کرتے۔

”کیوں جوتے بھسار ہی ہو بیٹا۔ عیسیٰ اپنے وقت پر ہی گھر آئے گا۔“ وہ مالا کے پیچھے ہی باہر

اسے بھی کچھ خیال سا آیا یا کچھ یاد سا آیا۔ اس کے لب سختی سے بھینچ گئے تھے بھی نہ ٹھکنے کے لیے۔ وہ غصے کو شدید ضبط کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ لمحوں میں رنگ بدل گیا۔ آخر ان باب بیٹے کو ہوا کیا تھا؟ مالا نا بھی نے عالم میں حق وق کھڑی تھی۔

”ہاں تو اس نے اپنا کوئی تجربہ کر لیا ہو گا تم پر، بس ہم ہی دونوں نہیں مانتے، زمانہ تو سارا کہتا ہے میری بیٹی غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک ہے۔“ حسیب چاچو کی آواز میں اب بھی گہرا کرب ہلکورے لے رہا تھا حالانکہ اگر ان کی بیٹی غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھی تو اس بات پر انہیں فخر کرنا چاہیے تھا مگر یہ اداسی نہ جانے کیوں تھی؟ شاید مالا کا سر پرانز خراب ہو جانے کی وجہ سے..... مالا کچھ سمجھ نہیں پاتی تھی اور اپنی عقل کے مطابق خود کو دلیل دے کر مطمئن بھی کر چکی تھی پھر یوں ہوا کہ علی عیسیٰ نے صورت حال کو سنبھال لیا۔ وہ اس وقت معنی خیز کشیف ماحول کو اپنی ہنسی اور چٹکوں سے بدل چکا تھا۔ کچھ دیر بعد مون بھی آگئی تھی اور محض مون کے چلے آنے سے اس کا باپ اور بھائی اتنے خوش ہوئے کہ سابقہ ناراضی یا غصہ انہوں نے فوراً بھلا دیا تھا۔ شاید یہ ماحول ایسا ہی سازگار یا خوشگوار رہتا مگر اس پارسل کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر بد مزگی ہوتے، ہوتے رہ گئی تھی۔ اگر عیسیٰ اس پارسل پر ہنگامہ کھڑا کرویتا یا بے نام سی اس سلپ پر لکھے الفاظ کو دیکھ کر مشکوک ہو جاتا یا پھر وہ سرے سے سمجھتا ہی نہیں کہ یہ پارسل سوزن نے بھیجا ہے۔ وہ اگر شک میں مبتلا ہو جاتا تب بھلا مالا کیا کر سکتی تھی؟ اسے کیسے یقین دلاتی؟ عیسیٰ کو کیسے مطمئن کرتی؟ اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی نہ عیسیٰ کھوج میں پڑا اور نہ ہی چاچو نے تفتیش کی مگر مالا اپنی چھٹی حس کا کیا کرتی جو اسے کی انہونی سے ڈرا رہی تھی۔ وہ اس پارسل پر اب مطمئن نہیں تھی اور عیسیٰ کے دفتر چلے جانے کے بعد مسلسل اسی پہلو پر غور کر رہی تھی جب چاچو کی آواز

روکھے، طنزیہ لب و لہجہ کو سن کر عیسیٰ قطعاً حیران ہوا بولا تھا بلکہ انتہا درجے کا حیران نظر آ رہا تھا۔

”میں تو خود حیران ہوں، پندرہ بیس منٹ پہلے مجھے قطعی طور پر اپنی سالگرہ یاد نہیں تھی پھر اچانک میرے ذہن میں خیال آیا، یوں سمجھیں کلک سے کچھ روشن ہوا تھا اور میرے سامنے سالگرہ کی ڈھنچکی آگئی۔“ وہ اپنی حیرانی کا اظہار بے آواز بلند کر رہا تھا۔ مالا بھی ایک دم ٹھٹھک گئی تھی حالانکہ اس میں ٹھٹھکنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اکثر اچانک بے خیالی میں برائی اور بھولی ہوئی باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ علی عیسیٰ کو کبھی سالگرہ یاد آگئی سو اس میں اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں تھی مگر جس چیز نے مالا کو ٹھٹھکایا تھا وہ چاچو کے کرب انگیز تاثرات تھے۔ ان کے چہرے پر ایک دم صدیوں کی... جھٹکن اتر آئی تھی۔ وہ لمحوں میں بہت تھکے، تھکے، پڑمرودہ اور غمناک نظر آنے لگے تھے۔ آخر چاچو کو کیا ہوا تھا؟ مالا زیادہ دیر سوچ بھی نہیں سکی تھی چاچو کی تھکی، تھکی خود کلامی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا وہ گویا علی عیسیٰ اور مالا کو نظر انداز کیے خود سے مخاطب تھے۔

”تو یہ کارستانی مون کی ہے۔ اس سے مالا کی چھوٹی سی خوشی بھی برداشت نہیں ہو سکی۔ میں مون کو نہ ہی بتاتا کہ مالا نے عیسیٰ کی سالگرہ کا اہتمام کر رکھا ہے۔ اسے سر پرانز دینے کے لیے۔“ ان کی آواز عجیب سی تکلیف میں بھیگ رہی تھی۔ چہرے پر دکھ کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ بہت اذیت میں نظر آ رہے تھے گویا مون کے عمل نے ان کے دل کو سخت چھیس پہنچائی تھی۔ جانے مون نے کیا، کیا تھا؟ ٹیلی فون کر کے عیسیٰ کو اطلاع دے دی تھی یا کسی اور ذرائع سے مطلع کروا دیا تھا؟

”مون نے فون تو نہیں کیا، یہ تو اچانک ہی میرے ذہن میں خیال آ گیا۔“ عیسیٰ بھی کچھ بولتے، بولتے ایک دم ٹھٹھک کر چپ ہو گیا تھا۔ گویا

وہ ناشتے سے فارغ ہو کر بھی عیسیٰ کو خوب صورت طریقے سے سی آف کر کے سرخ گلابوں کے گارڈن میں کھڑی پھولوں کی روح میں اترنے والی خوشبو کو سینے میں اتار رہی تھی۔ اسے کل شام کے مناظر یاد آ رہے تھے۔ کل عیسیٰ کی سالگرہ جو تھی۔ وہ پورا دن مصروف رہی تھی۔ چاچو اور وہ دونوں ایک چکر مار کر کٹ کا بھی لگا کر آئے تھے۔ اپنی طرف سے وہ اس کے لیے سر پرانز پلان کر رہے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ چاچو کی ڈھیروں بوکھلاہٹوں کے باوجود کھانا وقت پر تیار ہو گیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرانی تب ہوئی جب عیسیٰ وقت سے پہلے گھر آ گیا۔ مالا تو کیا مینی اور چاچو بھی حیران رہ گئے تھے حالانکہ کچھ دیر پہلے چاچو، مالا کو بتا رہے تھے کہ عیسیٰ کو کبھی اپنا برتھ ڈے یاد نہیں رہا۔ بچپن سے لے کر آج تک وہ ہمیشہ اسی انہم دن کو بھول جاتا ہے اور یہ بھی کہ عیسیٰ کی سالگرہ پر اتنا اہتمام نہیں ہوتا بس کیک کاٹا جاتا ہے جبکہ مالا نے عیسیٰ کو سر پرانز دینے کے لیے بہت اہتمام کر رکھا تھا اور وہ دونوں بہت خوش بھی تھے کہ عیسیٰ ایک دم سر پرانز ڈرہ جائے گا مگر ان سب کو حیرت کا جھٹکا تب لگا جب عیسیٰ اپنے موبائل پر یہ رنگ ٹیون سیٹ کر کے ہنستا مسکراتا اندر داخل ہوا۔

”آج ہماری سالگرہ ہے ناں! دیکھو ہم کو یاد ہے ناں۔“ وہ برابر مسکراتا ہوا گنگنا رہا تھا جبکہ چاچو تو کیا مالا بھی ہونق رہ گئی تھی تو گویا یہ سارے اہتمام میں سر پرانز کا پہلو کہیں سے بھی نہ لگتا تھا۔ وہ حضرت اپنی سالگرہ کے دن کو خوب یاد رکھے ہوئے تھے۔ مالا کی اتری صورت دیکھ کر چاچو فوراً تنگ کر بول اٹھے تھے۔

”پچھلے تیس سالوں میں تو تمہیں سالگرہ کا دن کبھی یاد نہیں رہا۔ آج بائیس، تیس سال بعد کیسے سالگرہ کا دن یاد آ گیا؟“ چاچو بھی سر پرانز کر کر رہے تھے۔ ان کے

بنارہی ہوں سو ذہن کچن کی طرف چلا گیا۔ "مالا کو اپنی بے دھیانی کا جواز پیش کرنے کے لیے بروقت بہانہ مل گیا تھا۔

"او..... تو یعنی آپ معدے سے ہو کر دل میں براجمان ہونے کا پورا پورا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔" عیسیٰ نے مسکرا کر اسے چھیڑا تو مالا خاصے اعتماد سے دو بدوبولی۔

"دل میں براجمان تو ہم ہو چکے، ایسی کوششیں تو بس محبت کو اور بڑھانے کے لیے کی جاتی ہیں۔" اتنے عرصے میں بلکہ شادی کے بعد مالا کی طرف سے پہلا خوب صورت اظہار عیسیٰ کی روح تک کو شانت کر گیا تھا بھی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"مارولس۔" عیسیٰ نے ہنسی کے دوران ہی ذرا رک کر کہا تھا پھر تھوڑی عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "دل تو چاہ رہا ہے تم سے تھوڑی اور لمبی بات کروں، ابھی میں تمہی کو سوچ رہا تھا، تمہی کو یاد کر رہا تھا۔ دل چاہتا ہے کہ اس دل کو پتہ لگیں اور اڑتا ہوا تمہارے پہلو میں جا کر غم روزگار..... عیسیٰ کو پٹری سے اترتا دیکھ کر مالا جلدی سے سنبھل گئی تھی اور جو بے چارہ سادہ دل تھا، عیسیٰ کی بات کے مفہوم میں الجھتا دھڑک، دھڑک کر بے حال ہو رہا تھا۔

"ویسے ایک بات کہوں؟" سوزن کا نمبر لکھوا کر عیسیٰ نے فون رکھنے سے پہلے ذرا تنگ کرنے والے انداز میں مالا کو چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ جوں جوں رکھنے لگی تھی، عیسیٰ کی بات سن کر رک سی گئی۔

"رقیبوں کو فون کر رہی ہو، ذرا دھیان سے۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا یا تنبیہ کر رہا تھا۔ مالا سمجھ نہیں پائی تھی مگر وہ خود کو کچھ بولنے سے روک نہیں پائی تھی۔ ایک دم آفاق کی باتیں یاد آنے لگیں۔ یہ اللہ نے اوپر جو کھوپڑی نما میموری باکس بنارکھا ہے یہاں سارا ڈیٹا ایک دم سیف ہو جاتا ہے کبھی کمپیوٹر کی خرابی کے باعث بھول چوک

"مالے! یہ تم ہوناں!" علی عیسیٰ کے لیےج میں یقین تھا مالا اسے تنگ کرنے کے موڈ میں نہیں تھی اسی لیے کچھ پھسکی سی آواز میں کہنے لگی۔

"جی! میں ہوں اور بھلا کون ہو سکتا ہے؟" "اور کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔" عیسیٰ گویا کھل کر مسکرا دیا۔ "کہیے ملکہ عالیہ! فون کس لیے کیا؟" وہ بڑی فرصت سے بات چیت کرنے کے موڈ میں لگ رہا تھا حالانکہ وہ اس وقت بہت مصروف تھا کچھ دیر بعد اسے ایک میٹنگ اٹینڈ کرنا تھی پھر ایک آفیشل لنچ کے لیے نکلنا تھا مگر مالا کی فون کال نے اسے روک لیا تھا۔

"مجھے سوزن کا نمبر چاہیے۔" مالا نے تمہید باندھے بغیر ڈائریکٹ نمبر مانگ لیا تھا۔ شاید وہ محسوس کر چکی تھی کہ عیسیٰ اس وقت خاصا مصروف ہوگا جبکہ وہ فون دریافت ہو جانے پر عیسیٰ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"ظالم نے یاد بھی کیا تو رقیب کو..... آہ۔" اس کا انداز ایسا مسکین سا تھا کہ مالا کو اتنے کشیدہ سے ماحول میں بھی ہنسی آگئی تھی۔ دراصل اس وقت مالا کے سر پر صرف سوزی سے بات کرنے کی دھن سوار تھی۔ وہ اپنی پریشانی کم کرنا چاہتی تھی یہ پوچھ کر کہ آیا سوزن نے ہی اسے گفٹ بھیجا ہے یا پھر مالا کسی کی سازش یا شرارت کا شکار ہونے والی تھی۔

"آج لگتا ہے، آپ خاصے فراغت کے موڈ میں ہیں۔" مالا کو کچھ تو بولنا ہی تھا حالانکہ ذہن سوزی میں اٹکا ہوا تھا۔ آنکھوں کے سامنے پارسل اور نقلی ٹکینوں کا بر۔ سلیٹ ناچ رہا تھا۔ ذہن کہیں تھا اور گفتگو بے ربط سی ہو رہی تھی۔ عیسیٰ نے اس کی..... بے توجہی فوراً نوٹ کر لی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" وہ فوراً پریشان ہوا تھا اور اس کی پریشانی محسوس کر کے مالا کو سنبھلنا ہی پڑا۔ "مجھے کیا ہوتا ہے ایچیوٹی، اناس کی پڈنگ

"مجھے امید ہے میری بیٹی مجھ سے کچھ نہیں چھپائے گی۔" چاچو کی محبت اور مان بھرے لہجے نے اسے بھر بھری ریت بنا دیا تھا۔ اسے لگا وہ حقیقت میں چاچو سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے اپنے خدشات تو نہیں البتہ رات والے پارسل کا ذکر ضرور کر دیا تھا جسے سن کر چاچو مطمئن انداز میں بولے تھے۔

"ہاں تو بیٹا تم سوزن کا شکریہ ادا کر دو، اسے کال کر لو۔" اس کی بات سمجھے بغیر انہوں نے وہی بات کہی تھی جو مالا کی خواہش میں شامل تھی۔ وہ سوزن کو فون کرنا چاہتی تھی مگر مالا کے پاس اس کا نمبر نہیں تھا اور مالا کی انجمن سوزن ہی دور کر سکتی تھی۔ "کیا سوزن کا نمبر مل سکتا ہے؟" مالا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"عیسیٰ کے پاس ہوگا تم عیسیٰ کو فون کر کے نمبر لے لو۔" چاچو کے مشورے نے مالا کو تھوڑا ریلیکس کر دیا تھا۔ وہ سر ہلا کر میز پر سے برتن اٹھانے لگی تھی۔ آج نئی نے نہیں آتا تھا اور ویسے بھی برتنوں کے علاوہ اور کوئی کام بھی نہیں تھا۔ صفائی تو یہاں دو ہفتے بھی نہ ہوتی تو گرد، دھول کا نشان نظر نہیں آتا تھا مگر مالا نے عادتاً پہلے برتن دھوئے پھر کچن صاف کیا اور پھر فارغ ہو کر فون تک آگئی۔ فون کے اوپر ہی عیسیٰ کا نمبر لکھا تھا یقیناً سہولت کے لیے لکھ دیا گیا تھا کہ کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی تھی۔ مالا نے جھجکتے ہوئے نمبر ڈائل کیا چونکہ یہ عیسیٰ کا پرسل نمبر تھا سو فون بھی عیسیٰ نے ہی اٹھایا۔ یقیناً وہ گھر کا نمبر دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا بھی اس نے پہلی بیل پر کال ریسیو کر لی تھی۔

"پاپا تو ٹھیک ہیں؟" اس نے ڈیج میں بہت عجلت بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ یقیناً وہ سمجھا ہوگا کہ نینی نے اسے فون کیا ہے جبکہ دوسری طرف خاموش محسوس کر کے وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ فون نینی نے نہیں کیا تبھی ہلکے ہلکے لہجے میں ذرا مسکرا کر بولا۔

آ جاتے تھے۔ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے حالانکہ مالا کی عیسیٰ کے لیے بے قراری انہیں دل و جان سے پسند تھی مگر وہ نہیں چاہتے تھے کہ مالا فضول میں چکر لگا لگا کر کھکتی رہے اور مالا کی ڈھٹائی بھی اس لمحے عروج پر ہوتی تھی۔

"میں تو واک کر رہی ہوں چاچو آپ بھی اپنے بیٹے کی طرح خاصے خوش فہم ہیں۔" مالا بھی دو بدو جواب دے کر اپنے تئیں انہیں لا جواب کر دیتی تھی مگر چاچو کی آنکھوں میں چھپی شرارت اسے باور کروا دیتی کہ چاچو قطعاً قائل نہیں ہوئے بلکہ خوب زچ کرنے والی نظروں سے دیکھتے رہتے تھے۔

"میرا بیٹا ضرور خوش فہم ہوگا مگر میں نہیں..... یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے بیٹا جی۔" چاچو نے ہار ماننا کہاں سیکھی تھی۔ یہ تو علی عیسیٰ تھا جو انہیں لا جواب کر دیتا تھا۔ مالا تو اکثر اپنی کہی باتوں میں خود ہی گرفتار ہو جاتی تھی۔

"یہاں دھوپ نکلتی کہاں ہے چاچو کبھی کبھار اگر موڈ ہوا تو جھلک دکھا دی۔" مالا کو موضوع بدلنے کا موقع مل جاتا تھا اور چاچو اس کی چالاکی پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے تھے۔

اس وقت بھی وہ مالا کو چھیڑنے کے موڈ میں تھے مگر اس کے چہرے پر پھیلی انجمن دیکھ کر رک سے گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے گلابز اتار کر میز پر رکھے، اخبار بھی سمیٹ دیا پھر اس کا چہرہ کھوجتے والے انداز میں دیکھ کر بولے تھے۔

"کیا بات ہے بیٹا، کوئی پریشانی ہے کیا؟" ان کے لہجے میں گہرا نظر تھا۔ اس کی چپ انہیں ہولا رہی تھی۔

"نہیں۔" وہ گویا خواب کی کیفیت سے جاگی تھی۔ ایک دم ہڑبڑا کر بولی۔ چاچو پُر سوچ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے پھر کچھ دیر تک دیکھتے رہے۔ مالا کو ان کی نظروں سے انجمن ہو رہی تھی۔

دوسری طرف شوخ پن کا کوئی انت نہیں تھا۔
 ”ایس..... کیا مطلب؟ کرتی تھی نہیں، کرتی ہے۔“ وہ اپنی بات پر زور دے کر چپکا تھا۔ احساسِ تفاخر تو اگرچہ محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا تاہم وہ اترا ضرور رہا تھا اور شاید مالا کو چڑانا بھی چاہتا تھا۔

”اس اچھی لڑکی کے ساتھ ویسے کچھ اچھا نہیں ہوا۔“ مالا بغیر چڑے اطمینان سے بولی تھی۔ عیسیٰ کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے کے لیے۔ وہ جو اسے تنگ کرنا چاہتا تھا ایک دم جھنجلا کر رہ گیا۔

”تو کیا میں نے اس اچھی لڑکی کے ساتھ برا کیا؟“ اسے چڑانے کی کوشش میں اب وہ خود چڑچڑے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بہت جلدی چڑ بھی جاتا تھا بھی تو چاچو اسے ہمہ وقت ستاتے رہتے تھے۔

”میں نے یہ کب کہا۔“ مالا نے فوراً وضاحت کی۔
 ”تو پھر؟“ وہ تملایا۔

”پھر یہ کہ وہ نامراد رہ گئی۔“ مالا نے حسرت سے کہا تھا۔ عیسیٰ اس کے حسرت زدہ انداز پر اشکراٹھا۔

”تو تم اسے نامراد کرو مگر ایک بات کا وہ بیان رکھنا۔ یہاں قانوناً ایک بیوی ہی رکھ سکتے ہیں۔“ عیسیٰ نے جس تمللاہٹ سے جواب دیا تھا مالا گویا دھک سے رہ گئی تھی۔

”آپ کہاں تک سوچ بھی آئے؟“ وہ حیران و حیران تھی۔ ”میں نے تو صرف ایک بات کی ہے، آپ کے ارادوں کا بھلا کیا ہی کہنا۔“ مالا اب عیسیٰ کے بے ساختہ پن کو آڑے ہاتھوں لے رہی تھی اور وہ کون سا شرمندہ تھا۔ پوری ڈھٹائی کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تو میں ایک بزنس مین ہوں میڈیشن مالا۔“ انہما کو پہلے سوچتا ہوں۔“ عیسیٰ نے ہنسی دبا کی تھی مگر مالا ہنس بھی نہ سکی۔ رہ رہ کر سوزن کا سوز و گداز سے بھر اچھرہ

کہے جا رہا تھا۔
 ”اور یار! آفاق جھوٹ نہیں بولتا، اس نے جو کہا ٹھیک ہی کہا۔“ اب کہ عیسیٰ کا لہجہ ذرا مدہم ہو گیا تھا۔ ”مگر ایک بری عادت ہے اس میں، راز سینے میں رکھنے والا نہیں ویسے بہت اچھا ہے۔ اتنا اچھا کہ میں نے تمہارے حوالے سے اس پر اعتماد کیا اور وہ اعتماد کو ٹھیک پہنچانے والا نہیں۔“ وہ مدہم لہجے میں جانے آفاق کی تعریف کر رہا تھا یا اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ جو کچھ بھی تھا مالا کو آفاق کے حوالے سے وضاحت کچھ پرسکون کر گئی تھی ورنہ وہ تو اچھی خاصی آفاق سے بدگمان ہو چکی تھی حالانکہ اس نے ایسا تو کچھ بھی نہیں کیا تھا جو مالا کو اس حد تک بدگمان کر دیتا مگر وہ عیسیٰ کی باتوں کو سمجھتے ہوئے آفاق کی گفتگو کو ذہن میں ڈھرا رہی تھی پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مالا نے آہستگی سے پوچھا۔

”تو کیا یہ سچ ہے کہ سوزن نے آپ سے شادی سے انکار کر دیا تھا؟“ مالا کے لہجے میں چھین نہیں تھی وہ بہت سادگی بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ ویسے بھی اسے سوزن سے کسی بھی قسم کی پُر خاش نہیں تھی۔ وہ جو بھی تھی جیسی بھی تھی مالا کو عزیز تھی۔ جانے یہ کیسا انوث سا رشتہ تھا جو خود بخود سوزن اور مالا کے درمیان جڑ چکا تھا۔

”ہاں، سو فی صد سچ۔“ عیسیٰ نے خواہ خواہ دھکی ہونے کی کوشش میں منہ پٹا لیا تھا۔ مالا نے کم از کم یہی محسوس کیا تھا کہ وہ غیر سنجیدہ سا ہے۔

”کوئی آپ کو بھی انکار کر سکتا ہے؟“ مالا نے حیرت سے پوچھا۔

”میں کہاں کا شہزادہ ہوں بھلا..... مجھے انکار کیوں نہیں ہو سکتا؟“ وہ التمازی سے کہنے لگا۔

”وہ آپ سے محبت کرتی تھی۔“ اس نے بڑے گہرے لہجے میں عیسیٰ کو جانے کیا جتنا چاہا تھا مگر

کوئی بات ٹھہر سکے۔ اس نے تمہیں ایک دو گھنٹے کے اندر پوری ہسٹری بتا دی ہوگی۔ اسٹازنٹ پاسنیل کہ وہ چپ رہے اور کچھ بولے نہیں۔ اسے بولتے رہنے کا خط ہے۔“ عیسیٰ کے اگلے سوال نے مالا کو ہکا بکا کر دیا تھا۔ وہ تو ابھی عیسیٰ کی بتائی تفصیل کے حصار سے نہیں نکلی تھی کہ عیسیٰ نے جھٹ سے محسوم بن کر کہا۔ ”پر تم خاصی گھٹی ہو یا دوسرے معنوں میں بردبار کہہ لو مجال ہے جو مجھ سے کچھ پوچھا ہو تم نے۔“ وہ اب مسکرا رہا تھا یا جتا رہا تھا۔ مالا گویا ہونق سی ہو گئی پھر اسے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کا اچانک خیال آ گیا۔ اگر وہ اب بھی نہ بولتی تو شاید عیسیٰ سمجھتا کہ وہ کسی بات پر ناراض یا بدگمان ہے۔

”میں آپ سے پوچھتی تب جب مجھے آفاق کی کسی بات پر یقین آتا۔ مجھے کیا خبر آفاق جھوٹ بول رہا تھا یا سچ؟ ویسے بھی میں اجنبیوں سے بے تکلف نہیں ہوتی اور نہ ان کی بے سرو پا باتوں کو حقیقت سمجھتی ہوں۔“ مالا کے تفصیلاً دو ٹوک اپنے تلے جواب نے جہاں عیسیٰ کا دل جیت لیا تھا۔ وہیں اسے اپنی ہم سفر پر فخر محسوس ہوا تھا۔ وہ تو ایسے سیپ کے مانند تھی جس کے اندر نگینہ چھپا تھا۔ عیسیٰ کو مالا پر ٹوٹ کے پیار آیا تھا مگر یہ پیار جتانے کا وقت یا موقع نہیں تھا۔

”میڈیشن مالا! آئی لو پو۔“ اپنے حواسوں پر قابو پا کر عیسیٰ نے جس خواب آگئیں، شرابی لہجے میں اظہارِ محبت کیا تھا مالا گویا لڑکھڑا گئی۔ وہ جو گھٹی یا بردبار والی بات سن کر اتنا سنجیدہ اور کرنا جواب دے رہی تھی عیسیٰ کے بے ساختہ انداز کو سن کر سرشار ہو گئی۔ وہ ایسا ہی تھا، جذباتی، منہ پھٹ اور دل میں کچھ بھی نہ رکھنے والا۔ نہ کینہ، نہ بغض، نہ حسد بس محبت دیتا اور محبت وصول کرتا تھا۔ جو کچھ محسوس کرتا فٹ سے کہہ دیتا جیسے ابھی مالا کی بات سننے بغیر اپنی

ہو جاتی ہے تاہم ڈیٹا ویلیٹ ہرگز نہیں ہوتا۔ کچھ دن بعد یادداشت کے خانوں سے پٹ پٹ باتیں نکل کر گرنے لگتی ہیں۔ جیسا کہ ابھی عیسیٰ کی چھیڑ چھاڑ نے اسے آفاق کی باتیں یاد دلا دی تھیں۔ سوزن کی عیسیٰ کے لیے محبت، عیسیٰ کی ماں کے سوزن جیسی اچھی لڑکی کے لیے جذبات، عیسیٰ کی شرط اور پھر سوزن کا انکار۔ اس نے محبت پر مذہب کو ترجیح دی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک منفرد اور عظیم لڑکی تھی اور اب عیسیٰ شاید تنبیہ کر رہا تھا کہ رقیبوں سے بات کرتے ہوئے محتاط رہنا یا پھر مذاق میں تنگ کر رہا تھا؟ مالا سمجھی نہیں مگر الجھ ضرور گئی۔

”سوزن میری رقیب کیسے ہو گئی؟“ مالا نے۔
 حتی المقدور اپنے لہجے کو نارمل کیا تھا۔ وہ عیسیٰ پر کچھ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی کہ اسے آفاق نے کچھ بتا رکھا ہے۔ دراصل یہ موضوع کبھی عیسیٰ نے چھیڑا ہی نہیں تھا ورنہ مالا تو کب سے بے چین تھی یہ جاننے کے لیے کہ آیا آفاق نے جھوٹ بولا تھا یا سچ؟

”آں..... تو گویا تم نہیں جانتیں؟“ عیسیٰ کچھ چونک گیا پھر کچھ دیر کے لیے سوچوں میں گم ہو گیا تھا۔ شاید اپنی غلٹ پسندی پر خود کو ملامت کر رہا تھا کہ اسے مالا کے ساتھ ایسی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ مالا کچھ اس قسم کے احساسات کا شکار تھی۔

”میں کیسے جان سکتی ہوں، آپ نے کچھ بتایا ہے کیا؟“ وہ التمازی میں ہونے کا موڈ بنا رہی تھی کہ عیسیٰ نے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں اس کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ ماما کی باتیں ضرور کرتا تھا مگر یہ نہیں بتاتا تھا کہ ماما کی خواہش تھی اپنی بھانجی کو بہو بنانے کی۔ شاید یورپ میں ایسی رشتے دار یوں کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا مگر علی عیسیٰ کی ماما کا گھرانا اس لحاظ سے بہت مختلف تھا۔

”اگرچہ سوزن نے تمہیں کچھ نہیں بتایا ہوگا مگر میں مان نہیں سکتا کہ آفاق کے ہلکے پیٹ میں



رشتہ بھڑو کا

رفاقت جاوید

گھر میں ہو کا عالم تھا..... لیکن زین کے دل و دماغ میں ایک شور برپا تھا..... بے بسی، بے چارگی اور حسرت و یاس میں مکمل طور پر جکڑا ہوا دیواروں پر آویزاں تصویروں کو بغور دیکھتے ہوئے ہاتھ مل رہا تھا..... فائزہ کے ہاتھ سے سجے ہوئے ڈیکوریشن پیمز جو اس نے بڑے چاؤ سے خریدے تھے وہ انہیں اسی انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ تین بیڈروم کا یہ پورشن کسی طور چھوٹا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے کہ فائزہ

رکھا ہے مجھے تم نے، دیکھو، تمہاری آواز سن کر مجھے سب کچھ بھول گیا۔“ اب وہ تیز تیز بولتا، فون سرعت سے بند کر گیا تھا۔ تاہم فون بند کرنے سے پہلے اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرنا نہیں بھولا تھا۔ فون بند کرنے کے بعد بھی مالا، علی عیسیٰ کی سحر آمیز گفتگو کے حصار میں رہی تھی۔ اس کا دل کسی پہلو سے بھی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ ایسا سرور تھا عیسیٰ کی باتوں میں اور کچھ ایسی ہی محبت ہو گئی تھی مالا کو علی عیسیٰ کی منفرد ذات سے۔

وہ کتنی ہی دیر تک عیسیٰ کی محبت کے رس میں بھیکتی رہی تھی، سوزن کے فون نمبر والی چٹ کو ہتھیلی میں دبائے ہوئے۔ وہ عیسیٰ کی گفتگو کے حصار میں سے نکلتا نہیں چاہتی تھی مگر فون کے سفید بٹنوں میں گڑھے ہند سے اسے زیادہ دیر تک مسکور نہیں رہے دے سکے۔ اس نے گہری سانس کھینچ کر نمبر ڈائل کرنا شروع کیا تھا کچھ ہی دیر میں فون کال ریسیو ہو گئی۔ فون تانتے نے اٹھایا تھا، مالا کی آواز سے بغیر وہ سی ایل آئی پر عیسیٰ کے گھر کا نمبر دیکھ کر کچھ چکی تھیں کہ فون کرنے والا کون ہے۔ مالا نے انگلش میں تانتے سے کہا تھا کہ وہ سوزن کو بلا دیں مگر تانتے انگریزی نہیں سمجھتی تھیں سو مالا کچھ تفکر میں پڑ گئی مگر ہوا کچھ یوں کہ تانتے نے آواز دے کر کسی اور کو بلایا تھا۔ شاید کوئی ان کے قریب تھا پٹنا گفتگو کر رہا تھا پھر ریسیور کسی اور کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا اور جو آواز مالا کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی کم از کم اس وقت مالا اس آواز کو سننا نہیں چاہتی تھی۔ تانتے نے آواز لگا کر کسے بلایا تھا، مالا سمجھ نہیں سکی تھی۔

مون حسیب، مالا کی زندگی میں کیا کرنے والی تھی..... علی عیسیٰ اور مالا کے بیچ کیا ہونے جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ ضرور معلوم ہو گا مگر اگلے ماہ

آنکھوں کے سامنے عکس بن رہا تھا۔ نم ناک آنکھیں، ابھرے ابھرے سرخ گالوں پر چھائی اداسی۔ وہ کتنا کم مسکراتی تھی پھر کرخ کی ٹھنڈی اور رسمی تقریب میں سوزن کے بہنے والے آنسو، وہ آنسو بلاوجہ تو نہیں گر رہے تھے۔ اتنی بالی سی عمر میں اس کی مذہبی دلچسپی، چمکولے لپٹا اس کا بھرا بھرا وجود، سادگی، وقار اور شرافت کی چمک لے اس کا وجود ٹھکرائے جانے والا تو ہرگز نہیں تھا مگر اسے ٹھکرایا نہیں گیا تھا وہ تو اس نے خود ہی..... اور اب عیسیٰ کہہ رہا تھا۔

”مجھے سوزن پر اعتراض نہ ہوتا اگر سچ میں تم، تمہارا وجود، تمہاری محبت اور تمہاری چاہت کے جگنو نہ ہوتے۔“ عیسیٰ کے لہجے میں واضح سچائی تھی۔ وہ کتنے مضبوط اور مدلل لہجے میں کہہ رہا تھا۔ کتنی خوب صورت بات کر رہا تھا۔ کتنے دل سے کہہ رہا تھا مگر مالا پھر بھی جگہ جگہ انگ گئی تھی۔

”آپ کو سوزن پر اعتراض نہ ہوتا، اگر بیچ میں میری محبت نہ ہوتی..... تو پھر مذہب کہاں گیا؟“ مالا کے دل میں پھانس سی چھپی تھی۔ وہ عیسائی لڑکی عظمت کے کس مینار پر کھڑی تھی جس نے محبت پر مذہب کو قربان نہیں کیا تھا مگر یہ.....

”میں نے ماما سے کہا تھا وہ اسلام قبول کر لے جیسے انہوں نے کیا تھا مگر وہ راضی نہیں ہوئی پھر میری اس سے جذباتی وابستگی بھی نہیں تھی۔ دراصل شروع میں پاپا اور میں سمجھتے تھے کہ مون کو سوزن ہمارے خلاف بھڑکاتی ہے یہی سوزن کے کہنے پر ہی مون گھر چھوڑ گئی مگر ہم کچھ غلط ہی سوچتے تھے مون تو خود ہی..... بہت عجیب اور جانے کیوں ہے وہ ایسی۔“ عیسیٰ بے ربط سا بولتا کچھ چپ کر گیا تھا پھر اچانک اسے گزرتے وقت کا احساس ہوا تھا۔ وہ ایک دم چونک کر سیدھا ہوا پھر عجلت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

”باتوں میں الجھالیتی ہو..... کچھ ایسا باندھ

نے اپنی ذہانت اور قرینے سے اسے اتنا آرام وہ بنا دیا تھا کہ اس میں درجنوں مہمانوں کی بھی بے آسانی کھپت ہو جایا کرتی تھی۔ اس گھر کے چتے، چتے میں اس کی عدم موجودگی کا احساس تھا۔ لاؤنج میں قدر آدم اپنی شادی کی فوٹو گراف دیکھ کر وہ وہیں رک گیا وہ اپنے بچ بستہ ہاتھوں کی انگلیوں سے اس کے خوب صورت خدوخال کو محسوس کرتے ہوئے خود کلائی کرنے لگا۔

”میں تمہارے قابل نہیں تھا..... لیکن ہمیشہ میں نے اس کے برعکس سوچا۔ کتنا بد قسمت ہوں میں..... واپس آ جاؤ، تمہیں میری جان کی قسم..... کیا آج میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے اس قسم سے منح نہیں کروگی۔ آئی لو یو فازی، میں جانتا ہوں تم یقین نہیں کروگی۔ مجھے اچھی طرح علم ہے۔“ دو موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے گرے اور آخر اس کا گریبان بھیگتا چلا گیا..... بیٹی کو سینے سے لگائے وہ فائزہ کو آوازیں دینے لگا..... جیسے کوئی دیوانہ اور جنونی گلیوں میں اپنی معشوقہ کے فراق میں تڑپ رہا ہو۔ اسی کیفیت میں وہ باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ان کی اربچ میرج تھی گر زین، فائزہ کو دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ سرو قد اور نمکین رنگت پر نیچے خدو خال میں مشرق سے تعلق رکھنے والی..... اپنے اندر اور باہر اک کا فرانہ حسن کو سمیٹے ہوئے تھی۔ نہایت سلیبی ہوئی، نئی تلی بات کرتی اور وہیما ساجسم کمال کا تھا۔ فائزہ کا روپ بہت چمکا تھا اگر اپنے اس وبے ہوئے حسن کے ساتھ وہ شوخ و شنگ باتیں کرتی اور زندگی سے بھرپور تقصیب لگاتی..... بے باکی اور بے تکلفی سے ملتی تو شاید پسند نہ کی جاتی..... اسی خوبی کو مد نظر رکھتے ہوئے زین کی ماں اور بہنوں نے بھی ووٹ اس رشتے کے حق میں دے ڈالے کیونکہ انہیں بھی تو کم گو، رکھ رکھاؤ

میں لا جواب اور گولڈ میڈلسٹ لڑکی کی تلاش تھی۔ ایسی من پسند ہو بیسیوں لڑکیاں دیکھنے کے بعد اسے پر ساس نے جھولی پھیلائے حقیقی سواہی بن کر ان کی چوکھٹ پکڑ لی۔

لڑکی والوں کو اور کیا چاہیے تھا! گرد و پیش میں آئے دن رونما ہونے والے چشم و دید واقعات اور ان کی اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کی رو سے لڑکا زین اور اس کا خاندان، حسب نسب کے لحاظ سے خاصا تسلی بخش لگا۔ نازخروں میں پئی فائزہ کے والد چاند صاحب نے ان کی حیثیت کے مطابق حق مہر کی رقم اور نکاح نامے میں طلاق کا حق بیٹی کو سونپنے کی شرائط ان کے گوش گزار کرویں..... جنہیں زین کے گھر والوں نے اس وقت تو بخوشی قبول کر لیا جبکہ فائزہ کی ماں طیبہ ان شرائط کے خلاف تھی کیونکہ اس نے اپنے خاندان میں ان شرائط کے بھیا تک نتائج دیکھ رکھے تھے مگر حامد نے بیوی کی مخالفت کو اہمیت نہیں دی تھی۔ دوسری طرف سے بے پناہ لگن اور چاہت ان کے لیے خوش آئند سندیسے کے مانند تھی۔ جو معمولی سے خدشات ول کی وھڑکن تیز کیا کرتے تھے۔ وہ بھی ان کی طرف سے ہر شرط پر رضامندی دیکھ کر رنو چکر ہو گئے..... اور خوشی، خوشی نکاح کی تیاریاں ہونے لگیں..... کیونکہ لڑکے والے منگی کے بجائے نکاح کرنے پر بھند تھے۔ رخصتی کا پروگرام چند مہینے بعد کا تھا۔

اپنی براوری اور عزیز واقارب کی موجودگی میں مولوی صاحب نے نکاح کی شروعات کی۔ نکاح نامے کے کچھ غیر ضروری کوائف جو ان کی نظر میں تھے، انہوں نے کر اس کا نشان لگا کر حق مہر سکہ رائج الوقت ایک سو بیس روپے لکھا..... جو شریعت کے مطابق تھا..... وہ زین کی طرف منہ کر کے بولے۔

”شرعی حق مہر بیوی تک پہنچا دینا جب تک اس کی اوائلی نہیں ہوگی۔ بیوی تم پر حرام ہے۔“

زین نے اثبات میں سر ہلایا..... خوشی کی لہر اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ اپنے ساتھ اپنا پرانا چاندانی عمر رسیدہ مولوی لے کر آئے تھے۔ اس نے انہی کے کہنے کے مطابق نکاح نامہ تیار کیا تھا۔ انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہم مولوی کا انتظام کر لیں گے اب ایسے مولوی کا انتظام اور نکاح نامہ بھی پر کیا ہوا تھا جس کی حامد صاحب کو ہرگز خبر نہیں تھی۔ مکمل بھروسہ اور اعتماد ان کی زبان پر تھا۔ ان کی میٹھی زبان اور معقول باتوں پر تھا..... یہ سن کر انہیں اک جھٹکا سا لگا۔

”حق مہر پانچ لاکھ لکھنے کا وعدہ کیا گیا تھا..... اور طلاق کا حق بھی۔“ انہوں نے چونک کر زین کی طرف دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”انکل بعد میں اس مسئلے پر گفت و شنید کر لیتے ہیں۔“ زین نے انہیں سرگوشی کے انداز میں آہستگی سے ٹوکا اور اسی اثنا میں مولوی صاحب عزیزوں کے ہمراہ فائزہ کی جانب چل پڑے جو اپنے کمرے میں پنک رنگ کے جوڑے میں لمبوس اپنی سمیلیوں، کزنز اور اکلوتی بہن میں گھری چھیڑ خانیوں سے محفوظ ہو رہی تھی۔ چہرے پر حیا کی لالی بکھری ہوئی تھی۔ بولتی آنکھوں سے خوشی چھلک رہی تھی مگر لیوں پر خاموشی نے اس کے جذبات پر غلبہ پارکھا تھا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد فضا میں مبارک سلامت کی صدا میں بلند ہونے لگیں۔ ایک دوسرے سے بغلیگر ہو کر فتح مندی کے جذبے میں سرشار سسرالی و دیگر رشتے دار کھانسنے پر ٹوٹ پڑے۔ فائزہ کے والدین کی بے بسی اور غصے کا بیانا اتنا لبریز ہو چکا تھا کہ کوشش کے باوجود وہ ول میں اٹھنے والے طوفان کی پردہ داری نہ کر سکے، جسے سسرال والوں نے بھی محسوس کیا۔ جب زین سے بات ہوئی تو اس کے خیالات نے ان کے پاؤں کے نیچے کی زمین سرکادی تھی۔

”آپ نے بیٹی کا سووا بہت کھائے میں کیا ہے، بیٹی تو انمول ہوتی ہے۔ کاش کہ مجھے ماما پہلے سے خبردار کرویتیں کہ آپ کے لالچ کا لیول کتنا ہائی ہے تو ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا..... ہم شریف لوگ ہیں کہ اپنی اس بے وقت کی بے عزتی کو برواشت کر گئے..... ورنہ اٹھ کر جا بھی سکتے تھے۔“ یہاں معاملہ یہی تھا کہ الٹا چور کو تو الٹا کو ڈانٹے..... فائزہ کے والدین رشتے داروں سے بھرے گھر میں اندر ہی اندر کڑھتے ہوئے خاموش رہ گئے..... کیونکہ اس وقت خاموش رہنے میں ہی مصلحت تھی..... وہ دوسری بیٹی کے آنے والے رشتے پر طبع و حرص کی مہر ثبت کر کے اسے تاحیات اپنے گھر بٹھانے کی غلطی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ خاموشی اور صبر و شکر ان کی مجبوری تھی۔ جسے سسرال والے بخوبی جانتے تھے۔ نکاح کے فوراً بعد زبان کی مٹھاس میں کڑواہٹ کی آمیزش نے انہیں پریشان اور فکر مند کر دیا تھا..... کیونکہ بیٹی کی شادی کا پہلا، پہلا تجربہ تھا..... سب کچھ انوکھا لگ رہا تھا۔ بیٹی کے سسرال والے کھانے کے بعد جا چکے تھے۔ فائزہ نے افسروگی میں نکاح کا جوڑا اتار کر پرے پھینک دیا کیونکہ اس نے والدین کی خاموشی میں اک جان لیوا طوفان کو محسوس کر لیا تھا۔ والدین کو آج اپنے جیسے بدل کلاس، سفید پوش اور اپنے وقار و ناموس کو سلامت رکھنے والے بے حساب لوگوں پر بے پناہ رحم آرہا تھا۔ آج سے پہلے انہیں ان مسائل کی خبر کم ہی تھی۔ ان کی حسین و جمیل اور تعلیم یافتہ بیٹی کی یہ قدر ہوگی..... جس کے حقوق کو یوں نظر انداز کیا جائے گا۔ آج وہ بھی مجبوراً حالات کی چکی میں اس بے دروی سے پس جائیں گے اور اس نا انصافی اور ستم ظریفی پر یوں سر تسلیم خم کر لیں گے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا..... رات بھر دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو تسلی و تشفی دینے میں مصروف تھے۔

”ہم کتنے احق نکلے کہ اس خاندان کے بزرگوار حضرات کی زبان پر بھروسہ کر بیٹھے۔۔۔۔۔ ان کی بیٹھی، چکنی چڑی باتوں پر اعتماد کر کے ہم نے۔۔۔ بے وقوفی اور نادانی کا ثبوت دیا ہے اس لیے رونا کس بات کا۔۔۔۔۔ انہیں ہماری ناتجربے کاری اور عاقبت نا اندیشی سے فائدہ اٹھانے کا پورا حق حاصل تھا۔ آف وہ اپنے دھوکے اور فریب سے ہماری عزت پر تھڑمار کر کس قدر شاداں و فرحاں تھے۔ کیا بیٹیوں کے رشتے طے کرنے کا مطلب سراسر بے عزتی اور ندامت ہے تو پھر ہم ان کی شادی کا فیصلہ کیوں کر لیتے ہیں؟ بیگم میں شازہ کی شادی کبھی نہیں کروں گا اس غلطی کا خمیازہ دوبارہ بھگتنے کی مزید سکت نہیں رہی۔ میری کمر ٹوٹ گئی ہے بیگم۔۔۔۔۔ یہ دکھ کسی سے شیر بھی نہیں کر سکتا۔“ وہ روہانی آواز میں بولے۔

”آپ دل چھوٹا مت کریں۔۔۔۔۔ والدین کی بے پناہ محبت اور دولت نہ تو بیٹی کے نصیب بدل سکتی ہے نہ ہی سسرال کی طرف سے مقرر کردہ حق مہر بچی کی قدر و منزلت اور خوشیوں میں اضافہ کر سکتا ہے۔ اگر والدین کے اختیار میں اپنی اولاد کے مقدر بدلنے کا ہتھیار ہوتا تو آج کسی کی بیٹی کلک کا ٹیکا پیشانی پر لگائے واپس اپنے میکے نہ آجیتھی۔۔۔۔۔ گھر آباد ہوتے ہیں بیٹی کے صبر و تحمل سے۔ اپنی ذات کی نفی کرنے سے۔۔۔۔۔ میں نے اپنی بیٹی کی جیسی تربیت کی ہے جیسا ادراک اسے سونپا ہے، مجھے امید ہے وہ اپنی زندگی میں بہت خوش اور کامیاب رہے گی۔“

طیبہ نے اپنی آشفتمند ہمت کو بحال کرتے ہوئے سمجھایا مگر ان کا دل مطمئن نہ ہوا۔۔۔۔۔ سر پکڑے بیٹھے رہے۔

”آپ اپنا رویہ درست کرنے کی کوشش کریں۔۔۔۔۔ ورنہ فائزہ بہت زیادہ پریشان ہو جائے گی اگر اپنی منفی سوچوں کے ہمراہ سسرال جائے گی تو کبھی بس کے نہ دے گی۔۔۔۔۔ دوسرے دن ہی واپس آجائے گی۔“ وہ اپنے دل کے درد کو دباتے

ہوئے خفگی سے بولیں۔

”تم ٹھیک کہتی ہو۔۔۔۔۔ فائزہ بہت خوش اور مطمئن ہے۔۔۔۔۔ دراصل مجھے شرمندگی، افسوس اور پچھتاوا ہو رہا ہے اپنی مجبوری اور اس کی سسرال کے غیر مناسب رویے پر۔۔۔۔۔ حق مہر کی مجھے رتی بھر پروا نہیں۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں اس کی اہمیت اس وقت زیر و ہو جاتی ہے جب بیٹی ہمیشہ کے لیے میکے آجاتی ہے۔ نہ تو سسرال حق مہر دینا چاہتا ہے، نہ ہی اس معاشرے کی عدالت حق مہر ادا کرنے پر بھرپور فیصلہ سنانے کی ہمت رکھتی ہے اور نہ ہی لڑکی کے والدین ان ذلالت و رسوائی کے سکوں سے اپنی بیٹی کے مقدر بدل سکتے ہیں۔۔۔۔۔ کاش کہ میں تمہاری بات مان جاتا تو فرض بخوشی اوا ہو جاتا۔۔۔۔۔“ وہ دل گرفتہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

”کیا بتاؤں کہ اپنی عزت کی خاطر اور رسوائی و بدنامی سے بچنے کے لیے خاموش رہ کر دوسروں کی نظروں میں بڑا پر اپنی نظروں میں چھوٹا محسوس کرنے لگا ہوں۔ تم نہیں جانتیں اپنی ہی نظروں میں گرا ہوا باپ کس کرب و اذیت سے گزر کر سانس لیتا ہے، میں کس قدر بزدل اور کم ہمت پڑ گیا تھا۔ اب سمجھ آئی کہ جب بھی میں نے بچی کی پیدائش کی خبر سنی تو دل اتھاہ گہرائیوں میں کیوں ڈوب جاتا تھا۔ میری سانسوں میں تیزی کیوں آ جاتی تھی۔ اس وقت بھی بے بسی تھی اور آج بھی میں اسی کیفیت میں مبتلا ہوں۔ آہ بچی کی نیک سیرت، حسن اور تعلیم بھی اس کی قدر و قیمت میں اضافہ نہ کر سکے۔“

”فکر نہ کریں حامد جی۔ انہیں بھی اس بے قدری کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ ان کے ہاں بھی دو بیٹیاں موجود ہیں۔ اوپر والا حساب لینے اور انصاف کرنے کو کافی ہے۔ اس پر اپنا معاملہ چھوڑ کر دیکھیں۔۔۔۔۔ انشاء اللہ ان کی عزت کی بقا بھی دوسروں کی مرہونِ منت ہوگی۔ وہ مکافاتِ عمل سے بچ کر

کہاں جائیں گے۔“ وہ نخوت سے بولی۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ ہمارے اختیارات کس قدر محدود ہیں، آج ہم بے اختیار ہو کر دیکھتے ہی رہ جاتے اور میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا اور ہم کچھ نہیں کر سکے۔“ حامد کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔۔۔۔۔ بھرائی ہوئی آواز میں روپ کر بولے۔

”خاندان کا بڑا اپن اور لڑکے کے میچورٹی لیول کو تو میں سمجھ ہی گیا۔ مجھے خدشہ ہے کہ فائزہ کے لیے ہم نے ایک جان لیوا طعنے کا سودا کر لیا ہے۔ جس کی سلامتی اسے رخصتی کے ساتھ ہی سونپ دی جائے گی۔ میری بچی کو تو ڈھنگ سے جواب دینا بھی نہیں آئے گا۔ شازہ اس کی جگہ ہوتی تو مجھے ہرگز فکر نہ ستاتی، فائزہ تو ہر مسئلہ اپنے تک رکھنے کی عادی ہے۔ ان کی سطحی باتوں کو کب تک برداشت کرے گی۔“

”خیر نکلے تو دھوکے باز اور جھوٹے لوگ۔۔۔۔۔ فی الحال ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے۔ ہم بیٹی والے ہیں، یہ معاشرہ ہمارا ساتھ ہرگز نہیں دے گا۔ اس لیے ہمیں بھی تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو کے مطابق چلنا ہوگا۔“ ماں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولے۔

”یہ معاشرہ، ہماری روایات و رسومات میں ان پر تھوکتا ہوں، دیکھتا ہوں کہ مجھے کون روکتا ہے، فیصلہ کرنے سے۔۔۔۔۔ جس میں میری فائزہ کی بہتری ہے ویسا ہی کروں گا۔ اتنا بڑا دھوکا کھانے کے بعد اب مجھے زمانے کا ڈر نہیں رہا۔“ ان کی آنکھیں یہ الفاظ کہتے ہوئے پھر اشکبار ہو گئیں۔ بیوی نے خود پر قابو پا کر ذرا سختی سے انہیں دیکھا۔

”اس کے لیے دعا کریں۔۔۔۔۔ ایسی کیا قیامت آگئی ہے کہ آپ کا رونا نہیں ٹھم رہا۔ عورتوں کی طرح رورہے ہیں۔“ وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے تنہا بولیں۔

”کچھ یاد ہے میرے لیے آپ نے کتنا حق

مہر لکھا تھا، میں بھی تو کسی کی ناز و نعم میں پلنے والی اکلوتی بیٹی تھی۔“

”بیگم۔۔۔۔۔ آج معاشرے کے خود ساختہ اصول ناقابلِ برواشت ہو گئے ہیں۔ پہلے کا زمانہ اور تھا۔۔۔۔۔ ایک دوسرے کی عزت کا پاس ہوتا تھا۔ زبان سے طے کیے ہوئے رشتے بھرپور اعتماد و لحاظ کے ماحول میں سالہا سال تک چلتے تھے۔ ان کا ٹوٹنا تو درد کی بات کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ وہ کافی سنبھل گئے تھے۔

”آج کی دنیا کے اصول اور قانون میں فرق ہے نو دو لیتے خاندانی بن بیٹھے ہیں، خاندانی اپنی شرافت و راست بازی میں کمیں بن گئے ہیں۔“

”چھوڑیں ایسی باتیں، اپنے دل و دماغ کو وسیع رکھیں، کہتے ہیں بیٹی کی شادی اپنے سے اونچے گھرانے میں کرنی چاہیے، اس بات میں بہت گہرائی ہے، ہم نے اپنی بچی کے لیے فیصلہ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہے، دیکھیے گا راج کرے گی ہماری بچی۔۔۔۔۔ بس ہمیں عقل و سمجھ سے کام لینا ہے۔“ ماں نے ظاہر آشوبی سے کہا۔

”تمہاری آنکھوں اور زبان میں بہت تضاد ہے۔“ وہ بیوی کی اداس آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

”تم ماں ہو بھلا اپنا دکھ و روکیے چھپا سکتی ہو۔ بے جا برواشت سے کام نہ لو۔ تمہارا دل کہیں پھٹ ہی نہ جائے۔ جی بھر کر رولو۔۔۔۔۔ میری خاطر خود پر جبر مت کرو۔۔۔۔۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔“

”کیا کروں ول کو جھوٹی تسلیاں دے رہی ہوں۔۔۔۔۔ بے شک دولت کے لحاظ سے ہم سے وہ بہت آگے ہیں۔ مگر عقل و شعور جیسی دولت سے خالی ہیں۔“ وہ تڑپتے ہوئے بولیں اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

”تم حوصلہ کرو۔۔۔۔۔ میں اس خاندان کے

بارے میں مزید جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا..... بچی ابھی ہمارے گھر میں ہے..... ہم اسے رخصت نہیں کرنا چاہیں گے تو کیا وہ..... خدا نخواستہ اٹھا کر لے جائیں گے۔“ وہ بے اختیار ہو کر بیوی کے آنسو صاف کرنے لگے۔ ”اب میں کسی مجبوری میں آنے والا نہیں..... ہم یہ رشتہ توڑ دیں گے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“

”ایسا مت سوچیے گا۔ نکاح کا ٹوٹ جانا تو بہ استغفار کون قبول کرے گا دوسری بار ہماری بچی کو..... ہر طرف سے قصور وار لڑکی والوں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ دوسری بیٹی جو ان ہے، کیا آپ اسے تمام عمر کنواری بٹھانا چاہتے ہیں؟ اللہ کا نام لے کر شادی کی تیاری شروع کرتے ہیں..... دو مہینوں میں ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ زیورات تو گھر سے نکل آئیں گے۔ باقی کے لیے پیسے کی ضرورت ہوگی۔“ وہ لہجہ کو نارمل کرتے ہوئے بولی۔

”جہیز.....؟ بھول جاؤ جہیز کو..... ایک پائی کی چیز ان دھوکے بازوں کے گھر میں نہیں جائے گی۔“ وہ تقریباً چیخ اٹھے۔

”ہم نے جہیز اپنی بیٹی کو دینا ہے..... اسے ضرورت کی ہر چیز دوں گی اور بہت اعلیٰ دوں گی۔ ہماری دو بیٹی تو بیٹیاں ہیں، سب کچھ انہی کا تو ہے۔“

”مانتا ہوں لیکن اس وقت ذرا سوچ بچار سے کام لو۔ پہلے بیٹی کو تو اس گھر میں بسنے دو پھر فیصلہ کریں گے کہ اس کے لیے کیا کیا جائے، فی الحال مجھے ان پر رتی بھرا اعتماد نہیں رہا۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولے۔

”ناجی کی باتیں اور جلد بازی کے فیصلے ہمیں زیب نہیں دیتے۔ والدین اپنی حیات میں بیٹی کے تمام فرائض سے سبکدوش ہو کر سرخروئی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ورنہ ان کے بعد بیٹی کے لیے سراسر بدنامی و رسوائی ہی ہے۔ سانس لیتی دو بھر ہو جاتی ہے انکی لڑکی کے لیے پھر ہماری بچیاں تو بہن بھائی اور

بن چچا، ماموں کے ہیں۔ ہمارے بعد ان کا سہارا کون بنے گا..... کون ان کی ذمہ داری اٹھائے گا؟ اس لیے بہتر ہے کہ ہماری دونوں بچیاں ہماری حیات میں ہی وقت سے اپنے، اپنے گھروں کو سیدھا رہ جائیں۔ آپ ان کی آبادی کے لیے دعا مانگیں نہ کہ بربادی اور بدنامی کا گڑھا کھود کر انہیں اس میں دھکا دے ڈالیں اور وہ عمر بھر آپ کو کوئی رہیں۔ میں اس کی اجازت آپ کو ہرگز نہیں دوں گی۔ ان کے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرنی ضروری ہے۔ کل سے ہی میں شازہ کے رشتے کی بھی فکر کرتی ہوں ایک دو لوگوں نے کہہ رکھا ہے۔“ بیگم کی بات پردہ ایک آہ بھر کر رہ گئی۔

☆☆☆

”وہ دلہن کے روپ میں اور بھی حسین اور پرکشش لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شرم و حیا کی لالی تو بھی ہی آج اور نمایاں ہو گئی تھی۔ اس کی چارہ دو جیٹھانیاں، تین عدد نندیں تمام رسموں اور نیگ وصول کرنے کے بعد کمرے میں اس کے ارد گرد بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑی جیٹھانی کی آواز تیر کے مانند اس کے کانوں کو چیرتی ہوئی کمرے کی معطر فضا کو زہر آلود کر گئی۔“

”جو لوگ پانچ لاکھ حق مہر کی ڈیمانڈ کرتے ہیں وہ بیٹی کو پچاس لاکھ کا جہیز دینے کی حیثیت تو ضرور رکھتے ہیں۔ فائزہ ہم آج سے نہیں ہیں۔ ذرا بتاؤ تو تمہارے والدین نے ایسا کیوں کیا.....؟“ اپنی حیثیت بھول گئی تھی کیا.....؟ بھیجی بچی بات کہیں میں تو اس بے انصافی پر شور برپا کر دیتی اور ہم چاروں بہویں وہاں سے سیدھی اپنے میکے سدھا رہا جاتیں اچھا ہی ہوا کہ ماں جی اس وقت عقل دکھا گئیں۔

”میرے ساتھ بھی تو انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ ہم نے سوچا۔ کون سے ایسے سُرخاب کے پر لگے ہیں محترمہ کو..... جو اتنی بڑی قیمت لگا دی۔ چلو یہ بھی خوب

رہی کہ میوزک سسٹم اور فی وی کے بغیر زندگی گزارنا مشکل تھی..... ورنہ یہ بھی دلہن کے ساتھ نہ آتے۔“

”اپنے کمرے میں الگ دنیا بسائے گی۔ کمپیوٹر، موبائل، ٹی وی اور میوزک سسٹم کے ہوتے ہوئے ہماری کیا وقعت ہے بھئی۔“ دوسری اور تیسری نے بھی بھویں چڑھا کر کہا۔

”اس وقت ایسی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے..... لمبی عمر پڑی ہے حساب کتاب چکانے کو۔“

”ویسے آپس کی بات ہے..... اپنے دل بہلاوے کی تو ہر شے لے کر آئی ہے، ویسے دلہن تو بہت عقلمند نکلی.....“ چوتھی نے کندھے اچکا کر کہا۔

”پڑھی لکھی بھولانے کا مزہ تو خوب آئے گا ہماری سسرال کو۔“

بچے تک جاری رہا..... نیند میں بچکولے کھاتی ہوئی وہیں طوعا و کرہا نیکی سے ٹیک لگائے ان کی بے بسی پر ماتم کرتی رہی۔

صبح ہوئی عموماً دلہن کا ناشتا رسم و رواج کے مطابق میکے کی طرف سے آتا ہے، ساس فون پر اس کی ماں کو اپنی فرمائش کے مطابق ناشتے کا مینیو اور مقدار لکھوا کر بے فکر ہو گئی تھیں۔ چاروں جیٹھانیاں بچوں سمیت رات کو ہی اپنے، اپنے گھروں کو جا چکی تھیں..... ناشتے کی آمد کے ساتھ ہی وہ اپنی فوج کے ہمراہ وارد ہو گئیں..... ناشتا ٹیبل پر رکھتے ہوئے انہوں نے ناشتے کی ہر ڈش پر نکتہ چینی کی اور ماضی میں آنے والے ان کے والدین کی جانب سے ناشتے بے مثال اور لائق بن گئے۔

☆☆☆

شادی کو دو سال ہو چکے تھے۔ فائزہ حاملہ بھی ہو چکی تھی کہ یک دم تندر کے بے حد اصرار پر بہنی مون باسی ہی سہی..... تھا تو بہنی مون جھٹ پٹ بہنی مون کا پروگرام بنالیا۔ دونوں نے سوات جانے کی تمام تیاریاں رات کو ہی مکمل کر لیں..... دو بیک کار بیڈور میں رکھ دیے گئے کیونکہ علی الصباح انہوں نے نکلتا تھا۔ صبح کیا دیکھتے ہیں کہ تین بیک مع دو بہنوں کے ان کے منتظر ہیں۔ زین نے بظاہر حیرت کا اظہار کرنے کو منہ کھولنا چاہا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

فائزہ تذبذب کے عالم میں گھری گاڑی میں بیٹھ گئی اور تمام راستے خاموشی سے بہنوں اور ان کے بھائی کی باتیں لطفیے اور پہلیاں سنتی رہی۔ یہ کیسا بہنی مون تھا وہ پوچھنے سے قاصر تھی۔ میٹکورہ میں ہوٹل کا ویلو بہت خوب صورت تھا لیکن میزوں کے رش کی وجہ سے انہیں دو کے بجائے ایک ہی کمر امل سکا..... رات بھر لوڈ واور کیرم کی بازیاں چلتی رہیں۔ فائزہ کی طبیعت طویل سفر نے خاصی خراب کر دی تھی۔ رات اسی غل غپاڑے میں بہ مشکل گزری..... اسے ان کی

ایشل کو پیش چیر سے نکال کر بیڈ پر لٹا دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی لیٹ کر اسے دودھ پلاتے ہوئے اپنی زندگی کے ایک اہم فیصلے پر ذہن کو تیار کرنے لگی۔ ہچکیاں لیتی ہوئی ایشل نے دودھ پیتے ہی سکون کی سانس لی اور غنودگی میں اپنی بھوک مٹاتی رہی اور ماں کو ذہنی و دلی طور پر مضبوطی کی جانب گامزن کرتی رہی۔ فیصلہ کرتے ہی فائزہ بھی گہری نیند میں چلی گئی۔ دروازہ کھٹکے اور ساس کی زہر میں۔ ڈوبی ہوئی آواز پر وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اسے چند لمحے سنبھلنے میں لگے۔ پجوشن کو سمجھتے ہی وہ ڈھٹائی اور بے پروائی کا اظہار کرتے ہوئے لیٹ گئی۔

”نواب زادی صاحبہ ذرا دقت ہی دیکھ لیا ہوتا۔۔۔۔۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے اور تم آرام فرما رہی ہو۔“ وہ خاموشی سے ساس کو دیکھنے لگی آج اس کی آنکھوں میں نہ خوف و ڈر تھا نہ ہی کسی قسم کے خدشات تھے۔ مکمل طور پر طمانیت تھی۔

”یہ لڑکیاں بڑی ڈھیٹ ہوتی ہیں، چند گھنٹے دودھ نہ ملنے پر مرنے لگتی ہیں۔ تم نے ٹھیک ٹاکم پر بہانہ تراشا ہے، مان گئی ہوں تمہاری شاطرانہ چال کو اگر ہم نے حق مہر لکھ کر تمہیں وزنی کر دیا ہوتا تو آج تم اس گھر کی مالکین اور میں نوکرانی ہوتی۔۔۔۔۔ مالکین بننے کے لیے پہلے نوکرانی کے روپ کو اپنانا پڑتا ہے۔ جرنیل پہلے دن سے جرنیل نہیں ہوتا۔ بے چارہ۔۔۔۔۔ رگڑے کھاتے، کھاتے یہاں تک پہنچتا ہے۔“ ساس قہر آلود نگاہوں سے گھورتی ہوئی زہرا گل رہی تھیں۔ فائزہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

”فازی میرے کپڑے کہاں ہیں؟ اور تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ ہمیں ہال میں سب سے پہلے پہنچنا چاہیے۔۔۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں حرا کے سسرال والے دیکھ لیں۔ ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔“ زین نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کاٹ دار لہجے میں کہا۔

والے ہوتے تو مجھے سسرال کے طعنے و تشنے گھائل نہ کرتے کیونکہ تم میرا مرہم ہوتے۔ اپنے پیار اور توجہ سے میرے دل کو سکون و اطمینان سے ہمکنار رکھتے۔“ وہ ہر وقت اپنی سوچوں میں الجھی رہتی۔ اور کم مائیگی کا احساس بتدریج بڑھتا چلا جاتا۔

☆☆☆

آج گھر میں خوب گہما گہمی تھی۔ زین کے والدین خوشی سے پھولے نہیں سارے تھے کیونکہ ان کی بیٹی حرا کا آج نکاح تھا۔ حرا کا منگیتر کینیڈا کا رہائشی تھا۔ حرا کے والدین نے ویزے کے حصول کے لیے صرف نکاح کو ہی ضروری سمجھا تا کہ ان کی بیٹی شادی کے فوراً بعد شوہر کے ساتھ کینیڈا جاسکے۔ انہیں سسرال کی خدمت گزاری کے لیے حرا کو یہاں چھوڑ جانا زیادتی اور بے انصافی لگ رہی تھی۔ انہوں نے حق مہر بھی پچاس لاکھ لکھوانے کی شرط پیش کی تھی جو ان لوگوں نے بخوشی قبول کر لی تھی۔ سو تو لے سونا اور طلاق کا حق بھی حرا کو حاصل تھا۔ اس صورت حال میں فائزہ کے لیے لعن طعن اور طنز میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ آتے جاتے فائزہ پر نشتر چلائے جا رہے تھے کہ ہماری بیٹی جن حقوق کے قابل تھی اسے سسرال نے فوراً بخش دیے ہیں۔ اور وہ ان کے اس روئے پر خاموش تھی۔ چند ماہ کی بیٹی کو پیش چیر میں ڈالے گھر کے کاموں میں مصروف تھی۔ نہ اسے کپڑے بدلنے کا ہوش تھا، نہ ہی بچی کو دودھ پلانے کا وقت تھا۔ وہ رو رو کے نڈھال ہو کر خود ہی سوچتی ہوئی۔ فائزہ نے اپنی ماما کو فون کر کے ایشل کو ان کے حوالے کرنا چاہا تا کہ اسے وقت پر کھانا پینا اور آرام مل سکے۔ یہ سن کر گھر میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ زین نے اسے بھی گھر سے نکل جانے کی دھمکی دی۔ فائزہ آئے دن اس قسم کی دھمکیاں اور بے جا تڑیاں سنتی آئی تھی۔ جنہیں زین کی ذہنی ناچنگی کا نام دے کر ٹال جاتی۔ آج کی دھمکی نے اس کی غیرت کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اس نے

نہیں لگا تھا۔۔۔۔۔ سمجھانا اور احساس دلانا تو دور کی بات تھی۔ بعض اوقات اسے اپنی پرکینینسی اک غلامی اک گناہ لگنے لگتی۔ جس کی یاداش سے لکھنا محال ہو گیا۔۔۔۔۔ اس کے نتیجے میں اس کی خود اعتمادی ختم ہونے کے رہ گئی اور وہ گولڈ میڈلسٹ فائزہ فقط ایک روایتی بہو اور بیوی بن کر رہ گئی تھی۔

اور یہ ہر آنے جانے والوں کی تعجب کا نشانہ بنتی چلی گئی۔ زین اپنی ہی دنیا میں مگن تھا۔ وہ مل کلاس کا روایتی خاوند تھا۔۔۔۔۔ جس کی نظر میں بیوی کی حیثیت ایک لونڈی سے بڑھ کر ہر گز نہیں تھی۔ اس کے حسن و سلیقے کی تعریف تو کیا۔۔۔۔۔ کبھی نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کی تعلیم نے بھی کسی کو متاثر نہیں کیا تھا۔ آئے دن اسے ہر ایک سے ایسی باتیں سننے کو پڑتی رہتی تھیں کہ ”آج کل چماروں کی بیٹیاں بھی ایم ای اے کر رہی ہیں۔ تم نے ایسا کون سا کمال کر دیا ہے کہ خڑہ اور غرور ہی ختم ہی نہیں ہو رہا۔“

☆☆☆

سسرال اور شوہر کے سرد روئے اور شک آمیز سلوک نے اس کا جینا دو بھر کر دیا۔ والدین کی فکر مندی اور اندیشوں نے بھی اسے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر اس کا حق مہر، ان کا من چاہا لکھ دیا جاتا تو اس کی اتنی بے قدری ہر گز نہیں ہوتی۔ ساس اور زندوں کا روئے روایتی نہ ہوتا۔۔۔۔۔ ہم عمر ہونے کی وجہ سے اب تک ان میں دوستی کا رشتہ استوار ہو چکا ہوتا۔ اور وہ شوہر کی بے توجہی و بے پروائی کا شکار نہ ہوتی۔۔۔۔۔ اگر انہیں حق مہر ادا کرنے کا خوف ہوتا تو آج حالات اتنے ناسازگار ہر گز نہ ہوتے۔۔۔۔۔ وہ بھی سراٹھا کر اس گھر میں باعزت زندگی گزار رہی ہوتی۔

”اب تو میں نشیب ہوں کہ ہر لمحے بہاؤ کا رخ میری طرف ہے۔۔۔۔۔ بھی ٹھنڈے تو بھی گرم حالات میں غوطے کھاتی ہوئی کب تک سانسوں کا تسلسل قائم رکھ سکوں گی۔ زین تم اچھے ہوتے، میری پروا کرے

بے حسی کا احساس تو پہلے دن ہی سے ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ نو مہینوں میں بیسیوں مواقع ایسے آئے تھے کہ نہ میاں کو اس کی پرائیویسی کی پروا ہوئی۔۔۔۔۔ نہ آرام کا خیال آیا۔۔۔۔۔ نہ ہی اس کی ذات کو اہم تصور کیا گیا تھا۔ باقی گھر کے افراد سے کیا توقع رکھ سکتی تھی۔ جس کے دل میں جو آواز زبان ادا کرتی چلی جاتی کسی کا دل دکھے یا ٹوٹے ان کی بلا سے۔

☆☆☆

”زین۔۔۔۔۔! کیا ہم آپ کے دوسرے بھائیوں کی طرح اپنی الگ دنیا نہیں بسا سکتے۔ میں یہاں ہر وقت کی لعن طعن سے تنگ آگئی ہوں۔ لیتی ہوں تو بیٹھنے کی تلقین کی جاتی ہے، بیٹھتی ہوں تو ایک پاؤں پر کھڑا رہنے کا حکم مل جاتا ہے۔ ملازمہ کی چھٹی گر کے تمام کام میرے ذمے لگا دیے ہیں۔ مجھ سے جھاڑو پوچا نہیں ہوتا، نیچے بیٹھ کر کام کرنا میرے لیے بہت مشکل ہو گیا ہے۔“ وہ زین سے کہتے، کہتے رک گئی کیونکہ پہلے بھی کئی بار ڈھکے چھپے لفظوں میں تذکرہ کر چکی تھی۔ جس کا زین نے مختصر جواب دے کر بات کو وہیں پر ختم کر دیا کرتا تھا۔

”تمہیں غلط فہمی ہے۔ ایسا ہر گز نہیں۔ دیکھو فائزہ ماں جی نے آٹھ بچے پیدا کیے ہیں۔ ایسی ہی مشکلوں اور تکلیفوں سے۔۔۔۔۔ تمہارے لیے کیا بہتر ہے وہ بخوبی جانتی ہیں۔ ڈاکٹر بھی یہی کہہ رہی تھی کہ چلو پھرو۔۔۔۔۔ کام کاج اور روزش کرتی رہو، ڈیوری میں آسانی رہتی ہے۔ وہ تمہارے لیے ہر وقت فکر مند رہتی ہیں۔ شک کی دنیا سے باہر نکل کر دیکھو۔“ وہ نئی سے بولا۔

”ایک ڈیوری کی آسانی کے لیے نو مہینے بچکی کے پاٹ میں بستی رہوں۔ میرے وجود اور اس میں پلٹنے والے بچے کو سکون و آرام چاہیے۔ زین آپ کو میری تکلیف کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔“ وہ شوہر کی طرف بے بسی سے دیکھ کر سوچنے لگی۔ مگر اس کے رُتبے کے لحاظ میں آگے سے جواب دینا مناسب

”محترمہ بچی کے بہانے سو رہی تھیں، گھر میں تل رکھنے کی جگہ نہیں اور یہ ہے کہ سب سے لا تعلق ایک پورشن یہ قبضہ جمائے بیٹھی ہے۔ تم بھی جو روکے غلام ہی نکلتے..... اس کی ہر بات پر جی حضوری..... دیکھنا خوب مزہ چکھائے گی نہیں۔“ ساس نے ہاتھ نچا کے کہا۔

”ماما..... ایسی بات نہیں..... مہمانوں کے لیے پورا پورشن حاضر ہے۔ ہم تو کہیں بھی اپنا فرش محمدی لگائیں گے۔“ زین نے ماں کے کندھے دباتے ہوئے کہا۔

”پورا پورشن حاضر ہے، ہونہ..... یہ تمہاری دھرم بتی کسی کو منہ لگائے گی تو کوئی اوپر قدم رکھنے کی جرات کرے گا ناں.....“ وہ نخوت سے بولیں۔ اس شور میں ایٹل جاگ کر رونے لگی اور ساس بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ زین نے بیٹگر سے کپڑے اتارتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

”فائزہ تمہیں کپڑے استری کرنے کا سلیقہ سکھانا پڑے گا یہ دیکھو کالر..... اور پیسٹ کی ڈبل کریم تمہارا جی پی اے ڈیسا نڈ کرنے والے بھی بے وقوف ہی تھے جو گولڈ میڈل تمہا دیا تھا۔ مجھے تو اس معصوم کی فکر کھائے جاتی ہے۔ تمہاری نا اہلی کی سزا اسے مل کر رہے گی۔“

”زین آئی تھنک کہ بہت ہو گئی۔ تقریباً تین سال سے میں ایسی ہی انسٹلنگ باتیں سن رہی ہوں مگر اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے قابل نہیں ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے بنے ہی نہیں۔ کہیں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے جوڑا بنتے ہوئے ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ ہم دونوں کی صحت کے لیے بہتر ہوگا۔“ فائزہ بیڈ سے نیچے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

”نان سٹپس..... اب زبان کو لگام دو..... جب بھی بولتی ہو..... انگارے ہی نکالتی ہو..... اس وقت ایسی باتیں کرنا تمہاری نادانی اور کم عقلی کا ثبوت

ہے۔ یہ سونے کا وقت تھا کہ مہمانوں کی آؤ بھگت ضروری تھی؟ نیچے بھابیاں کب کی آچکی ہیں، تم نے مجھے ان کے سامنے خوب شرمندہ کیا ہے۔“ وہ ہاتھ روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے پاس دس منٹ ہیں، اگر بروقت تیار نہ ہوئیں تو پھر گھر میں ہی اپنی تقدیر کو روٹا..... تم نے تو میرا دماغ ہی خراب کر دیا ہے۔“ وہ تنگ کر بولا۔

”میں کہیں نہیں جا رہی..... کیونکہ میں آپ کی بھابیوں سے کمتر عورت ہوں۔ مجھ میں عقل و شعور ہے نہ ہی سمجھ بوجھ..... مجھے میرے میکے پہنچا دیجیے..... اگر میرے لیے آپ کے پاس وقت نہیں تو میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔“ وہ سنجیدگی سے اکڑ کر بولی تو زین ششدر رہ گیا۔ غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا کیونکہ آج سے پہلے تو وہ دھمکیاں دیا کرتا تھا آج بیوی کی طرف سے دھمکی حیران کن تھی۔

”میں نے آپ کی طرح صرف دھمکی نہیں دی..... اپنا اٹل فیصلہ سنایا ہے۔ جسے بدلنا ناممکن ہے۔“ فائزہ نے سنجیدگی سے کہا اور کمرے سے ملحق اسٹور کی طرف بڑھ گئی۔

”سوچ لو..... کہ تم اس رشتے کو توڑنے پر تیار مگنی ہو، اس ڈرامے کے لیے وقت اور دن منتخب کرنے کی داد دیتا ہوں۔ تمہاری تعلیم نے تمہیں یہی درس دیا ہے کہ نازک حالات کا فائدہ اٹھاؤ۔“ وہ اسٹور کے دروازے پر کھڑا غیظ و غضب سے بولے جا رہا تھا۔

”یہ رشتہ تو اسی دن ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ جب آپ نے میرے والدین کو بیٹی کا سودا کرنے کا طعنہ دیا تھا۔ خاموشی اور صبر ان کی بہت بڑی غلطی تھی۔ والدین کیوں بھول جاتے ہیں کہ کل یہی بیٹی ایک نہیں دو یا تین کی صورت میں واپس ان پر نازل ہونے والی ہے۔ جس رشتے کی بنیاد میں ہی دھوکے بازی، فریب اور خود غرضی کی انتہا ہو وہ پایہ تکمیل تک

کبھی پہنچ سکتا ہے..... میرے والدین کی مصومیت اور شرافت کا قصور ہے..... سزا میں بھگت رہی ہوں۔“ وہ اٹیچی میں کپڑے ٹھونستے ہوئے بولی۔

”اب میرے ساتھ انہیں بھی سزا کاٹی ہوگی..... میں نے کوئی لو میرج نہیں کی تھی کہ واپس جانے میں ہچکچاہٹ محسوس کروں..... اپنے فیصلے کا مزہ وہ بھی چکھ ہی لیں۔“

”بچی رو رو کر ہلکان ہو گئی ہے۔ اٹھو یہاں سے۔“ وہ اس کے ہاتھ سے کپڑے پکڑتے ہوئے بولا۔ ”اسے جا کر دودھ پلاؤ۔“

”لڑکی ہے مر نہیں جائے گی۔“ وہ طنز یہ لہجے میں بولی۔

”اس موضوع پر بعد میں ڈسکشن کی جاسکتی ہے۔“ وہ قدرے دھیمپا پڑ گیا کیونکہ مصلحت اسی میں تھی۔ پہلی بار فائزہ کا غصہ لاوے کی طرح پھٹا تھا لیکن فائزہ پھرتی سے کپڑے اٹیچی میں رکھتی رہی۔

زین کو اس کی تیاری اور دھمکی مزاحیہ ڈراما نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے رویے میں سنجیدگی، احتجاج اور غلطی کو وہ محسوس کر کے دہل سا گیا تھا۔ سر کو جھٹک کر واش روم کی طرف بڑھ گیا..... اور فائزہ کے ہاتھ سرعت سے چلنے لگے۔

☆☆☆

”بیٹا! تمہارا فیصلہ ہرگز درست نہیں..... آج تمہاری نند کا نکاح ہے، تمہارے سسرال والے اپنے رشتے داروں کو تمہاری غیر موجودگی کا کیا جواز پیش کریں گے۔ اب بھی وقت ہے، تیار ہو کر ہال میں پہنچ جاؤ..... ورنہ آج کا گزر جانے والا قیمتی وقت واپس نہیں آئے گا۔ تاحیات ان لمحوں کی واپسی کی تمنا میں خود کو لعنت ملامت کرتی رہو گی..... مگر لا حاصل ہی رہو گی۔“ ماں نے نرمی اور سختی بھرے لہجے میں سمجھانا چاہا۔

”ماما! میں اسی جگہ واپس جانے کے لیے نہیں

آئی۔ میں نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے..... آپ نے مجھے جس وقت کا مقابلہ کرنے کے لیے تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا تھا۔ وہ تو میرے سامنے ہاتھ پھیلائے مجھے خوش آمدید کہہ رہا ہے۔“ وہ پرتسکین طویل سانس لے کر بولی۔

”عورت کے لیے ہر معاشرے میں مرد کا ساتھ چاہیے ہوتا ہے، عورت اکیلی زندگی گزارنے کی ہمت و حوصلہ رکھتی ہوتی تو ہمیں آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا میری بچی..... مرد کے سائے میں تم اپنی عزت و تحریم کو محفوظ رکھ سکتی ہو بیٹی، تمہارا اس طرح کا فعل تمہاری تعلیم و تربیت کے لیے گالی بن جائے گا یہ جان لو کہ شادی شدہ عورت کو اپنی آنکھیں اور کان بند رکھ کر دوسروں کی خوشی اور طمانیت کی خاطر خود پر جبر کر کے مسکرانا پڑتا ہے۔ اسی میں ہماری بقا ہے بچی..... زین کو فون کر دو کہ تمہیں یہاں سے پک کر لے۔“ ماں نے ملائمت سے کہا۔ ”مجھے کپڑے نکال دو، میں استری کیے دیتی ہوں۔“

”ماما.....! ان نصیحتوں کی میرے پاس اب کوئی اہمیت نہیں رہی۔ میں ایک کمزور اور بزدل مرد کے سہارے کے بنا بھی زندہ رہ سکتی ہوں۔ اگر میرا سائبان مضبوط ہوتا تو پھر فیصلہ کرنا میرے لیے بہت مشکل ہوتا۔ میں نہ تو وہاں لونڈی بن کر اپنی انا اور غیرت کو ان کی خواہشات کی بھیجیٹ چڑھا سکتی ہوں، نہ ہی مجھ میں بے وجہ قربانی اور ایثار کا جذبہ ہے۔ میں آپ سے مختلف ہوں ماما..... اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو شکل صورت میں ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے تو کردار و فطرت میں بھی ایک جیسے نہیں..... آپ سڑگوں کرنے میں فخر محسوس کرتی ہیں تو میں سراٹھا کر گردن تان کر چلنے میں آن بان بٹھتی ہوں۔“ وہ لہجے کو مدغم رکھتے ہوئے بولی۔ ”تین سال کا عرصہ میں نے خود پر جبر و زیادتی میں گزارا ہے۔ کیا یہ گناہ کبیرہ ہے ماما.....؟“

”تم اپنے گھر سدھارو..... ہنسی خوشی آؤ.....
میاں اور ساس کی اجازت کے بغیر میرے گھر کی دلہیز
پار کرنے کی کوشش بھی کی تو تمہیں اٹے پاؤں واپس
جانا پڑے گا۔“ ماں غیظ و غضب سے بولیں۔
”بیٹا تعلیم کا مقصد پڑی سے اترنے کا ہرگز
نہیں..... ایک تو آج کل کی لڑکیوں نے ایک
دوسرے کی دیکھا دیکھی اپنے رنگ ڈھنگ ہی بدل
ڈالے ہیں۔ میرے رنگ میں رنگی رہو..... سکون و
اطمینان اسی میں ہے۔“ طیبہ نے اسی وقت زین کو
کال کی تو فائزہ ماں کی بے بسی پر ششدر رہ گئی.....
اور سرگوشی کے انداز میں بے بسی سے بولی۔

”ماما آپ ان دھوکے بازوں کو جانتے ہو جتھے
ہوئے مجھ پر ظلم ڈھارہی ہیں..... میں وہاں ہرگز
نہیں جاؤں گی..... انہوں نے مجھے نہایت چال بازی
سے بن مول ہی حاصل کر لیا تھا..... اور آپ نے بھی
اعتراض کیا نہ انکار..... بس انہیں پکڑا دیا۔“

”بات کرو..... زین فون پر ہے.....“ ماں نے
آنکھیں نکالتے ہوئے آہستگی سے کہا تو طوعاً و کرہاً
فائزہ نے موبائل ماں کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔

”اگر غصہ اتر گیا ہے تو تمہیں لینے
آ جاؤں.....؟“ زین نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
”اگر آپ کو اس حقیقت کا علم ہو چکا ہے کہ آپ کی
بیوی کا شمار انسانوں کی فہرست میں ہوتا ہے تو.....
بے شک لینے آ جائیں..... ورنہ اس کی ضرورت نہیں۔“

وہ سنجیدگی سے بولی۔

”یار ہم برادری کو خواہ مخواہ چہ گوئیوں کی
اجازت کیونکر دیں۔ ہمارا اپنا مسئلہ ہے، مل جل کر اس
کا حل تلاش کر لیں گے۔“ وہ اپنا ہاتھ بھرے لہجے میں
بولتا تو فائزہ کے غصے کی آنچ بھی قدرے مدھم پڑ گئی۔

”پھر پھرے لیے کیا حکم ہے، بندہ خاک کی حاضر
ہو سکتا ہے؟“ وہ پھر ملاحت اور اپنائیت سے بولا تو
اس کی آنکھیں خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات سے

بھر گئیں۔

”خاموش کیوں ہو جانم.....؟ تمہاری عدم
موجودگی میں حرا کا نکاح کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ اب
پیارے لہجے میں بولا۔

”اس بارونق ماحول میں تم اداسی اور مایوسی
چھوڑ گئی ہو میری جان۔“

”جانتی ہوں..... اس وقت تمہیں میری
ضرورت ہے..... جیسی اس زبان میں سوائے حلاوت
کے اور کچھ نہیں رہا.....“ وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی۔
”خود غرض اور مطلب پرست کہیں کا۔“

”خاموشی کا مطلب ہے رضا مندی.....
ہے ناں یہی بات.....“ وہ خوش دلی سے بولا۔

”جی.....“ اس نے ماں کی خوشخوار نگاہوں میں
اک پارینہ داستان پڑھ کر مجبوراً کہا۔ تو دوسری طرف سے
اک خوشگوار قہقہہ اسے مزید ترپا گیا۔ جیسے اس کا سفر
اڑایا جا رہا ہو..... کہ بس اتنی سی ہی ہمت تھی کہ پل بھر
میں بے دم ہو گئی ہو۔

”تم تیار ہو جاؤ..... میں آدھے گھنٹے میں پہنچ
جاؤں گا..... ویسے تم نے بھی حد ہی کر دی ہے۔“ وہ
سنجیدہ ہو چکا تھا۔ فائزہ نے فون بند کر دیا اور سر پکڑ کر
بیٹھ گئی..... ماں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن
فائزہ گوئی اور بھری بن کر بیٹھ رہی..... اسے بحث و
مباحثہ کرنا بالکل فضول اور وقت کا زیاں لگ رہا تھا۔

☆☆☆

نکاح کے فنکشن میں سب سے آخر میں پہنچنے
والی فائزہ کو ہر ایک نے حیرت سے دیکھتے ہوئے
بیسویں سوال کر ڈالے تھے۔ زین کے کہنے کے
مطابق وہ ہر ایک کو بچی کی طبیعت خراب ہونے اور
ڈاکٹر سے مشورہ لینے کا بہانہ پیش کر رہی تھی..... اور
خود کو مسلسل کو سے جاری تھی کہ اس نے ایسا باغیانہ
فیصلہ کرنے سے پہلے اپنی ماں سے مشورہ ہی لے لیا
ہوتا تو آج اپنی نادانی پر زین کے سامنے کبھی نہ

ہوتی۔ نکاح سے فارغ ہونے کے بعد سب اپنے اپنے
گھروں کو سدھار گئے۔ گاڑی میں زین کے پہلو میں
فائزہ خاموش بیٹھی تھی..... دونوں ہی اپنے اپنے
زاویے سے سوچے جا رہے تھے۔ ایشل سوئی ہوئی
تھی اس لیے سوچوں کے تانے بانے میں کسی اور کی
شمولیت نہیں تھی۔ سوچیں گہری اور گہمیں تھیں۔ سفر
کیسے کتنا..... فائزہ کو اندازہ ہی نہیں ہوا..... جب
گاڑی ایک گھر کے گیٹ کے سامنے جھکے سے رکی تو وہ
ایک دم سے ٹھگی اور زین کی طرف سوالیہ نظروں سے
دیکھنے لگی۔ ماجرا سمجھ نہ آیا..... کہ اسے سسرال کے
بجائے میکے لانے کا مقصد وہ بھی رات کے ایک بجے
کیا ہے.....؟

”تھینک یو ویری مچ کہ تم نے میری عزت رکھ
لی۔ اس احسان کے بدلے تم جب تک میکے رہنا
چاہتی ہو میری طرف سے کوئی روک ٹوک
نہیں ہوگی۔“ لہجہ کاٹ دار تھا..... وہ ترپا اٹھی۔
”میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں زین۔“

”کون سا اپنا گھر.....؟“ وہ سرد مہری سے
بولی۔

”آپ نے بالکل درست سوال کیا ہے.....
میرا تو کوئی گھر ہی نہیں ہے زین، نہ تو والد کا گھر نہ ہی
شوہر کے گھر پر میرا مان ہے۔ یہ گھر پرایا ہوئے تین
سال بیت گئے ہیں۔ یہاں مجھے کوئی نہیں بجائے
گا..... آپ مجھے چوراہے میں اتار دیجیے..... یا کسی
جنگل و بیاباں میں چھوڑ آئیں..... دونوں صورتوں
میں درندوں اور بھیڑیوں کا لقمہ اجل بن جاؤں گی۔
آپ کی گلو خلاصی بھی ہو جائے گی..... میں بھی اس
دکھوں، اذیتوں اور نفرتوں کی آماجگاہ سے رہائی پا
جاؤں گی..... میں آپ کی بیٹی پر ہرگز زیادتی و بے
انصافی نہیں کروں گی۔ اسے اپنے ساتھ لے جائے گا
اس کے عارضی اور وقتی ٹھکانے پر اور بالآخر آپ کی
بیٹی کا انجام بھی اس کی ماں جیسا ہی ہوگا..... کیونکہ اس

بے نشان اور بے وقعت ذات جسے عورت کہتے ہیں
کے ساتھ ہر دور میں ایسا ہی ستم ہوتا آیا ہے تو آپ کی
بیٹی اور بہنیں کیسے محفوظ رہ سکتی ہیں۔“ فائزہ نے زہر
آلود لہجے میں کافی چبھتی ہوئی باتیں کیں۔

”تم کس قسم کی ماں ہو کہ اپنے ہی جسم کے
ٹکڑے کو کچھو کے لگانے لگی ہو اگر وعائیں قبول
ہوتیں تو تم ہمیں موت کی نیند سلا چکی ہوتیں..... جو
عورت اپنی اولاد کی نہیں ہو سکتی وہ شوہر کی وقادار کیسے
ہو سکتی ہے؟“ وہ خوشخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے
بڑی حقارت سے بولا۔

”میں نے بزرگوں کی زبانی سنا تھا کہ جب بیٹی
اس دنیا میں آتی ہے تو شرابی، جواری اور دیگر گناہوں
میں ڈوبا باپ اس کی محبت و پیار میں راہ راست پر
آنے کی بھرپور کوشش کرنے لگتا ہے۔ آپ کس قسم
کے باپ ہیں کہ بیٹی کی اہمیت اور وقعت کا احساس ہی
نہیں..... اس کے لیے اک سال خوردہ ٹوٹی پھوٹی
سیلن زدہ چھت کے انتخاب میں آپ نے ویر ہی نہیں
لگائی..... نامممل اور ادھورے پن میں ایشل کی
شخصیت کس قدر خوفناک، عبرت ناک اور گھناؤنی
ہوگی..... اس کے بارے میں سوچ لیجیے گا کہ آپ کے
گناہوں، دھوکے اور فریب کا خمیازہ آپ کی بیٹی بھگتے
گی۔ ویری سیڈ.....“ وہ افسردگی سے بولی۔

”میں اس معصوم کا مجرم ہوں، میں نے تمہارے
بطن سے اولاد پیدا کرنے کا جو گناہ کبیرہ کیا ہے اس کی
سزا تو مجھے مل کر رہے گی۔ بدبختی ہے اس معصوم بچی
کی..... جسے تم جیسی ماں کی کوکھ سے جنم لینا پڑا۔“ وہ
دانت چبا کر بولا اور بچی کو اس کی گود سے اٹھالیا۔

”اگر تم میں رتی بھر کی غیرت ہے تو مجھے اپنی
منحوس شکل کبھی نہیں دکھانا، تمہارے سائے کے بغیر
ایشل کا پروان چڑھنا بہترین ثابت ہوگا۔ تمہیں خود
اپنے اچھے برے کی تمیز نہیں تو اس معصوم کو کیا سکھا سکتی
ہو۔ اس کی داد داسے عمل کرنے میں بے مثال ہوں

لفظوں کے موتی

☆ کسی کو بھی معلوم نہیں اس کا اگلا شکار کون ہوگا۔

☆ جب آپ پہلا قدم اٹھالتے ہیں، تہیہ کر لیتے ہیں تو پھر واپسی نہیں ہوتی، گھڑا بے شک کچا ہو پھر بھی پار پہنچا دیتا ہے۔

☆ موت ایک بہت بڑے صبر کی مالک ہے اور وہ کبھی بے صبری نہیں ہوتی۔

☆ ہمت بھی عجیب پھولے ہوئے غبارے جیسی ہوتی ہے۔ ذرا نا موافق بات کی سوئی چھبی، شکل ہی نہیں حالت اور حالات تک بدل دیتی ہے۔

☆ یہ دنیا مکافات عمل کا نام ہے آج کسی کی راہ میں تم پتھر رکھو گے تو آنے والا وقت تمہاری راہ میں پہاڑ بن جائے گا۔

☆ خاموشی ایسے پردے کا نام ہے جس کے پیچھے لیاقت بھی ہو سکتی ہے اور حماقت بھی ہو سکتی ہے۔

☆ وہ بات اکثر بہت انمول ہوتی ہے جس میں الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوں۔

☆ اوب بہترین کمال اور خیرات افضل ترین عبادت ہے۔

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدرمرجان

دینے کے بجائے سمجھانے کی کوشش کریں۔“ فائزہ نے بے ساختگی سے کہا۔

”تم اپنے نکاح نامے میں...“ خاموشی پر دستخط کر کے میرے گھر آئی تھیں اس لیے خاموش ہی رہو... حرا کا مقام تم سے بہت اعلیٰ اور بلند ہے۔ پانچ بھائیوں کی بہن اپنے میکے سے ہی بھاری تھی تو سسرال نے بھی اسی کے مطابق اسے مال و دولت سے نواز دیا تھا۔ ہم پر احسان نہیں کیا... کہ ہم بچہ

دہا آہ آپ حرا کے لیے دعا کیا کریں... حالات اور وقت بدلتے زیادہ دیر نہیں لگتی... اس لیے حق مہر کو بیٹی کا تحفظ اور داماد کی اسیری مت سمجھیں... یہ سب کاغذی کھیل ہیں۔ جس میں آج تک بڑی والے نہیں جیتے... بلکہ حق مہر ان کے لیے بعض اوقات ندامت اور پچھتاوا بن جاتا ہے۔ پاؤں کی زنجیر بن کر عمر بھر قید رکھتا ہے۔“

”ایسی بھی بات نہیں... بہت بڑا ڈراوا ہوتا ہے حق مہر۔“

”جی نہیں، تعلیم بہت بڑی تھرٹ ہوتی ہے سسرال کے لیے... یہ ایسی دولت ہے جو مرتے دم تک ساتھ دیتی ہے۔ ہاتھوں کا میل نہیں ہوتی۔“ فائزہ نے بے اختیاری سے کہا... تو گفتگو کافی گرم ہو گئی۔

”کیا اول فول کے جاری ہو...“ اسی اثنا موبائل کی سیپ نے ماں کی چلتی زبان کو گرہ لگا دی۔ حرا کا نمبر دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہو کر باتیں کرنے لگیں۔ ”حرا بیٹا تمہاری آواز بہت اداس ہے۔ کیا بات ہے...؟“ ماں نے فکر مندی سے کہا۔ ”آج چمک نہیں رہی میری چڑیا رانی۔“

”آپ سب یاد آ رہے ہیں... یہاں میرا دل نہیں لگ رہا... جی چاہتا ہے کہ اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں...“ حرا نے روتے ہوئے کہا۔

”ہائے میرا دل بیٹھنے لگا ہے۔ ضرور عزیز نے جھگڑا کیا ہوگا... بیٹا ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں... ایک کے بدلے دس سناؤ... کچھ بھی ہونے والا نہیں... فکر مت کرو... پچاس لاکھ کی ادائیگی آسان نہیں ہوتی بیٹا... سونا محفوظ رکھنا... دس بار تمہیں سمجھایا تھا کہ میرے پاس رکھ جاؤ... مگر تم نے ایک نہ سنی اب محتاط رہنا... تم ہو بھی تو کملی اور سادی...“ ماں نے تڑپ کر کہا۔

”ماما... ایسی باتیں مت کریں... حرا کو شہ

اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں... سبھی ماں کی خوشی میں شامل تھے۔ چمک لہک کر باتیں ہو رہی تھیں۔ سوائے فائزہ کے... جس کی اندرونی کیفیت اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔ ”کاش کہ جیسا آپ نے اپنی بیٹی کے مستقبل کے لیے سوچا آپ اپنی بہوؤں کے لیے بھی ویسا ہی دل رکھتیں۔“ فائزہ نے چائے کا سب لیتے ہوئے سوچا۔ اس کے ماتھے پر گہری لکیریں تھیں۔

”تم جلی بھنی کیوں بیٹھی ہو...؟ تھوڑا سا معمولی سا، ذرا سا مسکرا ہی دو...“ زین نے سب کو ہنسا دیکھ کر فائزہ کو چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

”دیکھنا اگر میں نے اپنی اس خوش بخت بیٹی کا دو کروڑ کا حق مہر نہ لکھوایا تو اس کی داوی نہ لگتا... تم یاد رکھنا بہو...“ وہ فخریہ انداز میں بولی تھیں۔ ”جی ماما...! میں تو حق مہر کو ضروری نہیں سمجھتی... اول تو سسرال والوں کو حق مہر لکھتے ہوئے سبکی محسوس ہوتی ہے... کہ پرانی بیٹی کو اتنی اہمیت دیا کیوں دیں... اگر لکھ بھی دیا جائے تو ادائیگی میں آڑے آجاتی ہے۔“ وہ بے ساختگی سے بولی۔

”اپنی ماں کو سمجھا دیا ہوتا تو آج ہمارے درمیان اتنے فاصلے نہ ہوتے... تمہارے گھر والوں نے رشتے کی بنیاد ہی لالچ و طمع پر رکھی تھی۔ حرص پوری نہ ہوئی تو بیٹی کو خوب سکھا پڑھا کر ہمارے سر منڈھ دیا۔ آج تک تم ہمارے قریب ہی نہ لگیں۔ بس دور ہی دور رہیں۔ آج جل بھن کر کوئلہ ہو گئی ہو... اللہ تمہاری نظر و حسد سے میری بچی کو محفوظ رکھے۔“ وہ کڑک دار لہجے میں بولیں۔

”ماما! حق مہر ادا نہ کرنے کے بھی ہزاروں رستے ہیں... جب مصیبت سر پر منڈ لانے لگے تو خود بخود ہی ذہن کے چاروں طبق روشن ہو جاتے ہیں اور راہ بھائی دیئے لگتی ہے۔“ بڑے بیٹے نے لہجے میں کہا۔

کی۔ تم بے فکر رہو۔“ فائزہ نے اپنی توہین و ہتک کو شیر مادر سمجھ کر پی لیتا چاہا... کیونکہ چند ماہ کی بیٹی کو باپ کے حوالے کرنا اسے مایہ بے آب کی طرح تڑپانے لگا تھا۔ زین نے بچی کو کمبل میں لپیٹ کر پچھلی سیٹ پر لٹا دیا... فائزہ تیزی سے دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی بچی کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگالیا۔

”زین دنیا کو تماشا مت دکھائیں... اپنے گھر کی چھت تلے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، آخر ہم بالغ ہیں...“ فائزہ نے بے بسی سے کہا۔ غصہ کا نور ہو چکا تھا وہ ڈھمکے چکی تھی۔

”اس ضمن میں پہل تم نے کی ہے...“ وہ بے رخی سے بولا۔ ”میں نے تو تمہیں گھر سے نہیں نکالا تھا۔“ ”لیکن اس غلطی کا ازالہ بھی تو میں نے ہی کرنے کی کوشش کی ہے، اپنی غیرت کو تیاگ دیا ہے اب خوش ہو جائیں۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی... زین نے نفرت سے اس کی طرف سے منہ پھیرا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی اور سرعت سے ریورس کرتے ہوئے مین روڈ پر نکل گیا۔ فائزہ نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ ماں تو اسے زین کے سامنے ہی کھری کھری سنا کر اسی کے ساتھ رخصت کر دیتی اور اس کی رہی سہی عزت بھی مٹی میں مل جاتی۔

زین کا رُواں رُواں اپنی فتح یابی پر شاداں تھا مگر بظاہر بے حد خاموش اور الجھا ہوا لگ رہا تھا کہ کہیں فائزہ اس کے جذبات کی تہ تک نہ پہنچ جائے۔

☆☆☆

”میری حرا جیسے نصیب ہر بچی کے لکھے جائیں تو والدین بیٹی کی پیدائش پر ڈھول باجے بجائیں یہی سوچ کر میں خوشی سے نہال ہوئے جاتی ہوں کہ پچاس لاکھ حق مہر اور سو تلوے سونا... واہ میرے مولا... ہم تو اس قابل نہیں تھے... جیسا تو نے نواز ڈالا ہے۔ خوب ٹھکڑی آسای اور پھر زنجیریں بھی پہنی... بھاگ کر کہاں جائیں گے۔“ ماں بار بار

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

عام خاص کیوں نہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پوایو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایپلوڈنگ
- ☆ سپریم وائی، مارل کوالٹی، کپیر پیڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”اگر وہ لینے نہ آئے تو پھر.....؟“ وہ آصاف کرتے ہوئے بولیں۔

”بیگم.....! فکر مت کرو..... بچی کو چھین سانس تو لینے دو۔“ وہ آہستگی سے بولے۔

”وہ نہیں آئیں گے..... میری بات یاد رکھا..... طلاق آئے گی..... میں انہیں خوب ہوں..... فراڈیے اور چور اچکے ہیں، اس بد بخت خود چھوڑ آئیں..... یہ انہی کا بن مول مال ہے۔ ان کے مال کی حفاظت نہیں کر سکتے۔“ وہ ہاتھ منٹے ہوئے بولیں۔ ”حق مہر جھکڑی کا کام کرتا ہے۔ آپ تو اس میں بھی ناکام ہی رہے۔ نہ جانے اللہ نے آپ جیسے کمزور اور بزدل مرد کو بیٹیوں سے کیوں نوازا..... شازہ کے بھی ہاتھ پاؤں کاٹ کر ظالموں کے حوالے کر دیا آپ نے۔“ وہ عجیب پریشانی کے عالم میں تھیں۔

”اشو فائزہ بیٹا..... تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔ یہ ماں تمہیں چین نہیں لینے دے گی اور میرا بھی ناک میں دم کیے رکھے گی.....“ حامد نے بیٹی کو اپنے سینے سے لگا کر دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”ماما.....! میں اس قدر بے عزتی کے بعد واپس وہاں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی..... زین نے مجھ پر ہاتھ نہ اٹھایا ہوتا تو ضرور چلی جاتی۔ میں بچی کو کورٹ سے حاصل کر لوں گی۔ تعلیم اسی دن کے لیے کام آتی ہے، کل ہی نوکری کی تلاش شروع کر دوں گی..... میں آپ کے اوپر قطعاً بوجھ نہیں بنوں گی۔ ماما میں خود کو سنبھال لوں گی۔“ فائزہ نے ماں سے منت سماجت کرنے کے انداز میں کہا۔

”پلیز مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔“

”تم کورٹ جاؤ گی.....؟“ ماں نے حیرت سے کہا۔

”جی..... دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے میری اولاد نہیں چھین سکتی۔ مجھے اپنے حقوق کے حصول کے

بچھ جائیں۔“ ماں نے تیز لہجے میں اپنی بات مکمل کی اور بیٹی سے بات جاری رکھی۔ سب آہستہ آہستہ اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ زین نے کمرے میں داخل ہوتے ہی شعلہ بار نظروں سے اسے گھورا۔ ماں سے بیوی کی تلخ کلامی زین کو بھول نہیں رہی تھی۔ وہ تو کمرے میں آ کر اس پر اپنی بھڑاس نکالنے لگا اور دونوں میں جھگڑا فساد طویل کھینچتا چلا گیا..... انجام زد و کوب تک پہنچ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رات کے دو بجے فائزہ کو لعنت ملا مت کرتے ہوئے تھسٹ کر گاڑی میں ڈالا اور گاڑی دوڑاتا اسے میکے کے گیٹ پر جاتا راگروہ ڈور تیل بجانا نہیں بھولا تھا جونہی مین ڈور کھلا..... وہ وہاں سے سرعت سے نکل گیا۔ فائزہ لئے ہوئے جواری کی طرح گاڑی کی ریڈ لائٹس کو دور جاتا دیکھتی رہی۔ حامد گیٹ کا تالا کھول کر سامنے کھڑے تھے..... بگروہ بے خبر تھی۔

☆☆☆

”تم تو پیدا ہوتے ہی مر گئی ہو تیں..... رشتے دار برادری والوں کو کیا جواب دیں گے۔ شازہ کے سسرال کو تو مزید شمل جائے گی۔ وہ تو اسے کل ہی رخصت کر دیں گے۔“ ماں نے روتے ہوئے کہا۔

”تم نے ضرور زبان چلائی ہوگی، کیا کروں سارا بگاڑ تمہارے پاپا کا ہے۔“

”طیبہ.....! بچی پہلے ہی پریشان ہے اسے مزید طعنے تشنے دے کر مضطرب مت کرو..... چند دنوں کی بات ہے وہ خود ہی بھاگے چلے آئیں گے یہ بات یاد رکھو کہ اگر ہمیں اپنی بیٹی کا ہنسا بستا گھر دیکھنے کی تمنا ہے تو بیٹے کے لیے بھی والدین ایسی ہی خواہش رکھتے ہیں..... پھر چند ماہ کی بچی ماں کے بغیر کیسے پل سکتی ہے؟ اس وقت انہیں اس کی اشد ضرورت ہے..... خاوند کا غصہ تو دودھ کے ابال کی طرح ہوتا ہے۔“ حامد نے بیوی کو تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

لے کورٹ کی مدد لینا ہوگی۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔
 ”میں تمہارے ساتھ ہوں بیٹا۔۔۔۔۔ تمہاری
 زندگی اتنی ارزاں نہیں کہ تم سسک، سسک کر تڑپ کر
 گزارو۔۔۔۔۔ ماں کو سمجھاؤ کہ دنیا بدل چکی ہے۔ میں
 تمہاری ہمت و حوصلے کو داد دیتا ہوں۔ ایسے خبیث
 اور دھوکے باز لوگوں کے ساتھ تین گھنٹے گزارنے کسی
 اذیت ناک سزا سے کم نہیں ہوتے۔ تم نے تو تین
 سال سو لی پر لنگ کر کیسے بتا دیے۔“ حامد نے اس
 کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”آپ جیسا باپ میں نے آج تک نہیں
 دیکھا۔۔۔۔۔ جو بیٹی کو طلاق کے لیے اکسارہا ہو۔۔۔۔۔ خدا
 کے لیے اس کا گھر مت اجاڑیں۔۔۔۔۔ جان چھوڑ دیں
 اس کی۔۔۔۔۔ اور اسے اپنے شوہر کی خدمت گار بیوی
 بننے کی تلقین کریں۔۔۔۔۔ بیوی کو مارا سی کی زبان بے
 لگام ہونے پر پڑتی ہے۔“ وہ چیخ کر بولیں۔ ”یہ
 میسج نہ جانے کیسا زہرا گل کر آئی ہے۔“

”بیٹا تم تو جا کر آرام کرو۔۔۔۔۔ صبح ہمارے لیے
 خوشیاں لے کر نمودار ہونے والی ہے۔ ماں کی باتوں
 کی پروا نہ کرو۔۔۔۔۔ یہ ماں ہی ہوتی ہے جو بیٹی کو
 بسانے کے چکروں میں ہمیشہ کے لیے اسے کھودتی
 ہے۔ مجھے ان لوگوں پر رتی بھر اعتبار نہیں رہا۔۔۔۔۔
 طبیعت تم سن لو اس بار بیٹی کو بھیجنے کی غلطی مت کرنا۔۔۔۔۔
 وہ لوگ اسے قتل کر دیں گے۔۔۔۔۔ اور ہم زندہ درگور
 ہو جائیں گے۔“ وہ تڑپ کر بولے۔

”تمام بے جا پیش گوئیاں ہیں۔۔۔۔۔“ وہ چڑ کر
 بولی۔

”ماما۔۔۔۔۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی اگر آپ
 نے مجھے مجبور کیا تو میں آپ کے سامنے زہر کھا کر مر
 جاؤں گی۔ وہاں کی ذلتوں بھری زندگی میں رہنے
 سے موت ہزار بار درجے بہتر ہے۔“ فائزہ نے مستحکم
 لہجے میں کہا اور ماں کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

”اوہ مائی گاڈ۔۔۔۔۔!“ فائزہ کی طرف سے
 طلاق کا مطالبہ۔۔۔۔۔ میں تو اسے بہت ڈرپوک اور بے
 وقوف سمجھتا تھا۔۔۔۔۔ وہ تو بہت عقلمند لگی۔۔۔۔۔ بیٹی کو بھی
 حاصل کر لے گی اور چند ہفتوں بعد آزاد بھی ہو جائے
 گی۔“ زین بے قراری سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے
 سوچے جا رہا تھا۔ آخر اس کی سوچ، تڑپ اور التجاؤں
 میں بدل گئی۔ دل چاہا کہ اڑ کر فائزہ کے پاس پہنچ
 جائے۔ اپنی غلطیوں کی تلافی کرے اور اسے واپس
 گھر لے آئے مگر مردانگی اور انا نے اسے رد عمل سے
 وقتی طور پر روک دیا۔۔۔۔۔ وہ دیر تک اس کی تصویر سے
 باتیں کرتا رہا، معافی مانگتا رہا مگر جواب نہ ملا۔۔۔۔۔ آخر
 ہمت کر کے اس نے بیٹی کو اٹھایا اور باہر نکل گیا۔۔۔۔۔
 تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک سوالی کی طرح فائزہ کے
 گھر کے گیٹ پر کھڑا تھا۔

”فائزہ۔۔۔۔۔! اب تم بے وقوفی اور بد الحاشی سے
 کام مت لینا۔۔۔۔۔ زین تمہیں لینے آیا ہے مع تمہاری
 اولاد کے۔“ ماں نے سختی سے کہا۔

”نہیں جاؤں گی۔ بیٹی دینا چاہتا ہے تو اس
 احسان کا بدلہ ضرور چکاؤں گی۔ نہیں دینا چاہتا تو
 بذریعہ کورٹ حاصل کر لوں گی۔ میرے معاملے میں
 آپ کچھ نہیں بولیں گی۔“ وہ سنجیدگی سے کہنے لگی۔

”اس سے مل تو لو۔۔۔۔۔ اگر مسئلہ حل ہو جائے تو
 اس میں برائی ہی کیا ہے؟ بیٹی اپنے سسرال
 میں شوہر کے ساتھ ہی جیتی ہے۔ میری چاند میرے
 دل کے ٹکڑے۔۔۔۔۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔ تمہاری
 جلد بازی شازہ کو بھی لے ڈوبے گی۔ وہ بھی تو۔۔۔۔۔
 بے مول ہی چلی گئی۔“

”میں نے زین سے طلاق لینے کا فیصلہ کر لیا
 ہے، ماما۔۔۔۔۔ وہ میرے لیے نامحرم ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ اب
 اس سے ملنے کا جواز نہیں بنتا۔“ ماں اس کے حتمی
 انداز پر حیرت زدہ رہ گئیں۔

”مجھے مجبور کرنے کی کوشش مت کریں ماما۔۔۔۔۔“

میرا فیصلہ اٹل ہے۔“ انہوں نے اسے غصے سے گھورا اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔ زین فوراً ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”آئی..... صرف ایک بار فائزہ سے ملو اور..... میں اپنی تمام غلطیوں کو تباہیوں اور زیادتیوں کی معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ معاملہ اتنا بگڑ جائے گا مجھے اس کا اندازہ ہی نہیں ہوا..... اتنی جلدی ہنسی مذاق میں ہی ہمارا گھر ویرانہ کے دہانے پر کھڑا ہو جائے گا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا..... فائزہ تو..... بے مثال بہو اور بیوی تھی۔ میں نے اس کی قدر نہ کی۔“ زین کی آواز کسی گہری کنویں سے آرہی تھی۔

”بیٹا.....! وہ اب تمہاری کسی بات پر بھروسہ نہیں کرے گی کیونکہ اعتماد اور بھروسے کے اس رشتے میں تم لوگوں کی طرف سے بہت گہری دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ میاں بیوی کا رشتہ تو چند لفظوں سے جڑتا ہے۔ اس میں خون کی تپش و حرارت شامل نہیں ہوتی۔ جڑنے سے پہلے بن بست اور ناتواں ہوتا ہے، جڑنے کے بعد دو طرفہ قربانیوں سے اس میں محبت، احترام کی گرما نش شامل ہو کر اسے محکم بنا ڈالتی ہے..... لیکن یہاں معاملہ ہی یکطرفہ تھا..... فائزہ کب تک خود پر جبر و ستم کر سکتی تھی۔ آخر وہ بھی احساسات و جذبات سے گندمی اک گوشت پوست کا انسان ہے۔ مگر عورت کو یہاں انسان نہیں سمجھا جاتا ہے اور خصوصاً جب وہ بیوی بن جائے تو..... کہ وہ بھی عقل سمجھ رکھتی ہے۔ کب تک اپنے ذہن و قلب پر قفل لگائے رکھتی۔“ ماں نے افسردگی سے کہا۔ زین کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر وہ مزید گویا ہوئیں۔

”قصور میرا بھی ہے کیونکہ میں اس کی سپورٹ نہ بن سکی..... اسے وہاں سے مکر ٹکٹے کی تلقین کرتی رہی..... جبکہ اس کی اور میری سوچ اور زندگی میں..... بے تحاشا فرق ہے۔ میرے جیسی عورتیں چکی کے دو پاٹ میں پسے کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ فائزہ جیسی عورتیں تو

آکاش کا روشن ستارہ ہیں۔ جن کی زندگی روشنیوں سے ہمکنار رہنی چاہیے۔ ہم نے حق مہر کی ڈیمانڈ کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ جس نے اس رشتے میں زہر گھول دیا اور اب انجام ہمارے سامنے ہے۔“

”آپ درست فرما رہی ہیں..... حق مہر ہماری طرف سے مقرر نہیں ہوا وہ تو آپ کی طرف سے تعلیم کی صورت میں فائزہ کے پاس محفوظ تھا۔ جس کی مثال سے ہمیں سبق سیکھنا چاہیے۔ ہم نے حرا کا حق مہر اس کی سسرال سے فقط لکھت بڑھت کی صورت میں مقرر کیا تھا نقد تو شرعی ہی تھا اگر حق مہر اتنا ہی مضبوط اور فولادی ہوتا تو آج حرا کو تین کپڑوں میں گھر سے نکالنا نہ جاتا کہاں گیا حق مہر اور سونا جو اسے تحفظ دے پاتا وہ طلاق یافتہ یہ دکھ مرتے دم تک بھول نہیں پائے گی۔ کلک کا یہ دیکھا تعلیم سے مدھم پڑ سکتا تھا لیکن افسوس کہ ہم نے اس کے مستقبل کے لیے کچھ نہیں کیا..... نہ اعلیٰ تعلیم دی نہ ہی اس کے لیے بینک بیلنس کا انتظام کر سکے۔“ وہ اس کی باتوں پر حیرت زدہ تھی۔ ”مجھے آج احساس ہوا ہے کہ ہر بیٹی کے لیے ان دو میں سے ایک کا انتظام ہونا بہت ضروری ہے۔ ہمیں اپنی بیٹی کی خوشحالی اور کامیابی کے لیے سسرال اور اس کے شوہر کا مہر ہون منت نہیں رہنا چاہیے۔ اسے تعلیمی ہنر سے آراستہ کرنا چاہیے اگر ایسا ہونا مشکل ہے..... کیونکہ بعض اوقات بیٹی کا رجحان پڑھائی کی طرف نہیں ہوتا تو اس صورت میں اس کے ہاتھ میں بینک بیلنس اور سلیقہ شعاری ہنر مندی اور وفا داری کی سند ہونی لازمی ہے۔“ وہ مؤدبانہ انداز میں بولے چلے جا رہا تھا۔ طیبہ اور فائزہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ حرا زین کی بہن کے ساتھ سسرال میں کیا بیٹی اس کا لمبا چوڑا حق مہر بھی اس کے بسنے کی ضمانت نہ دے سکا اور کچھ سانس سر اور کچھ شوہر سے ناراضی طول اختیار کرتی چلی گئی اور طلاق پر قصہ ختم ہوا۔ زین کی والدہ جو فائزہ کو

میش ٹھوکر پر رکھتی تھیں بیٹی کی طلاق سے بل کر رہ گئیں۔ آج زین کے منہ سے حرا کی بابت جان کر طیبہ کے ساتھ ساتھ دروازے سے لگی کھڑی فائزہ بھی حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

”آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں۔ شوہر کو جب تک بیوی کے انسان ہونے کا احساس نہیں ہوگا..... ازدواجی زندگی خوشی، خوشی رواں دواں نہیں رہ سکتی۔“ بے شک ماں، باپ کی عزت کی خاطر ہر دوسری لڑکی سمجھوتے کی چادر اوڑھے رہتی ہے مگر اس کے اپنے دل کی خوشی کیا ہے اس سے کسی کو کوئی غرض نہیں ہوتی۔“ طیبہ نے خوشی کے آنسو پیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا..... وہ دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھیں کہ بے شک اپنی بہن کے اجڑنے سے ہی سہی زین کو دوسرے کی بیٹی کے جذبات کا احساس تو ہوا۔ ”آئی.....! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد میں فائزہ کے لیے الگ گھر خرید لوں گا..... اور اسے جنت کا گہوارہ بنانے کی پوری، پوری کوشش کروں گا۔ یہ اس کا حق ہے آئی..... گھر مرد کا نہیں عورت کا ہوتا ہے۔ وہ اس..... جنت کی مالکین ہوتی ہے۔“ وہ نہایت ملائمت سے بولا۔

”آئی فائزہ سے کہیں کیس واپس لے لے، میرا یقین کریں میں نے جو کہا ہے بالکل سچ کہا ہے۔ رتی بھر ہیر پھیر نہیں ہوگا اس میں۔“

”بیٹا..... تم لوگوں کے رشتے میں اسی چیز کی تو کمی رہی، تم میرے ساتھ چلو..... میں نہیں جانتی کہ وہ تمہاری باتوں پر اب کیسے یقین کرے گی۔“ وہ یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم سے نکل آئیں اور فائزہ کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے وہ چکن کی طرف بڑھیں اور داماد کے لیے ٹرائی سجانے لگیں۔

وہ چائے کی ٹرائی ڈرائنگ روم میں پہنچا کر فائزہ کے کمرے کی طرف بڑھیں اور بیٹی کی آواز پر دروازے پر رک گئیں۔

”زین مجھے آپ کے والدین کے ساتھ رہنے میں رتی بھر اعتراض نہیں۔ آخر ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک بیٹی کی موجودگی تو بہت ضروری ہے۔ بہو جو ان کا خون نہیں ہوتی مگر شوہر کی توجہ، ہمدردی اور پیار میں انہیں اپنے خون سے بڑھ کر سمجھنے میں پہل کر لیتی ہے لیکن آپ نے تو مجھے ایسا چانس ہی نہیں دیا۔“

”بھئی اب معاف کر دو..... میری نادانی اور احمقانہ پن کی وجہ سے تمہیں سسرال میں باعزت مقام نہ مل سکا۔ اس لیے ہمارا الگ رہنا ہی بہتر ہے۔ جب والدین کو ہماری ضرورت محسوس ہوگی تو ہم سب سے پہلے ہوں گے جو ان کی نگہداشت کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار ملیں گے کیونکہ میری بیگم لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں ایک ہے۔ جس کے بغیر میرا خاندان ادھورا ہے۔“ زین نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور فائزہ حسرت و بے یقینی کے نلے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر سسک اٹھی۔

”آنسو خوشی کے سمجھوں کہ بے یقینی کے؟“ وہ پیار بھرے لہجے میں بولا تو فائزہ نے ایشل کو اٹھا کر سینے سے چمٹا لیا اور خود اعتمادی سے بولی۔

”اعتماد کا رشتہ بحال کرنے اور اسے بھیگی دینے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ یہ مذاق نہیں زین، اچھی امید رکھو تمہیں مایوسی نہیں ہوگی صرف ایک بار مجھ پر بھروسہ کر کے تو دیکھو..... بیوی پیار و محبت کے ساتھ ساتھ شوہر سے عزت و احترام کی بھی طلبگار ہوتی ہے جیسی تو یہ رشتہ خوب صورت اور پاکدار بنتا ہے اور مضبوط خاندان وجود میں آتا ہے۔“ فائزہ مسکرا کر ایشل کو بے اختیار چومنے لگی کہ وہی ان دونوں کے درمیان مضبوط ڈور تھی۔

”درست فرما رہی ہیں آپ میری سمجھدار بیگم صاحبہ.....“ زین نے محبت پاش نظروں سے اپنی چھوٹی سی فیملی کو دیکھا۔



منی ناول

اک نئے مڑ پر

رضوانہ پرنس

آخری حصہ

کبھی منزل ، کبھی رستہ کوئی کیسے بدلتا ہے
ہمیں معلوم ہی کب تھا کوئی کیسے بدلتا ہے
یقین سے بے یقینی کے سفر تک ساتھ تھا میرے
بدل کر اس نے دکھلایا کوئی کیسے بدلتا ہے

راہ زیست کبھی پُر خار و پُریچ تو کبھی رواں دواں ہوتی ہے۔ اسی راہ پر سفر کرتے ہوئے اجنبی مسافروں سے آشنائی، کبھی منزل کی جانب رہنمائی کرتی ہے تو کبھی راہ گم کر دیتی ہے... ایسے ہی ایک مسافر کا دلگدازہ احوال جو منزل پر پہنچا تو ضرور مگر کیسے...؟

شوبز کی دنیا کے اسرار سے پردے اٹھاتی، گراتی ایک دل فریب روداد



لیے جیسے جلاپے کی آگ اسے اپنے اندر دھکتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ زینرا جس کرب سے گزر رہی تھی ویسا ہی دکھ وہ خود بھی محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ فاران کو فون کر کے بے نقط سنائے لیکن زینرا نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ ہرگز فاران پر یہ بات ظاہر نہ کرے کہ اسے زینرا کے ذریعے سب کچھ بتا چل گیا ہے ورنہ وہ برا فروختہ ہو کر زینرا کے خلاف کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا تھا۔ اجالا بس کڑھ کر رہ گئی تھی۔

ہم یہیں آس پاس تھے لیکن ہم تیرے التفات کو ترسے.....
 عمر بھر گفتگو رہی لیکن پیار کی ایک بات کو ترسے
 اپنی پرانی ڈائری میں لکھے ہوئے کسی مشہور شاعرہ کے یہ اشعار بے اختیار اسے آج پھر یاد آرہے تھے۔

”اجالا بس دعا کرو کہ فاران کاری ایکشن بہت سخت نہ ہو۔“ زینرا کی آواز پر وہ اپنے خیالوں سے باہر آگئی۔

”زینرا مجھے تو تمہاری باتوں سے سخت الجھن ہو رہی ہے..... ارے اب بھی تمہیں فاران کی ناراضی کی فکر ہے اور کوئی وجہ سننے تو حیران ہی رہ جائے کہ تم نے اس کی محبوبہ کی شادی کہیں اور کرادی ہے۔ شاباش ہے مٹی تم پر۔“ اس بار اجالا کو غصہ ہی آگیا تو زینرا اداسی سے مسکرا دی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو اجالا، میں جو اتنی جلیس عورت ہوا کرتی تھی کہ فاران کا کسی لڑکی کی طرف دیکھنا بھی مجھے گوارا نہیں تھا آج قدرت نے دیکھو مجھے کس مقام پر پہنچا دیا ہے۔“ کتنا ٹوٹا ہوا لہجہ تھا اس کا..... اجالا کو بے اختیار اس پر ترس آنے لگا۔

”زینرا بی اسٹرنگ..... تم نے جو بھی قدم اٹھایا ہے وہ شہزادی کی خواہش اس کی خوشی اور مرضی

ہیں میری جان نگلی جا رہی ہے۔“ زینرا فون پر اجالا سے اپنے اس خوف کو شیئر کر رہی تھی جو دن رات اسے کھائے جا رہا تھا۔

”پاگل ہو تم بھی زینرا..... بھلا یہ بھی کوئی ڈرنے کی بات ہے، بس بتا دینا کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا عدیل نے فوراً رشتہ بھیجا اور جھٹ پٹ شادی ہوگئی کیونکہ عدیل کو بہت جلدی تھی۔“ اجالا نے زینرا کے خوف کو یکسر رد کرتے ہوئے اس کی ہمت بندھائی۔ اجالا کو نہ جانے کیوں فاران کا شہزادی کے عشق میں دیوانہ ہونا اتنا ناگوار گزر رہا تھا۔ آخری بار فاران سے ملنے کے بعد وہ ایک بہت خوب صورت احساس لے کر واپس لوٹی تھی کہ فاران اسے ٹھکرا کر پچھتا رہا ہے۔ فاران کی اکثر ذومعنی باتوں کو اس نے اپنی مرضی کے رنگ دے کر یہ سمجھ لیا تھا کہ فاران کو اسے اپنی زندگی میں نہ لانے کا افسوس ہے اور وہ محبت جو اس نے بھی فاران سے کی تھی اب جا کر اس کے دل میں بھی اجالا کے لیے جاگنے لگی ہے اور اسی احساس نے ہمیشہ اس کے دل کو ٹھیس پہنچاتے ہوئے زخم کو مندمل کر کے اسے ایک عجیب سا سکون بخش دیا تھا۔ حالانکہ اب اس کی زندگی کا مرکز اس کا شوہر اور اس کے بچے تھے لیکن ایک ککب جو کانٹے کی طرح اسے چبھتی رہتی تھی فاران کے رویے نے جیسے اس چھین کو یکسر ختم کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ دل سے یہی چاہتی تھی کہ زینرا اور فاران پھر سے ایک ہو جائیں وہ ان کے بگڑتے ہوئے تعلقات پر بے حد فکر مند بھی رہا کرتی تھی لیکن جب زینرا نے اسے بتایا کہ فاران کس طرح شہزادی کی محبت میں ڈوب کر اسے حاصل کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے تو جیسے جھن سے کوئی چیز اجالا کے اندر ٹوٹی تھی۔ اپنے ٹھکرائے جانے کی اذیت دوبارہ دل میں جاگ اٹھی تھی۔ اسے زینرا سے بالکل جلن محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن شہزادی کے

پاس تھا پھر بھلا اسے اب کوئی فکر کرنے کی ضرورت تھی۔ واقعی قدرت کبھی کبھی انسان کو بالکل اچانک اتنے ناقابل یقین طریقے سے خوشیوں سے نوازتی ہے، اس کے خوابوں کو حقیقت میں بدلتی ہے جس کا اس نے بھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔ شہزادی کے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا..... عدیل کو اللہ نے فاران کے گھر جیسے صرف شہزادی کے لیے ہی بھیجا تھا..... اگر بچوں کے پہلے والے ٹیوٹر بیمار نہ پڑتے تو بھلا وہ کہاں عدیل کو پاسکتی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں توبہ کرتے ہوئے ان بے چارے سر کی بیماری پر شکر ادا کیا تھا۔

”اچھا سنو، اب تم جلدی سے فریش ہو جاؤ تاکہ ہم باہر جا کر امی کے ساتھ ناشتا کر سکیں..... میں چاہتا ہوں کہ پہلے ہی روز سے تم اپنے رویے سے میری ای کا دل جیت لو..... میری بہنوں کو اپنا گردیدہ بنا لو تاکہ ہم سب مکھ جھن سے اس گھر کی چھت تلے ایک آئیڈیل زندگی گزار سکیں۔“ اس بار عدیل نے اشارتاً..... یہ بھی جتانے کی کوشش کی کہ اسے شہزادی کے ساتھ ساتھ..... اپنی ماں اور بہنیں بھی کتنی عزیز ہیں۔

”ٹھیک ہے عدیل، میں جلدی سے تیار ہو جاتی ہوں۔“ اس کے لہجے میں چھپی فرمانبرداری کو محسوس کر کے عدیل بے اختیار ہنس دیا۔

”بس یار تمہاری یہی مصومیت تو ہمیں مارے ڈالتی ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ ای کو بھی اپنی یہ مصوم سی بہو بہت جلد بے حد عزیز ہو جائے گی۔“ اس نے شہزادی کے رخسار پر جھولتی لٹ کو پیار سے کھینچتے ہوئے اسے شرارت سے دیکھا تو شہزادی کے منہ سے بے ساختہ ”انشاء اللہ“ نکلا تھا۔

☆☆☆

”سنو اجالا، مجھے بہت ڈر محسوس ہو رہا ہے۔ جوں، جوں فاران کے آنے کے دن قریب آرہے

کتنی خوب صورت تھی اس کی زندگی کی وہ صبح جب عدیل نے بہت پیار سے اسے جگایا تھا..... وہ جو بالکل بے خبر سو رہی تھی، ایک لمحے کو تو اسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے سوئی ہوئی آنکھوں سے عدیل کی جانب دیکھا اور دوسرے ہی لمحے جیسے اس کا ذہن مکمل جاگ اٹھا۔ وہ بے اختیار تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا یہ خوابیدہ حسن عدیل کے دل پر مزید قیامت ڈھا گیا۔ وہ بے خودی میں اسے تکتا ہی چلا گیا۔

شہزادی کے چہرے پر حیا کے رنگ بکھر گئے اور پلکیں بے اختیار جھپکنیں۔

”اپنے نئے گھر کی پہلی صبح مبارک ہو شہزادی.....“ عدیل نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بے حد پیار سے اسے دیکھا تو نہ جانے کیوں شہزادی کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔

”مجھے بالکل یقین نہیں آرہا عدیل کہ اللہ نے مجھے میرا اپنا گھر دے دیا ہے۔ اب آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گے نا.....“ آنسو پٹ پٹ اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے..... عدیل نے بے ساختہ اسے اپنی بانہوں میں سیٹ لیا۔

”شہزادی تم نے رات کو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب تم کبھی نہیں روو گی پھر یہ وعدہ خلائی کیسی.....؟ بس اب ہماری زندگی میں صرف خوشیاں اور مسکراہٹیں ہوں گی اور یہ شادی اور ویسے کے ہنگامے ختم ہو جائیں تو پھر میں خود تمہارے ابا اور اماں کو جا کر ڈھونڈوں گا..... اور دیکھنا انشاء اللہ وہ خود آ کر تمہیں گلے لگائیں گے۔“ کتنی محبت سے وہ اسے سمجھا رہا تھا، تسلی دے رہا تھا اور شہزادی کو کتنے تحفظ کا احساس ہو رہا تھا، اس کی بانہوں کے حصار میں..... بالکل اس طرح جیسے وہ ایک بہت محفوظ پناہ گاہ میں آگئی ہو، کوئی بھی ڈر خوف یا دوسرے اس کے دل میں نہیں رہا تھا..... اب اس کا محافظ اس کے

کے عشق میں ڈوب کر اس نے اپنے گھر والوں کی ناراضی مول لے لی تھی اور اب وہی زینرا اس کی زندگی میں کہیں دور دور نہیں تھی لیکن ان کی زندگی میں آنے والی یہ دوریاں یہ فاصلے تو شہزادی سے ملنے سے قبل ہی ان دونوں کے درمیان آچکے تھے اور اس کی تصور وار بھی فاران کی نظر میں زینرا ہی تھی جس نے اس کی زندگی میں آنے والے اس نئے موڑ پر قدم قدم پر اس کے راستے میں کانٹے بچھائے۔ اسے آگے بڑھتا دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے اسے پیچھے کی طرف دھکیلتا چاہا..... اسے اپنی اس نئی فیلڈ میں کام کرنے کے لیے ذہنی سکون کی ضرورت تھی لیکن زینرا نے اسے ہر مل ایک اذیت سے دوچار رکھا..... پتا نہیں کہاں کی نفرت ساگنی تھی فاران کے دل میں زینرا کے لیے کہ اب وہ اس کی رفاقت میں زندگی گزارنے کا تصور کرتے ہوئے بھی گھبرانے لگا تھا۔ یہاں تک کہ اجالا جسے اس نے زینرا کی محبت میں ٹھکرا دیا تھا اب اسے زینرا کے مقابلے میں اچھی لگنے لگی تھی، اپنے فیصلے پر پچھتاوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے اور پھر ایسے میں شہزادی کا اچانک اس کی زندگی میں آ جانا اسے اپنی سپاٹ اور تنہا خزاں آلود زندگی میں بہار کے ایک مہکتے ہوئے خوشگوار جھونکے کے مانند محسوس ہوا تھا۔ وہ پہلی ہی نظر میں کچھ اس طرح سے دل میں اتر گئی تھی کہ بس پھر وہیں کی ہو کر رہ گئی، وہ اس لمحے کے سحر سے پھر بھی نکل ہی نہیں پایا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ محبت دل میں داخل ہونے کے لیے اجازت نہیں مانگتی۔ یہ تب ہو جاتی ہے جب نہیں ہونی چاہیے۔ ایسا ہی کچھ فاران کے ساتھ ہوا تھا۔ شہزادی کی محبت دل میں بس جانے کے بعد پھر اسے کسی اور کی تمنا ہی نہیں رہی تھی۔ کسی بھی عورت میں اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ اس بار وہ واپس جا کر شہزادی کو بتانا چاہتا تھا کہ اس کی محبت میں کوئی ہوس شامل نہیں ہے وہ اس کے جسم کی نہیں روح کی

پکار ہے۔ وہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنا کر اپنی زندگی میں بکھری ہوئی ساری خوشی کو منادینا چاہتا ہے۔ وہ اس سے عمر میں بہت چھوٹی سہی لیکن وہ اسے کبھی اس فرق کو محسوس نہیں ہونے دے گا۔ اب بھی وہ اتنا یک لگتا ہے کہ کم عمر ہیر وئن بھی اس کے ساتھ سوٹ کر جاتی ہے۔ خوابوں اور خواہشوں کی راہ گزر پر چلتا ہوا وہ بہت دور تک نکل جایا کرتا تھا اور اب تو بس وہ ہی دن رہ گئے تھے اس کی بے قراری کو قرار ملنے کے لیے..... اس نے پچھلے دنوں گھر کے لینڈ لائن نمبر پر فون کرنے کی کافی کوشش بھی کی تھی لیکن شاید فون خراب تھا کال مل کر ہی نہیں دی اور زینرا کے موبائل پر وہ کال کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ لینڈ لائن کا فون خراب نہیں بلکہ زینرا نے اس کا تار ہی نکال دیا ہے وہ نہیں چاہتی تھی کہ بچوں یا نوکروں کے ذریعے شہزادی کی شادی کی خبر اسے مل جائے۔ جتنی خاموشی سے یہ شادی ہوئی تھی اسے فاران کے یہاں آنے تک اسی خاموشی کو برقرار رکھنا تھا۔

☆☆☆

وہ عدیل کے سینے میں منہ چھپائے بہت بے قراری سے رو رہی تھی۔ عدیل اس کا سر سہلاتے ہوئے اسے تسلی آمیز لہجے میں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”دیکھو شہزادی انشاء اللہ تم بہت جلدی بڑی عزت کے ساتھ اپنے اماں، ابا اور رانی سے ملو گی، مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں آج تمہارے محلے میں گیا تھا لیکن اگر تم اپنا رونا بند نہیں کرو گی تو میں اس سے آگے کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ اس کی پیار بھری دھمکی کام آگئی شہزادی نے بے اختیار اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بہت بے تابی سے اس کی جانب دیکھا۔

”عدیل جلدی بتائیں پھر کیا ہوا..... اماں اور ابا کے بارے میں بھی کچھ پتا چلا..... ہم کب ان سے ملنے جا رہے ہیں؟“ اس کی بے قراری پر عدیل کو ہنسی

آگئی۔ وہ آنسو سے جوہی اندر داخل ہوا تھا رخشندہ نے اسے شہزادی کی طبیعت کے بارے میں فوراً ہی بتا ڈالا تھا۔ رانیہ اور مدیحہ اسی کے پاس بیٹھی ہوئی اس کا دل بھلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ عدیل کے کمرے میں داخل ہونے پر وہ دونوں چائے لانے کا کہہ کر چبے ہی کمرے سے باہر نکلیں شہزادی جو اتنی دیر سے اپنے اوپر ضبط کا بند باندھے ہوئے تھی فوراً ہی اٹھ کر عدیل سے لپٹ کر کچھ ایسے روئی کہ وہ پریشان ہو گیا۔ ”کیا ہوا شہزادی سب خیریت تو ہے ناں.....؟“ ”عدیل آج بازار میں مجھے رانی نظر آئی تھی فقیر محمد بھی ساتھ تھا۔“ اس نے ہچکیوں کے درمیان... یہ مشکل بتایا تو عدیل گھبرا سا گیا۔

”اوہ..... تو کیا ان لوگوں نے امی کے سامنے تم کو کچھ کہہ دیا کیا؟“ عدیل کی پریشانی جائز تھی، اس نے ماں سے یہ بات چھپائی تھی کہ شہزادی گھر سے بھاگ کر زینرا کے پاس رہ رہی تھی۔ وہ اپنی امی کے خیالات سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ سب کچھ برداشت کر لیں گی لیکن گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو کبھی قبول نہیں کریں گی کیونکہ ان کی نظر میں ایسی لڑکیاں بالکل بھی قابل عزت نہیں تھیں۔ وہ شہزادی کی بے گناہی کو کسی حال میں بھی تسلیم نہیں کرنے والی تھیں۔ یہی اس نے انہیں یہ بتایا تھا کہ شہزادی زینرا کے دور کی رشتے داروں میں سے ہے اور کچھ گھریلو حالات کی خرابی نے اسے زینرا کے ساتھ رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ زینرا نے بھی عدیل کی درخواست پر ایسی ہی کہانی رخشندہ کو سنائی تھی اور رخشندہ نے بھی زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی ویسے بھی وہ زینرا سے مل کر مطمئن ہوئی تھیں اور پھر شہزادی کا اتنا معصوم چہرہ اور بے پناہ حسن انہیں بہت متاثر کر گیا تھا۔

”نہیں عدیل، اللہ کا شکر ہے کہ ان لوگوں نے ہمیں نہیں دیکھا اور میں فوراً طبیعت خرابی کا بہانہ بنا

کرای کو لے کر واپس آگئی لیکن رانی کو دیکھنے کے بعد مجھ سے صبر نہیں ہو رہا..... میں کیا کروں عدیل..... میں اتنی بے بس کیوں ہو گئی آخر کب میں اپنے گھر والوں سے مل سکوں گی۔“ وہ زار و قطار رو رہی تھی عدیل کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی اور اب عدیل کے یہ بتانے پر کہ وہ آج اس کے محلے گیا تھا جیسے اس کے آنسو ایک دم ختم گئے تھے۔

”شہزادی مجھے پتا چلا ہے کہ پرسوں تمہارے اماں اور ابا واپس لاہور آ رہے ہیں۔ تمہارے پڑوس میں رہنے والے ایک صاحب نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ اجمل صاحب پرسوں واپس اپنے گھر آ جائیں گے کیونکہ آج ہی ان کی چھوٹی بیٹی اپنے شوہر کے ساتھ گھر کی صفائی وغیرہ کروانے آئی تھی۔“ عدیل اسے بتا رہا تھا اور وہ پوری آنکھیں کھولے اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ بہت ہی عجیب سی کیفیت سے... دو چار ہو رہا تھا اس کا دل..... اماں، ابا اور رانی سے ملنے کی بے پناہ خوشی اپنی جگہ لیکن اس خوشی میں چھپا شدید خوف ایک عفریت کے مانند اسے سہا بھی رہا تھا۔

ابا کا ری ایکشن نہ جانے اسے دیکھ کر کیا ہو گا..... وہ اسے معاف بھی کریں گے یا نہیں؟..... اماں بھی اپنی خفگی جتا میں گی ضرور لیکن پھر ان کی خفگی، ان کے آنسوؤں میں بدل جائے گی اور رانی وہ تو سب کچھ بھلا کر بے اختیار آ کر اس سے لپٹ جائے گی۔ رہ گیا..... فقیر محمد تو عدیل کے سامنے اس کی ہمت ہی نہیں پڑے گی کچھ بھی کہنے کی۔ بس کاش ابا اسے معاف کر دیں..... ایسی ہی کتنی سوچیں اس کے ذہن میں لپچل چار ہی تھیں۔

”عدیل میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔ میں کیسے سب کا سامنا کروں گی۔ پتا نہیں وہ میری بات کا یقین بھی کریں گے یا نہیں۔“ شہزادی کی آواز میں لغزش تھی۔

”میں نے اس معاملے پر غور کر لیا ہے۔ کل ہم

جہاز کی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ آنکھیں بند کیے اپنے حسین تصورات میں گم تھا۔ لاہور آنے میں بس اب کچھ ہی دیر باقی تھی۔ اس نے جیب سے بے حد خوب صورت ڈائمنڈ کی رنگ ایک بار پھر نکال کر دیکھی اور ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ساتھ بیٹھی ہوئی ماہ رخ نے کچھ جپلس ہو کر اسے ٹوکا۔

”فاران آپ بار بار یہ انگوٹھی نکال کر کیا جتنا چاہ رہے ہیں۔ ارے بابا ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کی بیوی بہت پیاری ہیں اور.....“ فاران نے کچھ خشک لہجے میں اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

”ماہ رخ پلیز یہ میرا بہت پرسل معاملہ ہے، میں اس پر ڈسکشن کرنا بالکل پسند نہیں کروں گا۔“

ماہ رخ کچھ کھسیا سی گئی۔ وہ اس کی فلم کی ہیروئن ہونے کے باوجود اس وقت اپنے آپ کو ایکسٹریسے بھی کم محسوس کر رہی تھی۔

تھوڑا سا مذاق کرنے کا حق سمجھ لیا تھا..... لیکن آپ کچھ زیادہ ہی sensitive ہو رہے ہیں آج کل، اللہ خیر کرے.....“ وہ غنی سے کہتے ہوئے اپنی سیٹ سے اٹھ کر آگے جا کر بیٹھ گئی۔ ویسے بھی فرسٹ کلاس میں کافی سیٹس خالی تھیں۔ ان کے ڈائریکٹر نے جو ان کے ساتھ والی رو میں بیٹھا ہوا تھا ان کے درمیان ہوتی ہوئی اس غنی کو محسوس کیا تو کچھ گھبرا سا گیا۔ ابھی اس کی فلم کا کچھ کام باقی تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کے بگڑتے تعلقات کا اثر اس کی فلم پر پڑے۔ وہ کچھ اپ سیٹ سا ہو کر فاران کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔

”فاران یار، ذرا مجھ پر رحم کرو..... ماہ رخ کو تو تم جانتے ہی ہو اس کا غرہ ساری فلم انڈسٹری میں مشہور ہے اگر اس نے کچھ گڑبڑ کر دی تو میں تباہ ہو جاؤں گا یار.....“ شہر یار کی پریشانی کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ ماہ رخ اس سے پہلے بھی شہر یار سے فاران کے رویے کے بارے میں شکایت کر چکی تھی۔

دونوں زنیہ صاحبہ کے گھر چلتے ہیں۔ تمہیں ہمت کر کے اب انہیں ساری سچائی بتانی ہوگی۔ اتنے دنوں میں ویسے بھی وہ تمہیں سمجھ ہی گئی ہیں۔ تمہارے کردار، تمہاری معصومیت کی تو وہ قسم کھانے کو تیار رہتی ہیں تو پھر تمہارے مصلحتاً بولے ہوئے جھوٹ کو وہ بالکل ماسٹڈ نہیں کریں گی بلکہ انہیں تو خوشی ہوگی کہ تمہاری کوئی ظالم خالہ نہیں ہیں بلکہ تمہارے چاہنے والے ماں، باپ اور بہن موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارا اس طرح اپنے ماں باپ کو چھوڑ دینا انہیں برا لگے لیکن بہر حال تم انہیں منا ہی لوگی۔“ عدیل کی باتوں پر اس نے الجھ کر اسے دیکھا۔

”لیکن عدیل انہیں یہ سب کچھ بتانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”ارے پاگل لڑکی..... ان کی گواہی تمہارے اس کیس کو بہت مضبوط بنا دے گی..... پہلے میں، زنیہ صاحبہ اور ان کے بچوں کے ساتھ جا کر تمہارے ابا سے ملوں گا..... ہم لوگ ہر ممکن طریقے سے ان لوگوں کا دل صاف کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں تمہارا شوہر ہونے کے ناتے تمہاری پاکیزگی کی گواہی دوں گا۔ زنیہ صاحبہ بھی تمہاری بے گناہی کی گواہ ہوں گی۔ میں روشانہ کو بھی سمجھا دوں گا کہ وہ اپنی شہزادی باجی کے بارے میں یہ ضرور بتائے کہ وہ اس کی باجی بن کر اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ شہزادی پلیز تم مجھ پر بس دل سے بھروسہ کر کے ہر فکر سے آزاد ہو جاؤ۔ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔“ اس کے ڈوبتے ہوئے دل میں عدیل کا ہر جملہ جیسے ایک تقویت بن کر اتر رہا تھا۔

☆☆☆

وہ راستے پہ لا کے دامن چھڑا رہے ہیں جس دل میں گھر بنایا اس گھر کو ڈھار ہے ہیں پہچان کے بھی ہم کو، انجان ان کا بننا اپنے تغالوں سے دل کو دکھا رہے ہیں ہم نے تو کبھی ان کو ایسے نہیں ستایا پوچھنے کوئی شفق، وہ کیوں ستارے ہیں

شہر یار فلم کا ڈائریکٹر اور پروڈیوسر دونوں ہی تھا اور ماہ رخ کا آف موڈ اسے بہت فکر مند کر رہا تھا۔ شہر یار کے اصرار پر وہ طوعاً و کرہاً اٹھ کر ماہ رخ کے پاس آ گیا کہ بقول شہر یار تم جہاز کو اس وقت فلم کا سیٹ سمجھ کر تھوڑی سی ایکٹنگ کر کے ماہ رخ کا موڈ ٹھیک کر دو..... اور پھر ایسا ہی ہوا اس نے کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو ایک بار پھر ہیرو کے روپ میں ڈھال لیا تھا جو فلم میں اپنی ہیروئن کو منانے کے لیے بہت خوب صورت جملوں کا سہارا لیا کرتا تھا۔ ویسے بھی شہر یار نے اسے اپنی دوسری فلم کے لیے سائن کیا ہوا تھا اور فاران جانتا تھا کہ شہر یار کو نقصان پہنچنے کا مطلب اس کے اپنے کیریئر کو دھچکا لگنے کے مترادف تھا۔

لاہور کے ائر پورٹ پر جب جہاز لینڈ کر رہا تھا تو جہاں ماہ رخ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری

اسے اپنے حسن اپنی اداکاری پر کچھ زیادہ ہی ناز تھا۔ ویسے بھی آج کل وہ کافی ٹاپ پر جا رہی تھی بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ہر فلم پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کی ضرورت بنتی جا رہی تھی وہ..... فاران کے ساتھ شوٹنگ میں جذباتی سین کراتے ہوئے اب وہ سچ سچ اس کے قریب آنا چاہ رہی تھی لیکن فاران کی طرف سے ملنے والے کوئڈر سپانس کو جیسے اس نے اپنی اپنا کا مسئلہ بنالیا تھا، اپنی انسلٹ محسوس کرنے لگی تھی وہ..... اس کے تو ایک اشارے پر لوگ جان دینے کو تیار ہو جاتے تھے اور فاران تھا کہ اس کی نگاہ التفات کو اہمیت ہی نہیں دے رہا تھا..... اور اس وقت جب اس کی منزل کچھ گھنٹوں کی مسافت پر تھی اور وہ آنکھیں موند کر صرف اور صرف شہزادی کو سوچنا چاہ رہا تھا ایسے میں شہر یار کی بے چارگی سے کی گئی ریکیو سیٹ پر عمل کرنا اسے انتہائی ٹھن لگ رہا تھا۔



ہیروئن خواتین کا کارڈ

ہلوسم بریسٹ ڈولپنگ ایڈڈ ٹائیٹنگ کریم (ہرٹل)

چیونٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے

بریسٹ کی نرمی کو برقرار رکھتی ہے۔ بریسٹ کو سٹائل اور خوبصورت بناتی ہے۔

Rs. 250/=

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

گلیسی

یونانی کریم

نتیجہ جلدی پر چھوٹی سے بڑا ہوا اور خوبصورت ہے۔

کریم کے ذریعہ جلد کو صاف کر کے رگڑ کر لائی ہے۔

0345-700600

042-7666264

Cell: 0333-5203553, Website: www.devapk.com

051-5502903-5533528

2433682

042-7666264

ہوئی تھی وہیں فاران کا دل بھی اپنی جان جاں سے ملنے کے تصور سے ہی کھلا جا رہا تھا۔ وہ ایک بہت خوب صورت احساس سے سرشار تھا، کتنی عجیب سی بات تھی کہ اس دوران اسے ایک بل بھی زبیرا کا خیال نہیں آیا تھا بس دل ایک ضربی بچے کے مانند۔ صرف شہزادی کے نام کی گردان کیے جا رہا تھا۔ اس نے کسی کو بھی اپنی فلائٹ ٹائمنگ کے بارے میں نہیں بتایا تھا صرف اس کا سیکریٹری انرپورٹ پر اس کا منتظر تھا۔ کار جب اس کے بنگلے کے پورچ میں آ کر رکی تو لان میں کھیلتا ہوا فرحان دوڑتا ہوا آ کر اس سے لپٹ گیا۔ فاران نے بے اختیار اسے گود میں اٹھالیا۔ اپنے بچے پر اسے بے تحاشا پیار آیا تھا۔ اتنے دنوں بعد جو دیکھا تھا اسے۔ فاران کو کچھ ندامت سی بھی محسوس ہوئی تھی اس وقت..... کیسا باپ تھا وہ جو شہزادی کی یادوں میں گم ہو کر اپنے بچوں کو بھلا ہی بیٹھا تھا۔ کیا شہزادی کی محبت سب رشتوں پر بھاری پڑ گئی تھی۔ وہ فرحان کو گود میں اٹھائے اس سے باتیں کرتا ہوا اندر داخل ہوا تو ڈرائنگ روم سے آتی ہوئی باتوں کی آواز پر وہ کچھ ٹھنک کر رک گیا بے اختیار دل میں خیال آیا کہ کہیں راحیلہ باجی یا زبیرا کے ای ابو تو نہیں آئے ہوئے ہیں۔

”اچھا ہے اگر وہ لوگ آگئے ہیں تو اب مجھے بھی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ اب میں مزید وقت نہیں ضائع کروں گا۔“ فاران نے بیٹے کو گود سے اتارتے ہوئے سوچا تھا۔

”بابا آگئے..... بابا آگئے.....“ فرحان خوشی سے اچھلتا ہوا اندر ڈرائنگ روم میں دوڑتا ہوا چلا گیا۔ فاران بھی اس کے پیچھے ہی اندر داخل ہوا تھا اور پھر جیسے سامنے کے منظر نے اسے بالکل ہی منجمد کر دیا۔ پتا نہیں موت کی تکلیف کیسی ہوتی ہوگی لیکن آج اس نے مرنے سے پہلے ہی اس کا مزہ چکھ لیا تھا۔ سامنے ہی شہزادی ڈیپ ریڈ کمدانی کے سوٹ

میں عدیل کے ساتھ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ گورے، گورے ہاتھوں میں رچی مہندی، سنڈل کلائیوں میں کھلتی سرخ سنہری چوڑیاں اور چہرے پر نکھر اڑھتا ہوا کاروپ بہت واضح طور پر بتا رہا تھا کہ وہ نئی نویلی دہن ہے اور اس کے بالکل نزدیک بیٹھا ہوا عدیل..... فاران کا دل جیسے ڈوبنے لگا تو کیا زبیرا نے اس کی غیر موجودگی میں شہزادی کو اس سے چھین کر عدیل کا بنا دیا..... وہ تھی دامن رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ہر بل بسنے والے خواب کی تصویر بجائے اس کے، عدیل کو کیسے مل سکتی ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے، وہ جنونی انداز میں آگے بڑھا..... زبیرا جو عدیل کی کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ اچانک ہی فرحان کی اس آواز پر کہ بابا آگئے بے اختیار متوجس ہو کر سامنے دیکھنے لگی جہاں فاران شدید غصے کی کیفیت میں اسے اپنی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا تھا۔ اسے لگا جیسے ایک دم سے اس کے پیروں کی جان کل گئی ہو۔ وہ ویسے ہی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی جبکہ شہزادی کے چہرے کا رنگ بھی اڑ گیا تھا البتہ عدیل اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

”السلام علیکم..... سر what a pleasant surprise“ فاران کو تو جیسے کچھ سنائی دے رہا تھا اور نہ کچھ دکھائی..... وہ عدیل کا بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کرتے ہوئے زبیرا کے قریب آ گیا۔ ”یہ تم نے کیا کر دیا زبیرا..... میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گا۔ خدا کی قسم میں تمہیں اس کی بہت بڑی سزا دوں گا۔“ اس کے لہجے کی دہکتی آگ جیسے زبیرا کو جھلسائے جا رہی تھی۔ خوف کے بارے منہ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہہ پاتی۔ عدیل اس کی بیہوشی کو سنبھالنے کی خاطر جلدی سے آگے بڑھا آیا۔

”سراسر میں زبیرا صاحبہ کا کوئی قصور نہیں ہے اصل میں.....“ لیکن عدیل کا جملہ آدھا ہی رہ گیا

کیونکہ فاران نے پلٹ کر اس کے گال پر اتنی زور سے پھڑپھڑا کر مارا تھا کہ وہ لڑکھڑا کر قریب رکھی ہوئی میز سے کھرا گیا۔ شہزادی کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ فاران نے پلٹ کر اسے دیکھا اور بے اختیار اس کے قریب آ کر دیوانگی کے عالم میں اس کے کاندھوں کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”شہزادی میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ میرا انتظار کرنا لیکن پھر تم کیوں اس عورت کی باتوں میں آ گئیں۔ تمہیں نہیں پتا اس وقت میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ تم ابھی اسی وقت میرے ساتھ چلو میں ان سب سے نپٹ لوں گا۔“ فاران بالکل ہوش میں نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ عدیل تیزی سے ان لوگوں کے نزدیک آیا اور پوری قوت سے فاران کو دھکا دے کر شہزادی کو اپنی ہانہوں میں سمیٹ لیا جو تھر تھر کانپ رہی تھی۔

”خبردار جو آئندہ میری بیوی کے قریب بھی آنے کی کوشش کی۔ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔“ عدیل بھی آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ زبیرا پھٹی، پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی جبکہ فرحان بہم کر زور زور سے رونے لگا۔ شور کی آواز شاید باہر تک بھی پہنچ گئی تھی تبھی دونوں گارڈز بھاگتے ہوئے اندر آگئے جہاں فاران، عدیل کے دھکا دینے کے بعد اس کی دھمکی کے جواب میں اس پر جھپٹا تھا اس نے عدیل کو مٹکا مارنا چاہا لیکن عدیل نے اپنے ہاتھ سے اسے روک دیا۔ اتنے میں دونوں گارڈز نے جلدی سے بڑھ کر عدیل کو اپنے قابو میں کر لیا جو فاران سے گتھم گتھا ہو چکا تھا۔

”لے جا کر باہر پھینک دو اس منحوس کو۔“ فاران نے چیخ کر گارڈز کو حکم دیا۔ ایک گارڈ نے زور سے عدیل کو پھڑپھڑاتے ہوئے اسے باہر کی طرف گھسیٹا جبکہ دوسرا بھی اسے مارنے سے گریز نہیں کر رہا تھا۔ شہزادی

روتے ہوئے زبیرا سے لپٹ گئی تب زبیرا میں نہ جانے کہاں سے ہمت آ گئی وہ بے اختیار زور سے چلائی۔ ”قادر چھوڑ دو انہیں، یہ میرے مہمان ہیں۔“ گارڈز نے کچھ گھبرا کر فاران کی طرف دیکھا۔ اتنے میں عدیل نے تیزی سے اپنے آپ کو چھڑایا اور روتی ہوئی شہزادی کا ہاتھ تھام کر قہر آلود نظروں سے فاران کو دیکھتا ہوا باہر کی جانب بڑھا۔ فاران نے بہت کرب سے دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ جس کی یادوں جس کے خیالوں نے اسے دنیا سے بیگانہ کر دیا تھا..... وہ اس کے عشق اس کے جنون سے کتنی بیگانہ تھی۔ اس کے جذبات اس کے احساسات سے وہ کیسے اتنی لا تعلق تھی کہ اسی کے سامنے عدیل کا ہاتھ تھام کر جاتے ہوئے اسے جتا گئی تھی کہ اس کی چاہت وہ نہیں بلکہ عدیل ہے۔ دونوں گارڈز بھی ان کے پیچھے باہر جا چکے تھے، وہ خالی، خالی نظروں سے دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ تب ہی زبیرا جھکتی ہوئی اس کے نزدیک چلی آئی۔ اس نے روتے ہوئے فرحان کا ہاتھ تھاما ہوا تھا جو سسکیاں بھرتا ہوا خوفزدہ نظروں سے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تو اچھا ہی ہوا تھا کہ رد شانہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھی وہ اپنی کسی کلاس فیلو کی برتھ ڈے پر ابھی کچھ ہی دیر قبل گئی تھی ورنہ صورت حال مزید گھبر ہو جاتی کیونکہ وہ بڑی حساس بچی تھی۔

زبیرا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ فاران یوں اچانک آجائے گا۔ عدیل آج شہزادی کو لے کر اس کے پاس بہت اہم مسئلہ ڈسکس کرنے آیا تھا..... اور جب شہزادی نے ڈرتے، ڈرتے اسے اپنی اصل کہانی سنائی تھی تو لمحے بھر کو تو وہ شاکڈ رہ گئی تھی اسے شہزادی کے جھوٹ پر غصہ بھی آیا تھا لیکن پھر عدیل کے سمجھانے اور شہزادی کے آنسوؤں نے اسے موم کر دیا تھا اور اس وقت وہ لوگ کل کا پروگرام طے کر رہے تھے کہ کیسے شہزادی کے والدین سے مل کر انہیں اس کی بے گناہی کا یقین دلایا جائے لیکن

ہوئے بے ہوش ہو کر ان کی بانہوں میں جھول گئی۔
ایسہ نے بے حد گھبرا کر اسے سنبھالنے کی
کوشش کی جبکہ عدیل نے تیزی سے بڑھ کر اسے
زمین پر گرنے سے پہلے ہی اپنے بازوؤں میں سمیٹ
لیا تھا..... اجمل صاحب بھی سب کچھ بھول کر اس کی
طرف لپکے۔

”کیا ہو گیا ہے میری بچی کو.....؟“ وہ انتہائی
پریشانی سے عدیل سے اسے برآمدے میں رکھے ہوئے
پتنگ پر لٹاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”اجمل اگر میری شہزادی کو کچھ ہو گیا تو میں
آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ ارے سن تو لیتے
کہ اس پر کیا گزری تھی۔“ ایسہ روتے ہوئے پانی
کے چھینٹے مارتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ عدیل بھی
گھبرا کر اس کے رخساروں کو تھپتھپاتے ہوئے اسے
پکار رہا تھا جبکہ اجمل صاحب ڈوبتے ہوئے دل کے
ساتھ اسے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔

”انکل آپ یقین کریں جب شہزادی آپ
لوگوں کو چھوڑ کر گئی تھی تو اس وقت میں اس کو جانتا
تک نہیں تھا۔ ملنا تو بہت دور کی بات ہے لیکن آج یہ
میری بیوی ہے۔ میں ایک شریف فیملی کے گھر سے
اسے عزت سے بپاہ کر لایا ہوں۔“ دفعتاً عدیل نے
سراٹھا کر بھڑائی ہوئی آواز میں انہیں مخاطب کیا تو اس
کے لہجے کی سچائی نہ چاہتے ہوئے بھی اجمل صاحب
کو اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تبھی شہزادی
کے پوتوں میں ذرا سی جنبش ہوئی تھی۔

”شہزادی آنکھیں کھولو میری بچی..... تمہاری اماں
ہمیشہ تمہارا ساتھ دے گی۔“ ایسہ نے اسے ہوش میں
آتے دیکھا تو بے تابی سے اسے پکارتے ہوئے اس پر
جھک گئیں۔ آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے۔
شہزادی نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں تو اجمل صاحب
جلدی سے اس کے پاس سے ہٹ کر تخت پر بیٹھ گئے۔
”اماں پلیز ابا سے کہیں کہ مجھے معاف

کر دیں۔“ شہزادی نے نقاہت سے کہتے ہوئے ان
کی گود میں منہ چھپا لیا۔ اپنی ماں کے آنسوؤں میں وہ
ان کی کھونکی ہوئی مامتا ڈھونڈ چکی تھی۔

”وہ تمہیں معاف کر چکے ہیں شہزادی..... میں
ان کا چہرہ پڑھنا جانتی ہوں۔“ ایسہ نے دزدیدہ
نظروں سے سامنے سر جھکا کر بیٹھے ہوئے اجمل
صاحب کو دیکھتے ہوئے بہت آہستگی سے کہا تھا۔ ان
کا دل اپنے شوہر کی اس بے بسی پر کڑھ رہا تھا۔
جنہوں نے تبھی شہزادی کا منہ نہ دیکھنے کی قسم کھائی
تھی۔ اس وقت شہزادی کی بے گناہی کی گواہی اس کا
وہ شوہر دے رہا تھا جس نے ان لوگوں کی غیر
موجودگی میں ان کی بیٹی کا ہاتھ تھاما تھا۔ ان کی
شہزادی بتا ان لوگوں کی دعائیں لیے کسی اور کے گھر
سے رخصت ہوئی تھی۔ اس سے بڑا بھلا کوئی اور قسم
ہوسکتا تھا کسی ماں باپ کے لیے..... لیکن بہر حال
ان کے دل میں بس یہ سکون ضرور تھا کہ ان کی بیٹی کسی
کے ساتھ بھاگی نہیں تھی۔ اس کا ایک، ایک آنسو اس
کی معصومیت کا گواہ بن کر انہیں اس بات کا اطمینان
دلا گیا تھا..... پھر اس کے ساتھ آنے والا اس کا شوہر
چہرے، مہرے اور بات چیت سے کسی شریف
خاندان کا نوجوان لگ رہا تھا لیکن پھر بھی شہزادی نے
اپنی نادانی کی وجہ سے ان لوگوں کو جس اذیت اور
کرب سے دوچار رکھا تھا اس دکھ کو بس وہی لوگ سمجھ
سکتے تھے، جن کی بیٹیاں ان کی عزت کو اپنے پاؤں
تले روند کر انہیں ذلت اور بدنامی کے ایسے
اندھیروں میں چھوڑ کر جاتی ہیں جہاں وہ کسی سے
آنکھیں ملانے کے بھی قابل نہیں رہتے۔ وہ تو اجمل
صاحب نے اپنی فہم و فراست سے کام لے کر کسی کو
بھی نہیں پتا چلنے دیا تھا کہ ان کے گھر پر وہ قیامت
ٹوٹی ہے جس نے انہیں زندہ درگور کر دیا۔

عام عورتوں کے برعکس ایسہ نے بھی اپنے
شوہر کا کھل ساتھ دیتے ہوئے اپنی کسی بھی بات سے

اپنے خاندان اور جاننے والوں پر کبھی کبھہ ظاہر نہیں
ہونے دیا تھا حالانکہ دل اندر سے بالکل ختم ہوتا جا رہا
تھا، رد و کر آنکھیں بھی خشک ہو چکی تھیں۔ رانی کو ہی
اپنے گھر پر گزرنے والے اس سانچے کی خبر تھی، وہ
بھی ایسہ نے اپنے گاؤں جانے سے پہلے سامان کی
پتنگ کے بہانے اسے گھر بلا لیا تھا۔ فقیر محمد اسے چند
گھنٹوں کے لیے ان کے پاس چھوڑ گیا تھا اور یہ چند
گھنٹے رانی کے لیے اپنے اندر ایسے قیامت خیز لمحات
چھپائے ہوئے تھے جن کی اذیت اس سے بالکل سہی
نہیں جا رہی تھی..... شہزادی کے یوں اچانک غائب
ہو جانے کی خبر نے اس کے تو ہوش دھواس ہی اڑا کر
رکھ دیے تھے۔ وہ یوں چلا، چلا کر روئی تھی کہ ماں
باپ کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ خود ان دونوں
کی اپنی حالت بھی دگرگوں تھی ان کے چھوٹے سے
گھر میں ایک ماتم سا پاپا تھا۔ ایک لڑکی کی عاقبت
نااندیشی نے کیسے ان معصوم لوگوں کو آنسوؤں
میں ڈبو کر ان سے ان کی خوشیاں بھی چھین لی تھیں۔
ابھی تو رانی نے اپنی زندگی کی نئی شروعات کو ڈھنگ
سے سمجھا بھی نہیں تھا کہ ان کے خوشیوں بھرے رنگین
دلوں پر ایک دم سے سیاہی بکھر گئی تھی۔ پھر اجمل
صاحب نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے نہ جانے
کتنی دیر تک رانی کو سمجھایا تھا۔

وہ معصوم کم سن سی لڑکی برستی آنکھوں اور سہے
ہوئے دل کے ساتھ اپنے ابا کی وہ تمام نصیحتیں سمجھنے کی
کوشش کر رہی تھی جس سے اس کے خاندان کی عزت بچ
سکتی تھی۔ کتنے بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا شہزادی
نے اسے کہ اتنی بڑی خبر کو اسے ہمیشہ اپنے دل میں چھپا
کر پہلے کی طرح ہنسنا بولنا تھا۔ اپنی بہن کی فرضی شادی
میں گاؤں نہ جانے کا بس صرف تھوڑا سا افسوس ظاہر کر
کے اپنی زندگی میں گمن ہو جانا کوئی آسان بات نہیں تھی
لیکن اسے یہ ایکٹنگ بھی کرنا تھی اور ابھی فقیر محمد کے
آنے سے پہلے، پہلے اسے اپنے آپ کو بالکل نارمل بھی

کرنا تھا..... اور اس دقت ایسہ کو وہ تمام باتیں یاد آئیں
تو ان کی گود میں منہ چھپائے شہزادی کو ایک دم اپنے
سے الگ کر دینے کو دل چاہنے لگا..... بے اختیار ہی
محبت کی جگہ غصے نے لے لی تھی لیکن پھر ایک سہی ہوئی
سی خوفزدہ چڑیا کے مانند ان کی مامتا کی چھاؤں میں پناہ
لیتی ہوئی اپنی اس بیٹی پر ترس بھی آنے لگا۔

”جاؤ بیٹا، اپنے ابا کے پاس جا کر سب باتیں
پوری سچائی کے ساتھ بتا دو..... جو داغ وہ اپنی نیک
نامی پر تمہاری وجہ سے لگا ہوا محسوس کر رہے تھے اب
اس کو تم اپنی بے گناہی ثابت کر کے ہی مٹا سکتی ہو۔“
انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے کہا تو عدیل
نے بھی فوراً ہی آنکھ کے اشارے سے اسے اجمل
صاحب کے پاس جانے کا اشارہ کیا تھا۔ شہزادی
آہستہ سے اٹھی لیکن اجمل صاحب کے پاس جانے
کے بجائے وہ ایک دم اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
سب ہی نے حیران ہو کر اسے اندر کمرے میں جاتے
ہوئے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ ایسہ گھبرا کر اس کے
پیچھے جاتیں وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس بار اس
کے ہاتھ میں قرآن شریف تھا۔ وہ آہستگی سے آکر
اجمل صاحب کے نزدیک بیٹھ گئی۔

”ابا میں جانتی ہوں آپ کا مجھ پر سے اعتبار
اٹھ چکا ہے لیکن آپ کو اس بات پر ہمیشہ یقین رہے گا
کہ میں قرآن ہاتھ میں لے کر کبھی جھوٹ نہیں بول
سکتی..... ابا میں اس قرآن کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ
میں اس روز ہونے سے صرف اپنے غصے اور فقیر محمد کی
غذاق اڑاتی ہوئی نگاہوں کی وجہ سے نکلی تھی..... میں
ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں ابا جو صرف ایک محبت
کی خاطر اتنی محبتوں کا خون کروتی ہیں..... اپنے
پیارے رشتوں کو دنیا کے سامنے جھینے کے قابل ہی
نہیں چھوڑتیں..... ابا ایسی کوئی بات نہیں تھی اور ابا
آپ کی بیٹی محفوظ ہاتھوں میں رہی ہے۔ میں نے
آپ کی عزت پر کوئی حرف نہیں آنے دیا۔“ آخری

جملہ کہتے ہوئے وہ بے اختیار روتے ہوئے اجمل صاحب کے گلے لگ گئی۔ عدیل نے اس کے ہاتھ سے قرآن پاک لے لیا۔ اجمل صاحب کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی..... پھر عدیل نے تفصیل سے شہزادی کے ہوٹل سے نکلنے کے بعد کے تمام واقعات ان لوگوں کو بتاتے ہوئے اجمل صاحب سے یہ التجا بھی کہ وہ اب چل کر اس کی امی سے بھی مل لیں لیکن ان پر کچھ ظاہر نہیں کریں کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ شہزادی کی عزت... کبھی اس کی ماں کی نظروں میں کم ہو..... جب عدیل انہیں یہ سب تفصیل بتا رہا تھا تو شہزادی کی تشکر آمیز نگاہیں جیسے اس کے چہرے کی بلا میں لے رہی تھیں..... اسے عدیل کسی فرشتے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

شوہر بننا کسی مرد کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہوتی لیکن کسی عورت کی چھوٹی، چھوٹی سی خوشیوں کا ضامن بن جانا، اس کی عزت کا محافظ بن کر دنیا کے سامنے اس کے لیے ڈھال بن جانا..... یہ ہر مرد کے بس کی بات نہیں ہوتی اور وہ کتنی خوش قسمت تھی کہ اسے صرف شوہر نہیں بلکہ اپنی زندگی کا بہت سچا اور بے لوث محبت کرنے والا ساتھی ملا تھا..... گھر چھوڑنے کے بعد اگر زینرا اور پھر عدیل جیسے لوگ نہ ملتے تو اپنی نادانی و نا سمجھی سے اٹھائے ہوئے قدموں کی وجہ سے وہ نہ جانے کن ہاتھوں میں پڑ گئی ہوتی..... شہزادی نے ایک جھر جھری لے کر سوچا تھا اور اس کے ساتھ ہی زینرا کی یاد ایک فکر بن کر اسے پریشان کر گئی..... پتا نہیں ان پر اس دن ان لوگوں کے چلے آنے کے بعد کیا گزری تھی۔

☆☆☆

”تم ابھی اور اسی وقت اپنا سامان پیک کرو..... ہم لوگ رات کی فلائٹ سے کراچی جا رہے ہیں۔“ فرحان کو بہلا کر جب وہ کمرے میں آئی تھی تو فاران نے بہت درشت لہجے میں اپنا حکم

اسے سنایا تھا۔

”نہیں فاران میں آج تو کیا۔۔۔ فی الحال ایک مہینہ کہیں نہیں جاسکتی۔ بچوں کے انگرام نزدیک آرہے ہیں۔“ زینرا نے بہت نارمل انداز میں ایسے جواب دینے کی کوشش کی گویا فاران کوئی تفریحی پروگرام بنا رہا ہو حالانکہ اس کا دل اندر سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

”شٹ اپ.....“ فاران بری طرح سے دباؤ تھا..... ”بچوں کی آڑ لے کر فضول بہانے بنانے کی ضرورت نہیں..... تم کیا سمجھتی ہو شہزادی کو مجھ سے چھین کر تم دوبارہ میری زندگی میں واپس آ جاؤ گی ارے تم تو شہزادی کے آنے سے پہلے ہی میرے لیے مریچکی تھیں۔ بس میں بچوں کی خاطر تمہاری لاش کو دفنانے سے ڈر رہا تھا..... لیکن اب میرا فیصلہ اٹل ہے میں کسی کی بھی خاطر جبر کی زندگی نہیں گزار سکتا سمجھیں تم.....؟“ فاران کا ایک ایک جملہ زینرا کے دل پر کوڑے کے مانند لگ رہا تھا۔

”فاران میں آپ کی نفرت اتنے عرصے سے صرف اس آس پر سستی رہی ہوں کہ شاید آپ کے دل میں میری سوئی ہوئی محبت دوبارہ جاگ اٹھے لیکن وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر بے اختیار رو دی۔

”اب مجھے تم سے نہ محبت رہی ہے اور نہ ہی نفرت محسوس ہو رہی ہے، کوئی بھی احساس باقی نہیں رہا تمہارے لیے میرے دل میں..... آج میں جس اذیت سے گزر رہا ہوں اس کے بعد اب میرے لیے غم اور خوشی دونوں ہی کوئی معنی نہیں رکھتے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے بے اختیار اس کی آواز بھرا گئی۔ زینرا نے بہت بے بسی سے اسے دیکھا..... کتنی سفاکی سے فاران نے اپنے الفاظ اس کی روح تک میں گھاؤ ڈال دیے تھے لیکن پھر بھی اس وقت فاران آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھ کر نہ جانے کیوں بے اختیار اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ

اپنے اس بے درد محبوب کو اپنے گلے سے لگا کر اس کی آنکھوں کے آنسو اپنی آنکھوں میں اتار لے..... اپنے دل کو مضبوط کر کے اس سے شہزادی کے بچھڑ جانے کا دکھ بھی بانٹنے کو وہ تیار تھی لیکن اس بے مہر نے تو اسے اپنے آپ سے اتنا دور کر لیا تھا کہ وہ تو اب اس کے سامنے کو بھی نہیں چھو سکتی تھی۔ آخر وہ ایسا کیا کرے کہ اس کا فاران اس کے پاس واپس لوٹ آئے..... زینرا نے بہت بے بسی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں کو مسلتے ہوئے سوچا تھا۔

”کل کراچی میں اپنے اور تمہارے گھر والوں کے سامنے میں اپنا فیصلہ سناؤں گا۔“ فاران نے مزید اسے مخاطب کیا تو اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ ”نہیں فاران..... پلیز آپ اتنی جلد بازی سے کام مت لیجیے..... کسی سے بھی کچھ مت کہیے..... میں بے شک بچوں کے ساتھ کراچی میں رہ لوں گی لیکن کم از کم میرے پاس ایک آس تو رہے گی کہ شاید آپ بھی مجھے واپس مل جائیں۔“ بے چارگی سے کہتے ہوئے وہ بے اختیار رو دی۔

”ہوتہ..... تم نے قدم، قدم پر میری آس..... میری تمنائوں کا خون کیا ہے تو پھر تمہیں بھی کسی آس کے ساتھ جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ چلو میں اس قصے کو ابھی تمام کر دیتا ہوں، میں نے تمہیں طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی۔“ فاران کے بالکل اچانک کہے گئے یہ جملے ایک بم کی طرح جیسے زینرا کے وجود کے پر خچے اڑا گئے، وہ سیکتے کے عالم میں پھٹی، پھٹی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ پورا کمرہ اسے گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا..... اپنی چیخ رو کٹنے کے لیے اس نے بہت مضبوطی سے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا ہوا تھا..... ایک بہت ہی ناقابل یقین کیفیت سے دوچار ہو رہی تھی وہ اس وقت.....

”ہو گئی تسلی تمہیں کہ اب میں تمہیں کبھی واپس

نہیں مل سکتا.....“ فاران نے اپنی سرخ ہوئی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اسے عیسیٰ نظروں سے دیکھا۔ اس وقت وہ اپنے آپے میں لگ ہی نہیں رہا تھا..... اپنے خوابوں کے چکنا چور ہونے کا بدلہ لے کر بھی جیسے اسے جین نہیں آ رہا تھا..... وہ زینرا کی غیر ہوتی ہوئی حالت کا نوٹس لیے بغیر اسے مزید کچھ کے دینے پر آمادہ تھا..... زینرا کا پورا جسم کانپ رہا تھا اس نے زور سے فاران کو پکارا لیکن اس کے منہ سے آواز ہی نہیں نکلی۔

”اب ہمارے درمیان وہ کاغذی اور شرعی رشتہ بھی نہیں رہا جو مجھے ہر لمحہ گھٹن کا احساس دلانا رہتا تھا۔ جاؤ اب جا کر تھوڑی بہت پکینگ کر لو..... فلائٹ میں زیادہ وقت نہیں ہے۔ باقی سامان میں بعد میں بھجوا دوں گا..... اور ہاں بچوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا وہ تمہارے پاس ہی رہیں گے، میں ہر مہینہ ان سے ملنے آ جایا کروں گا۔“ فاران کا چہرہ بالکل سرخ ہو رہا تھا اور ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ زینرا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھی تو فاران کی آواز پر ایک لمحے کو اس کے پیر تھم گئے۔ کتنا درد تھا فاران کے لہجے میں.....

”پتا نہیں اس کے چھن جانے کے بعد میں کبھی خوش رہ بھی سکوں گا یا نہیں..... لیکن ایک بات یاد رکھنا اس کی محبت اس کی یادیں تم کیا کوئی بھی مجھ سے نہیں چھین سکتا۔“ زینرا کو اس کے الفاظ زہر میں بجھے ہوئے تیر کے مانند اپنے دل پر لگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اتنی بڑی قیامت اس پر توڑ کر بھی فاران کو اس پر ذرا بھی رحم نہیں آ رہا تھا۔ اس کے آنسو اس کا کرب، اس کی اتنی تڑپ کچھ بھی تو فاران کو نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ وہ اس وقت بھی شہزادی کے غم میں ماتم کناں تھا..... اس کی یادوں میں زندہ رہنے کی باتیں کر رہا تھا۔ زینرا کے صدمے سے چور دل میں غصے کی چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ ایک جھٹکے سے اس کی طرف مڑی..... بہت ہی سخت جملہ کہنے

کے لیے لب کھولے لیکن اس کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ فاران سینے کو دونوں ہاتھوں سے تھامے قالین پر گر رہا تھا۔۔۔۔۔ پسینہ پانی کی طرح اس کے چہرے کو بھگور رہا تھا۔۔۔۔۔ زنیہ اسب کچھ بھول کر اس کی طرف لپکی اس وقت تک وہ نیچے گر چکا تھا۔۔۔۔۔ زنیہ نے گھبرا کر اس کے پسینے سے شرابور چہرے کو اپنے دہنے سے پونچھتے ہوئے اسے زور سے ہکا را لیکن فاران کی بند آنکھوں میں کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں بیٹھی ہوئی سفید چاندنی پر عورتیں بیٹھی ہوئی قرآن پڑھ رہی تھیں۔ زنیہ اوہیں دیوار سے ٹیک لگائے خالی، خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے نزدیک ہی بیٹھی ہوئی راحیلہ اور ساجدہ باجی کے آنسو نہیں ٹھہر رہے تھے۔۔۔۔۔ اپنے بھائی کی اس اچانک موت نے انہیں صدمے کی شدت سے بے حال کیا ہوا تھا۔ ان کا بے قراری سے رونا کسی سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ ذیشان بھائی بھی اپنے چھوٹے بھائی کے یوں ایک دم مرجانے کو برداشت نہیں کر پارہے تھے۔۔۔۔۔ ابھی دو دن پہلے تو فاران نے سوٹر لینڈ سے انہیں فون کر کے بتایا تھا کہ وہ لاہور پہنچتے ہی انہیں فوراً اپنے پاس بلوالے گا۔ کتنی چمکتی ہوئی سی آواز تھی اس کی۔۔۔۔۔ خوشی سے معمور لہجہ اب بھی ان کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

”ذیشان بھائی اتنے دنوں سے آپ کو نہیں دیکھا ہے، بس میرے آتے ہی آپ بھی لاہور آجائیے گا۔۔۔۔۔ میں اپنی زندگی کی کچھ خوشیاں آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔“

اس کے جملے یاد آتے ہی ذیشان کے دل میں ہوک سی اٹھی اور وہ بے اختیار ہو کر زور سے رو دیے۔۔۔۔۔ روشاند کا ترپنا بھی سب کا دل کاٹے دے رہا تھا۔ اپنے بابا کو بار بار پکارتے ہوئے وہ غڈ حال ہوئی جا رہی تھی۔ فرحان سہا ہوا سا اپنی نانی

کی گود میں دیکھا سب کی آہ و فغاں کو سن رہا تھا۔ سیر صاحب اپنی بیٹی کے یوں اچانک اجڑ جانے پر بالکل ہی ٹوٹ گئے تھے۔۔۔۔۔ پتا نہیں ان کی بیٹی کی اتنی رشک آمیز زندگی کو کس کی نظر لگ گئی تھی۔ یہ جملہ جب زنیہ کو گلے لگاتے ہوئے انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا تو زنیہ نے بہت اداسی سے اپنے باپ کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا کہ لاعلمی، آگاہی کے کرب سے کتنی زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ کل سے آج تک کا وقفہ اسے سالوں پر محیط لگ رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ صدیوں کی مسافت ایک دن میں طے کر آئی ہو۔ کیا کچھ نہ سہ لیا تھا، اس نے اتنے سے وقت میں۔۔۔۔۔

فاران کو شدید ہارٹ ایک ہوا تھا اسپتال لے جانے کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی۔ حالانکہ ڈاکٹر زاور ایسولینس فوراً ہی گھر پہنچ گئے تھے لیکن فاران ان کے آنے سے قبل ہی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ وہ کتنے کے عالم میں اپنے سامنے ابدی خیند سوئے ہوئے فاران کو دیکھ رہی تھی۔

”اگر آپ کو ہمیشہ کے لیے جانا ہی تھا تو فاران مجھے اپنی بیوی کی حیثیت سے الوداع کہنے کا حق تو نہ چھینتے۔۔۔۔۔ صرف چند ہی لمحوں کی تو بات تھی۔“ زنیہ نے اس کے بے جان چہرے کو بہت شکایتی نظروں سے دیکھا۔۔۔۔۔ ”فاران آپ کی اتنی اچانک موت مجھے صدمے سے چور کیوں نہیں کر رہی۔۔۔۔۔ میں تو آپ کی معمولی سی بیماری سے دال جاتی تھی۔۔۔۔۔ آپ بہت بد قسمت ہیں فاران اتنے سالوں کا ساتھ آپ نے مرنے سے صرف چند منٹ پہلے ہی ختم کر دیا وہ بھی اس لڑکی کے عشق میں جو اپنی نئی زندگی میں من ہے۔ کچھ دیر پہلے آپ نے مجھ پر جو قیامت توڑی ان تین الفاظ نے میرے دل کو اندر سے ختم کر دیا ہے کہ اب اس میں آپ کی موت کا غم بھی نہیں رہا۔۔۔۔۔ ہاں یہ صدمہ ضرور ہو رہا ہے کہ آپ کے

آخری جملوں میں میرے لیے سوائے نفرت کے اور کچھ نہیں تھا۔“ وہ بے آواز رو رہی تھی۔

”بے شک آپ مجھ سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں پھر بھی آپ کی بچاؤ بنی رہتی لیکن آپ نے اپنی آخری سانسیں شہزادی کو پکارتے ہوئے لی ہیں اس کے لیے میں آپ کو کبھی معاف نہیں کر دوں گی۔ آپ مجھے کراچی لے جانا چاہ رہے تھے ناں۔۔۔۔۔ تاکہ سب کے سامنے یہ اعلان کر سکیں کہ آپ نے مجھے طلاق دے دی ہے تو کراچی تو مجھے جانا ہی ہوگا لیکن مطلقہ بن کر نہیں بلکہ آپ کی بیوہ بن کر۔۔۔۔۔ شکر ہے اس طلاق کا گواہ کوئی نہیں۔۔۔۔۔ آپ کی اس نام نہاد حسین رفاقت اور خوب صورت زندگی جس پر سارا خاندان مجھ پر رشک کرتا تھا اس بھرم کو میں ہمیشہ بنا کر رکھوں گی ورنہ آپ نے تو مجھ سے دنیا والوں کے سامنے سر اٹھا کر جینے کا حق بھی چھین لیا۔۔۔۔۔ میں کیسے سب کی تمسخر اڑانی نگاہوں کا سامنا کرتی۔۔۔۔۔ میرے ماں، باپ جو میری زندگی پر فخر کیا کرتے ہیں وہ جیتے جی مرجاتے۔۔۔۔۔ اب کم از کم میں عزت کے ساتھ تو جیوں گی۔ لوگ ہمیشہ میری خوشیوں میری شاندار زندگی اور میرے شوہر کی سچی محبت کی مثال دیتے رہیں گے۔ کسی کو بھی نہیں پتا چلے گا فاران کہ مرنے سے بس چند لمحے پہلے ہی آپ نے مجھے طلاق دے کر اپنی نفرت کی انتہا بتا دی تھی۔ فاران میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کی موت میں میری عزت چھینی ہوگی۔“ یہ سوچ ایک عجیب سی خوشی بن کر جب اس کے دل میں چھائی تو اس نے بے اختیار گھبرا کر اپنے سر کو جھکادیا تھا۔

فاران کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی تھی۔ پوری فلم انڈسٹری تو جیسے ال کر رہ گئی تھی۔ خاص کر پروڈیوسرز تو بے حد شاک میں تھے فاران کی موت سے زیادہ انہیں فلموں کی فکر پڑ گئی تھی۔ کچھ ہی گھنٹوں میں اس کے میکے اور سسرال والے اس کے پاس پہنچ گئے تھے۔ آہ و بکا سے اس گھر

کے در و دیوار لرز رہے تھے۔۔۔۔۔ فاران کی اس اچانک جوان موت کو کسی کا ذہن قبول نہیں کر رہا تھا۔ بس ایک زنیہ اٹھی جو اپنی خشک آنکھوں اور منجمد ہوتے ہوئے ذہن کے ساتھ بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ سب لوگ اسے رُلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ زنیہ کا دل چاہا وہ چیخ، چیخ کر سب کو بتائے کہ فاران اپنے آخری لمحات میں اسے اتار لاکر گیا ہے کیہ اب اس کے پاس آنسوؤں کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے۔ بھی اسے سامنے سے شہزادی آتی ہوئی نظر آئی۔ سیاہ چادر میں اپنے چاند کی طرح چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ انتہائی خوب صورت لگ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی زنیہ کے کانوں میں فاران کی آواز کی بازگشت گونجنے لگی۔

”میں نے تمہیں طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی۔۔۔۔۔ ہاں اس کی محبت اس کی یادیں مجھ سے تم تو کیا کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔“ زنیہ کا دل جیسے پھٹنے لگا۔۔۔۔۔ اس کے شوہر نے اس لڑکی کے عشق میں ڈوب کر اس کے چھن جانے کے غم میں اسے طلاق دی تھی۔ وہ شہزادی کی محبت۔۔۔۔۔ اس کی یادیں اپنے دل میں بسا کر موت کی آغوش میں گیا تھا پھر بھلا وہ کیسے اس سے اپنے شوہر کا پُرسہ لیتی۔۔۔۔۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ ”میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے ای، مجھے کمرے میں لے چلیے۔۔۔۔۔“ اس کا ہڈیانی انداز سب کو پریشان کر گیا۔۔۔۔۔ وہ اپنی ای اور فاران کی بھابی کے سہارے اٹھ کر کمرے میں آگئی تھی۔ چہرے سے اس نے اپنے ہاتھ ہٹائے ہی نہیں تھے۔ بس وہ ہڈیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ شہزادی اس کے قریب آئی نہیں سکی۔ بس اپنی باجی کی اس حالت پر وہ وہیں کچھ دیر بیٹھی آنسو بہاتی رہی پھر واپس لوٹ گئی اسے پتا بھی نہیں چلا کہ اس کی باجی جو اس سے بے حد پیار کرتی تھیں اب اس کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں۔ زنیہ اپنے بیڈ پر آکر کچھ خاموش

حجاب

عقیدہ حق



اس کے ہاتھ پیر جیسے بے جان ہو رہے تھے..... دل کی دھڑکن بہت تیزی سے کم ہو رہی تھی..... سانس لینی دشوار ہو رہی تھی اس نے چکراتے سر کے ساتھ چاروں طرف نظریں دوڑائیں..... رش تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا..... وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا..... چھپ جانا چاہتا تھا، مر جانا چاہتا تھا، بہت رونا چاہتا تھا..... اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ زمین پر بیٹھ جائے اور مٹھیاں بھر بھر کر ریت اپنے

محبت، وہی والہانہ انداز..... انہوں نے بہت پیار سے مجھے رنگ پہناتے ہوئے دوبارہ نئی زندگی شروع کرنے کی باتیں کی تھیں لیکن لمحوں میں سب ختم ہو گیا..... اجالا اب یہ رنگ ان کی یاد میں کر ہمیشہ میری انگلی میں رہے گی۔“ وہ بری طرح سے روتے ہوئے اپنے آپ کو جھوٹ کی اس خوب صورت دنیا میں پہنچا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس پاس بیٹھی ہوئی عورتیں جن میں اس کی ماں بھی شامل تھیں اس کی اس ٹریجڈی کو سنتے ہوئے آنسو بہا رہی تھیں لیکن اجالا اس کے ایک، ایک لفظ میں پروئے ہوئے جھوٹ کو اچھی طرح سے محسوس کر رہی تھی۔ استنہ عرصے سے وہ زنیرا کے دکھوں میں شریک رہی تھی۔ فاران کی بے اعتنائی، اس کی نفرت کی شدت کو اچھی طرح سے دیکھا اور سمجھا تھا..... زنیرا کی وہ واحد راز دار تھی جس سے اس نے اپنے آنسو شیر کیے تھے اور اجالا یہ بھی جان رہی تھی کہ زنیرا جس رنگ کا ذکر کر رہی ہے وہ فاران کس کے لیے لے کر آیا ہوگا..... وہ چپ چاپ اس کی باتیں سنتے ہوئے آنسو بہاتی رہی..... فاران کی موت خود اس کے لیے بھی تو ایک ایسا سانحہ تھا جس نے اس کا دل چیر کر رکھ دیا تھا۔ فون بند کر کے برسی آنکھوں کے ساتھ اس نے سوچا۔

”زنیرا میں جانتی ہوں کہ فاران نے آکر تم کو اپنے روتے سے جیتے جی مار دیا ہوگا لیکن میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ خود بھی اپنے دکھ دل میں چھپائے یوں اچانک چپ چاپ چلا جائے گا۔ چلو اچھا ہے کہ تم اپنی زندگی کے اس تاریک باب پر ایک بہت حسین جگہ کا خوشیوں بھرا کورچر ہا کر اسے دینا کو دکھا رہی ہو۔“ اجالا جب یہ سب کچھ سوچ رہی تھی تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ زنیرا کے اس جھوٹ میں چھپا اس کی زندگی کا سب سے کڑوا سچ وہ کبھی نہیں جان پائے گی جو فاران کے ساتھ اس کی قبر کی تاریکیوں میں کم ہو گیا ہے۔

(ختم شد)

ہوئی تو اس کی امی نے سکون کی سانس لی ورنہ وہ تو بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا ہی گئی تھیں۔ بھی روشانہ بے حد پریشان اور خوفزدہ سی اس کے پاس چلی آئی۔ ”مما..... آپ ٹھیک ہیں ناں..... بابا کی طرح آپ تو نہیں جائیں گی ناں.....“ وہ زنیرا سے لپٹ کر زور، زور سے رونے لگی تو زنیرا نے بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”نہیں میری جان، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اب میں تمہارے اور فرحان کے لیے تمہاری ماما بھی ہوں اور بابا بھی۔“ اور فاران کے انتقال کے بعد پہلی بار وہ پھوٹ، پھوٹ کر روئی۔ فرحان بھی سہا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔ دونوں بچوں کو لپٹائے وہ نہ جانے کتنی دیر تک رونی رہی کسی نے بھی اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی کہ سب ہی یہی چاہتے تھے کہ اتنی دیر سے اس کے دل پر چھایا شدید صدمہ کا غبار آنسوؤں کے ذریعے نکل جائے۔ اسی شام اجالا کافون اس کے پاس آ گیا۔

”زنیرا یہ کیا ہو گیا..... فاران ایسے اچانک کیسے چلا گیا.....؟“ اجالا کی آواز آنسوؤں سے بوجھل تھی..... زنیرا کا دل چاہا کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ اس سے وہ سب کچھ شیر کرے جو وہ ایک بوجھ کی طرح اپنے دل پر اٹھائے ہوئے تھی..... لیکن نہیں..... اب اسے زندگی کا یہ سب سے بڑا راز اپنے ساتھ قبر تک لے جانا تھا۔ یہ صرف اس کے اور فاران کے درمیان تھا اور فاران اب کبھی واپس لوٹ کر کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ اس نے ورا زکھول کر اس میں رکھی ہوئی وہ ڈائمنڈ کی رنگ نکالی جوا سے فاران کی سائنڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی ملی تھی اور وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ وہ یہ کس کے لیے لایا تھا۔

”اجالا بس وہ اچانک چلے گئے، وہ سوئٹر لینڈ سے میرے لیے ڈائمنڈ کی رنگ لے کر آئے تھے استنہ دنوں بعد وہ مجھے بالکل پہلے جیسے لگ رہے تھے ویسی ہی

اوپر ڈالے اتنی ریت ڈالے کہ وہ اس ریت میں
 زندہ دفن ہو جائے..... مگر دفن ہونا..... مرجانا اتنا
 آسان نہیں ہوتا۔ ان چند لمحوں میں اسے اچھی طرح
 معلوم ہو گیا تھا..... اس نے دھندلی ہوتی نظروں
 سے اس منظر کو پھر دیکھنا چاہا..... لیکن آنسوؤں سے
 لبالب بھری آنکھوں نے اس منظر.... میں پانی بھر
 دیا..... اس نے بے دردی سے آنکھیں رگڑ
 ڈالیں..... اور پھر اس کی آنکھیں بھیڑ میں گم ہوتی
 اس لڑکی پر جم سی گئیں.....

☆☆☆

”اوتے تیری خیر..... کیا بات ہے رانی.....
آج بڑی دیر کر دی۔“ مکی کے ہنسنے میں آگ برساتا
آسمان..... اور مسافروں سے کھینچ بھری بس سے
بڑی مشکل سے اپنے وجود کو بچھ و سالم تھیٹ کر
باہر نکالتی حجاب نے اس جملے پر پلٹ کر دیکھا.....
جہاں گئے کارس نکالنے والے ٹھیلے کے پاس کھڑا.....
پان سے رنگے دانتوں کی نمائش کرتا..... میلی سی جینز
اور نیلی ٹائٹ شرٹ جس کے فرنٹ پر لکھی انگریزی
گالیوں کے ترجمے سے بے خبر..... بالوں میں
انگلیاں پھیرتا..... حسب معمول وہی نوجوان کھڑا
تھا..... اس نے جلدی سے سر سے اتر جانے والی
چادر کو سر پر جھاتے اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹا.....
اس نوجوان کی سیٹی کوروز کی طرح نظر انداز کیا.....
گمری کی شدت اس کے چہرے کو جھلسا رہی تھی۔
قریب ہی لگے تل کو دیکھ کر اس کا جی چاہا اس کی ٹونٹی
سے منہ لگا کر غٹا غٹ پانی پی جائے..... لیکن کمر پر
چبھتی اس نوجوان کی ہوس بھری نظروں نے اسے
رکنے اور اس کی سوچ کو عملی جامہ پہنانے سے
روکا..... اس نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری.....
چادر کے پلو سے چہرہ پونچھا اور آگے بڑھتی گئی
..... مکی لمبی سے لمبی ہوئی چلی گئی..... اس نے پیچھے
آتے نوجوان کو دیکھ کر رفتار تیز کر دی اور پھر گھر کا

دروازہ اسے جیسے جنت کا دروازہ لگا..... اس نے
دروازے پر لگی تاب گھمائی جو اس طرح لگائی گئی تھی
کہ اگر باہر سے گھمائی جائے تو اندر سے لگی ہوئی
کنڈی کھل جائے۔ حجاب، موسم اور زمانے کے سرد و
گرم کو سہتی روز ہی تقریباً دو اور سوا دو کے درمیان گھر
پہنچتی تھی۔

وہ فطرتاً ایسی لڑکی تھی جو اپنی ذات سے صرف
 دوسروں کو آرام ہی دے سکتی تھی..... وہ صلح جو تھی.....
 وہ محبت کرنا جانتی تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ محبت
 قربانی مانگتی ہے..... محبت دینے کا نام ہے اور وہ بھی
 صرف دیتی تھی..... اُسے پسند نہیں تھا کہ اس کی وجہ
 سے کسی کو تکلیف ہو سو وہ خود ہی دروازہ کھول کر اندر
 آ جاتی تھی..... اندر داخل ہو کر اس نے ایک نظر
 سارے گھر پر ڈالی..... صحن کے پتھوں بیچ لگا... آم کا
 درخت سارے گھر کو ایک عجیب سی محبت بھری
 چھاؤں میں لیے ہوئے تھا..... بھیا اور بھابی کے
 کمرے کا دروازہ بند تھا..... اندر سے دبی، دبی محنتی
 خیز ہنسی کی آوازیں گھر کے سنائے میں صاف سنائی
 دے رہی تھیں۔

حجاب نے مایوسی سے نفی میں گمروں ہلاتے ہوئے بند دروازے کی طرف دیکھا اور سر سے چادر اتارتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

”آج پھر وہ کبخت عبدالشکور آیا تھا دروازے پر بہت چیخ چلا کر گیا ہے۔“ حجاب جو سارے دن کی مشقت کے بعد بیٹکن کے رستے پر بہت سارا چاٹ مسالا چھڑک کر روٹی کے ساتھ کھا رہی تھی..... ہاں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”کون عبد الشکور اماں.....؟“ اس نے
 ٹھنڈے پانی کو حلق سے اتارتے ہوئے پوچھا۔
 ”مکان دار..... اور کون بیٹا..... اور وہ بھی کیا
 کرے..... تین مہینے کا کرایہ چڑھ گیا ہے..... کہہ رہا

تھا..... میں تین، تین مہینے انتظار نہیں کر سکتا یا تو اسی مہینے سارا کرایہ دو..... ورنہ پھر گھر خالی کر دو.....“
نسبہ بیٹم نے خاموشی سے سر جھکائے کھانا کھاتی
جواب سے کہا۔

”تو اماں کرایہ دے دیں گے..... وہ ایسا کیوں
 کر رہا ہے؟“ حجاب کے لہجے میں بیزاری تھی.....
 اس نے دوپٹے کے پلا سے گردن پر بہتے پسینے کو
 پونچھتے ہوئے سراٹھا کر چھت پر لٹکے پتھے کو دیکھا۔
 ”ارے بیٹا پتھے کو کیا دیکھ رہی ہے..... کجخت
 بجلی والے بجلی کاٹ گئے ہیں..... وہ تو اللہ بھلا کرے
 برابر والی ہاجرہ کا..... اس نے خود ہی اپنے گھر سے
 تار لگا دیا..... کہنے لگی آپا..... ایسی گری میں کیسے
 رہو گی کم از کم پنکھا اور ایک جی تو جلے ناں..... سواتنا
 بھی گھوم رہا ہے تو خدا کا شکر ادا کرو.....“ نیسہ بیگم
 نے بیٹی کی بیزار نظروں کو پتھے پر ٹکا دیکھ کر تازہ ترین
 حالات سے آگاہ کیا۔

”اماں..... مکان وار آیا تھا..... بجلی کٹ
 گئی..... گھر میں سودا ختم ہو گیا..... یہ سب تم نے
 بھائی کو بتایا تھا؟ یا وہ صبح سے کمرے سے نکلے ہی
 نہیں۔“ حجاب نے بقایا روٹی کو دسترخوان میں لپیٹتے
 ہوئے ماں سے سوال کیا۔
 ”بڑا بھائی ہے تمہارا.....“ نسیم بیگم نے بیٹی کو
 ٹوکا۔

”کیا کروں اماں..... تم اس قدر پریشان بیٹھی ہو..... مجھے دونوں اے کھانے مشکل ہو گئے..... بچے پڑھنے کے لیے آتے ہوں گے..... اب رات تک ان کو پڑھاؤں گی..... لیکن مسئلے ہیں کہ ختم ہی نہیں ہو رہے اور بھائی صاحب اور ان کی بیگم آرام کر رہے ہیں۔“ حجاب نے کھانے کی ٹرے اٹھا کر کھڑے ہوتے ہوئے ایک نظر دوبارہ بھائی کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور پلٹ کر پریشان بیٹھی ماں سے کہا۔

”ارے بیٹا کیوں اس قدر غصہ کر رہی ہے..... گیا تھا..... لیکن کہیں بات ہی نہیں بنی..... ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہے، کوشش تو بہت کر رہا ہے لیکن اب آدمی اپنی تقدیر کا کیا کرے..... جب تقدیر میں ہی خواری ہو تو پھر بندہ بھی کیا کرے.....“

نیسہ بیگم نے بھرپور انداز میں بیٹے کی حمایت کی۔

”ارے میری بھولی اماں وہ کہیں نہیں مگے بس گھر سے پیٹ بھرنا شتا کر کے، مگلی کے ٹکڑ پر جا بیٹھتے ہیں..... اور آتی جاتی لڑکیوں پر آوازیں کتے ہیں اور جب بھوک ستانے لگتی ہے تو گھر آ جاتے ہیں..... کھانے کے لیے روٹی اور آرام کے لیے بستر موجود ہے تو کاہے کو کام کریں گے۔“

حجاب صرف سوچ کر رہ گئی..... غربت.....
 جنگدستی کی آگ میں جھلکتی ایک امید کا دامن ہاتھ میں
 تھامے بیٹھی ماں کو وہ کیسے بتاتی..... وہ کیسے بتا سکتی تھی
 اور وہ بتانا بھی نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

عبد الغفور اور نسیہ بیگم کی کل کائنات یہی دو بچے تھے حجاب اور سلمان..... حجاب نے بی ایس سی کیا تھا جبکہ سلمان مڈل سے آگے نہ بڑھ سکا۔

گھر میں اللہ کا شکر تھا..... سلمان ایک گارمنٹ فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا اگر ضرورت سے زیادہ نہ تھا تو ضرورت کے لیے پریشان بھی نہیں ہونا پڑتا تھا..... زندگی سکھ اور آرام سے بسر ہو رہی تھی کہ اچانک عبدالغفور کے ہارٹ اٹیک سے فوت ہو جانے سے زندگی درہم برہم ہو گئی سلمان جو بنیادی طور پر ایک آرام طلب لڑکا تھا گھر کی ذمہ داریوں سے گھبرا گیا۔ جمع پونجی ختم ہوئی تو حجاب نے ایک پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر لی یوں فاقوں کی نوبت آئے آتے رہ گئی۔

چند ماہ پہلے ہی نسیم بیگم نے سلمان کی شادی اپنی بھانجی بتول کے ساتھ کر دی..... بتول، سلمان

راجا کی کہانی

ایک تھا راجا ایک بھی رانی
دونوں مر گئے ختم کہانی
دونوں مر گئے بات پرانی
کیسے مر گئے.....؟ سنو کہانی
رانی تھی نو خیزی لڑکی
اہلڑپن میں کوئی نہ ٹانی
رانی کی اپنی دنیا تھی
الٹی سیدھی تبھی نہ مانی
اک دن راجا ملنے آیا
رانی کو کہلانے رانی
رانی بہتر روئی دھوئی
ماں نے سنی نہ آنا کانی
آخر وہ بھی بنی دلہنیا
چھپی دنیا ہو گئی فانی
آگے کنواں پیچھے کھائی
اب رانی نے بات یہ جانی
آگے چلے تو مر جائے گی
پیچھے مڑے تو ٹھوکر کھانی
دائیں نہ رستہ بائیں نہ رستہ
اد پر نیچے ہوا نہ پانی
راجا سے فریاد جو کی تو
راجا گونگا، رد دی رانی
رانی مر گئی راجا رویا
رانی نے یہ کیا تھی ٹھانی
راجا نے جی کر کیا کرنا؟
دونوں مر گئے سنی کہانی!

شاعرہ: شبنم گل، رادل پنڈی

رانی ہو.....“فرزانہ کا لہجہ خوشگوار تھا۔ وہ ایسی ہی تھی..... ہنسی مسکراتی اور خوش باش۔“

”فرزانہ تمہارے گھر کے حالات بھی میرے جیسے ہیں اور تنخواہ تمہاری مجھ سے کم ہے..... لیکن تمہارے خرچے..... تمہارا رہن سہن بہت شاہانہ ہے..... یہ سب کس طرح ہوتا ہے.....؟“ حجاب نے کئی ماہ سے سینے میں اٹکا سوال باہر نکالا۔

”ایک تو حجاب تم یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ ہم بھی انسان ہیں..... ہم قربانی کے جانور نہیں ہیں کہ رات دن کی مشقت کریں اور آخر میں حلال ہو جائیں.....“ فرزانہ کا لہجہ تلخ ہوا۔

”لیکن.....“ حجاب نے کچھ بولنا چاہا۔

”پہلے میری بات مکمل ہونے دو.....“ فرزانہ نے ہاتھ اٹھا کر حجاب کو ٹوکا۔

”بظاہر میری تنخواہ کم ہے..... میں ٹیوشنر بھی نہیں پڑھاتی لیکن جو میں اپنے گھروالوں کے لیے کر رہی ہوں اس کے بعد میرا حق تو بنتا ہے ناں کہ میں اپنی چھوٹی موٹی خواہشات پوری کر لوں..... اور میں اپنی خواہشیں پوری کرتی ہوں۔“ فرزانہ کا لہجہ مضبوط تھا۔

”ارے تم اسکول میں پڑھانے کے علاوہ کوئی اور کام بھی کرتی ہو..... یہ تو مجھے پتا ہی نہیں تھا..... وہ کیا کرتی ہو؟“ حجاب کو واقعی حیرت ہوئی تھی۔

فرزانہ حجاب کو دیکھ کر مسکراتی..... تھوڑا سا ہلکے کردہ حجاب کے قریب ہو کر بیٹھی پھر اس نے چاروں طرف دیکھا اور اپنا اطمینان کرنے کے بعد وہ آہستہ سے گویا ہوئی۔ ”میں ایک خاص دھندا کرتی ہوں۔“

”خاص دھندا.....؟“ حجاب کے منہ سے خوف زدہ انداز میں سرسرا تا ہوا نکلا۔

☆☆☆

”تم کہاں ہوتی ہو یا ر..... نظر ہی نہیں آتیں..... کل آیا تو چٹا چلا میڈم سو گئی ہیں..... خدا کا

ایک تیز براؤنڈ پرفیوم کی خوشبو اس کو حال میں کھینچ لاتی۔“

”کچھ نہیں یا ر..... سوچ رہی ہوں اس شخص سے ایک چپل خرید لوں.....“ حجاب نے ایک ٹھکی ہوئی..... ٹڈھال..... سانس کو خارج کرتے ہوئے کامن روم کے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے عجیب شرمندہ، شرمندہ سے لہجے میں کہا۔

”تو لے لو ناں بھئی..... اس قدر پریشان ہونے اور سوچ بچار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ چلو میرے ساتھ چلو..... طارق روڈ پر سیل لگی ہوئی ہے..... وہاں سے تم بھی خرید لینا بلکہ ایک میں بھی خرید لوں گی۔“ فرزانہ نے لا ابالی سے انداز میں کہا۔

حجاب کو اس کی بے پردائی پر ایک لمحے کو حیرت ہوئی کہ وہ اتنے آرام سے پیسے کیسے خرچ کر سکتی ہے جبکہ ان دونوں کے گھر کے حالات اور مسائل تقریباً ایک جیسے تھے۔

”خرید لوں.....؟“ حجاب نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”ارے میری بہن..... میری گڑیا، میری چھرا لے لے، بہت ہی برا لگتا ہے اس حلیے میں اسکول آنا.....“

حجاب کو فرزانہ کی بات ایک دفعہ پھر شرمندگی کے گڑھوں میں لے گئی۔ اس نے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا اور پھر اپنے آپ کو اس طرح سیٹھنے کی کوشش کی کہ اس کی روح اور جسم کی خستہ حالی سب سے اور خاص کر اس وقت فرزانہ کی نظروں سے پوشیدہ رہے۔

”وہیے ایک بات پوچھوں فرزانہ.....؟“ حجاب نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

”ارے ایک کیا ہزار باتیں پوچھو..... اس طرح کرایے داروں کی طرح اجازت کیوں مانگ

کی بچپن کی سنگ تھی۔ بالکل اسی طرح بتول کے بھائی حیدر سے حجاب کی نسبت طے تھی۔

شادی کے کچھ ہی دنوں بعد سلمان کی نوکری ختم ہو گئی۔ روز روز دیر سے جانا..... چھٹی کرنا..... بہانے بنانا..... فیکٹری کا منجر برداشت نہ کر سکا اور سلمان کا حساب کتاب بند کر دیا۔

حجاب نے تو بھائی کا ہاتھ بٹانے کے لیے نوکری کی تھی..... لیکن جلد ہی نوکری اس کی مجبوری اور ضرورت بن گئی..... ضرورت..... مجبوری میں تبدیل ہوئی تو اس نے شام میں بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھانا شروع کر دیا اور پھر بالکل غیر محسوس طریقے سے سارے گھر کی ڈتے داری اس کے نازک کندھوں پر آ گئی اور وہ اس بوجھ تلے دھتی چلی گئی۔

☆☆☆

”کیا سوچ رہی ہو.....؟ نوٹوں میں کیا تلاش کر رہی ہو.....؟“ وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں..... ہاتھ میں سو، سو کے چند نوٹ لیے بیٹھی تھی اپنی کو لیگ فرزانہ جو اس کی بہت اچھی دوست بھی تھی کی آواز پر چونک اٹھی۔ اس نے اک نظر اپنی دوست پر ڈالی۔ بہترین ڈیزائنر کا لان کا سوٹ، پیروں میں سوٹ کی میچنگ کی خوب صورت چپل..... ہاتھ میں قیمتی ہینڈ بیگ..... چہرے پر تازگی و بے فکری لیے اس سے مخاطب تھی۔ حجاب نے فرزانہ کا بھرپور جائزہ لیا اور پھر نظر اپنے ہی اوپر آ کر ٹھہر گئی۔ معمولی سا کئی دفعہ کا دھلائے، مٹے پرنٹ کا سوٹ..... ہاتھ میں دو سو روپے والا اس کی غربت پر قہقہے مارتا پرس..... پیروں میں کئی دفعہ کی سلائی کی ہوئی آخری سائیس لیتی چپل..... چہرے پر تھکن، پریشانی پھر اس نے سامنے لگے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا۔

”کیا ہو گیا یا ر..... اتنی خاموش کیوں ہو.....؟“ فرزانہ نے اب اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

محسوس طریقے سے بغیر کسی اظہار اور وعدے کی ڈوری کے ایک دوسرے کے تھے۔

”آپ محبت سے پلائیں اور میں نہ ہوں۔“

ایسے تو حالات نہیں..... حیدر گنگٹایا۔

اور حجاب..... چو لھے پر چائے کی کیتلی رکھتے رکھتے پلٹ کر مسکرا دی کہ یہ لکھتے تو حاصل زندگی ہوتے ہیں۔ اور وہ نہ جانے کتنے دنوں بعد اس طرح مسکرائی تھی۔

☆☆☆

”کوئی کام دام ملا بیٹا.....؟“ جیسے ہی صبح کا نکلا سلمان سہ پہر کو گھر میں داخل ہوا..... نیسہ بیگم نے آس بھرے لہجے میں پوچھا۔

”نہیں ملا۔“ سلمان کا لہجہ وہی بے پروائی لیے ہوئے تھا۔

”نہیں ملا یا تو نے کوشش ہی نہیں کی.....؟“ نیسہ بیگم کا لہجہ سوالیہ تھا۔ سلمان خاموش کھڑا واش بیسن پر لگے شیشے میں اپنا چہرہ دیکھتا رہا۔

”ارے اس طرح کب تک چلے گا، مکان دار روز ذلیل کر کے جا رہا ہے۔ بجلی کے بل کی قسطیں کروائی تھیں تو بھرنا بھی تو ہے..... صبح کھالو تو شام کو نہیں ہے اور شام کو کھالو تو صبح کی فکر میں رات بھر نیند نہیں آتی..... ایک میری بچی کتنی محنت کرے.....“

”ہاں..... ہاں..... تمہاری لاڈلی ہی تو محنت کرتی ہے ناں..... اگر پورا نہیں پڑتا تو تم بھی کہیں جا کر برتن مانجھ لو.....“ حجاب کے ذکر پر تو جیسے سلمان کے آگ ہی لگ گئی..... اس نے چیختے ہوئے ماں کی بات کو بیچ میں سے کاٹا۔

”ادھبہ..... پورا نہیں پڑتا..... ان کا پورا نہیں پڑتا ہوگا میرے تو سارے کام ہو جاتے ہیں..... ساری بات یہ ہے کہ سلمان جو مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے وہ ماں، بیٹی کو کھلتا ہے۔ یہ دونوں چاہتی ہیں سلمان دن بھر محنت کرے اور رات کو تھکا

شکر ہے آج تم مل گئیں۔“ حجاب تو کھڑی ہونے سے کچن کے گندے سلیب رگڑ رہی تھی۔ حیدر کی آواز پر پلٹی۔

”تو کیا کروں حیدر..... اسکول..... ٹیوشن اور گھر کے کام..... مجھے تو منہ دھونے کی فرصت نہیں ملتی..... صبح کو جلدی اٹھنا ہوتا ہے تو رات کو جلدی سو جاتی ہوں۔“ حجاب نے حیدر کو اپنی مجبوریاں گنوائیں۔

”اور بتول.....؟“ حیدر نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ محترمہ تو بل کر پھیلی بھی نہیں توڑتیں..... ان کے تو کمرے میں کھانا پہنچانا پڑتا ہے..... وہ بھی میرے ہی ذمے ہے۔“

”یار سمجھ میں نہیں آتا بتول کو کیا ہو گیا ہے..... میں گھر جا کر ای سے بات کروں گا..... کم از کم بتول کو گھر کے کام کاج میں تو تمہاری مدد کرنی چاہیے.....“ حیدر نے جیسے حجاب کی سوچ پڑھ لی تھی۔

اسے حجاب کو دیکھ کر شدید افسوس ہوا تھا..... نہ جانے اس سے بے بسی کیوں برتی جا رہی تھی..... گھر اور گھر سے باہر وہ اکیلی پس رہی تھی اور کسی کو اس کا خیال نہیں تھا اور وہ سارے گھر کو آرام پہنچانے کے لیے ہلکان ہوتی چلی جاتی..... اس قدر بے حس رویہ وہ سخت متعجب تھا۔

”ارے تم کیوں علامہ اقبال کی طرح سوچوں میں غرق ہو..... یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے..... یہ بتاؤ..... چائے پوگے.....؟“ حیدر کو اس قدر شرمندہ دیکھ کر حجاب کو ایک عجیب سا افسوس ہوا..... سو اس نے زبردستی لہجہ مختلف بناتے ہوئے کہا۔

بلیک راؤسلک کے کڑتے اور سفید شلوار میں وہ دل میں اتر جانے کی حد تک بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ حیدر اور وہ دونوں بچپن ہی سے بالکل غیر

بیٹی تھی، ماں کی ہمدرد اور غمگسار..... اس نے تڑپ کر پوچھا کہ ماں کے چہرے پر لکھی فکر اور پریشانی کی داستان کسی کو نظر آئے یا نہیں لیکن وہ پڑھ سکتی تھی، وہ پڑھ رہی تھی۔

”مکان دار بہت بے عزتی کرتا ہے..... اگر کئی محلے میں مل جائے تو وہیں چار لوگوں میں باتیں سنانے لگتا ہے..... میں چاہ رہی تھی کہ اس دفعہ چاہے فاقے کرنے پڑ جائیں..... تمہاری تنخواہ اور ٹیوشن کے پیسے ملا کر میں کرایہ دے دوں..... پیٹ بھرے نہ بھرے عزت رہ جائے..... تم بعد میں چپل لے لینا.....“ نیسہ بیگم کے لہجے میں ایک عجیب سی بے بسی تھی۔

وہ کچھ نہ بولی..... بس پرس کھولا اور سلیقے سے نہ کیا ہوا پانچ سو کا نوٹ ماں کے ہاتھ میں تھما دیا۔

☆☆☆

”یا اللہ غربت سے زیادہ چھوٹی چادر تکلیف دیتی ہے..... سر چھپائیں یا پھر..... میرے اللہ..... ایک چپل..... ایک دوپٹے کے لیے بھی ترسنا پڑتا ہے..... لیکن تیرا شکر ہے، سر پر عزت کی چادر تنی ہوئی ہے۔ تیری مہربانی مالک.....“ حجاب نے عشا کی نماز میں دعا کرتے ہوئے اللہ سے حال دل کہا۔

”کیا ہوا چپل نہیں خریدی.....؟“ حجاب جو سر جھکائے اسٹاف روم میں بیٹھی بچوں کی کاپیاں چیک کر رہی تھی..... فرزانہ کے سوال پر چونکی۔

”نہیں.....“ حجاب نے لاشعوری طور پر بیروں کو چھپاتے ہوئے پست آواز میں کہا۔

”کیوں.....؟ کیوں نہیں لی..... ارے یار ہر مہینے کی تنخواہ میں سے کم از کم ایک سوٹ اور ایک چپل تو خرید لیا کرو.....“ فرزانہ کے لہجے میں محبت تھی۔

”کیسے خرید سکتی ہوں.....؟ میں بھی نہیں خرید سکتی، میں اپنے لیے کبھی کچھ نہیں کر سکتی، میرے ساتھ، میری زندگی کے ساتھ بہت مسئلے ہیں، تم

ہارا آ کر سو جائے..... اور میں سارا دن یور ہوتی رہوں..... اب کم از کم کچھ نہیں تو سلمان کے ساتھ جا کر پارک میں ہی بیٹھ جاتی ہوں۔“ بتول سوچ کر رہ گئی۔

”خالہ میں بھی کہتی رہتی ہوں..... اب وہ بھی کیا کریں..... اس قدر کوشش تو کرتے ہیں..... کہیں بات ہی نہیں بنتی..... ورنہ انہیں کون سا اچھا لگتا ہے اس طرح فارغ بیٹھنا۔“ بتول نے کن انکھیوں سے میاں کو دیکھا ادھلک! بلک کر روتے ہوئے ساس سے گھویر آواز میں کہنے لگی۔

”کس قدر محبت کرتی ہے بتول مجھ سے..... اور یہ اماں.....“ سلمان نے بڑی بے فکری کے ساتھ فکر مند ماں کو دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

”اماں یہ پیسے.....“ حجاب نے تنخواہ کا لفافہ ماں کو تھماتے ہوئے کہا۔

”بیٹا اس دفعہ پیسے کم ہیں.....؟“ نیسہ بیگم نے دوبارہ نوٹ گنتے ہوئے پرس میں کچھ ڈھونڈتی حجاب سے پوچھا۔

”ہاں اماں، ایک چھٹی کی تھی ناں اس کے پیسے کٹ گئے ہیں۔“ اس کی آواز دھیمی تھی۔

”لیکن بیٹا یہ تو پورے آٹھ سو روپے کم ہیں۔“ نیسہ بیگم کے چہرے پر کچھ کھوجتی ہوئی فکر تھی۔

”وہ اماں میں نے پانچ سو روپے اپنی چپل خریدنے کے لیے رکھے ہیں۔ بالکل نوٹ گئی ہے..... بہت شرم آتی ہے..... اب تو اسکول کے بچے بھی کہنے لگے ہیں.....“ حجاب نے اس طرح وضاحت دی جیسے اس نے یہ پیسے اپنی تنخواہ سے نہ روکے ہوں بلکہ چوری کیے ہوں۔

”پر بیٹا..... یہ.....“ ان کا لہجہ ہلکایا۔

”کیا بات ہے اماں..... کیا بات ہے؟“ وہ

نہیں جانتیں..... تمہیں نہیں پتا.....“ حجاب کو ہمدردی سے نفرت تھی۔ لوگوں کے سامنے رونا سخت ناپسند تھا، اس کے باوجود اس کی آنکھ نم تھی۔

”مجھے سب پتا ہے، مجھے سب اندازہ ہے، میں بھی معاشرے کے اسی طبقے سے تعلق رکھتی ہوں..... جس طبقے کی فرد تم بھی ہو لیکن حجاب یوں چھوٹی، چھوٹی چیزوں کے لیے ترسنے اور نکلنے، نکلنے کے لیے شرمندہ ہونے سے بہتر ہے کہ کوئی چور راستہ ڈھونڈ لو..... کم از کم زندگی میں کوئی تو آسانی ملے.....“

فرزانہ نے حجاب کے برابر میں رکھا پرس اٹھا کر سینٹر ٹیبل پر رکھا اور پھر اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے ہلکی آواز میں اس سے کہا۔

”رات دن محنت کرتی تو ہوں تم ایسا کرو، میرے لیے دد پھر کی شفٹ میں حجاب ڈھونڈ دو، میں دونوں شفٹوں میں پڑھا لوں گی اور.....“

”بس کرو..... بس کرو قربانیاں دینا..... ان نوکریوں سے کوئی پورا پڑتا ہے بھلا سارا دن کوٹھو کے تیل کی طرح یہ پرائیویٹ اسکول والے محنت لیتے ہیں اور کتنی کے چند ہزار بھیک کی طرح ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں..... اب چند ہزار سے کچھ نہیں ہوتا میری جان تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا..... میری بات مان لو..... جو میں کر رہی ہوں وہ کام تم بھی کر لو.....“

کون کہہ رہا ہے کہ ساری زندگی کرنا..... ارے جب گھر کے مسئلے حل ہو جائیں، تمہارا جینز جمع ہو جائے تو لعنت بھیجنا ساری محنت مشقت پر اور آرام سے میاں کے گھر میں راج کرنا۔ میری تو بھی یہی پلاننگ ہے۔“ فرزانہ نے حجاب کی بات کو سچ میں کانٹے ہوئے ایک لمبی تقریر کر ڈالی۔

”تمہارا کام.....؟“ حجاب نے یہ مشکل تھوک نکالا۔

فرزانہ نے اثبات میں سر ہلایا اور حجاب کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

”میں کیسے کر سکتی ہو..... ہم غریب ضرور ہیں پر عزت دار ہیں، ہمارے کشکول میں عزت کے کچھ کچھ بھی نہیں ہے اور جو کسی نے دیکھ لیا تو.....؟“

نہیں، میں نہیں کر سکتی۔“ حجاب نے عجیب سے خوفزدہ انداز میں جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

”عزت؟“ فرزانہ بے ساختہ ہنسی اور پھر ہنسی ہی چلی گئی۔ ”ارے میڈم آج کل تو عزت بھی ہی لوگوں کی ہوتی ہے جن کی جیب گرم ہوتی ہے جس کے پاس جتنے نوٹ وہ اتنا ہی عزت دار ہے۔“

فرزانہ نے جگہ، جگہ سے سلی ہوئی حجاب کی چپلوں پر نظریں جماتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

☆☆☆

”تو آج یہ دن بھی آنا تھا.....“ حجاب نے اپنے جسم کے گرد بڑی سی چادر لپیٹتے ہوئے، فکری سے لوڈ دیکھتے بھائی اور بھانج کو دیکھا اور بستر پر خاموش، بے بس لیٹی ماں کو..... اس نے آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو بہت کمال سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

”پھر ڈاکٹر صاحب.....“ سلمان نے کان اسپتال میں چیک اپ کرتے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

”دیکھیں..... ان کو دل کا دورہ پڑا ہے اسکی انہیں رکھنا پڑے گا پھر چند ٹیسٹ وغیرہ کے بعد ان انجیو گرافی کا فیصلہ ہوگا تو پتا چلے گا کہ اب کیا ہے..... ہو سکتا ہے انجیو گرافی کے بعد فوری ہی پلاسٹی کرنا پڑے.....“ ڈاکٹر نے حجاب کے ہاتھ دوائیوں کی تھیلی لیتے ہوئے پروفیشنل انداز میں کہا..... سلمان بھی ساتھ کھڑا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب خرچہ کتنا آئے گا.....؟“ حجاب نے فکر مند لہجے میں پوچھا۔ سلمان نے حجاب کی بہن کی طرف دیکھا..... بیسیوں کے بارے میں اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ کہاں سے آئیں گے

رہے ہوتے..... کاش.....“

”تمہارا فون ہے حجاب.....“ حجاب جو اپنی زندگی میں شامل بہت سارے کاش، اپنی سوچوں میں بیٹھی دہرا رہی تھی جوں کی آواز پر حال میں واپس آ گئی..... اس نے بے دلی سے ہاتھ بڑھا کر بتول کے ہاتھ سے موبائل فون لیا..... فون کی اسکرین پر جگمگاتے ہوئے نام کو دیکھا اور پھر اس کے منہ سے نکلا۔

”ہیلو فرزانہ.....“

☆☆☆

”بہت بہت شکریہ فرزانہ..... یقین کرو..... میں جلد ہی تمہارے پیسے لوٹا دوں گی۔“ حجاب نے ہزار، ہزار کے پینتیس نوٹ گن کر پرس میں رکھتے ہوئے مشکور اور احسان مند لہجے میں فرزانہ سے کہا۔

”کوئی بات نہیں میری بہن..... ہم سب کے دکھ مشترک ہیں، مجھے معلوم تھا اس وقت تمہیں پیسوں کی شدید ضرورت ہوگی، اسی لیے میں نے فوراً تمہیں فون کیا تھا..... اور اتنا شکریہ مت ادا کرو، انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔“ اس کے لہجے میں خلوص ہی خلوص تھا۔

”تو کیا اس بھری دنیا میں صرف تم ہی واحد انسان..... بچی ہو.....؟ جن سگے رشتوں نے مدد کرنے سے منع کر دیا تھا۔ کیا وہ سب انسان نہیں ہیں..... یا ہم انسان نہیں ہیں۔“ حجاب نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”چھوڑو یہ سب باتیں میرے خیال سے زندگی کا یہ حادثہ تمہارے لیے ایک سبق ہے..... زندگی میں کوئی اور ایمر جنسی کہیں بھی، کسی بھی وقت آ سکتی ہے..... تم یہ سب باتیں چھوڑو..... جا کر اسپتال میں فیس بھرو..... ہاں یہ بتاؤ میرے ساتھ کب چلو گی.....؟ فرزانہ کو ایک دم جیسے یاد آیا ہو۔

”جلد ہی.....“ حجاب نے جیسے اپنے آپ سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

لیکن حجاب تو پیسے کی اہمیت اور ضرورت سے واقف تھی..... سو اس کی پوری توجہ ڈاکٹر صاحب کی طرف تھی..... اور ڈاکٹر کے لیے تو خرچہ بتانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مشکل تو آئے ہوئے مریض کے غریب گھر والوں پر آتی ہے۔ ڈاکٹر لبیا چوڑا خرچہ بتاتے ہوئے دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہو گیا..... آج صبح ہی سے نفیسہ بیگم سینے میں درد کی شکایت کر رہی تھیں اور جب ان کا درد ناقابل برداشت ہو گیا تو دونوں انہیں رکتے میں بیٹھا کر کارڈیالوجسٹ آئے تھے۔ اس وقت ایمر جنسی وارڈ میں لیٹی ماں کے سر ہانے وہ لوگ شدید پریشانی کے عالم میں کھڑے تھے۔ حجاب نے ایک نظر درد کی شدت سے آنکھیں بند کیں لیٹی ماں کو دیکھا اور پھر اپنی بے بسی پر آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

☆☆☆

”کچھ بندوبست ہوا بھائی.....؟“ حجاب نے گھر میں داخل ہوتے سلمان کو دیکھ کر بے قراری سے پوچھا۔

”نہیں، کہیں سے کوئی بندوبست نہیں ہوا دیسے تو سب بڑے مال دار کے بچے بنے پھرتے ہیں اور اب ہمیں ضرورت پڑی تو سب بھوکے، تنگے ہو گئے.....“ اس نے جلتے جھنے لہجے میں صحن میں پڑی چہل کوٹھو کر مارتے ہوئے کہا۔

”اب کیا ہوگا.....؟ آج تو ہر حال میں پیسے جمع کروانے ہیں۔“ حجاب تقریباً رو دینے کو تھی۔

حجاب کے سوال پر اداس گھر پر، اداسی کے ساتھ ساتھ خاموشی بھی چھا گئی..... اس کے سوال کا کسی کے پاس بھی جواب نہیں تھا۔

”کاش..... کاش اب اتنی جلدی نہ مرے ہوتے..... کاش، کاش بھائی تم زندگی کو تنجیدگی سے لیتے..... کاش تم کوئی کام کر رہے ہوتے..... تو آج صرف پینتیس ہزار کے لیے ہم یوں بھیک نہ مانگ

☆☆☆

”اچھا اماں میں جا رہی ہوں.....“ حجاب نے پرس کی زپ لگاتے ہوئے بستر پر لیٹی نیسہ بیگم سے کہا۔

”کہاں جا رہی ہے.....؟ ابھی تو آئی ہے اور آتے ہی پھر جا رہی ہے۔“ سلمان جو مزے سے سنگترے چھیل، چھیل کر کھا رہا تھا، کرخت آواز میں بولا۔

”کام پر جا رہی ہوں.....“ وہ بے پروائی سے سنگترے چھیلتی بھانج کو اور سینہ تانے سوال بنے کھڑے بھائی کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

”کون سا کام.....؟ ابھی تو اسکول سے آئی ہے۔“ نیسہ بیگم کے منہ سے سلمان ہی کا سوال دوبارہ نکلا۔

”اماں بہت قرضہ ہو گیا ہے ایک نوکری سے پورا نہیں پڑتا میں نے ایک اور نوکری کر لی ہے..... بس وہیں جا رہی ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں..... جلد ہی واپس آ جاؤں گی.....“ حجاب نے بیمار ماں کو تسلی دی۔

”دل نہیں لگتا ہمارے ساتھ کیا جو ایک اور نوکری کر لی۔“ بتول نے میاں کی شہ پر بڑے طنز یہ لہجے میں مجرم بنی کھڑی حجاب سے پوچھا۔

”بس ایسے ہی شوق ہو گیا ہے دراصل سارا دن جھولے میں بیٹھے، بیٹھے تھک جاتی ہوں..... وزن بڑھنے لگا ہے پہلے سوچا جم جو اُن کر لوں..... پھر سوچا نوکری کر لوں۔“

”اری کیا اول فول بکے جا رہی ہے..... یہ ایک دم کیا سوچھی ہے تجھے..... نہ کسی سے ذکر نہ مشورہ..... کوئی بڑا چھوٹا ہے تیرا یا نہیں؟“ بتول کے چہرے کے بڑبڑتے تیوروں سے گھبرا کر..... نیسہ بیگم نے حجاب کو ڈانٹا۔

”ایک دم نہیں سوچھی اماں، بہت مشکل فیصلہ

ہے بڑا دل کو سمجھایا ہے..... اماں میرا بھی دل چاہتا ہے دوپہر کو پیر پھیلا کر سوؤں اور سہ پہر کو صحن میں بیٹھ کر ڈوبتے سورج کو دیکھوں لیکن اماں یہ سب آسان نہیں ہے..... زندگی موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے..... زندگی بہت مشکل ہے..... آج سہا دن ہے اللہ کے واسطے مجھے جانے دو..... تم بھول گئی ہو لیکن مجھے یاد ہے آج بیس تاریخ ہے اور کسی بھی دن ہمارا سامان سڑک پر پھینکا جانے والا ہے..... سڑک پر کھڑے ہونے سے بہتر ہے میں کام پر چلی جاؤں..... لہذا میں جا رہی ہوں اور خبردار جو کسی نے مجھے روکا.....“ حجاب نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو بے دردی سے چادر کے پلو سے پونچھا اور تیز قدموں سے گھر سے باہر نکل گئی۔

”تم نے دیکھا اماں کس قدر بد زبان ہو گئی ہے بہت زبان چلنے لگی ہے اس کی..... میں بتائے دے رہا ہوں۔ اماں..... جس دن مجھے چڑھ گئی ناں تو سالی کی زبان گلدی سے پکڑ کر کھینچ لوں گا..... سمجھا لیا تم اس کو.....“ سلمان نے غصے سے کھولتے ہوئے خاموش بیٹھی ماں سے کہا..... جن کی آنکھوں میں ایک عجیب سی بے بسی تھی ایک ایسی بے بسی جسے پڑھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

☆☆☆

”زندگی اتنی بڑی آزمائش ہوگی..... یا اللہ ایسی آزمائش، ایسا کڑا امتحان..... پیٹ کا وزن آج سمجھ آیا..... ساری زندگی کیا کیا میں نے میرے پاس تو عزت کے سوا کچھ نہیں تھا..... میں نے..... میں نے اس کی بھی پروا نہیں تھی..... چند ٹکوں کے لیے.....“ حجاب نے میز پر رکھے پرس کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا اور پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔ بعض اوقات آنسو زندگی بھر کے ساتھی بن جاتے ہیں..... اور شاید اس کے آنسو بھی.....

☆☆☆

”زندگی کے کتنے کام پورے ہو گئے فرزانہ.....“ حجاب نے پیسے گن کر پرس میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں واقعی وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا..... کتنا عرصہ ہو گیا ہم دونوں کو یہ کام کرتے ہوئے..... انشاء اللہ اس اتوار کے بعد میں تو چھوڑ دوں گی..... رشتہ طے ہو گیا ہے اور جہیز جمع ہو گیا ہے.....“ فرزانہ نے مطمئن لہجے میں کہا۔

”تم چھوڑ دو گی اور میں اکیلی.....؟“ وہ گھبرا گئی۔

”ارے اب تمہیں میری کیا ضرورت..... تم تو خود بہت ایکسپرٹ ہو گئی ہو..... بس کچھ عرصے بعد تم بھی چھوڑ دینا اور پھر میاں کے گھر عزت سے بیٹھ کر روٹیاں پکانا۔“ فرزانہ نے ہستے ہوئے حجاب کو پھینکا۔

”عزت.....“ حجاب کے منہ سے سرسرا تا ہوا نکلا اور وہ گھر کے سامنے رکشے سے اتر گئی..... اکثر جب اسے دیر ہو جاتی تھی تو وہ دونوں رکشالے لے جی نہیں کیونکہ حجاب کا گھر پہلے آتا تھا سو فرزانہ اسے اتارتے ہوئے اپنے گھر چلی جاتی تھی۔

☆☆☆

”آج تم کو کافی دیر ہو گئی بیٹا.....“ حجاب جو نماز پڑھ کر جانسازتہ کر رہی تھی..... ماں کی آواز پر پلٹی..... ایک نظر ماں کے مطمئن چہرے پر ڈالی اور پھر نظر جھکا لی۔

”کیا بہت تھک گئیں بیٹا.....؟“ نیسہ بیگم نے بیٹی کی خاموشی میں چھپی تھکن اور اداسی کو محسوس کرتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”آج کیا اماں میں تو ہر وقت تھکی ہوئی رہتی ہوں۔“ حجاب نے آہستگی سے کہا اور پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”بعض اوقات جسم ہی نہیں روح بھی تھک جاتی ہے۔ روح پر رکھا بوجھ سانس لینے نہیں دیتا.....

سو نے نہیں دیتا، میری روح کا بوجھ بھی اب ناقابل برداشت ہو گیا ہے..... میرا دم گھٹنے لگا ہے، لگتا ہے میں مرجاؤں گی.....“ ہمیشہ کی طرح حجاب صرف سوچ کے رہ گئی۔

”اماں یہ کراہیہ.....“ حجاب نے پاس رکھے پرس میں سے نوٹ نکال کر ماں کو دیتے ہوئے کہا۔

”جیتتی رہو..... خوش رہو..... اللہ تمہاری کمائی میں برکت دے..... ارے بیٹا میں کیا بتاؤں جب سے اس مردود کو کراہیہ وقت پر ملنے لگا ہے..... ایسی عزت سے خالہ، خالہ کرنے لگا ہے کہ کیا بتاؤں.....“

نیسہ بیگم نے پیسے گنتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”اللہ نہ کرے، میری کمائی میں برکت ہو..... اور اماں..... ہم کیا اور ہماری عزت کیا.....“ حجاب کے منہ سے سرسرا تا ہوا نکلا۔

”اے لو..... کیوں نہیں، ہماری عزت کیوں نہیں..... ارے غریب ہیں پر بے غیرت تھوڑا ہی ہیں.....“ نیسہ بیگم نے حجاب کی بات پر چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پر بیٹا..... ایک بات تو بتاؤ..... آخر تم کام کیا کرتی ہو.....“

”کیوں؟“ حجاب نے ماتھے پر ہل ڈالے۔

”ارے سب پوچھتے ہیں، اب مجھے کچھ پتا ہو تو میں بتاؤں ناں.....“ نیسہ بیگم نے حجاب کے قریب بیٹھتے ہوئے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

”کیا ضرورت ہے بتانے کی..... جب ہم فاتحے کر رہے تھے، بھوکے مر رہے تھے..... ارے غیروں کے ہاتھوں ذلیل ہو رہے تھے تو کسی نے آکر نہ پوچھا..... اور اب سب کے پیٹ میں درد ہونے لگا ہے..... کوئی ضرورت نہیں، کسی کو جواب دینے کی..... بس خاموش رہا کریں.....“ حجاب کا لہجہ

خوب صورت نسخہ

☆ چہرے کی جھائیوں کے لیے سویا کھانا، اسے ابال کر پانی پینا مفید ہے۔

☆ بکری کا کچا دودھ اور گلاب کی تازہ پتیوں کا پیسٹ بنا کر تین تا چار چہرے پر لگائیں پھر نیم گرم پانی سے منہ دھولیں..... جھائیوں کے لیے مفید ہے۔

☆ دوپہر کے کھانے میں پھل اور کچے سبزیاں سلاطین کی صورت لازمی کھائیں..... تلی ہوئی اشیاء سے ہر ممکن پرہیز کریں..... اپنا الگ رومال یا تولیہ رکھیں، کسی کی خوب صورت اور فریش اسکن دیکھ کر جلنے کڑھنے کے بجائے اللہ کی بنائی ہوئی چیز کی تعریف کریں۔

☆ پودینے کی سبز پتیوں ڈنشل سمیت دھو کر ابال لیں اور پانی چھان کر فریج میں بوتل میں رکھ لیں۔ درود شریف پڑھ کر آدھا کپ یہ پانی پی لیں نہار منہ..... باقاعدگی سے پیئیں۔ جلد میں نکھار پیدا ہوگا۔

☆ پانچ بادام بھگو کر چھیل لیں اور بھینگی ہوئی خوبانی کے ساتھ آدھا کپ دودھ ڈال کر پیسٹ بنالیں، صبح شام اس کا مساج کریں اور نیم گرم پانی سے چہرہ دھولیں..... پر ترکیب میں چہرہ، گردن اور بازو بھی شامل رکھیں۔

☆ لیموں کا رس نچوڑ کر چھلکے ہاتھوں کی پشت پر گڑیں اسی طرح کہنی پر بھی..... نمائندہ کاٹے ہوئے جو ہاتھوں پر رس ٹپکے اسے کریم کی طرح چہرے اور ہاتھوں پر مل لیں اور کچھ دیر بعد نیم گرم پانی سے دھولیں۔

☆ مندرجہ بالا نسخے بغیر اضافی خرچ کے آپ کے حسن کو یقیناً نکھار بخشیں گے۔ ہر وقت کی فضول سوچوں کے بجائے درود شریف اور یا اللہ، یا رحمن، یا رحیم کا ورد کرتی رہیں..... بے شک اللہ بہترین مصور ہے اسے یا معذور کہہ کر یاد رکھیں۔

☆ مرسلہ: نفیسہ آرا، اس الخیمہ

ہوں، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بس اس دوری کو اب ختم ہو جانا چاہیے..... میں چاہتا ہوں ساری زندگی تم دوسروں کے لیے جیتی رہی ہو اب میری جان اپنے لیے جیو..... بس....." حیدر نے حجاب کی بات سے بغیر کہا اور فون بند کر دیا۔

اور وہ پریشان ہونے کے باوجود مسکرا دی..... کوئی تو تھا جو اس سے محبت کرتا تھا..... اس کی پروا کرتا تھا..... اس پر بھروسہ کرتا تھا۔

اسے یقین تھا کہ اس کی زندگی میں بھی بہار آئے گی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ ضروری نہیں ہر یقین حقیقت کا روپ دھار لے..... تقدیر کا صرف ایک وار..... کیا کر سکتا ہے کاش وہ جان پاتی..... لیکن کچھ باتیں نہ گزرتے حالات سمجھاتے ہیں اور نہ ہی کوئی استاد لیکن وقت..... وقت سب کچھ سمجھا دیتا ہے۔

☆☆☆

"اماں کا فون آیا تھا....." بتول نے چینل ہر چنگ کرتے سلمان کو مخاطب کیا۔

"ہوں....." سلمان کی توجہ اسکرین پر تھی۔

"سن رہے ہیں ناں حیدر نے منگنی توڑ دی ہے آپ کی بہن سے....." بتول نے دھماکا کیا۔

"منگنی توڑ دی..... لیکن پرسوں تو خالہ کا فون آیا تھا کہ وہ اتوار کو شادی کی تاریخ لینے آرہی ہیں، کل جب حیدر آیا تھا تو اس کا موڈ بھی صحیح تھا۔" سلمان نے جلدی سے ٹی وی بند کیا اور پریشان ہو کر بتول سے کہا۔

کتنا ہی بے پروا تھا وہ پر حجاب کا بھائی تو تھا ناں۔

"میری تو پہلے ہی مرضی نہیں تھی، وہی دیوانہ ہو رہا تھا، اس نے تو صاف کہہ دیا ہے میں اس لڑکی سے شادی کے لیے بالکل تیار نہیں..... جس کا کردار مشکوک ہو....."

اٹھائیں۔" حیدر کے لہجے میں دبا دبا سا غصہ تھا۔
"ہائیں فون نہیں اٹھائی..... اگر فون نہیں اٹھائی تو اس وقت تم کس سے بات کر رہے ہو۔" حجاب نے حیدر کو چھیڑا۔

"دیکھو حجاب میرا خون مت کھولاؤ، آج سارا دن ہو گیا مجھے خوار ہوتے ہوئے..... لیکن تمہارا فون بند جا رہا تھا..... تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ میں کس قدر پریشان ہوا ہوں آج..... آج اتوار کا دن تھا..... میں نے سوچا تم سے ملنے آؤں گا لیکن تم..... تم....." حیدر کا لہجہ بے انتہا ناراض تھا۔

حجاب کو حیدر کی ناراضی سے شدید تکلیف ہوئی لیکن زندگی میں آنے والی تکلیفوں، تنگیوں، جھڑکیوں نے اس کو مضبوط کر دیا تھا یا شاید ڈھیٹ.....

"ناراض کیوں ہو رہے ہو حیدر، تم جانتے تو ہو..... میں سنڈے کو بھی جاب پر ہوتی ہوں اور سنڈے کو تو میں بہت ہی بڑی ہوتی ہوں..... میں جاب پر ہوتی ہوں تو کیسے فون برسرِ حرکت ہوں۔" حجاب نے رسان سے لہجے میں کہا کہ حیدر کی ناراضی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"چھوڑ دیا یہ سارے بہانے، تم اسکول میں تو سارے فون انٹینڈ کرتی ہو لیکن پتا نہیں یہ دنیا کی کون سی جاب ہے جس کا نہ تم نام بتاتی ہو اور نہ ہی دفتر کا پتا دیتی ہو..... میں تو تنگ آ گیا ہوں اس خوار کی سے..... بس اماں سے کہہ کر جلد ہی شادی کی تاریخ رکھواتا ہوں اور ختم کرتا ہوں سارے مسئلے....." حیدر نے جھنجھلاہٹے ہوئے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"حیدر....."

"پلیز حجاب ایک لفظ نہ کہنا..... میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا..... میں ایک دو دن میں تمہارے گھر آتا ہوں اور پھر بات کرتے ہیں....." وہ لہجے میں پیار سمونے بولا۔ "میں تم سے بہت محبت کرتا

روکھا ہو گیا۔

"ہاں بیٹا، روٹی کما کر لارہی ہو تو ماں کی زبان پر تالے بھی لگاؤ گی تم کیا جانو مجبوری....." نفیسہ بیگم کو حجاب کا انداز برا لگا تو انہوں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ لیکن بیٹی سے بدگمان ہونے سے پہلے کاش وہ جان سکتیں..... کہ وہ ان کی محبت میں کہاں، کہاں مجبور ہوئی ہے۔ کاش وہ جان سکتیں..... کاش.....

☆☆☆

ٹرن..... ٹرن..... حجاب جو بیٹھی تو لیے سے گیلے چہرے کو رگڑ رگڑ کر پونچھ رہی تھی نے چونک کر اسکرین پر جگمگاتے نام کو دیکھا..... اور دوبارہ سے چہرہ پونچھنے لگی..... اکثر حجاب کو ایک عجیب سا ڈپریشن ہو جاتا تھا اس کو ایسا لگتا تھا کہ اس کے سارے وجود پر ایک نہ نظر آنے والی..... بدبودار..... غلاظت لگی ہوئی ہے..... سو وہ گھنٹوں ٹل کے نیچے بیٹھی وہ نہ نظر آنے والی غلاظت صاف کرتی رہی..... دھوتی رہتی اور جب دھوتے، دھوتے تھک جاتی یاٹنکی میں پانی ختم ہو جاتا تو پھر بیٹھی تو لیے سے رگڑ رگڑ کر ہاتھ پیر اور چہرہ پونچھتی رہتی..... اور اس وقت بھی وہ ڈریسڈ تھی۔ اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی حتیٰ کہ اسکرین پر جگمگاتے حیدر کے میسج کی بھی نہیں۔

☆☆☆

"یار تم کہاں ہو.....؟ میں تو ترس گیا ہوں تم سے ملنے کے لیے، تمہاری آواز سننے کے لیے..... اب بھی نہ جانے کب سے ٹرائی کر رہا تھا....." حیدر کی آواز سیل فون میں ابھری۔

"کہاں غائب ہوں..... کہیں بھی نہیں..... بس تم ہی کو نظر نہیں آتی۔" حجاب نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ تم فون کیوں نہیں

”کردار مشکوک... بھلا لڑکیوں کہا۔“
سلمان نے سوالیہ لہجے میں خاموش بیٹھی بتول سے کہا۔

”لو ایک حیدر ہی کیا ساری دنیا کہہ رہی ہے، ذرا سوچیں تو سہی یہ کوئی نوکری ہے، جس میں روز کا حساب روز ہوتا ہے صبح تمہاری بہن خالی پرس لے کر جاتی ہے اور شام کو بھرے پرس کے ساتھ واپس آتی ہے۔ اب تو اس کا بٹوا نوٹوں سے بھرا رہتا ہے۔ کہنے والے تو بہت کچھ کہہ رہے ہیں، میرا تو رشتہ ہی ایسا ہے کچھ کہوں اور چور بنوں۔ میری تو خاموشی ہی بھلی۔“ بتول نے سلمان کے سوال کے جواب میں اپنے آپ سے کہا اور خاموش رہی۔

”میں پوچھ رہا ہوں۔ ایسا کیوں کہا حیدر نے؟“ سلمان نے تیز آواز میں بتول سے پوچھا۔
”مجھے کیا پتا۔۔۔۔۔ خود معلوم کر لو۔۔۔۔۔“ بتول نے بھی تڑخ کر جواب دیا۔

☆☆☆

”کیا ہوا اماں مجھے کیوں نہیں لے رہی ہو۔۔۔۔۔؟“ حجاب نے جب گراہیہ نیمہ بیگم کو دینا چاہا تو انہوں نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔

”دیکھو حجاب میں کہہ رہی ہوں چھوڑ یہ نوکری۔۔۔۔۔ ہمیں نہیں چاہئیں تیرے پیسے۔۔۔۔۔ سارا خاندان، سارا محلہ تھوٹھو کر رہا ہے ہر کوئی پوچھتا ہے آخر ایسا کون سا کام ہے جو تمہاری بیٹی کرتی ہے، نہ دفتر کا پتا، نہ آنے جانے کا وقت، نہ عید بقرعید پر چھٹی، ہر روز جاتی ہے روز پیسے لاتی ہے، ارے میں کس کس کو جواب دوں بس ختم کرو اس کام کو اور گھر میں بیٹھو بس۔“ نیمہ بیگم نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

”ہاں، گھر بیٹھ جاؤں پھر وہی فاقہ مستی، لڑائی جھگڑے، شروع ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ اماں تم لوگ ہو

ہی ناشکرے، کتنا ہی تم لوگوں کے لیے کر لو۔۔۔۔۔ تم لوگ خوش ہونے والے ہو ہی نہیں۔“ حجاب نے غصے میں ہاتھ میں پکڑے نوٹ فرش پر پھینکے۔
”خدا کے واسطے تو ہمیں معاف کر دے۔۔۔۔۔“

ہم سب بہت برے ہیں ناشکرے ہیں، ارے ہر کوئی انگلی اٹھا رہا ہے، ساری دنیا تھوٹھو کر رہی ہے۔۔۔۔۔ بس سن لے اب تو گھر سے نکلی تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔“ نیمہ بیگم نے غصے سے چیخے ہوئے کہا۔

”ارے اماں تمہاری ضرورتوں کے لیے میں بازار میں جا کھڑی ہوئی، اپنی عزت بچ دی اور تم میری ٹانگیں توڑ دوں گی، دوگی، بہت خوب۔۔۔۔۔ واہ۔۔۔۔۔ واہ۔۔۔۔۔“ حجاب نے عجیب تاسف اور دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”عزت بچ دی۔۔۔۔۔ بازار میں جا کھڑی ہوئی؟“ حیدر نے چکراتے سر کے ساتھ جیسے اپنے آپ سے کہا اور وہ جو خوشی، خوشی حجاب کو بتانے آیا تھا کہ اتوار کو اس کی اماں شادی کی تاریخ لینے آرہی ہیں۔۔۔۔۔ حجاب کے لفظوں میں الجھتا دے پاؤں باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”دیکھتا ہوں یہ کہاں جا رہی ہے۔۔۔۔۔؟“ سلمان نے اپنے آپ سے کہا۔

آج جب حجاب کام پر جانے کے لیے گھر سے نکلی تو ایک ربوالور لے کر سلمان بھی اس کے پیچھے نکلا۔۔۔۔۔ بتول کی باتوں اور اماں کی خاموشی نے اسے پاگل کر دیا تھا۔۔۔۔۔ اسے یقین تھا کہ حجاب بھگ چکی ہے۔۔۔۔۔ پیسوں کے لالچ میں اس نے اپنی عصمت داغدار کر لی ہے۔۔۔۔۔ آج اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑے گا اور پھر موقع بر ہی اسے گولی مار دے گا کہ ایک غیرت مند بھائی کو۔۔۔۔۔ کیا کرنا چاہیے۔

گھر سے نکل کر حجاب ذرا فاصلے پر کھڑی گاڑی میں جا بیٹھی جس میں پہلے ہی سے چادروں میں لپی چند لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ چلتے چلتے وہ گاڑی ایک پوش علاقے میں داخل ہو گئی تھی۔ سلمان بھی تھوڑے فاصلے سے موٹر سائیکل پر پیچھا کر رہا تھا۔

جب گاڑی وہاں کے سنڈے بازار کے پارکنگ لائٹ میں رکی تو اس کے منہ سے نکلا۔۔۔۔۔ ”یہ یہاں کیوں آئی ہے؟“

گاڑی سے لڑکیاں تیزی سے اتریں۔ ایک دم لوگوں کے رش نے حجاب کو چند لمحوں کے لیے سلمان کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔۔۔۔۔ وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا۔۔۔۔۔ اور پھر بھیڑ کا حصہ بنتی حجاب کو اس نے دیکھا۔

”اس کی بہن حجاب۔۔۔۔۔“ وہ ساکت تھا۔ آتے جاتے لوگ اس سے ٹکرا رہے تھے لیکن اسے کچھ ہوش نہیں تھا اس کی نگاہیں دور ہوئی حجاب پر گڑی تھیں جو گود میں ایک بچہ لیے۔۔۔۔۔ صدا لگا رہی تھی۔

”باجی اللہ کے واسطے۔۔۔۔۔ اپنے بچوں کے صدمے کچھ دیتی جاؤ، باجی اللہ کے واسطے اپنے بچوں کے صدمے کچھ دیتی جاؤ، غریب کو کچھ دے دو کہ بچے کا پیٹ بھر سکے، اللہ تمہارا پیٹ بھرے گا۔“

”یہ کیا آج پھر آلو کی قلیاں؟“ سلمان نے دھڑخوان پر رکھی سالن کی ڈش کو کھول کر دیکھتے ہوئے غصے سے ماں سے کہا۔

”ارے بیٹا۔۔۔۔۔ یہ بھی نصیب ہو رہا ہے تو اللہ کا شکر ادا کرو۔۔۔۔۔“

”ان آلو کی قلیوں پر اللہ کا شکر۔۔۔۔۔ روز دال، ہنری، دال، ہنری۔۔۔۔۔ اماں اب تو الٹی آنے لگی ہے ان کھانوں کو دیکھ، دیکھ کر تم گوشت کیوں نہیں پکاتیں۔۔۔۔۔ میں نہیں کھاؤں گا یہ سب۔“ سلمان غصے میں دسترخوان سے اٹھ کھڑا ہوا۔

حجاب

”کہاں سے پکاؤں تیرے لیے گوشت کے بچے، ناشکری مت کر خود کوئی کام کیوں نہیں کرتا۔۔۔۔۔ ایک لڑکی کمانے والی۔۔۔۔۔ اس کے پیسوں میں، میں کیا کروں؟“ نیمہ بیگم نے سلمان کا ہاتھ پکڑ کر واپس دسترخوان پر بٹھاتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”اماں کل تم ضرور بھائی کے لیے چکن کڑا ہی پکا دینا میں کام پر مزید دو گھنٹے رک جاؤں گی۔“ حجاب نے کھانا کھاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ قریب سے گزرتی ایک خاتون کا دھکا اسے واپس حال میں کھینچ لایا۔

”یا اللہ میری بہن۔۔۔۔۔ میرے منہ کے ذائقے کے لیے۔۔۔۔۔ میری ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے بھیک مانگتی رہی۔۔۔۔۔ اور ہم اسے برا بھلا کہتے رہے۔۔۔۔۔ اسے بد کردار سمجھتے رہے۔۔۔۔۔ ارے میری بہن جیسا کردار تو کسی کا ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔۔۔“ سلمان۔۔۔۔۔ دکھے دل۔۔۔۔۔ روتی آنکھوں اور بے جان وجود کے ساتھ اس فقیرنی کو جو اس کی سگی بہن تھی۔۔۔۔۔ جو ایک عظیم بیٹی اور باکردار بہن کو بھیڑ کا حصہ بننے دیکھتا رہا۔۔۔۔۔ اور پھر ضمیر کے کوڑے اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے۔۔۔۔۔ وہ ایک ڈھیر کی طرح زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔۔۔۔۔ اس نے اپنا گریبان پھاڑ لیا، مٹی بھر بھر کر ریت سر پر ڈال کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

وہ رو رہا تھا، چیخ رہا تھا اپنے آپ کو پیٹ رہا تھا اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگ رہا تھا آس پاس سے گزرتے لوگ حیران ہو کر دیکھ رہے تھے۔۔۔۔۔ کہ یہ اکیلا بیٹھا روتا بلکتا نوجوان آخر کس سے معافی مانگ رہا ہے۔

کوئی نہیں۔۔۔۔۔ ہاں کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ ان کی حجاب نے انہیں خود بے حجابی سے بچا لیا تھا۔

شہزادہ شہزاد

عنیزہ سید

14

نیو کی لا آجری کی اینڈ فرینٹک اپاٹس
ماونڈ سسٹم اور جلد ساری کی ہولت موجود ہے
نئے اور پائے ناؤسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
دکان نمبر 13 حدید بازار اسلام آباد



زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے... خیر و شر، نیکی اور بدی...
زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت... ہر برائی پر حاوی ہو جاتی ہے اور اسی
طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری سایہ ناز صنفہ عنیزہ سید نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اکائے
ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی بتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود دُرانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زندگی میں چھپیدگی کے باعث ثانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیکورٹ میں پران چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑمی چھتی ہے۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی بھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو واپس مفارقت دے گئے۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہر زاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و قیانت کا شکار ہو چلا تھا۔ بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے بینش کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر ساتھی وانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا تھا۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بد مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زونی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ وانیال آرٹ کا شوق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دن طیارے کے دھوئیں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حاوٹے کا شکار ہو جاتا ہے۔ نادر، حمزہ سے ملتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ اگر زونی قصور دار ہوگی تو وہ خود اسے لے کر آئے گا۔ حمزہ کہتا ہے کہ اسے اب تنگ نہیں کیا جائے گا۔ علینہ اچانک فہد کی آمد سے بہت خوش ہوتی ہے لیکن جب وہ یہ سنتی ہے کہ وہ میرال کی تلاش میں آیا ہے تو یہ اسے اچھا نہیں لگتا۔ نادر اپنے گھر میں زونی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ نیشن، مہر زاد کو منجمل کر چلنے کا مشورہ دیتی ہے۔ مہر زاد حلف اٹھانے کے بعد سوچ رہا تھا کہ حلف اٹھانے والوں کو حلف کے الفاظ یاد رکھنی ہوتے ہیں کہ وہ ان پر عمل کر سکیں۔ مہرین، حمزہ پر شادی کے لیے زور ڈالتی ہے لیکن وہ پس و پیش سے کام لیتا ہے تو محمود دُرانی کہتے ہیں کہ وہ کوشش کریں گے کہ وہ اس کی چواں کو اپرول دلا دیں۔ زرنگار کو اس خصوصی نمبر سے دعویٰ ردائی کا پیغام ملتا ہے اور پھر امراتو بیگم کہتی ہے کہ سروار صاحب نے ٹکٹ بھیجا ہے۔ گڈی، مہر زاد سے کہتی ہے کہ اسے وزارت کا عہدہ ملنے کی خوشی میں چپا کی بھی تقریب میں زرنگار کو بلانا چاہیے تھا۔ علینہ، فہد کو بتاتی ہے کہ ایک سوشل ویب سائٹ پر میرال صلاح الدین کے نام کا صفحہ موجود ہے۔ میرال کو بتایا جاتا ہے کہ اس کا نام انگریز کنٹرول لسٹ میں شامل ہے اس لیے وہ دعویٰ نہیں جاسکتی۔ میرال حیران ہوتی ہے کہ وہ لوگ اسے کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ مہر زاد کے آدمی اسے بتاتے ہیں کہ میرال کو بڑے گھرایا گیا ہے۔ مہر زاد فون کرنا چاہتا ہے لیکن میرال سے رابطہ ممکن نہیں ہوتا۔ زونی ٹیکسی کر کے میرال کی گاڑی کا پیچھا کرتی ہے۔ نادر، حمزہ محمود کو میرال کے بارے میں بتاتا ہے۔ عافیہ ویب سائٹ پر فہد کا منیج پڑھ کر اس سے رابطہ کرنے کا سوچتی ہیں۔ مہر زاد خان اپنی برادری کے لوگوں پر میرال کے سلسلے میں دباؤ ڈالتا ہے۔ نیشن، مہر زاد خان کی نیوز سکر کے ساتھ منعقد کی گئی میٹنگ دیکھتی ہے تو اسے کچھ غیر معمولی محسوس ہوتا ہے۔ فہد اور حمزہ، وانیال اور عافیہ سے ملنے آتے ہیں۔ علینہ، فہد کے جانے کے بعد سوچتی ہے کہ اس کے ہونے سے کتنی رونق ہوگئی تھی۔ فہد، وانیال، عافیہ اور حمزہ سے کہتا ہے کہ اسے اپنے کچھ کانٹیک آزمائے دیں۔ مہر زاد کے انداز میں غیر معمولی تبدیلی پریشاں حیران ہوتی ہے۔ نادر کی ماں اسے کہتی ہے کہ اس کی بہنیں آرہی ہیں، وہ دونوں اپنا اپنا گروپ بنا لیتے ہیں۔ وانیال بینش سے کہتا ہے کہ وہ اسے پرہیز کرنا چاہتا ہے۔ زرنگار کو ایک شخص لینے آتا ہے تو وہ اسے کہتی ہے کہ وہ اس پر یہ احسان کرے کہ اس کی زندگی ختم کر دے لیکن وہ ایسا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ مہر زاد کے پاس اس کے نانا کا فون آتا ہے کہ زرنگار جلد ہی اس تک پہنچنے والی ہے اور اب اسے اپنی ماں کی خواہش کا احترام کرنا ہوگا۔ وہ مہر زاد خان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی فون بدلے۔ فہد، عافیہ اور حمزہ کو بتاتا ہے کہ میرال کو اس رات جس عمارت میں لے جایا گیا اس کا محرک مہر زاد نہیں ہے۔ وانیال کہتا ہے کہ لڑکی کو اگر وہاں سے نکالنا ہے تو پرائیویسی کو چھوڑنا ہوگا جس پر حمزہ، فہد اور عافیہ سب ہی خاموش رہتے ہیں۔ بینش کی ماں اس سے کہتی ہے کہ اب پڑھائی چھوڑ کر شادی کی فکر کرے۔ بینش ماں سے کہتی ہے کہ وہ تھوڑا انتظار کرے۔ زرنگار، مہر زاد سے کہتی ہے کہ اگر اسے پتا ہوتا کہ اسے مہر زاد کے سامنے لایا جا رہا ہے تو وہ یہاں نہ آتی اپنی زندگی ختم کر لیتی۔ مہر زاد، زرنگار کو یقین دلاتا ہے کہ اسے اب یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ وہ یہاں محفوظ ہے لیکن زرنگار کو اس کی کسی بات پر یقین نہیں آتا۔ امراتو بیگم کو پولیس پکڑ لیتی ہے۔ فہد، چیف منسٹر سے ملتا ہے لیکن اسے چیف منسٹر سے مل کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ حمزہ، نگین کو بتاتا ہے کہ اس نے سیکورٹ والا گھر ماموں سے خرید لیا ہے۔ بینش کی ماں اسے بتاتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کے بیٹے سے اس کا رشتہ کر رہی ہے۔ نادر، زونی سے کہتا ہے کہ اس کے پاس انجینی والوں کا فون آیا تھا۔ مہر زاد، عافیہ کو ملنے کے لیے بلاتا ہے۔

اب آگے پڑھیں

شام شہبازاں

وہ کیا کہہ رہا تھا..... خود کو کیا قرار دے رہا تھا عافیہ کو اس کی بات پر غور کرنے اور سمجھنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ وہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اب تک انہوں نے جو کچھ اس کے بارے میں سنا اور پڑھا تھا، اسے سننے اور پڑھنے کے بعد ان کے ذہن نے اس کا ایک خاکہ تیار کر رکھا تھا..... وہ ایک چالباز، مکار، کرپٹ، عیاش، ہمہ وقت اقتدار میں رہنے والے کروک شخص کا بیٹا تھا، ملکی تاریخ کے اکثر ایسے سیاست دانوں کے بیٹوں کی طرح آکسفورڈ، کیمبرج یا ہارورڈ سے پڑھا ہوا تو ضرور تھا مگر اس کی جبلت میں وہی مکاری، کرپشن، عیاشی اور چالبازی موجود تھی جو اس کے خاندان سے تعلق رکھنے والے تمام سیاست دانوں کا خاصہ تھی۔ اسی شخص کے ہاتھوں ایک معصوم لڑکی کا اغوا ہوا تھا، اسی نے اُسے... جس بے جا میں رکھا ہوا تھا اور یہی شخص اس کی عصمت پامال کرنے کے جرم میں سنگساری کا سزاوار قرار دیے جانے کا مستحق تھا۔ ان کے ذہن میں اس کا یہ خاکہ پختہ اور مکمل تھا مگر اس وقت وہ کیا سنا رہا تھا۔ وہ زرنگار کو میرال صلاح الدین ڈکلیئر کر رہا تھا۔ خود کو اس کے اغوا کے الزام سے بری قرار دے رہا تھا۔ میرال کی عصمت کو اپنی عزت بتا رہا تھا اور سب سے بڑھ کر وہ صوفی صاحب اور ان کی دعاؤں سے واقفیت کا حال سن رہا تھا۔ عافیہ کا ذہن ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پلٹے کھانے لگا تھا۔ وہ کس بات کو سچ سمجھیں کس کو جھوٹ، کس کو درست قرار دیں کس کو غلط.....

”میں نے غلط کیا جو اکیلی چلی آئی..... وانیال کو ساتھ لانا چاہیے تھا۔“ انہوں نے ماؤف ہوتے دماغ کو قابو کرتے ہوئے سوچا۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری ایک بھی بات پر یقین نہیں آ رہا ہوگا۔“ وہ ان کے چہرے کے تاثرات کو جانچتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے اپنے ذہن میں جو میرا خاکہ تیار کر رکھا ہے اس کے مطابق آپ کو ایسا ہی سوچنا چاہیے۔“

عافیہ نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، یقیناً ان کی نظروں میں تذبذب تھا۔

”آپ بھی غلط نہیں سوچ رہیں.....“ اس نے سر جھٹکا..... ”میری بد قسمتی کہ میری فیملی ہسٹری اور میرے موجودہ حالات، میرے بارے میں ایسے ہی خیالات کو جنم دے سکتے ہیں۔“ اس کی مسکراہٹ میں طنز کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

”لیکن مجھے خود کو ایسے امیج سے آزاد کروانے میں کوئی دلچسپی بھی نہیں۔“ اس نے عافیہ کو یقین دلانے کے سے انداز میں دیکھا۔

”ہاں مگر آپ کے سامنے.....“ پھر وہ گہری سانس لیتے ہوئے سراٹھا کر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ ”بلکہ شاید ہر اس شخص کے سامنے جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح میرال صلاح الدین سے ہے، میں اپنی بے گناہی کا گواہ بننا چاہتا ہوں۔“

عافیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا..... وہ بھی انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”بلکہ اپنی کیا..... میرال صلاح الدین کی بے گناہی کا گواہ بننے کی خواہش رکھتا ہوں۔“

”تم بات کو گھما پھرا کر مت کرو.....“ عافیہ نے بہ مشکل اپنے دل کی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ تمہارے خلاف عوامی سطح پر ایک لابی سرگرم ہو رہی ہے اور تم آج کے دور میں سانس لے رہے ہو، آج کا دور.....“ وہ سانس لینے کو رکیں..... ”جس میں آوازوں کو دبانے اور سروں کو کچلنا تمہارے باپ دادا کے

مہر زاد خان کی طرف دیکھے بغیر کبھی تھی۔

☆☆☆

”آپ کا تو کچھ کہہ نہیں سکتا مگر میرا دماغ ابھی چل نہیں گیا جو میں مائے ممتاز سے کہوں کہ ہمارے گھر رشتہ ڈالے۔“ بینش کے بڑے بھائی سلیم نے رات کے کھانے کے دوران گفتگو میں اپنی اماں کے نئے اور تازہ خیال کو سننے کے بعد کہا۔

”بندے کو اپنی اوقات میں ہی رہنا چاہیے سلیم۔“ اماں نے بیٹے کے جواب کی وجہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ”بندہ اپنے جیسوں میں ہی رہتا، بستا، چٹتا ہے۔“

”نہ اماں نہ.....“ سلیم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بینش ہماری اکلوتی لاڈلی بہن ہے، اسے اتنا پڑھا لکھا کے مائے ممتاز کے گھر کیسے بیاہ دیں، جس کے گھر کے کونے، کونے سے جہالت نیکی سانسے سے ہی نظر آ جاتی ہے۔“

”یہ سلیم ہے ناں.....“ اماں نے ناراض ہوتے ہوئے چھوٹے بیٹے کلیم کی طرف دیکھا۔ ”اسے تو شروع سے ہی بڑے لوگوں میں بیٹے کھلونے (بیٹھے کھڑے ہونے) کا شوق ہے، تو بتا تو، تو سمجھ رہا ہے ناں میری بات۔“

”میں نے کیا سمجھی ہے بات.....“ کلیم نے روغنی نان پر تلی ہوئی مچھلی کا بڑا سا ٹکڑا رکھ کر اسے رول کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”میرے پلے تو اس بے وقت کی راگنی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، کدھر تو گلبرگ، کینٹ، جوہر ٹاؤن میں رہنے والوں کے رشتے دیکھنے کی بات کر رہی تھی اماں، کدھر مائے ممتاز کا پسرور اب نظروں میں سا گیا۔“

”بس میں نے سمجھ لیا ہے، اونچے خواب دیکھنے لگو تو بندے کو اپنی اڑیاں (ایڑیاں) بھی اوپر اٹھانی پڑتی ہیں۔“ اماں نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”اور بندہ زیادہ دیر پہاں بھار (بجوں کے بل) کھڑا نہیں ہو سکتا، اڑیاں واپس اپنی جگہ پر ٹکانی پڑتی ہیں، اس کا قد واپس اپنی جگہ پر آ جاتا ہے اور وہ جن کی ہمسری کے خیال سے پہاں بھار (بجوں کے بل) کھڑا ہوتا ہے، وہ اس کا قد بُت پہچان کر منہ موڑ لیتے ہیں، بھامتا کے گھر رشتہ دے کر ہمیں اپنی اڑیاں اٹھانی نہیں پڑیں گی بلکہ اس کی انھیں گی، وہ تھک کر واپس زمین پر اڑیاں لگا بھی دے گا ناں تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہمیں تو پہلے ہی پتا ہے اس کا قد بُت کتنا ہے۔“ اماں کی زندگی کے تجربوں سے لبریز ان باتوں پر پہلے تو وہ انہیں دیکھتا رہ گیا۔

”واہ اماں واہ..... آپ نے بھی لگتا ہے کتابیں پڑھ لی ہیں، بینش کے پاس بیٹھ کر، بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہو۔“ اس نے مچھلی کے کانٹے منہ سے نکال کر پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”سولہ آنے چاہیے کہہ رہی ہوں سلیم، وقت پر عقل پر تھ (ہاتھ) ڈال لینے میں ہی فائدہ ہے۔“ اماں اصل بات دل میں رکھتے ہوئے سلیم کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”رہنے دے اماں، عقل کو بھی اور ہاتھ کو بھی..... ہماری بینش ہیرا ہے ہیرا..... ہم اسے راکھ میں رُلنے کے لیے مائے ممتاز کے گھر بیاہ دیں.....؟“ سلیم نے دسترخوان سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اماں کی نادرتجوہیز کو گریس سے رد کرتے ہوئے کہا۔

”بینش کو پڑھائی مکمل کر لینے دے..... پھر ہم اس کے لیے شہزادہ ڈھوٹہ ہی نکالیں گے تو فکر نہ کر، اپنی

ادوار کی نسبت خاصا مشکل ہو چکا ہے۔“ اپنی بات ختم کرنے کے بعد عافیہ نے دُزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی بات کے رد عمل میں اس کے چہرے کے تاثرات جاننا چاہ رہی تھیں۔ وہ عمر میں اس سے بڑی تھیں، ان کا ایمان بہت مضبوط تھا اور وہ خاصی خود اعتماد۔ بھی تھیں لیکن نہ جانے اس شخص کی شخصیت میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ جو وہ خود کو اس سے دبتا ہوا محسوس کر رہی تھیں۔

”دور آج کا ہو یا گزریے کل کا.....“ انہوں نے دیکھا ان کی بات سن کر مسکراتے ہوئے کچھ دیر اس پر غور کرنے کے بعد وہ بولا تھا۔ ”یا اس سے بھی پہلے کل کا، آوازیں دبانے اور سر کچلنے کی روایتیں ختم نہیں ہو سکتیں اگرچہ ان پر عمل کے طریقے بدل چکے ہیں، بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے لیکن آپ اطمینان رکھیے۔“ وہ ان کے سامنے دھڑے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں چنگیز خان جیسی صفات رکھنے والوں کے خاندان سے ضرور تعلق رکھتا ہوں مگر چنگیز خان کے بھی کچھ اصول ایسے تھے جن کی وجہ سے وہ اپنے دور کے جنگجوؤں میں ممتاز ہوا، یاد رکھیں چنگیز خان بھی اپنی ماں کا بے حد احترام کرتا تھا اگرچہ اس بات کا ذکر تاریخ میں بہت کم ہوا۔“

”واہ..... مثال دینے کو تمہیں چنگیز خان ہی یاد آیا۔“ عافیہ نے بے اختیار کہا۔

”ہوں.....“ وہ مسکرایا۔ ”اس لیے کہ میں ایک سپہ سالار کی حیثیت میں اس کا بہت بڑا مداح ہوں، وہ مجھ معنوں میں ایک قابل ترین سپہ سالار تھا۔“

”ظاہر ہے جیسی تمہاری فطرت ہے ویسی ہی مثالیں بھی تمہیں بھاتی ہوں گی۔“ عافیہ نے ناگواری سے کہا۔ ”جب ہی اس سے متاثر ہو کر کھوپڑیوں کے بجائے مُردہ روحوں کے مینار کھڑے کرنا تمہارا خاندانی مشغلہ ٹھہرا۔“

”مجھے آپ کی اس بات سے اختلاف ہو رہا ہے، روحمیں مُردہ نہیں ہوتیں، جسم مُردہ ہو جاتا ہے، روحمیں تو عالم بالا کی طرف پرواز کر جایا کرتی ہیں۔ عالم ارواح میں جا کر واپس رجسٹر ہو جاتی ہوں گی۔“

”باتوں کے تو تے، مینا بنا کر ہی تو تم لوگ عام عوام کو بے وقوف بنایا کرتے ہو اور پھر ان سادہ لوحوں کے ووٹوں کے ذریعے اقتدار کے ہمارا اپنی گرفت جاری رکھتے ہو۔“ عافیہ اس کی بات سے متاثر نہ ہوتے ہوئے بولیں۔ ”خیر“ پھر انہوں نے سر جھٹکا.....

”میں تم پر واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میں تمہاری باتوں میں آنے والی نہیں..... میں کانوں سے نہیں آنکھوں دیکھی پر یقین رکھتی ہوں۔“

”خوب.....“ اس کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔ ”ابھی تک جس مفروضے کو لے کر آپ اپنے خیال میں ایک تحریک کو کمانڈ کر رہی ہیں، اس مفروضے کے کتنے مندرجات آپ نے آنکھوں سے دیکھ رکھے ہیں؟“ عافیہ کے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا۔

”میں جانتی ہوں مجھے یہاں بلانے کا مقصد صرف اور صرف اس تحریک کو کنٹرول کرنا ہے۔“ انہوں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”سیاست دانوں کے پاس مختلف جھنڈے ہوتے ہیں تحریکوں کو کنٹرول کرنے کے لیے لیکن میں واضح کر دوں، ہماری آواز بند ہوگی نہ ہی جدوجہد رکے گی۔ تم خود کو چاہے کتنا ہی پارسا ثابت کرنے کی کوشش کیوں نہ کر لو، یہ سچ ہے کہ میرا اب بھی تمہارے قبضے میں ہے، ایک معصوم بے گناہ لڑکی کے ساتھ جو ظلم تم نے کیا ہے اس پر تو آسمان بھی کانپ اٹھا ہوگا، تمہیں یو پی چھوڑ دینے کے گناہ میں کم از کم میں شریک نہیں ہو سکتی..... بھلے تم اپنے اقتدار کے نقشے میں مجھ سے اور میری فیملی سے کیسا ہی سلوک کر لو۔“ انہوں نے یہ بات

دل اعلیٰ جنگ کے بعد اپنی کوشش میں کامیابی کی داستان انہیں سنا ڈالی تھی۔ پینتیس منٹ کا عرصہ بہت مختصر مگر مزاد خان کا بیان جامع اور مکمل تھا۔

”پتا نہیں کیوں.....“ عافیہ نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری بات پر یقین کرنے کو دل چاہ رہا ہے اگرچہ دل یہ بھی کہہ رہا ہے کہ تم جس بھنور میں پھنسے ہوئے ہو اس بھنور کے قریب تک بھی پار سائی نام کی شے نہیں پھٹتی مگر میرال کے بارے میں تمہارا بیان ایسا ہے کہ اس کی سچائی کی ایک نامحسوس مگر عجیب سی گواہی کہیں سے آتی محسوس ہو رہی ہے۔“

”میرے لیے یہ سب اطمینان کا باعث ہے۔“ مہر زاد خان نے متانت سے کہا۔

”زرنگار کو میرال جانتا اور صوفی صاحب کی دعاؤں کا ذکر..... دو ایسی باتیں ہیں جو صرف اُسے ہی معلوم ہو سکتی ہیں جس کو میرال نے خود یہ دونوں باتیں بتائی ہوں۔“ عافیہ نے مزید کہا۔

”اسی لیے میں نے آپ کو بتایا کہ میں ”زرنگار“ کے قریب کہانیاں کہنے اور کہانیاں سننے کے لیے گیا تھا۔ میرے پاس تو سنانے کو کچھ ایسے الفاظ ہی تھے جن سے اس کا اعتبار مجھ پر بندھ جاتا مگر اس کے پاس سنانے کو بہت کچھ تھا، وہ بہت کچھ جس کا میں نے مختصراً آپ سے ذکر کیا۔“

”پتا نہیں.....“ عافیہ نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ”پتا نہیں کیوں، میرال کے متعلق وہ سب سن کر ڈسکس کرتے ہوئے جو ہم تک پہنچا۔ یا ہم نے خود assume کر لیا، میرے ذہن میں ایک ہی بات گردش کرتی تھی کہ اگر وہ اتنے برے حالات کو پہنچ چکی ہے جو ہم سوچ رہے ہیں تو اس کے لیے صوفی صاحب جو دعائیں کیا کرتے تھے جس طرح وہ آنٹی رابعہ کو تسلی دیا کرتے تھے پھر اس کی تو کوئی حقیقت نہ ہوئی تاں جبکہ میں نے اپنے بیٹے کے سلسلے میں خود ان کی یقین دہانیوں کو معجزے کی شکل میں حقیقت میں ڈھلتے دیکھا ہے، جب سب مایوس تھے ایک صرف وہ تھے جو یقین دلاتے تھے زندگی عطا کرنے والے کی ذات بہت بڑی ہے، وہ دنیا سے جاتے، جاتے اپنے جانے اور دانیال کی زندگی اور صحت کی خبر دے گئے، وہ انتہائی عبادت گزار، پرہیز گار، نیک اور متقی شخص تھے پھر ان کی دعائیں میرال کو کیوں نہیں لگیں، میں بار بار سوچتی تھی اور میرا ذہن اس سوال پر اٹک کر بند ہو جاتا تھا۔“

”میں صوفی صاحب کو نہیں جانتا، میں نے ان کا کبھی نام بھی نہیں سنا مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کچھ نیک لوگ جب دل سے دعا دیتے ہیں تو وہ دعا لگتی بھی ہے اور معجزے بھی دکھا سکتی ہے۔“ مہر زاد خان نے کہا۔

”بہر حال.....“ عافیہ نے سر ہلایا۔ ”جو تم نے سنایا میں جب تک میرال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ اور کانوں سے اس سے یہ سن نہیں لوں گی کہ وہ امان میں ہے، تب تک دل سے یقین نہیں کر سکتی۔“

”آپ اس کا حق رکھتی ہیں۔“ مہر زاد نے کہا اور اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ”تمہیں ثبوت دینا ہوں گے۔“ عافیہ نے اپنے لہجے میں مضبوطی کا تاثر دیتے ہوئے کہا۔ ”جب تک وہ نہیں ملتے، ہم اپنا کام جاری رکھیں گے۔“

”میں آج ہی میرال کو آپ کے حوالے کر دیتا کیونکہ میں بھی سمجھتا ہوں کہ میرے تحفظ میں رہتے ہوئے اسے تحفظ تو ضرور ملتا رہے گا مگر اس کے متعلق شکوک بدستور جاری رہیں گے مگر حالات اتنے پیچیدہ ہو چکے ہیں کہ فی الحال یہ ممکن نہیں، اسے آپ کے حوالے کر دینا آپ اور اس کی دونوں کی سلامتی کو خطرے میں

پیش شہزادی ہے شہزادی، اس کے ساتھ کوئی شہزادہ ہی ہے گا نا کہ مائے ممتاز کا جوڑی چوگاٹھ والا..... کیوں بھی کلیم!“ اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بھائی کی طرف دیکھا، دونوں بھائی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیے۔ اماں کی تجویز ہنسی، ہنسی میں اڑ گئی۔ وہ بیٹوں کو اصل بات بتانے سے کترار ہی تھی۔ ان کے مزاجوں سے واقف تھی، بہت اچھی طرح جانتی تھی اصل بات بتائے گی تو یہی بھائی جو شہزادی قرار دے رہے تھے اُسے اگلے ہی روز مائے ممتاز کے گھر تو کیا اس سے چھوٹے مائے ریاض کے گھر بھی بیابان پر تیار ہو جائیں گے جس کا بیٹا کسی موٹر لیکٹریشن کے پاس ابھی کام سیکھ رہا تھا اور جس کا کام میں ابھی ہاتھ بھی سیدھا نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

عافیہ کے فون کی اسکرین نے روشن ہو کر انہیں دانیال کی کال کا اشارہ دیا تھا۔ انہوں نے ایک نظر مہر زاد خان کی طرف دیکھا اور پھر فون آن کر کے کان سے لگالیا۔

”آپ خیریت سے تو ہیں ناں می..... اس (گالی) نے آپ سے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟“ دانیال کے لہجے میں شدید بے چینی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں دانیال.....“ عافیہ نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”گالی مت دو، تم جانتے ہو گالی دینا کیا گناہ ہے۔“

”آئی ایم سوری می۔“ دانیال کے لہجے میں شرمندگی ظاہر ہوئی۔ ”لیکن جو شخص سراپا گالی ہوا سے کسی اچھے نام سے کیسے یاد کیا جاسکتا ہے۔“

”کبھی ایسا بھی ہوتا ہے دانیال کہ ہم حقیقتوں سے دور..... حقیقتوں سے بے خبر..... انہیں اپنی ہی نظر سے دیکھ رہے ہوتے ہیں، ہماری نظر پر ہماری سوچ زاویہ نظر بن کر چھائی ہوتی ہے، ایسے میں حقیقتوں کو قریب سے دیکھنے پر ہم اچانک ہڑبڑا جاتے ہیں، کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہو رہا ہے اس وقت، اس وقت میں ہڑبڑائی بلکہ شیشائی ہوئی ہوں، میرا انتظار کرو، گھر آ کر تم سے بات کرتی ہوں۔“ عافیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور فون بند کر کے ایک بار پھر مہر زاد خان پر نظر ڈالی جو انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔

”میں آپ کی اس ہڑبڑاہٹ اور شیشائی جانے کی صورت حال پر معذرت خواہ ہوں۔“ وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔“

”میں نے اپنے بیٹے سے سچ بولا ہے۔“ عافیہ نے جواب دیا۔ ”حقیقت کو قریب سے دیکھنا ایک الگ ہی تجربہ ہے، اس وقت میں محسوس کر سکتی ہوں کہ خود پر کچھ اچھلتے ہوئے دیکھ کر تمہیں کیسا لگتا ہوگا۔“

”مجھے برا نہیں لگنا چاہیے تھا۔“ وہ نرمی سے بولا۔ ”کچھ میں کھلے کنول تک رسائی حاصل کرنے کی خواہش کرتے ہوئے مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ میرے اپنے ہی قدم کچھ میں پڑنے سے کچھ اچھلے گی بھی اور مجھ پر اس کے چھینٹے بھی پڑیں گے، میرے لیے یہ صورت حال غیر متوقع نہیں تھی۔“

عافیہ کچھ سوچتے ہوئے غور سے مہر زاد خان کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی بدگمانی، شکوک اور نفرت کا احساس دور کرنے کے لیے مہر زاد خان نے کچھ زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ اس نے صرف پینتیس منٹ کے اندر امراتہ کلیم کے ٹھکانے تک اتفاقہ رسائی اور زرنگار سے ملاقات سے لے کر ایک ہزار راتوں کے معاوضے، کہانیاں کہنے اور کہانیاں سننے کے عمل، بد صورتی میں چھپی خوب صورتی کو بد صورتی سے نکال لینے کی کوششوں اور پھر ایک

شام شہزادان

کوئی بوجھ تھا نہ دل میں خوف..... ”شداد کی جس جنت کا ذکر اس نے کتابوں میں پڑھ رکھا تھا وہ شاید ایسی ہی ہوگی۔“ وہاں رہتے ہوئے اس نے البتہ یہ ضرور سوچا تھا، وہ جس، جس جہنم سے گزر کر یہاں پہنچی تھی اس کے بعد اسے یہ جگہ انسان کی بنائی جنت ہی محسوس ہو رہی تھی لیکن پھر وہ اولین دن گزر گئے اور اس کی فطرت اس جگہ اور یہاں کے آرام و سکون کی عادی ہونے لگی۔ اس کے بعد ذہن میں سوال اٹھنے لگے اور دل اکتانا شروع ہو گیا، الجھنا شروع ہو گیا۔

”آخر مجھے یہاں بھیجنے اور رکھنے کا مقصد کیا ہے؟“

”کیا آپ مجھے یہاں قید رکھ کر وہ ذہنی مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں جو کہانیوں کے جن کو کسی شہزادی کو اپنی قید میں رکھ کر محسوس ہوا کرتی تھی؟“

”کیا مجھے ایسی جگہ زندگی کے باقی دن بلا کسی قصور سولٹری کنسائنمنٹ کی سزا کا منتہ گزاردینا ہوں گے.....“

”ہیں میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا اور میں یہیں دفن کر دی جاؤں گی؟“

”یہ جگہ وہ رنگون ہے جو میرے لیے کالا پانی ثابت ہو رہا ہے۔“

مہر زاد خان کو اس کے خصوصی نمبر سے اب اسی قسم کے پیغامات موصول ہو رہے تھے، وہ یہ پیغامات سمجھتی تھی، ان کے جواب نہ آنے پر جھنجھلائی تھی اور چڑ کر پہلے سے بھی زیادہ تلخ اور سخت پیغامات بھیجتی تھی۔ رفتہ رفتہ اسے اس جگہ پر موجود ہر چیز سے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی..... بیش قیمت سامان سے بچ کرے، سبزہ، پھل، پھول، کتابیں، ٹی وی جس پر محدود اور مخصوص چھٹلواتے تھے یہاں موجود اس کی

ڈالنے کے مترادف ہوگا۔“ مہر زاد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اور رہا آپ کا کام...“ وہ مسکرایا۔ ”آپ اسے شوق سے جاری رکھ سکتی ہیں مگر یہ مت بھیجے گا کہ آپ کے اس کام سے گھبرا کر میں نے آپ کو کوئی ”ڈیل“ کر لے سکے۔“ لیے یہاں تک آنے کی زحمت دی ہے، ہمارے ساتھ تو اب یہ روٹین بن چکی ہے۔ ہم ہمہ وقت، اگلیوں، سوالیہ چہروں، مشکوک اشاروں، اچھلتی کچڑ اور غلیظ گالیوں کی زد میں رہتے ہیں، اس دور جدید نے سیاست کو گالی میں تبدیل کر رکھا ہے پھر بھی ہم سیاست ہی کے ذریعے تبدیلی کے خواہش مند بھی ہیں۔“ اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ تلخ ہو گئی۔

”مجھے سیاست میں کوئی دلچسپی ہے نہ غرض.....“ عافیہ نے کہنا چاہا۔

”مگر مجھے اس بات میں دلچسپی ضرور ہے کہ ”میرال.....“ کے نام پر سیاست نہ کی جائے کیونکہ وہ میرا

سیاسی نہیں ذاتی معاملہ ہے۔“ مہر زاد نے عافیہ کی بات کا منہ ہوتے ہوئے کہا۔

عافیہ نے چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا..... انہیں مہر زاد خان کے چہرے پر ایک تحریر واضح ہوتی

دکھائی دی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں..... ”مجھے امید ہے کہ تم جتنی جلدی ممکن ہو اسے ہم تک پہنچا دو گے بظاہر وہ لاوارث نظر آتی ہے مگر تمہیں اندازہ نہیں کہ اس کے لیے چلائی تحریک میں کہاں، کہاں سے کون، کون سے مضطرب لوگ ایک، ایک کر کے ہم سے ملنے چلے گئے، یوں جیسے اس کے لیے ایک پورا خاندان سامنے گیا۔ ماں، باپ، بہن بھائی دوست سب رشتے اس کے ارد گرد نظر آتے ہیں۔“

”میں سمجھ رہا ہوں اور میرا دل خوشی کی کیفیت بھی محسوس کر رہا ہے۔“ مہر زاد نے بازو کمر کے پیچھے

باندھتے ہوئے کہا۔ ”میرا یقین اور بھی مضبوط ہونے لگا ہے کہ وہ یقیناً کسی کی دعاؤں کے حصار میں ہے۔ جب

ہی تو میری نظروں نے اسے لوکیٹ کیا اور میرے اعصاب نے اسے وہاں سے نکال لینے کی تحریک پکڑ لی۔ وہ یقیناً بہت خوش قسمت اور بلند بخت ہے ورنہ ان حالات میں بھی اس طرح بچ نہ پاتی۔“

”ہوں۔“ عافیہ نے اس کی بات سن کر سر ہلایا۔ ”میں اب چلوں گی۔“

”ایک بار پھر آپ کو یہاں بلاسنے کی گستاخی پر معذرت خواہ ہوں۔“ مہر زاد نے کہا۔ ”ماؤں کو بلایا

نہیں جاتا، خود ان کے پاس جایا جاتا ہے مگر یقین جانیں یہ میری مجبوری تھی۔“

”کوئی بات نہیں، میرال تک رسائی کے لیے تو میں کہیں بھی جانے کو تیار ہوں۔“ عافیہ نے کہا۔

”ایک درخواست بھی کروں گا آپ سے۔“ مہر زاد نے آگے بڑھ کر عافیہ کے لیے دروازہ کھولتے

ہوئے کہا۔ ”اپنے صفحے کی تفصیلات کی مدد میں لکھے اس جملے کو نکال دیجیے گا۔ جس میں بولڈ الفاظ میں لکھا

گیا ہے کہ ”seeing is believing“ کیونکہ جو نظر آتا ہے ہمیشہ وہی سچ نہیں ہوتا۔“

عافیہ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گئیں..... سردار زادہ مہر زاد خان جسے دیکھنے پر وہ

اسے گولی مار دینے کی خواہش مند تھیں سے ملاقات ان کی زندگی کے گمنے، چنے انوکھے تجربات میں سے

ایک ثابت ہوئی تھی۔

☆☆☆

وہ اُس جگہ پر قید تھی یا وہ جگہ اس کی ملکیت تھی، اس جگہ پر رہائش کے اولین دنوں میں اسے یہ خیال نہیں آیا

تھا، ایک طویل اعصابی اور ذہنی مشقت جھیلنے کے بعد اسے چند ایسے دن میسر آئے تھے جن میں اس کے ذہن پر

ماہنامہ سوسائٹی ڈائجسٹ

بدلتے موسم کی سچ ادائیاں
مئی 2014ء کے شمارے کی دل داریاں

آوارہ گروہ ● دکھ سکھ کے شکر کہ ساقیوں کی ایک زلی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک کو اپنی تلاش کا معیار پیش تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹو کی شمولیت

جواری ● احمد اقبال کے شراب قلم سے ایک جواری کے کھیل کے نئے انداز

مغرب کے ذالیہ انداز ● مغربی دنیا کی تہذیب و تمدن کی عکاسی اور عورت کی پردہ ناکہل فرمائی کہانیاں

سرورق کی کہانیاں

پٹلی کہانی ● ماضی کی دھند میں مدفن ہو جانے والے واقعات کا از سر نو آغاز...
تخیر و اسرار کے پوشیدہ راز... کاشف ذمیر کے قلم کی جولانی

دوسری کہانی ● اپنوں کی اجنبیت اور اجنبیوں کی قربت میں گندھے سرورق کے دلچسپ موڑ... سرور اکرام کے مخصوص انداز میں تحریر کردہ...



آپ کے تہرے... شکاری... کتا...

اسے دیکھ رہا تھا۔ اسی طرح جیسے وہ امراؤ بیگم کے ہاں گھنٹوں اس کے سامنے بیٹھا اس کی بیان کی جانے والی داستان سنتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں؟“ اس کی محویت سے گھبرا کر اس نے اپنے لہجے کو مزید کھردرا دیا۔ ”شیر اپنے شکار کو مس زاویے سے بھنبھونڈنے میں زیادہ لذت محسوس کرتا ہے۔ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کیا؟“

”ہوں.....“ وہ چونک کر اپنی محویت سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ”شکر ہے تم نے مجھے شیر سے تشبیہ دے دی ورنہ شکار تو کتے بھی کرتے ہیں۔“

”آپ جیسے لوگوں کے شکرانے کے بھی کیا کیا پیمانے ہوتے ہیں۔“ وہ مزید تلخ ہوئی۔ ”جانوروں سے تشبیہ دے جانے پر ناراض ہونے کے بجائے شیر اور کتے کے فرق پر شکر ادا کر رہے ہیں؟“

"Do you know that you are sounding quite rude?"

مہرزا دا چانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ میرال نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا مگر مہرزا نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے منع کر دیا۔

”تمہارا اگرچہ اس میں کوئی قصور بھی نہیں ہے، تم جن حالات کا شکار رہی ہو ان کی وجہ سے تمہارا ایسا ہو جانا ایک فطری رد عمل ہے لیکن شاید مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم پر یہ انداز چٹا نہیں یا شاید اب کے میں تم سے اس انداز کی توقع نہیں کر رہا تھا۔“ مہرزاو کے لہجے میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ وہ جواب دینا چاہتے ہوئے بھی جواب نہیں دے پائی تھی۔

”میں دو ہفتوں سے تمہارے ایسے ہی پیغامات وصول کرتے ہوئے بھی اسی الجھن کا شکار رہا ہوں جو آج تمہارے سامنے بیٹھ کر تمہاری باتیں سن کر میرے دل کو جکڑ رہی ہے۔“ مہرزاو خان نے کہا۔ ”شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ کس آگ کے دریا سے گزرنے کے بعد تم یہاں پہنچی ہو..... یہ جگہ یا زندگی جو اک کنارہ ہے ایسا کنارہ جس پر زندگی اپنی تمام تر خوب صورتیوں کے ساتھ بستی بسائے بیٹھی ہے۔“

”کیا میں آگ کے دریا سے گزر چکی ہوں؟“ میرال نے ابرو چڑھاتے ہوئے اس سے سوال کیا..... ”آپ کہتے ہیں کہ میں آگ کا دریا پار کر چکی ہوں۔“ اب کے وہ طنزیہ انداز میں ہنسی..... ”جبکہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آگ کا دریا بے کنار ہے، یہ چہار سو پھیلا ہوا ہے کیونکہ اس کا تو کوئی کنارہ ہی نہیں ہے۔“ اس کی بات غور سے سنتا مہرزاو دا چانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا..... اس نے ایک نظر میرال پر ڈالی اور پھر ایک لمبی سانس لیتے ہوئے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کا یہ انداز اتنا نامانوس اور اجنبی تھا کہ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھنک کر رہ گئی تھی۔

”اگر میں تمہیں بتا دوں کہ آگ کے دریا میں ہاتھ پاؤں مارنے اور اس کیفیت میں ہونا جس میں تم اس وقت ہو..... میں کیا فرق ہے تو شاید تم عمر بھر کسی بات کا شکوہ نہ تو اللہ سے، نہ ہی کسی انسان سے کر سکو، تم خود پر نازل ہونے والی blessings (اللہ کی جانب سے عنایات) کو دیکھ لو اور سمجھ پاؤ تو شاید یہ بھی بھول جاؤ کہ تم پر اتنے سال کیا کیا ہوتی! مہرزاو خان کا لہجہ سنجیدہ اور سخت تھا۔ ”مجھے تو تم پر کبھی، کبھی رشک آنے لگتا ہے۔“ اس نے میرال کی طرف دیکھا۔ ”اتنی deprived (محروم) اور پھر اتنی blessed، کاش تم جان پاؤ۔“

”میں یہ جان کر بھی کیا کر لوں گی، آپ کی blessings اور deprivations کے

خدمت کے لیے ہمہ وقت مستعد ملازمین، اس کا دل ان سب سے اچاٹ ہونے لگا۔ وہ اس گھر کے خصوصی پریزروم میں جاتی اور گھنٹوں کوئی دعا، کسی نماز، کوئی ایک آیت کی تلاوت کیے بغیر وہاں بیٹھ کر باہر نکل آتی۔

”کیا میرے دل پر جہل اور کفر کی مہر لگ چکی ہے؟“

”کیا میں سماعت رکھنے کے باوجود بہری، بصارت کے باوجود بے بصر اور قوت گویائی رکھنے کے باوجود گونگی ہو چکی ہوں؟“

”آزمائش کا ایک دور ختم ہونے کے بعد کیا آزمائش کا یہ نیا دور شروع ہو چکا جس میں، میں اپنے عمل میں آزاد اور کوئی عذر، کوئی دلیل میرے حق میں میرے کام نہ آئے گی؟“

سوال تھے، سوچیں تھیں اور ان گنت الجھنیں تھیں..... شاید وہ ان سوالوں، سوچوں اور الجھنوں میں گمراہ ہو جانی تو وزن کے بگاڑ کا شکار ہو جاتی اگر ایک خوشگوار شام کو بغیر کسی پیشگی اطلاع کے مہرزاو خان وہاں نہ آ جاتا..... اس کی آمد کے ساتھ ہی پہلے سے ہمہ وقت مستعد عملہ اور بھی زیادہ مستعد اور مصروف نظر آنے لگا تھا۔ یوں جیسے زندگی نے ہڑ بڑا کر سانس لی ہو..... اس کی طرح اس گھر میں ایک مخصوص روشیں میں مگن ہر شخص جیسے بوکھلا کر گہری نیند سے جاگا تھا۔ ہر طرف دوڑ، بھاگ، رفتار نظر آنے لگی تھی۔ اپنی آمد کے آدھے گھنٹے کے بعد ہی وہ میرال کے سامنے موجود تھا۔

”جی فرمائیں..... اب میری زندگی جو آپ کے اختیار میں ہے کہ بارے میں آپ کا اگلا فیصلہ کیا ہے، اب مجھے کن نئے حالات سے دوچار ہونا ہے؟“ اس نے اس کے اپنے سامنے بیٹھتے ہی بغیر کسی سلام دعا کے چپختے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔ مہرزاو خان کے چہرے پر تذبذب کا سایہ جھلکا تھا۔ جبے دیکھ کر وہ اس کا جواب سنے بغیر ہاتھ اٹھا کر اسے تسلی دینے کے سے انداز میں بولی تھی۔

”فکرت کیجیے، میں نے آپ کے اس انداز حکمرانی کے سامنے خود کو بے اختیار جانتے ہوئے اپنی وحشی روحانی اور جسمانی شکست تسلیم کر لی ہے، فرمائیں اگلا حکم کیا ہے؟ خاکسار کسی رو بوٹ کے مانند اسے بجالانے کو تیار ہے۔“

”اچھا.....“ مہرزاو خان نے اپنے چہرے پر چھائے تذبذب اور حیرانی کو چھپانے کی کوشش میں مسکرا کر کہا۔ ”تمہاری زبان اور تمہارا بیان، بڑا زبردست ہے، تمہاری ایک اضافی خوبی..... جس کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔“

”تعریف و توصیف کے چکر کو اب جانے دیجیے سردار زاوہ صاحب، اسی چکر میں پھنسا کر آپ نے مجھے سنہری خواب دیکھنے کی عادت ڈالی تھی لیکن اب یہ ہتھکنڈا پرانا ہو چکا، کوئی نیا حربہ آزمائیں.....“ وہ ہنسی سے بولی تھی۔

”میرے انداز حکمرانی کے سامنے اپنی شکست تو تم تسلیم کر ہی چکی ہو پھر مجھے کوئی ہتھکنڈا آزمانے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ میرال کے چہرے پر ایک تلخ اور طنزیہ مہر پور مسکراہٹ پھیلی۔

”چلیں پھر میرے شکست تسلیم کر لینے کے اعلان کا جشن ہی منا لیجیے، آپ پورا حق رکھتے ہیں اس جشن کو منانے کا۔“ اس نے اپنی بو جھل پلوں میں چھپی غلافی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ غور سے

وہ ادب کی کتاب جیسا تھا

بہاروں کی ایک خوشبو بھری صبح میں یہ خوب صورت تقریب..... میڈم فرزانہ امین چوہدری کے لیے سجائی گئی تھی جو تحصیل کوٹ مومن ہائر سیکنڈری اسکول کی پرنسپل رہ چکی ہیں..... ان کے بیسویں گریڈ کی ترقی پر ان کے اعزاز میں یہ خوب صورت تقریب منعقد کی گئی جس میں اسکول و کالج کے اسٹاف کے علاوہ کوٹ مومن کی دیگر معزز و معتبر شخصیات نے شرکت کی اور میڈم فرزانہ امین چوہدری کی علم کے شعبے میں دیرینہ وابستگی اور محنت و کامیابی پر مبارک باد کے ساتھ خراج عقیدت پیش کیا۔ اسی تقریب میں مس طیبہ کی ریٹائرمنٹ پر انہیں بھی زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا کہ شعبہ تدریس میں ان کی بھی نمایاں خدمات رہی ہیں۔ مقررین میں میڈم رابعہ طاہر خان، پھلردان۔ مس نعیمہ، سابق ڈپٹی ڈی سی او، مس روبینہ حسن، پرنسپل معظم آباد۔ مس عنبر، سرگودھا۔ میڈم شمیم، 10 چک شمالی۔ میڈم مسرت اعجاز، مڈھرا نچھا۔ میڈم زیتون، 11 چک جنوبی۔ میڈم رشیدہ۔ پھلردان اور دیگر اسٹاف میں سے مس کوثر، مس راقہ، مس صائمہ ستار، مس معظمہ بتول، مس مطلوب، مس فہمیدہ حسن..... نے فرداً فرداً اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا۔ میں نے مس فرزانہ امین چوہدری کی کردار ساز شخصیت کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں جو خراج عقیدت پیش کیا تھا وہ اگرچہ کچھ بھی نہیں تھا میں ان کے عمل و ہنر کے علاوہ ظاہری و باطنی خوب صورتی کو لفظوں کی پوشاک پہنا ہی نہ سکی تھی مگر پھر بھی میرے الفاظ کو اور میرے جملوں کو شرکائے تقریب نے بہت سراہا اور انہی کے اصرار پر میں وہ الفاظ قارئین پاکیزہ سے شیر کر رہی ہوں کیونکہ یہ تمام افراد بھی پاکیزہ کے بہت فین ہیں۔ فرزانہ امین چوہدری ایک کم تر ترقی یافتہ شہر کی ایسی صاحب کمال بیٹی ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ جو جرات، شرافت، غیرت کا پیکر ہے جسے شہرت کی چاہ نہ آرزو اور نہ دولت کی حرص و ہوس وہ فقط علم تقسیم کرنا جانتی ہے یہی اس کی زندگی کا مشن تھا، ہے اور رہے گا معاشرے کی ایسی با کردار اور باشعور

standards شاید میں کبھی سمجھ نہ پاؤں۔“ میرال، مہر زاد کے بدلے ہوئے انداز اور لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

”جان لوگی..... بہت جلد جان لوگی۔“ مہر زاد نے کہا۔

”جان لوں گی؟“ اس نے حیرت بھرے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”گویا ابھی اور بھی کچھ ہونا باقی ہے، کوئی نیا باب کھلنے والا ہے کیا.....؟“

”تمہارے لہجے کی بدگمانی، نفرت، شکوک اور اس میں گھومتے بل کھاتے سوال اگرچہ جان لیوا ہیں مگر کیونکہ میں سخت جان ہوں، اس لیے سنبھل جاؤں گا۔“ مہر زاد نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”مجھے ابھی واپس جانا ہے، میں آج ادھر تھوڑا وقت لے کر آیا تھا۔ سوچا تھا کہ تم سے کچھ اپنے دل کی کہوں گا مگر.....“ وہ کہتے کہتے رکا..... ”ایک بدگمان دل سے اپنے دل کی بات کہنے کا کیا فائدہ..... اس لیے دل کی دل ہی میں لیے چلتا ہوں..... کہانیاں سننے اور کہانیاں کہتے، کہتے اصل کہانی ان کہی اور ان سنی رہ بھی جائے تو شاید کوئی فرق نہ پڑے.....“ وہ اپنی بات کے جواب میں اس کی بات سے بغیر تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا۔ میرال کے لیے اس کے آخری الفاظ معنی خیز تھے اور غور طلب بھی.....

بیٹیوں سے ہی معاشرے کا آدھا چہرہ مکمل ہوتا ہے اور ایسی صاحب کردار لڑکیاں ہی تو اماؤس کی کالی سیاہ راتوں میں چراغ کی طرح ہوتی ہیں، میڈم فرزانہ نے میرے شہر کی لڑکیوں کو نہ صرف درسی کتب کا علم عطا کیا بلکہ ان کی ذہنی نشوونما اور کردار کی تربیت کر کے سنہری اقدار اور مثبت روایات کو پروان چڑھایا۔ میڈم فرزانہ نے اپنی فہم و فراست، علم و دانش اور اخلاق و کردار سے جہاں اپنے فرائض منصبی کو بطریق احسن نبھایا وہاں لوگوں کے..... خصوصاً اپنی شاگردوں اور ساتھی اساتذہ کے دلوں میں گھر کر لیا..... اسی لیے تو ان کے اس کالج سے چلے جانے کے ذکر سے ہی ہر آنکھ پر نم تھی، ہر دل اداس تھا۔ ترقی کے اس تیز ترین دور میں جہاں حرص و ہوس، لالچ، طمع اور بدلے کی خواہش نے معاشرے کے دکھلے خدو خال کو مسخ کر کے... بصورت شکل دے دی ہے وہاں میڈم فرزانہ جیسے با اصول، ثابت قدم اور شخصیت ساز لوگ اگرچہ خال، خال ہیں مگر ہیں ضرور..... اور ان کی خدمات اندھیری راتوں میں روشن چراغوں کے مانند نمایاں اور جگمگاتی رہتی ہیں..... جنہوں نے رشوت اور سفارش کی بد نما چھینٹوں سے خود کو عیب دار نہیں ہونے دیا، مساوات کے اصولوں کو اپنا کر طبقوں میں امتیاز نہ آنے دیا..... امیر غریب کے لیے یکساں اصول اپناتے ہوئے میرٹ کو فروغ دیا..... اور تحصیل کوٹ مومن کے اس نوزائیدہ ادارے کی بنیادوں کو اپنے اخلاق، محنت اور لگن سے سینچا اور مضبوط کیا۔ یہی لوگ ہوتے ہیں جن کے نقش قدم پر چل کے کھوئی منزلوں کے نشان ملتے ہیں۔ یہ نسلوں کے امین ہوتے ہیں اور ذہنوں کو اپنی محنت، قابلیت سے شعور دلائی اور پاکیزگی عطا کرتے ہیں اور فعال معاشرے کی تشکیل میں اپنا حصہ ڈالتے جاتے ہیں، میرے پیارے پاکستان کو ایسے ہی مخلص اور محنتی لوگوں کی ضرورت ہے اور کبھی، کبھی ایک ننھا سا دیا بھی کافی ہوتا ہے روشنی کے لیے..... بس آپ امید اور روشنی کا دیا بھی بجھنے نہیں دیں۔

و عاؤں کی طالب
مسز نسیم غلام علی گوندل، کوٹ مومن

☆☆☆

”آپ کو اندازہ ہے مئی کہ یہ سیاست دان جو ہوتے ہیں ان کے پاس ایک ہی تو ہنر ہوتا ہے کہ لہجے دار الفاظ میں سننے والے کو پھنساتے جائیں اور وہ پھنستا جائے۔“ دانیال نے جھنجھلاتے ہوئے عافیہ سے کہا۔ مہر زاد خان سے مل کر واپس آنے کے بعد ان کا رویہ اور گفتگو اس کے لیے حیرت انگیز امر تھا وہ اسے الجھا بھی رہی تھیں۔

”لیکن میرا خیال نہیں تھا کہ آپ جیسی خاتون کو وہ یوں اپنے الفاظ کے جال میں پکڑ سکتا ہوگا۔“ پھر اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”آپ کیا نہیں جانتیں..... آپ کو ان شعبہ بازوں کے بارے میں کیا علم نہیں؟ اس ملک، اس معاشرے کی تاریخ سے آپ کی واقفیت بھی کم نہیں پھر بھی آپ اس کی باتوں میں آئیں گی؟“ وہ عجیب کیفیت سے دو جا رہا تھا۔

”میں اس کی باتوں میں نہیں آئی دانیال۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا، ان کا لہجہ نرم تھا اور چہرے پر سکون چھایا ہوا تھا۔ ”نہ ہی اس نے مجھے اپنی باتوں میں الجھانے کی کوشش کی، جب میں یہاں سے گئی تھی اس وقت اس کے بارے میں میرے خیالات بھی وہی تھے جو تمہارے ہیں لیکن اس کے سامنے جا کر، اس کی گفتگو

سن کر مجھے ایسا لگا کہ جو نظر آتا ہے ہمیشہ وہی حقیقت نہیں ہوتا۔“

”آپ کا مطلب ہے جیسا آج کل وہ ہر جگہ portray ہو رہا ہے وہ ویسا نہیں ہے؟“ دانیال کے لیے میں ہلکا سا تسخیر جھلکا۔ ”وہ ویسا ہی ہے مگر بلکہ شاید اس کا کردار اس سے بھی زیادہ گھناؤنا ہوگا۔“

”معاشرے کے ہر فرد نے اپنے، اپنے دائیں ہاتھ میں برش پکڑ رکھا ہے۔“ عافیہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اپنے، اپنے برش سے ہم سب جسے چاہیں اور جیسا چاہیں portray کر لیتے ہیں اور پھر اسی پورٹریٹ کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں، اس لیے کہ ہمیں جو نظر آتا ہے ہم اسی پر یقین کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔“

”اوہ می!“ دانیال کا دل چاہ رہا تھا اپنا سر پیٹ لے، اس کی ماں اسے میرال کے سلسلے میں کی جانے والی ہر کوشش بند کر دینے کا حکم سنا چکی تھی اور مسلسل مہرزاو خان کی وکالت کیے چلی جا رہی تھی۔ ”آپ نے وہ کالم نہیں پڑھے جو اس کے بارے میں لکھے جاتے ہیں، انٹرنیٹ پر اس کے بارے میں کیے جانے والے تبصرے نہیں دیکھے ہو، اس کی فیملی، اس کی ہسٹری، میرال کے سلسلے میں اس کا سامنے آنے والا کردار کوئی ایک جہزبانی اس کی وکالت کرتی نظر آتی ہے آپ کو؟“ وہ ان سے سوال کر رہا تھا۔ ”اور آپ ہیں کہ ایک ہی ملاقات میں reverse ہو گئیں۔“

”کبھی، کبھی ایک ہی ملاقات کسی کو جان لینے کے لیے کافی ہوتی ہے دانیال۔“ عافیہ نے اسی نثری سے کہا جو وہ دانیال کو کوئی بات سمجھانے کے لیے اختیار کیا کرتی تھیں۔ ”اور کالم نگاروں، صحافیوں، بلاگز کا کیا ہے، ان کے ہاتھوں میں کوئی بھی رقم تھا کر جیسے چاہے پتھر پکڑا دے، انہیں کسی پر کچھ بھی لکھتے ہوئے کیا عار ہو سکتی ہے مگر ہم تم.....“ انہوں نے دانیال کی طرف دیکھا۔ ”دانیال میری اور تمہاری حیثیت مختلف ہے، ہم جن تجربوں سے گزر چکے ہیں، ہمیں کسی پر پتھر برسانے سے پہلے کیا سو فائدہ سوچ نہیں لینا چاہیے، خصوصاً جب ہم جان چکے ہوں کہ جس پر پتھر برسانے کے لیے ہم ہجوم میں کھڑے ہیں، اس کا تعلق شیاطین کے اس قبیلے سے نہیں ہے جن پر پتھر برسانے جانے چاہئیں۔“ اب عافیہ جذباتی ہو رہی تھیں۔ دانیال نے ان کی طرف دیکھا ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”ہم کسی غلط سمت چلنے لگیں گے ناں دانیال یا ہم کسی سے زیادہ قوی کر جائیں گے تو ہماری پکڑ دوسروں سے زیادہ ہوگی، ہم سے تو کہا جائے گا کہ ”ارے تمہیں تو ایک موقع اور دیا گیا تھا، تمہیں تو مہلت عطا کی گئی تھی پھر بھی تم نہ دیکھ سکے، نہ سن سکے، نہ حق بات سمجھ سکے۔“

دانیال نے ایک مرتبہ پھر ماں کی طرف دیکھا۔ وہ ان کے چہرے کے تاثرات جانچ کر ڈر گیا تھا۔ ”اوکے، اوکے!“ اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”جیسا آپ کہہ رہی ہیں می یقیناً ویسا ہی ہوگا۔“

”میں یہ نہیں کہتی کہ وہ کوئی پرفیکٹ انسان ہوگا۔“ عافیہ نے اپنے جذبات کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔ ”آدم زادوں کے جس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے یقیناً اس پر ان کا اثر ضرور ہوگا مگر میرال کے سلسلے میں اس کا رویہ یقیناً مختلف ہے، ہمیں محل اور صبر سے اس کے دعوے اور وعدے کی تکمیل تک انتظار کرنا چاہیے۔ اگر وہ غلط ہوگا تو بھی سامنے آجائے گا، سچا ہوگا تو بھی پتا چل جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اب کے دانیال نے ماں کی گفتگو سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہم ایک معجزے کی امید میں دن، مہینے، سال صبر کے ساتھ انتظار کر چکے ہیں تو دوسرے معجزے کی امید میں مزید انتظار کر لینے میں کوئی

حرج نہیں۔“

”مجھے یقین تھا تم میری بات سمجھ جاؤ گے۔“ عافیہ کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ پھیلی۔

”میں سمجھ چکا اور اب حزرہ اور فہد کو بھی سمجھا دوں گا، مجھ سے زیادہ شاید وہ اس سلسلے میں جذباتی ہیں۔“ دانیال نے کہا۔

”میں میرال کے سلسلے میں مکمل طور پر پُر امید ہوں، جب مہرزاو خان اُسے ہمارے پاس بھیجے گا..... میری خواہش ہے کہ میں تمہارے ڈیڈی، دانیال تمہارے تمہاری فیملی اس گھر میں اس کا یونہی استقبال کریں جیسے کوئی خاندان اپنی مدتوں بعد گھر واپس آنے والی بیٹی کا کرتا ہے۔“ اس شام عافیہ نے اپنی بہو سے اسکاپ پر بات کرتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

اشعر نے سیڑھیوں کے ساتھ اوپر جاتی منقش ریلنگ پر ہاتھ پھیرا، اس آبنوسی ریلنگ کے نچلے سرے پر شیر کا منہ بنا تھا، ایک ایسا شیر جس کا منہ کھلا تھا اور آنکھیں پوری کھلی تھیں، ریلنگ کے اوپری اور نچلی سطح کے درمیان بنی جالی کسی ماہر کار ریکر کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اشعر کو وہ گھر اس وقت بھی بہت مانوس سا لگا تھا جب وہ نکمیں سے شادی ہو جانے کے بعد پہلی بار اپنی سسرال سیالکوٹ آیا تھا۔ شہر کے ایک پرانے محلے میں نکمیں کے والدین کے قدرے جدید طرز تعمیر پر بنے گھر کے ساتھ جڑا یہ قدیم طرز تعمیر کا حامل گھر اسے بہت پسند آیا تھا۔ اس گھر میں نکمیں کی دادی اپنے نواسے حزرہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ اسے یہاں آکر محسوس ہوا تھا کہ اس کی نئی نوکیلی دلہن نکمیں کو بھی اس گھر سے خاصا انس تھا۔ اپنے والدین کے گھر کے بجائے وہ ان چند دنوں میں جب وہ سیالکوٹ میں مقیم رہے تھے زیادہ وقت اپنی دادی کے گھر میں گزارتی تھی۔

”یہ سیڑھیاں دیکھ رہے ہیں آپ؟“ وہ چلی منزل کی چھت سے اوپر ایک اور چھت کی طرف جاتی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتاتی۔ ”اپنے بچپن کی گرمیوں کی اکثر چھتیاں ہم نے انہی سیڑھیوں میں بیٹھے چھٹیوں کا کام کرتے، کھاتے پیتے، کھیلتے گزاری ہیں، انہی سیڑھیوں کے ذریعے ہم بالائی چھت پر جایا کرتے تھے اور نیچے محلے کی گلیوں میں جھانکتے ہوئے آتے جاتے لوگوں پر نظر رکھتے، ان پر منٹس پاس کیا کرتے تھے۔“

”لکڑی سے بنے اس کمرے میں ہم سردیوں کی شاموں میں بی اماں کے بستر میں گھس کر ان سے کہانیاں سنا کرتے تھے۔“ وہ اسے اس گھر کا ایک، ایک کمرہ دکھاتے ہوئے اس سے جڑی اپنی یادوں کا ذکر کرتی۔

”اس بڑے کمرے میں جہاں یہ بڑا سا ریڈ پور کھا ہے ناں، ہمیں بیٹھ کر ابامیاں اور چھوٹے پچارات اٹھ بچے کی خبریں سنتے تھے، انہیں فی وی پر ہونے والی خبروں سے ریڈیو کی خبریں زیادہ اچھی لگتی تھیں۔ ہم بھی ان کے پاس بیٹھ کر خبریں سنتے تھے، اسی لیے تو ہماری اردو اتنی اچھی ہے۔“ وہ کہتی۔

”تمہاری اردو اتنی اچھی ہے، جب ہی اس گھر سے جڑی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے تم خود کو میں کے بجائے ہم کہنے لگتی ہو مغلیہ شہزادی۔“ اشعر مسکرا کر کہتا۔

”ارے ہم سے مراد میں اکیلی تھوڑی ہوتی ہوں۔“ اس کی اس بات کا جواب نکمیں نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے دیا۔

”پھر.....“ حمزہ نے اشعر کی طرف سے دھیان ہٹا کر دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دیکھیں اس کا کیا مستقبل ہوتا ہے۔ ابھی تو اس کے بہت سے چھوٹے موٹے کام باقی ہیں۔“

”چلو تم نے جو بھی اس کے بارے میں سوچا ہے وہ اپنی جگہ، بہر حال یہ گھربا پہلے سے بھی زیادہ آئینہ دل گھربن چکا ہے۔“ اشعر نے کہا۔

”میں اسی لیے آج آپ کو ساتھ لایا تھا۔ مجھے یقین تھا آپ کو یہ پسند آئے گا، میں نے تو سوچا تھا نکلن بھی ساتھ آئے گی مگر معذرت کے ساتھ اشعر بھائی، نکلن کو آپ کے گھر نے اپنے کاموں میں کچھ زیادہ ہی جکڑ رکھا ہے۔“ حمزہ نے پہلی بار اشعر سے گلہ کیا۔

”شکایت کر رہے ہو، شکوہ، گلہ ٹاپ..... ہے ناں؟“ اشعر مسکرایا۔

”جی بالکل۔“ حمزہ نے سر ہلایا۔

”اب چھوٹے کی شادی ہو جائے گی تو اس کی بیوی آنے کے بعد نکلن پر سے ذمے داریوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔“ اشعر نے اس کی بات کا مختصر سا جواب دیا۔

”پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ نکلن اس طرح گھریلو ذمے داریوں میں جکڑے جانے کے لیے نہیں بنی تھی۔ اس کا سارا علم، ذہانت، تعقل، کچن کے مسالوں اور ڈیٹر جنٹ پاؤڈر کے دانوں میں گم ہو رہا ہے۔ یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔“

”میں جانتا ہوں یار۔“ اشعر نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر ہم لوگ جیسے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں

بے وزن گنبد

سوچیں جب کسی بند گنبد میں بھٹکتی پھر رہی ہوں تو منزل کے کھو دینے کا اضطراب کس قدر بے کل رکھتا ہے اس کا احساس زیر نظر تحریر کو پڑھ کر ہوگا..... آخری صفحات پر ناصر ملک کا دلکش شاہکار

گردش دوراں کے اسیر

تاریخ کے جھڑکوں سے الیاس سینٹاپوری کا دلچسپ انتخاب..... معلومات میں اضافہ کرتی ابتدائی صفحات کی سوغات

پس زنداں

دل کی بے تاب دھڑکنوں کا سنسنی خیز احوال

ظاہر جاوید مغل کے قلم کی روانی اور محبت کا دلربا انداز

ماروی

کبھی ملنا، کبھی بچھڑنا..... عاشقی کا انداز سہی مگر..... رقیبوں کا ہنر بھی اپنی جگہ..... محی الدین نواب کا دلچسپ سلسلہ

امجد حسن کا شیخ خیر تنویر ریاض اور سلیم انور کی کاوشیں اور منک و بلوٹ کا کارنامہ

ہوئے دیا تھا۔

”پھر؟“ اشعر اس جواب پر حیران ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”ہم سے مراد میں اور حمزہ ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔ ”میں اور حمزہ بچپن سے اکٹھے پڑھتے، اکٹھے کھیلتے آ رہے ہیں، دو سال ہی تو چھوٹا ہے مجھ سے حمزہ۔“ نکلن کے اس جواب نے ہی اشعر کی توجہ حمزہ کی طرف مبذول کرائی تھی، نکلن کے اپنے بہن، بھائیوں اور اس کے دیگر کزنز سے کہیں مختلف وہ خاموش طبع اور سنجیدہ لڑکا اسے اس وقت بھی چونکا گیا تھا۔

”یہ لڑکا تو بہت مختلف ہے بھی، لیے دیے رہنے والا، خاموش سا۔“ اس نے حمزہ سے پہلی ملاقات کے بعد نکلن سے کہا تھا۔ اس کی اس بات کے جواب میں نکلن نے اسے حمزہ کی داستان سنائی تھی..... اور اس داستان کو سننے کے بعد اگلی ملاقات ہی میں اشعر کی حمزہ سے اسی طرح دوستی ہو گئی تھی جیسے نکلن کی حمزہ سے تھی۔

اس نے یاد کرتے ہوئے سر جھٹکا اور مسکراتے ہوئے سامنے دیکھا۔ حمزہ اس نیم تاریک ڈیوڑھی سے نکل کر اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا، جس میں بقول نکلن کے گرمیوں کی دوپہروں میں وہ اور حمزہ بیٹھ کر تختیاں دھوتے، ہسکھاتے اور لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔

”تم نے اس ڈیوڑھی کو بھی رینوویٹ کیا ہے کیا؟“ اشعر نے حمزہ سے پوچھا۔

”ہاں کچھ کچھ، آئیں آپ کو دکھاؤں۔“ وہ اُسے لیے ڈیوڑھی کی طرف آگیا، اس نیچی چھت والی نیم تاریک ڈیوڑھی کے سر پر اب نیچی چھت کے بجائے پریڈ فابریک گلاس سایہ فگن تھا جس سے آسمان پر سجے سورج کی روشنی چھن کر نیچے تک آرہی تھی۔ فابریک گلاس کی چھت کی وجہ سے اب یہ ڈیوڑھی ایک روشن اور کشادہ انٹریس میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کی مشرقی دیوار کے ساتھ دوسوانی کرسیاں اور ایک چنیوٹی میز رکھی تھی اور فرش پر پریڈ ٹائلز سے آراستہ تھا۔

”میں تمہارے اعلیٰ ذوق کا قائل ہو گیا حمزہ، تم نے جس خوب صورتی سے اس گھر کو قدیم اور جدید انداز میں رینوویٹ کیا ہے اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ تم کوئی ماہر تعمیرات ہو۔“ اس نے تحسین آمیز نظروں سے حمزہ کو دیکھا۔

”پتا نہیں یہ اچھا ہے کہ نہیں۔“ حمزہ نے کمرے میں چاروں طرف نظر گھماتے ہوئے جواب دیا۔ ”میری تو بس ایک کوشش ہی ہے۔“

”یہ صرف اچھا نہیں بلکہ بہت ہی اچھا ہے۔“ اشعر نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”ویسے اس پر پیسہ بھی تو بہت خرچ ہوا ہوگا، جس طرح تم نے عمارت کی اصل شکل کو برقرار رکھتے ہوئے اسے جدید انداز میں از سر نو سجایا ہے، ایسے کام کے لیے تو بہت زیادہ پیسہ چاہیے ہوتا ہے۔“

”ہاں، شاید اپنی استطاعت سے بڑھ کر خرچ کر چکا ہوں۔“ حمزہ نے سر ہلایا۔

”اس کا اب کرومے کیا؟“ اشعر کا ذہن کب کا اس ایک سوال میں اٹکا ہوا تھا۔

”تم خود تو یہاں رہ نہیں سکتے، تمہاری جاب لاہور میں ہے، اس گھر کو رینٹ پر دو گے کیا؟“

”ارے نہیں اشعر بھائی۔“ وہ تیزی سے بولا تھا۔ ”اپنے شوق، اپنی محبت، اپنے جذبات اور اپنے آپ کو کون رینٹ پر دیتا ہے؟“

”پھر؟“ اشعر نے ابرو چڑھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

میں چلی جا رہی تھیں ایک ہی سال کے اندر، اندر چلنے کی کبھی نہ سوچتا۔“
 ”بس پھر اب اس کچے بچے کو دیکھیے اور میرا تماشا دیکھیے ہوتا کیا ہے۔“
 ”مجھے اپنی پشت پر ایک پھل دے لینے دو، تم جو کارنامہ انجام دینے جا رہے ہو اس کے سرانجام ہو جانے کے بعد میدان ہمارے لیے اتنا وسیع ہو جائے گا کہ اس میں کھل کھیلنے ہوئے شاید تمہاری پشت پر پھل دینے کا وقت نہ ملے۔“

”یس مائی ڈیئر ڈیڈ میرا شانہ بھی حاضر ہے اور پشت بھی، ایک کے بجائے زیادہ تھکیاں دے لیں ایک ہی بار میں..... کیونکہ اس کارنامے کو انجام دے لینے کے بعد ایک کے بعد ایک کتنے ہی کارناموں کا راستہ کھلنے والا ہے اور پھر وقت کا کیا پتا آپ کو ملے نہ ملے۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے، ان سردار زادوں کے گھر کی لڑائی ان کے گھر میں ہی چا دینے جیسی عقل مندی سے بڑا کارنامہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا جی بھڑکھکیاں لو۔“

”میں تو اس پاتال سے ’امراؤ بیگم‘ کا ہیرا نکال لانے کا تہیہ کیے بیٹھا تھا ڈیڈ مگر قسمت دیکھیں ایک رکھیل کے بجائے درمیان ہی میں میرے ہاتھ سردار زادے کی نہ ہونے والی منگیتر لگ گئی، اب صبح ہو یا شام، رات ہو یا دن، وقت اس کی مہربان زلفوں کی چھاؤں ہی میں گزرتا ہے۔“

”بڑے لکی ہو بھئی! ورنہ اس خاندان کی مہ جبینوں سے ہمارا واسطہ کم ہی پڑا ہوگا کبھی، وہ حسینائیں انتخاب کرتے ہوئے اپنے خاندان اور قبیلے کی دشمنیوں، دوستیوں کا بڑا لحاظ کرتی ہیں۔“

”اس بار خاندان کی نہیں ذاتی دشمنی نے اس کی اور ہماری پرانی دشمنی کو دوستی میں بدل دیا ہے۔ ہمارا aim ایک ہے اور game بھی ایک سا ہی ہونے والا ہے۔“

”چلو بھئی بیسٹ آف لک، میں وہیں انتظار کروں گا تمہارا فیڈرل کیمپل میں۔“
 ”آپ جارہے ہیں کیا؟“

”ہاں آج ہی، بڑے صاحب کی عزیزہ نے طلب کیا ہے، کچھ ذاتی مصروفیات ہیں ان کے ساتھ۔“
 ”گویا یہ سرکاری وزٹ نہیں ہوگا؟“

”نہیں خالصتاً ذاتی۔“
 ”چلیں پھر وہیں بیٹھ کر اس بریکنگ نیوز کا انتظار کیجیے گا کہ کب آتی ہے۔“

”شیور، شیور۔“

☆☆☆
 ”میں نے مہر زاد خاناں ایک ہی فرمائش رکھی تھی تمہارے سامنے..... اور برادری کو تمہارے پیچھے کھڑا کر دیا تھا۔“

”بلقی آواز میں بولنے والے نانا جان نے اپنے قریب رکھے بیچوان کا کش لگاتے ہوئے اس سے کہا تھا۔“
 ”میں برادری کا مشکور ہوں نانا جان“ وہ احترام سے بولا تھا۔

”مگر وہ جو برادری تم سے ناراض ہے، اس کا کیا کریں؟“
 ”انہیں ناراض نہیں ہونا چاہیے نانا جان..... کسی سے کوئی کام زبردستی نہیں کرایا جاسکتا، میرے پیچھے کھڑے ہونے میں برادری کا اپنا مفاد تھا، ایک ایسی وزارت جاتی رہتی جو برسا برس تک حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی رہی، سو اور وزارتیں تو ہاتھ آئیں مگر یہ نہیں آئی، ایسے میں اسے بچانے کے لیے میرے پیچھے

”ایک ہی وقت میں ہر سرحد پر جنگ چھیڑ لینے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے، بچا بھی کچا ہے، ورنہ جو چالیں سالوں

وہاں لڑکی کی زندگی رفتہ، رفتہ ایسی ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔“
 ”ہوتی ہوگی۔“ حمزہ نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”مگر آپ جیسے شخص سے مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ نکمیں کو یوں گم ہو جانے دیں گے۔ اس کے کپڑے مائز کو آپ کے سہارے اور کنسرن کا شانہ درکار تھا، آپ بدستی سے اسے وہ دے نہیں پائے۔“

اشعر نے حمزہ کی طرف دیکھا جو کچھ وہ خود نگین کے بارے میں محسوس کرتا چلا آ رہا تھا، حمزہ نے اسے الفاظ کا پہناوا دیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں اس قدیم گھر کے صحن میں کھڑے تھے جس کی مغربی جھری دار دیواری کی جھریوں سے تازہ ہوا گزر کر ان تک پہنچ رہی تھی۔ وہیں کھڑے، کھڑے اشعر نے اپنے دل میں خود سے نگین کے بارے میں ایک عہد کیا تھا اور یہ خاموش عہد کرنے کے بعد اس نے حمزہ کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔ حمزہ کو لمحے بھر کے لیے وہم ہوا تھا کہ شاید اشعر اس کی باتوں سے ناراض ہو گیا تھا مگر اس کی مسکراہٹ اسے نگین کے لیے پرامید کر گئی تھی۔

☆☆☆
 ”یقین کیجیے ڈیڈ اگر اس طرح کے کارنامے ریکارڈ کرنے والا کوئی ادارہ ہو تو دنیا کے بہترین ریکارڈ

فائٹرز کی فہرست میں میرا نام ٹاپ آف دی لسٹ پر ہوگا۔“
 ”پہلی بار مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے کہ تم نے کوئی ڈھنگ کا کام کیا ہے۔“

”انتقام ڈیڈ..... انتقام ایک ایسی آگ ہے جو انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو تپا کر کندن بنا دیتی ہے۔“
 ”واہ رہے میرے ہاتھ تیری اردو دانی کے صدقے، لگتا ہے آج کل اپنے نامور دانشور و صوفی کزن

کے ساتھ خاصا وقت گزار رہے ہو۔“
 ”ارے کس کا نام لے دیا ڈیڈ! اس بے چارے کا تو اپنا سارا وقت چہرے پر مسکینی سجا کر، آنکھوں میں

ذہانت کے سرمے لگا کر، لہجے میں دانشوروں سے تاثر پٹکا کر، ٹیچر دینے کی تیاریوں میں گزر جاتا ہے، اس کے ساتھ کوئی دوسرا کیا وقت گزارے گا۔“

”جو بھی ہے ویسے بندہ ہے اول درجے کا فنکار، ایک دم اے کیٹگری!“
 ”جی بالکل! بڑی محنت کے بعد وہ نمونہ تیار ہوتا ہے جسے لوگ آدھی رات کوئی دی اسکرین پر جلوہ گر

دیکھتے ہیں۔“
 ”ارے ہمارے خاندان کی فنکاریوں کا تو ایک زمانہ گواہ ہے۔“

”بس پھر یاد رکھیے اس خاندان کے فنکاروں میں ایک اور فنکار کا گراں قدر اضافہ ہونے جا رہا ہے، ایسا

بس بھر دیا ہے اپنی فنکاری میں کہ اس کا ڈسا وہ سردار زادہ پانی بھی نہ مانگ سکے گا۔“
 ”ارے پانی کی بوتل ساتھ رکھ دینا اپنے ڈنک کے، اس بے چارے نے اتنے جتن سے جو گریس کی دھڑ

کے عرق سے جان چھڑا کر خود کو پانی پر لگایا ہے تو تڑپ، تڑپ کر جان دیتے ہوئے اسے ایک عدد امپورٹڈ پانی کی بوتل تو نصیب ہوئی ہی چاہیے۔“

”ہا ہا پانی کی طلب میں اس کی نظرس اویس خان کے گھر کی طرف دیکھیں گی وہ کبھی بھول کر بھی نہیں بوجھ پائے گا کہ زہر اس کے پیالے میں دراصل گھولا کس نے تھا۔“

”ایک ہی وقت میں ہر سرحد پر جنگ چھیڑ لینے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے، بچا بھی کچا ہے، ورنہ جو چالیں سالوں

احتجاج

ارجسند قسقل



اسكول كى نوكرى شروع كىے مجھے چند ماه ہى ہوئے تھے۔ شروع شروع ميں تو قسج سو رے اٹھنے كى يہ ڈيوٹى مجھے بہت كھلى ليكن پھر آہستہ آہستہ كام اور ذتے واريوں كے علاوہ مختلف فيصلے كرنے كا بوجھ بھى جب ميرے ناتواں كندھوں پر آن پڑا تو خود بخود ہى نيند بھى قابو ميں آنے لگی اور چند ماه ميں ہى ميں اس نئے روئين كى عاوى ہو چكى تھى اور اپنى ذتے واريوں كو خاصا انجوائے كرنے لگی تھى۔

كھڑے ہونے كا سودا برا نہيں تھا۔ اس كے لہجے ميں خاصا اطمينان تھا۔
”تم چيزوں كو فارگر اٹھ لے رہے ہو مہر زاد خان۔“ بلغى آواز كى دھاڑ بھى خاصى زبردست تھى۔

”وہ ايك unconditional سپورٹ تھى نانا جان۔“
”نہيں تھى unconditional اويس خان كى بہن اور عبد الكريم خان كى پوتى كو تمہارے گھر آنا ہے بدلے ميں بياہ كر، تمہارى ماں نے خود ان كے گھر جا كر نشانى ميں بيں تو لے سونا ڈالا تھا بچى كو۔“

”يہ سب كام بالا ہى بالا سوچے اور كيے گئے ہوں گے نانا جان! مير ان سے براہ راست كوئى تعلق نہيں، ميں نے صاف الفاظ ميں كہا تھا كہ برادرى مير اساتھ ويتى ہے تو ٹھيك ہے، دوسرى صورت ميں مجھے بھى اپنا راستہ معلوم ہے۔“

”بلاؤ اپنى ماں كو، وہ بھى تو يہيں ہے، پوچھو اسے كيا نشانى كے ساتھ اس نے قبيلے سے تمہارى غير مشروط حمايت طلب نہيں كى تھى؟“

”وہ ماں ہيں اور ان كى متا ان سے كچھ بھى كرا سكتى ہے ليكن ميں نے ان سے بھى اس سلسلے ميں اتفاق نہيں كيا تھا۔“

”بہت برا ہو جائے گا مہر زاد خان، بہت برا كرو گے تم اگر اس بات سے ہٹ گئے، صد يوں سے پتہ چلى آرہى ويواروں ميں وراڑيں پڑنے لگيں گى۔“

”وراڑوں كے ساتھ بھى بہت عرصہ چل جائىں گى يہ ويوارىں نانا جان، يہ عمارت اتنى جلد ڈھے جائے والى نہيں ہے۔ اس كى بنيادوں ميں كتنوں ہى كا خون وڻن ہے، بے شمار آہيں اور سسكياں وڻى ہوئى ہيں ان كے نيچے، ان ويواروں كو اپنا بھرم تو بہر حال ركھنا ہى ہے۔ جتنى جلد نہ ميں بوس ہوں گى اتنى ہى جلد ان كے نيچے دڻى آہيں اور سسكياں نكل كر باہر آجائىں گى، سو ويواروں كى وراڑوں سے مت ڈريں۔“

”تم نہيں جانتے مہر زاد خان! تم كيوں نہيں سمجھتے..... بہت برا ہوگا اگر تم اس كٹ منٹ سے ہٹ جاؤ گے، كيا فرق پڑے گا تمہيں جو ايك بار باجے ان كى مرضى سے بجو لو گے، اس كے بعد جتنى بار مرضى ہے سہرے باندھنا، حرم پال ليٹنا، تمہيں كسى نے منع كرنا ہے كيا؟“

”صرف ايك بار ہى كى تو بات ہے نانا جان، ايك بار ہو گيا تو باقى كيا رہ جائے گا؟“ مہر زاد خان نے كہا اور ان كى طرف ديكھا جو اپنے فون پر كسى كا نمبر ملا رہے تھے۔

”ہاں، ميں بول رہا ہوں مہر زادو كى ماں.....“ وہ كہ رہے تھے۔
”مجھے تمہارے بيٹے كى جوانى كا خيال آتا ہے اسى ليے بار بار بچ ميں پڑ جاتا ہوں، اس كے باپ نے تو

كھا ہنڈا كے گولى كھائى تھى، يہ جوانى ميں ہى سين تان كر كھڑا ہو گيا ہے، اسے سمجھا ميرى بچى، مجھ سے يہ صدمہ برواشت نہيں ہوگا اس عمر ميں۔“ وہ كہ رہے تھے اور مہر زاد خان خوب اچھى طرح جانتا تھا كہ ان كے كان سے لگے فون ميں ابھرتى آواز دوسرى طرف جس كان تك پہنچ رہى تھى اس كى سماعت پر كيے دھماكے ہو رہے ہوں گے اور اس دل پر كيا گزر رہى ہوگى۔

جارى ہے

اس سے پہلے کبھی میں نے پرنسپل کی ذمہ داری نہیں لی تھی۔ بس ایک ٹیچر تھی جسے اپنے کام میں اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اچانک ہی ظہیر، میرے شوہر کے ایک دوست نے مجھے تجویز کیا اور انہی کے اصرار پر میں ظہیر کے ساتھ ٹرسٹی صاحب سے ملنے چلی گئی اور جب میں واپس آئی تو اپنا کمپنٹ لیٹر میرے ہاتھ میں تھا۔ یہ ایک درمیانے درجے کا اسکول تھا اور اس کے مالکوں نے گویا اسے خدمتِ خلق کے پیش نظر قائم کیا تھا۔ تنخواہ اگرچہ دیگر اسکولوں کے مقابلے میں کم تھی مگر کچھ تو اپنی مصروفیت کے لیے اور کچھ اس خیال سے بھی کہ اگر میں اس کا رخیر میں اپنا حصہ بھی ڈال دوں تو سودا برائے نہیں ہے، میں نے بھی حامی بھری۔

اسکول میں عام طور پر مڈل اور لوئر مڈل کلاس کے بچے تھے جن کا مجھے پہلے تجربہ نہیں تھا کیونکہ خود میں نے ہمیشہ پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھا اور پڑھایا اس لیے یہاں کی استانیاں اور بچے مجھے عجیب سمجھتے ہوں گے۔ خود مجھے بھی ان کے رویوں کی عادت نہ تھی مگر وہی بات کہ آہستہ آہستہ انہوں نے مجھے اور میں نے انہیں قبول کر ہی لیا۔ سب سے مشکل کام یہ تھا کہ ہر ماہ ہی کوئی نہ کوئی استانی ملازمت چھوڑ دیتی، کچھ کو تو میں نے خود ہٹایا کیونکہ ان کے کام کا معیار ہی بہت کمتر تھا اور کچھ مجھے ہی ”سخت“ کہہ کر چلی گئیں لیکن اب کوئی سال بھر ہونے کو آیا تو لگا کہ اب کافی بہتری آنے لگی ہے معاملات میں۔

مجھے ہمیشہ سے ہی یہ عادت رہی کہ اپنے بچوں کے بولنے کا سلسلہ شروع ہوتے ہی میں انہیں چھوٹی، چھوٹی دعائیں سکھانے لگتی تھی، کھانے کی دعا، باہر جانے کی دعا، سواری کی دعا، سونے کی دعا اور ایسے ہی بہت سی وہ دعائیں جو ہم نے بچپن میں سیکھی تھیں۔ پھر ایک اسکول جہاں میں نے چار سال ملازمت کی وہاں میں نے ایک بڑا خوشگوار

طریقہ دیکھا کہ صبح اسمبلی کے علاوہ وہاں اسکول جمع ہونے کے وقت پر یعنی آخری پیرزے میں بیل سے پانچ سات منٹ پہلے سب بچے کلاس ٹیچر کے ساتھ قرآن پاک سے لی گئی۔۔۔ دو دعائیں لازمی پڑھتے تھے اس کے بعد انہیں جانے کی اجازت ملتی تھی۔ چنانچہ چھوٹی جماعتوں سے لے کر بڑی کلاسوں تک تمام بچیوں کو یہ دعائیں رٹی ہوئی تھیں۔ مجھے یہ طریقہ بہت پسند آیا تھا۔

اب کہ جب میرے پاس یہ اختیار تھا تو میں نے نہ صرف ان میں سے ایک دعا چھٹی کے وقت سے پہلے لازمی کر دی۔ بلکہ اس کے علاوہ ہفتے میں ایک بار صبح اسمبلی میں، میں ایک چھوٹی سی دعا اپنے سب بچوں کو سناتی اور ساری ٹیچرز اور بچے یہ دعا دہراتے اور اسی طرح بہت کم دنوں میں ماشاء اللہ ان بچوں نے بہت سی چھوٹی، چھوٹی دعائیں سکھ لیں۔ ہمیں استاد اور والدین کی میٹنگز میں اس پرنسپل بیک بھی ملا کہ کس طرح بچوں نے دعائیں گھر میں پڑھیں۔۔۔۔۔ مثلاً سوتے ہوئے کھاتے ہوئے یا آیت الکرسی وغیرہ تو ماں باپ کو بھی یاد ہو گئیں اور ان کے بہن بھائیوں کو بھی۔۔۔۔۔

بریک کے وقت جو چالیس منٹ کی ہوتی تھی عموماً دو ٹیچرز کی گراؤنڈ میں ڈیوٹی ہوتی تھی، جیسے ہی بچے بریک کی بیل سننے انہیں باہر بھاگنے کی جلدی پڑتی۔۔۔۔۔ اب ہوتا یہ کہ سب اپنے اپنے کلاس ہاتھ میں پکڑے باہر کی طرف دوڑتے اس افراتفری میں کسی کے ہاتھ سے کچھ گرتا تو کوئی خود ہی گر جاتا حالانکہ روز کہا جاتا کہ آہستہ آہستہ لائن بنا کر ٹیکو میرا خیال ہے کہ کھیلنے کا وقت کم ہو جانے کی فکر میں روز ہی یہ بات بھول کر باہر کو دوڑ پڑتے۔۔۔۔۔ اب گراؤنڈ میں بھی یہی حال ہوتا، ایک ہاتھ سے منہ میں کھانا بھرا جا رہا ہے اور جلدی، جلدی حلق سے اٹا رہا

جا رہا ہے تو دوسرے سے گیند پھینکی جا رہی ہے۔ شور اتنا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ اسی افراتفری میں روز ہی کسی نہ کسی کو پہلے چوٹ لگتی، دو منٹ کی بھاگ دوڑ رک جاتی اور جو بچی ڈیوٹی پر موجود ٹیچرز اس بچے کو سنبھالتیں، چھوٹے بڑے ہر سائز کے طلباء پھر اپنے کھیل کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ جیسے ہی بریک ختم ہوتی، میں تقریباً روز ہی باہر جا کر خاموشی سے ایک طرف کھڑے ہو کر ٹیچرز کو اور مختلف جماعتوں کے بچوں کو دیکھتی تاکہ اگر کوئی چیز صحیح سے نہ ہو رہی ہو تو اگلے روز اسمبلی میں سب کو بتا سکوں۔

یہ بات بڑی دلچسپ تھی کہ جیسے ہی بچے کلاسوں میں جاتے، سارا گراؤنڈ مختلف قسم کے ریپرز، لفافوں، ڈبل روٹی کے ٹکڑوں اور چھوٹی موٹی کھانے پینے کی چیزوں سے پٹا پڑا ہوتا، دیکھتے ہی دیکھتے گودوں کے غول کے غول کاٹیں کرتے اٹھتے اور اڑھرتو اسکول کا جھدار تھیلیاں اور کاغذ سمیٹ رہا ہوتا دوسری طرف تمام مہمان کوٹے جلدی، جلدی چھوٹے سے چھوٹے کھانے کے ذرے تک بھی صاف کرتے اور کاٹیں، کاٹیں کرتے واپس آؤ جاتے۔ جیسے شکر یہ کر رہے ہوں۔

روز کا یہ معمول تھا اور میں چپکے، چپکے یہ منظر دیکھا کرتی۔

ایک دن کچھ ایسا ہوا کہ بڑے بچے بھاگتے بھاگتے چھوٹوں کی طرف چلے گئے اور اتفاقاً جو دو موٹے بچے ایک دوسرے سے ٹکرائے تو ایک منی سی ہٹی کی ان سے زور سے ٹکر لگی اور وہ بے چاری منہ کے بل زمین پر گر پڑی۔۔۔۔۔ اس کے گال پر ٹیل پڑ گیا اور گھٹنے چھلے سوا لگ اور وہ روئی بھی خوب۔۔۔۔۔ کیونکہ اسے تکلیف کے ساتھ ساتھ شاک بھی لگا تھا۔ خیر اس کی ٹیچر اسے بہلا پھسلا کر اندر لائیں اور فرسٹ ایڈ کے کمرے میں اس کے گال کی ٹھنڈی ٹکڑی لگائی گئی تب

کہیں جا کر اس کا رونا بند ہوا۔

اگلے دن ہی اس کے والدین میرے دفتر میں موجود تھے اور غصہ بھی کر رہے تھے کہ ایسا ہوا کیوں، خیر انہیں تو میں نے معذرت کر کے اور تسلی دینے کر بھیج دیا مگر خود سوچ میں پڑ گئی، خاصی سوچ بچار کے بعد ایک حل سمجھ میں آیا کہ ایک تو بڑے بچوں کا کسی بھی حالت میں چھوٹی کلاسوں والے حصے میں جانا بند ہو اور ان کی

تاریخیں متوجہ ہوں



کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

- ☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
- ☆ شہر اور علاقے کا نام۔
- ☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا سہايل فون نمبر

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ چلی کیشنز

سبس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

63-C 111 سٹیشن ڈسٹریکٹ اتھارٹی من کوئی روڈ، کوئی

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

کر چکے تھے۔ اپنی، اپنی دانست میں ہم زندگی کی بہت سی کامیابیاں حاصل کر چکے تھے اور کر رہے تھے مگر ہماری دوستی زیادہ کامیاب تھی۔

مول کا نوٹ زدہ لہجے میں بات کرنے کی

خاور

ستارہ ہو کر دل

سیا رضا ردا

ہماری دوستی کتابوں میں بسی خوشبو کے مانند تھی۔ اس کے ملنے والے اور میرے جاننے والے سب ہی کا دعویٰ تھا کہ مول اور نشاط کی دوستی بے مثال ہے اور یہ سچ ہی تو تھا کہ ہم تعلیمی مراحل طے

”بھئی کسی کو کوئی بات ناپسندیدہ تو نہیں لگی؟ کوئی اعتراض ہو تو بلا جھجک ابھی بتادیں تاکہ اس کا حل تلاش کیا جائے۔“ میں نے پھر بھی احتیاطاً پوچھا۔ ”میم کچھ ہیں ایسے جنہیں آپ کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا۔“ شذرہ ایک شریر سی استانی نے مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”اوہو..... یہ ضرور مسز فاروقی اور مسز جزار ہوں گی، ان دونوں کو کوئی نئی چیز دل سے قبول کرنے میں زیادہ وقت لگتا ہے خیر.....“ میں نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔

سب لوگ حیرت سے شذرہ کی طرف دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں..... ”وہ کون ہیں؟“ مجھ سے بھی رہا نہیں گیا فوراً پوچھا۔ ”شذرہ وہ کون ہیں؟“

”میڈم وہ کوئے...“ ایک دم سے جواب آیا۔ سب نے بے ساختہ ہنسا شروع کر دیا۔ اور میری نظروں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا۔ بچوں کے اندر جماعتوں میں جاتے ہی کوؤں کی ڈاریں حسب معمول اتریں مگر یہ کیا آج تو ان کے لیے کچھ کھانے کو تھا ہی نہیں..... (بھلا ہوا اس نئی پرنسپل کا) اس قدر کائیں، کائیں ہوئی کہ ہر ایک کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس احتجاج کا نوٹس لینا پڑا۔ مگر کسی کو یہ خیال اس وقت نہیں آیا تھا کہ آج یہ مہمان اس قدر برہم کیوں ہیں، اگلے دن پھر یہی ہوا، استانیاں بھی خوش نہیں بننے بھی خوش مگر کائیں، کائیں کے شور نے اچھی خاصی ایمر جنسی کا سماں پیش کر دیا۔

آج میں نے اپنے اسٹنٹ کو بلا کر ہدایت دی کہ ان کے لیے دانے کا بندوبست کروے اور حسب معمول وقت طعام... ان کا کھانا سرو کر دیا جائے کہ احتجاج کسی کا بھی ہو..... اس کا نوٹس لینا تو ضروری ہوتا ہے۔

ٹیچرز بھی اس بات کا خیال رکھیں۔ دوسرے تمام کلاسیں بریک کے پہلے دس.... منٹ کلاس رومز میں ہی کھانے وغیرہ سے فارغ ہو جائیں اور پھر قطار بنا کر باہر جائیں، اس صورت میں ایک تو کھانا تیز سے کھایا جاتا..... کوڑا بجے خود ڈسٹ بن میں ڈالتے..... دعا بھی پڑھ لیتے اور کھاتے ہوئے کھیلنے کی افرا تفری بھی نہ ہوتی..... ساری ٹیچرز کو میں نے پانچ منٹ کو اپنے دفتر میں بلایا اور اسپورٹس ٹیچر کو تمام کلاسوں کے راؤنڈ لگانے کا کہہ دیا۔ ٹیچرز کو بھی یہ تجویز خاصی اچھی لگی اور سب نے کہا کہ اس پر عمل ہونا چاہیے۔

اگلے دن ایسا ہی ہوا بریک کی گھنٹی بجی تو ایک دم سے افرا تفری کے بجائے خاموشی چھائی رہی..... ہر کلاس میں بچے جلدی جلدی کھانا ختم کرنے میں مصروف تھے۔ صبح آسبلی میں، میں اس بات کی اتانٹمنٹ کر چکی تھی اور ٹیچرز نے بھی اپنی اپنی کلاسوں میں بچوں کو سمجھایا تھا۔ دس منٹ کے بعد سب طلبا چھوٹے بڑے، باہر نکلنا شروع ہوئے، آج ہر ایک کو یوں لگتا تھا کہ جیسے کھیل کا وقت کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہو، وقت مقررہ پر سب اپنی، اپنی کلاسوں میں آئے اور پڑھائی شروع ہو گئی۔

میں نے صبح ہی سب جماعتوں میں نوٹس بھیج دیا تھا کہ تمام ٹیچرز چھٹی کی گھنٹی کے فوراً بعد صرف دس منٹ کے لیے میرے دفتر میں آجائیں تاکہ میں فیڈ بیک لے سکوں۔ سب استانیاں میرے کمرے میں پہنچی کچھ کو جانے کی جلدی تھی مگر آنا بھی ضروری تھا اور کم عمر ٹیچرز تو ہنستی کھلکھلاتی، باتیں کرتی موجود تھیں، میں نے سب پر ایک نظر ڈالی۔

”ہاں بھی تو کیسا رہا آج کا نیا تجربہ.....؟“

”کافی اچھا۔“ ہر طرف سے یہی جواب آیا۔

”تو پھر آپ لوگوں کا کیا مشورہ ہے اسے مستقل کر دیں؟“ بعض سینئر ٹیچرز نے صا د کہا اور کہا ”ضرور.....“



ستارہ ہو کہ دل

کو اگر میں لکھنے بیٹھوں تو یہ کہانی دوستی سے زیادہ احسان مندی کے گرد گھومنے لگے گی۔

☆☆☆

وہ اصول پسند تھی مگر جانے کیوں جو لوگ خود اصول پسند ہوتے ہیں دوسروں کے اصول کیوں ان کی نظروں میں نیچے ہوتے ہیں؟ ہر انسان کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ وہ اسے جس طرح چاہے گزارے مگر یہ بات شاید مول یزدانی کے اصول کے خلاف تھی۔ وہ مجھے اکثر ہی اپنے انڈسٹریل ہوم اور بوتیک پر لے جایا کرتی تھی بھول اس کے... پپانے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اسے اس بات کی اجازت دی ہے۔ مول کو بیٹ ورک، فینسی ورک، انٹیریئر ڈیکوریشن کے علاوہ تمام جتنے بھی بنیادی کورسز تھے ان سب پر عبور حاصل تھا۔ وہ بہت اچھی ڈیزائنر بھی تھی مگر اب یہ تھا کہ وہ ان بکھیروں میں خود نہیں بڑتی تھی۔ اپنے انڈسٹریل ہوم کے لیے اس نے بارہ لڑکیوں پر مشتمل اسٹاف رکھا ہوا تھا۔ انڈسٹریل ہوم کو مول نے بڑی محنت سے ڈیکوریٹ کیا تھا۔ ہر شے ایک منظم طریقے سے سیٹ تھی۔ اسی طرح اس کا بوتیک بھی جدید فیشن کے ملبوسات سے آراستہ تھا یہاں بھی اس نے تین لڑکیاں رکھی ہوئی تھیں اور خود باہر کی... بھاگ دوڑ کرتی، اچھی ڈریس ڈیزائنر تھی اس لیے نت نئی تبدیلیاں لاتی رہتی۔ یونیورسٹی میں کلاسز کم اینڈ کیا کرتی۔

”چلو نشاط ذرا ماسٹر صاحب کی خبر لوں کہ ڈریس سلے یا نہیں۔ بوتیک پر اس دفعہ تو ماسٹر صاحب نے بہت دن لگا دیے۔ ان کے مزاج بھی ٹھیک کرنا پڑیں گے اتنی مشکل سے ڈیزائن ان کو سمجھایا تھا کہیں بگاڑ ہی نہ بیٹھے ہوں۔“ مجھے اس کے ساتھ جانا پڑتا۔ وہ ماسٹر جی کی خبر لیتی تب تک میں مشینوں میں لگے کپڑے اور اپنے کام میں مشغول کارنگروں کو دیکھتی رہتی۔

اور مشاعرہ کوئی جلدی ختم ہو گا؟“ میں رات کے بڑھتے سائے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی تو وہ مزے سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے بجائے جواب دینے کے زہر خند سے انداز میں مسکرا کر ایک رکشے کی جانب اشارہ کرتی بھاگتے ہوئے رکشے کی پشت پر لکھا تھا۔

”خند میری ادا ٹھہری!“

یوں وہ اکثر ہی ای، ابو سے کہہ کر مجھے زبردستی ہر جگہ اپنے ساتھ لے جایا کرتی۔ کسی کی بات سے زیادہ اس کی بات اہم ہوا کرتی اور مزے کی بات تو یہ تھی کہ وہ اپنی بات منوا بھی لیا کرتی تھی۔

نفسیات میں میرے نمبر بے حد کم آئے تھے تقریباً سی گریڈ۔ سرائیاز مارکس دینے کے معاملے میں بے حد کجحواس تھے مگر میں روہاسی ہوئی جا رہی تھی کیونکہ باقی سبیکٹ میں میرے نمبر اچھے تھے اور اس سے میری فرسٹ کلاس میں فرق پڑ سکتا تھا۔

”دونوں سمسٹرز میں سرائیاز نے میرے ساتھ امتیازی سلوک ہی کیا، میری پرستش بالکل گر گئی ہے۔“ میں پریشانی میں مبتلا تھی اور بار بار یہی گردان تھی۔

”فکر نہ کرو تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ مول بڑے غیر معمولی انداز میں بولی۔

”وہ کیسے؟“ میں حیران ہوئی کیونکہ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ سرائیاز سب کو ایک ہی چھٹری سے ہانکتے تھے مگر یہ چھٹری مول نے ایسی بدلی کہ سرائیاز نے دوبارہ میری کا پیاں چیک کیں اور نتیجہ اچھا ہاں میری فرسٹ کلاس میری منتظر تھی۔ آخر سرائیاز کی سب سے چھوٹی بیٹی مول کے اسکول میں زیر تعلیم تھی یہ دلیل کم تو نہ تھی۔

مول کے پپا کا اسکول تھا اور شہر کے معروف ترین اسکولوں میں اس کا شمار تھا۔ سو سرائیاز کے اصولوں میں پچ تو آتی ہی تھی۔ یہی نہیں کم و بیش اس نے میرے ساتھ ایسے بہت سے احسان کیے جن

عزیز تھی اور وہ میری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال کچھ اس طرح رکھتی تھی کہ مجھے اکثر اس پر پیار آ جاتا۔ وہ مجھے اپنے سے بے حد قریب لگا کرتی۔

☆☆☆

ہم صرف دو ہی بہنیں تھیں۔ فرزانہ باجی مجھ سے بڑی تھیں۔ امی، ابو نے ان کی مگنی ہمارے پاپا زاو بھائی شاکر سے طے کر دی تھی۔ وہ مقامی کالج میں لکچرار تھے۔ بے حد نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ میں اپنے امی، ابو کی بہت لاڈلی تھی۔ میرا صرف یہی شوق تھا کہ میں تعلیم حاصل کروں سو ابو نے میرے شوق کو دیکھتے ہوئے بخوشی اجازت دے دی تھی۔ ہمارے گھر میں اللہ کا کرم تھا کہ ہر طرح سے خوش حالی تھی۔ ابو ایک بہت اچھی انٹرنیشنل فرم میں ایجنے عہدے پر فائز تھے۔ پُرکشش تنخواہ تھی اور ہمیں کیا چاہیے تھا۔

میں کمپلیکس زدہ لڑکی نہ تھی اور نہ کوئی احساس محرومی میرے اندر چل رہا تھا۔ خوشگوار حالات نے میری طبیعت میں انکساری، نرمی، ہمدردی اور محبت جیسے مثبت اوصاف پروان چڑھائے تھے مگر مول سے دوستی کے ساتھ رفتہ رفتہ مجھ پر یہ احساس غالب آتا جا رہا تھا کہ اس نے مجھے کچھ اس طرح رکھا ہوا ہے کہ میری اپنی حیثیت ختم ہو کر رہ گئی ہے حالانکہ وہ ایک آزاد طبع لڑکی تھی۔ نزاکت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں ہٹ دھرمی یعنی اپنی غلط بات پر بھی ڈٹ جانے کی عادت تھی۔ وہ مجھے دوست سے زیادہ حاکم لگا کرتی۔ کبھی کبھی تو میں اسے باتوں، باتوں میں کہہ بھی دیا کرتی۔

”مول کبھی دوست بن کر بھی بات کر لیا کرو۔۔۔ یہ کیا، جب دیکھو محکمہ انداز اپنا سے رہتی ہو۔ ہر بات میں ضد، دوسرے کی مرضی تمہارے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اب بتاؤ آرٹس کونسل جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اتنی رات ہو جائے گی

عادی تھی۔ ہم دونوں کی دوستی کی بنیاد کالج سے پڑی تھی۔ ایک ہی کالج سے ہم نے پڑھا۔ نفسیات میں ایم اے کرنا میرا تو شوق تھا ہی۔۔۔ مول کا بھی جنون تھا۔ شناسائی کا یہ لمحہ گہرا ہوتا گیا اور ہماری دوستی بھی گہری ہوتی چلی گئی۔ مول شاعرانہ مزاج کی حامل پر ایک کھروری لڑکی تھی۔ کھروری میں نے اس لیے کہا کہ اس کی ذات کا کھر دراپن تین چار ملاقاتوں میں ہی ظاہر ہو جاتا تھا۔ وہ کسی سے بھی بہت بے تکلف انداز میں بات کرنے کی روادار نہیں تھی۔ آج اس نے اگر کسی سے ہنس کر بات کر لی تو اگلے دن وہ اسی سے بے رخی کے ساتھ پیش آئے گی۔ اگر اس کے پاس وقت نہیں ہے تو وہ صاف کہہ دے گی اپنی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہ اس وقت تو ہم لائبریری جا رہے ہیں۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر لائبریری چل دیتی۔

”اب بتاؤ امتحان سر پر ہیں اور یہ ہمیں اپنے بھائی کی شادی کی الیم دکھانے لائی ہیں۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی چلنے لگتی۔

”لیکن مول! تم نے ہی تو وعدہ کیا تھا آج دیکھیں گے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”خیر اس وقت تو ہم فارغ تھے مگر آج ڈاکٹر یزدانی نے جو لکچر دیا ہے لائبریری میں اس موضوع سے متعلق شاذ و نادر ہی کتابیں ہیں اور مجھے ہر صورت آج ہی اس پر نوٹس بنانے ہیں۔“ نوٹس بنانے ضروری تھے یا نہیں مگر یہ طے تھا کہ اس کا موڈ نہیں تھا اور جب موڈ نہ ہو تو وہ کسی کے بھی احساسات سے قطع نظر اپنی مرضی کیا کرتی تھی۔ رہ گئی میں یعنی نشاط پرویز تو میں اسے اچھی طرح انڈرائسٹنڈ کرتی تھی اور ہماری باہم دوستی کا ایک بڑا راز یہ بھی تھا کہ میں اسے جانتی تھی مگر کبھی کبھی نہ جانے کیوں۔۔۔ ہماری اس دوستی میں مول ہمیشہ بالا دست رہتی تھی اور اس کی یہ بالادستی مجھے اکثر گراں بھی گزرتی۔۔۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مجھے بے حد

رسول اکرم ﷺ کے فرمان

☆ جب مانگو تو خدا سے مانگو اور جب مدد چاہو تو اللہ سے مانگو۔

☆ انصاف کی گھڑی برسوں کی عبادت سے بہتر ہے۔

☆ جو بات تم کو شک میں ڈالے وہ چھوڑ دو۔
☆ جہنمی لوگ، خود پسند، خود پرست، متکبر، ترسین اور بخیل ہوتے ہیں۔

☆ جس نے میری قبر کی زیارت کی، اس پر میری شفاعت واجب ہوگئی۔

☆ جو چپ رہا اس نے نجات پائی۔
☆ جس برتن کو ڈھکا نہ گیا ہو، اس کا پانی

مست ہو۔

☆ دعا عبادت کی جان ہے۔
☆ جو لوگ اندھیروں میں مسجدوں کی طرف جاتے ہیں انہیں قیامت کے دن نور کی خوش خبری سنا دو۔

☆ سچ بولو خواہ کسی کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو۔
☆ حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔

☆ چغل خور جنت میں داخل نہ ہوگا۔
☆ ہر گناہ کی توبہ ہے مگر بد اخلاقی کی نہیں۔

☆ میوے دار درخت لگانا صدقہ جاریہ ہے۔
☆ مسلسل منور شہزادی، گوجرانوالہ

تیزی سے بولی۔

”تو اپنے بوتیک پر بلا لو۔“

”نہیں، یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔“ عجیب منطق تھی

اس کی۔

”بھئی تم کہیں بھی مل لو۔“

”کہاں ملوں؟“

”اچھا چھوڑو، ضرورت کیا ہے بلانے

کی؟“ میں نے زچ ہو کر کہا۔

”نہیں، میں وعدہ کر چکی ہوں اور جو میں کہتی

ہوں وہ کر کے رہتی ہوں خواہ کچھ بھی ہو۔“ وہ ہٹ

دھری سے بولی۔ ”کیونکہ وہ مصر ہے ملنے پر اور

مسلل انکار میں نہیں کر سکتی اور..... اور یہ کہ میں نے

سوچ لیا ہے کہ اسے کہاں بلانا ہے۔“

”کہاں بلانا ہے؟“

”تمہارے گھر پر۔“ وہ بھرپور سنجیدگی سے بولی۔

”کیا..... تم ٹھیک تو ہو؟“ مجھے اس کی دماغی

حالت پر شبہ سا ہوا۔ ”ایک اجنبی شخص کو جسے میں

جاننے نہیں اور پھر ابو، امی، فرزانہ باجی، یہ سب کیا

کہیں گے۔ ہرگز نہیں یہ اچھی بات نہیں ہے۔

مول تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ امی کیا سوچیں گی۔“ میں

رد بانسی سی ہو کر بولی۔ ”اور میں کیا کہوں گی کہ وہ

کون ہے؟“

”اُفہ..... کچھ نہیں ہوگا، تمہیں پریشان ہونے

کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آنٹی، انکل کو منانا میری

فُتے داری ہے۔“ وہ رمان سے بولی اور آفاق احمد

پر یہ بات ختم کر کے موضوع بدل دیا۔

عجیب سی بات تھی آخر وہ اپنے گھر کیوں نہیں

بلانا چاہتی تھی آفاق احمد کو..... وہ اپنے فیصلوں میں

آزاد تھی جہاں تک میرا خیال تھا۔ اس کے والدین کو

بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا کیونکہ بقول مول سب

کی اپنی، اپنی زندگی ہے پھر اس کے والد نے تو ویسے

بھی ایک شادی اور کر رکھی تھی۔ شاید اسی سبب اس کو

ذرا سی بھی کوتاہی برداشت نہیں کرتی تھی۔ اس کا

اسٹاف اس کے لہجے کی سختی سے خوف کھاتا تھا۔ وہ ذرا

سی بے ترتیبی پر اسٹاف بدلنے کی قائل تھی۔ کسی کی خطا

بہت کم معاف کیا کرتی تھی۔ وہ دلوں پر حکمرانی کے

فن سے نا آشنا بس ظاہری حکمرانی کرنا جانتی تھی۔

”تمہیں معلوم ہے نشاط، آفاق کا آج پھر فون آیا

تھا۔“ مول مجھے آفاق کے بارے میں بتانے لگی۔

ابھی کچھ دنوں پہلے ہی اس کی اور مول کی دوستی

ہوئی تھی وہ بھی ٹیلی فون پر۔ آفاق نے اتفاقاً کوئی

نمبر ڈائل کیا ہوگا مگر وہ نمبر مول کے نمبر سے ٹکرا گیا

اور یوں ایک رانگ نمبر نے دونوں کے بیچ دوستی کی

راہ ہموار کر دی۔ یہ مجھے مول نے بتایا تھا۔ بقول

مول ”اسس کے اور میرے مزاجوں میں گہری ہم

آہنگی ہے۔ اس کا مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ بولتا ہی چلا

جاتا ہے۔ وہ بے حد خوب صورت لہجے کا مالک ہے۔“

اور خوب صورت لہجہ مول کی کمزوری تھا اور جہاں

تک میرا خیال تھا آفاق کی خوب صورت آواز بھی

اسے متاثر کر گئی تھی۔ چار مہینے تو ہو ہی گئے تھے انہیں

فون پر باتیں کرتے ہوئے۔

”ہاں تو پھر؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی مطالبہ کہ کسی طرح آپ مجھ سے

مل لیں۔“

”تو پھر تم نے کیا سوچا؟“ میں نے اس کی

طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں معلوم ہے میں کس قسم کی..... لڑکی

ہوں۔ میں نے اسے ملنے سے منع تو نہیں کیا کیونکہ

میں میچور ہوں اس لیے اس میں مجھے کوئی برائی نظر نہیں آتی۔

ہاں مگر یہ بے کہیں کسی ریسٹورنٹ میں ملنا نہیں چاہتی۔“

وہ پرموج انداز میں بولی۔

”تو قباحت کیا ہے باہر نہیں تو گھر میں سہی، مگر

بلاوا سے۔“ میں نے کہا۔

”اپنے گھر میں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ

ایسے ہی ایک دن جب مجھے مول کے ساتھ

جانا پڑا تو میں اسی طرح بکھرے کپڑوں کے گرو.....

بے انتہا سوچوں میں مصروف تھی کہ مول کی تیز آواز پر

چوکی جو ماسٹر جی پر بری طرح گرج رہی تھی۔

”جب میں نے آپ کو منع کیا تھا کہ“ لینا

بوتیک“ کے کپڑے آپ نہیں لیں گے تو پھر آپ ہر

دفعہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس طرح میرے

لبوسات کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے کپڑوں کی سلائی

بھی ڈھیلی ہوتی ہے۔ کالر دیکھ رہے ہیں آپ، میں

نے اس طرح کہا تھا کیا؟ یہ آپ کی بے حد.....

بے پروائی ہے میں آپ کو منہ مانگا معاوضہ دیتی ہوں۔

میرے یہ ڈریس باہر بھی جاتے ہیں۔ اگر آپ کی

یہی بے نیازی رہی تو مجھے پھر کوئی دوسرا انتظام کرنا

پڑے گا۔“ مول بے حد طیش کے عالم میں بولی۔

”دیکھیں جی ہمیں بھی بہت کچھ دیکھنا پڑتا

ہے۔ کارنگروں کو بھی دینا پڑتا ہے۔ ہمیں پورا نہیں

پڑتا۔ اس لیے ہم آپ کے علاوہ دوسروں کو بھی

مایوس نہیں کرتے..... یہ تو ٹھیک بات نہیں ہے کہ ہم

صرف آپ ہی کے کپڑے سیا کریں۔ ہاں البتہ

دوسری غلطیوں کی میں معافی چاہتا ہوں۔“ ماسٹر نے

بہت سلیقے سے اپنی بات کی۔

”نہیں ماسٹر جی، میں اپنی کسی بھی چیز پر پوری

توجہ چاہتی ہوں۔ یہ میں نے آپ سے پہلے ہی روز

کہہ دیا تھا اور میرا معاوضہ بھی آپ جانتے ہیں لہذا

آپ کی اگر مجبوری ہے تو پھر میرا بھی اپنا اصول ہے،

آپ میرا کام پوری ٹیکسوٹی سے نہیں کر سکتے تو کوئی

بات نہیں میں کوئی دوسرا انتظام کر لوں گی۔“

”دیکھیں جی آپ۔“ ماسٹر جی گڑبڑا کر بولے

مگر وہ سختی سے اپنی بات مکمل کر کے مجھے لے کر

آگے بڑھ چکی تھی اور پھر پیسہ پھینک کر تماشا دیکھ اسٹلے

ہی دن اس نے اشتہار دے دیا اور پھر جلد ہی اسے نیا

درزی مل گیا۔ اس کے اصولوں پر ہاں کہنے والا۔ وہ

اس درجہ آزادی ملی ہوئی تھی بہر حال یہ میری سوچ

کے بارے میں پوچھا۔
 ”بظاہر تو بہت اچھی لگی مگر تمہیں معلوم ہے کہ لوگوں کے بارے میں میرا مطالعہ کتنا وسیع ہے اس لیے رائے قائم کرنے میں دیر تو لگتی ہے مگر ہم میں زیادہ باتیں اشارے کے بارے میں ہوتی رہیں۔ میں تو ہوں ہی لبر اور موصوف بھی لبر ہیں اور یہ بات ذرا کچھ جھپتی ہے کہ وہ میرے ہم رنگ اشار ہیں۔ خیر زندگی میں تھری ضروری ہے یہ ملاقات ادھوری سہی مگر جاندار تھی۔“
 اور پھر دو دن بعد مول بھی لندن چلی گئی، ہر سال کی طرح۔ اپنے انگل کے پاس جن کا وہ اکثر تذکرہ کرتی تھی۔ وہ واپسی پر میرے لیے ڈھیروں تحائف لائی۔

☆☆☆

وقت کچھ آگے سرکا تو مول اور آفاق کی دوستی اور آگے بڑھی اور بڑھتے بڑھتے ختم بھی ہو گئی۔ آفاق، مول سے شادی کا خواہش مند تھا مگر مول کو اس کی بہت سی باتوں پر اعتراض تھا۔ مول کو چہرہ شناسی اور ستاروں کے علم پر کافی عبور تھا اس کی باتوں کے حوالے میں تجربے کا پھول نہیں بلکہ ان دونوں کے علم کا پھول تھا مگر اسے آفاق کے اشار پر اعتراض تھا کہ لبر امر زندگی بھر تعریف و توصیف کے خواہش مند رہتے ہیں اور چاہے جانے کے عمل کی توقع دوسروں سے رکھتے ہیں۔ مول نے بتایا ”جتنا گریس فل وہ نظر آتا ہے، باتوں اور کردار میں بالکل نہیں ہے۔ وہ اپنے گھر کی چھوٹی سی چھوٹی بات مجھے یوں بتاتا ہے جیسے میں اس کی والدہ ہوں اور خصوصاً مردوں میں مجھے یہ خوبی اچھی نہیں لگتی“ بہر حال مول نے اسے آزمایا اور بہ آسانی اپنا راستہ بدل بھی لیا یہ کہہ کر کہ ”ہم زندگی کے سفر میں ایک دوسرے کے لیے موزوں نہیں ہیں۔“ اور یوں آفاق احمد کسی لائبریری میں رکھی ان کتابوں کی طرح ہو گیا جو کسی کام کی نہیں

”کیا مطلب؟“
 ”ارے یہی کہ چلے گئے بھی اور وہ جانے کے لیے تو آئے تھے۔“ وہ کمال اطمینان سے بولی۔
 ”تو کیا مطلب؟“ تم نے ان سے بات نہیں کی؟“
 ”کیوں؟ بات کیوں نہیں کی۔“
 ”مگر اتنی سی دیر میں کیا بات ہوئی ہوگی؟“
 ”ارے واہ، میرے ہاتھ میں گھڑی بندھی ہے غلط بیگم۔ بس جہاں میں منٹ پورے ہوئے میں نے کہا اب آپ جا سکتے ہیں کیونکہ اتنی ہی میری کمینٹ تھی۔“
 ”تو وہ چلے گئے؟“ میں اس کی بد اخلاقی پر برا مان گئی۔

”ہاں ظاہر ہے مگر تم کس فکر میں غلط ہو؟“ وہ چڑ کر بولی۔
 ”کسی فکر میں نہیں مگر مول بی بی کچھ اخلاقی تھانے بھی ہوتے ہیں۔ وہ شخص ہمارے گھر مہمان تھا اور تم نے اسے ایسے ہی جانے دیا۔ اب یہ کون سی گا؟“ میں نے ٹرے میں رکھی کولڈ ڈرنکس کی طرف اشارہ کیا۔

”افو یہ کوئی غیر اخلاقی بات نہیں ہوئی اسے ہم میں گے اور کون ہے گا۔“ وہ ڈھٹائی سے بولی۔
 ”بہر حال مجھے یہ اچھا نہیں لگا کوئی ہمارے گھر آیا اور ایسے ہی چلا گیا۔ تم فون پر ان سے معذرت کر لیتا۔“ میں اپنی دھن میں بولی۔
 ”خبردار جو تم نے معذرت کا نام لیا۔ معذرت کی اس میں کیا ضرورت پیش آگئی۔ بس ملنا مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔“ وہ دوسرا گلاس بھی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”اور ویسے بھی آج رات کی فلائٹ سے وہ جرمنی جا رہا ہے سو اس لیے ملاقات ضروری تھی بس اور پھر پرسوں میری بھی فلائٹ ہے۔“
 ”روبرو گفتگو کیسی لگی؟“ میں نے آفاق احمد

بھٹک نہ جائیں۔
 ”جی نہیں، بڑا سمجھ دار آدمی ہے بہت اچھی طرح یہاں کی لوکیشن کو سمجھ چکا ہے۔ بھٹکنے کی تم نے خوب کئی۔“
 ہاں واقعی میں نے خوب کئی اور تب ہی گیارہ چالیس پر دروازے پر بیل بجی اور میں، امی اور فرزانہ باجی کے اٹھنے سے پیشتر ہی گیٹ پر موجود تھی۔ میں نے گیٹ کھولا تو سامنے ایک بے حد ہینڈسم سا شخص کھڑا تھا۔ اس نے بے حد شائستہ انداز میں پہلے سلام کیا اور پھر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔
 ”آپ مول؟“

”نہیں جی۔“ میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ اندر ہیں۔ آئیں آپ تشریف لے آئیں۔“ میری رہنمائی میں وہ اندر چلا آیا۔
 ”یہ ہیں مول۔“ اس کی نگاہ مول پر پڑی اور میں ان دونوں کے پاس ذرا ہی دیر بیٹھی اور ایک سیکیورز کر کے چلی آئی کیونکہ مجھے وہاں رکنا مناسب نہیں لگا تھا۔
 امی کو یہ معلوم تھا کہ یہ مول کے کزن ہیں اور کسی تعلق سے کی بنا پر ان کا مول کے گھر آنا جانا بند ہے سو مول نے ہم پر اعتماد کرتے ہوئے انہیں یہاں بلا لیا ہے۔

فرزانہ باجی مجھ سے پوچھتی رہیں کہ کیسے ہیں، کیا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ ان کے۔۔۔ سوالوں کے جواب دیتے، دیتے کافی وقت گزر گیا اور جب میں آفاق احمد کے اعزاز میں مہمانداری نبھاتے ہوئے مشروب لے کر پہنچی تو کمرے میں سوائے مول کے کوئی نہیں تھا۔ جو بڑے آرام سے صوفے پر گردن اونچی کیے بیٹھی تھی۔

”ہائیں، یہ تمہارے آفاق احمد کہاں چلے گئے؟“ میں نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔
 ”گئے جہاں انہیں جانا تھا۔“

نے بتانے سے گریز کیا کیونکہ بارہا اس کی گفتگو سے یہ عندیہ ضرور ملتا تھا کہ ہمدردی جتانے والوں سے اسے سخت نفرت ہے۔
 اس کو کیا دکھ تھے، کیا رنج تھے؟ اس نے آج تک مجھ سے معمولی سی بات بھی شیر نہیں کی تھی۔ اور ایک میں تھی کہ اگر فرزانہ باجی یا امی نے ذرا سا مجھے ڈانٹ بھی دیا ہوتا تو وہ بھی مول کو بتاتی مگر میرے سامنے اس کے گھر کے معاملات ہمیشہ پوشیدہ رہے۔

☆☆☆

آفاق احمد کے سلسلے میں جب میں نے فرزانہ باجی کو بتایا اور یہ بھی کہ وہ آفاق احمد کو یہاں بلانا چاہتی ہے تو فرزانہ باجی نے کہا۔
 ”تم کیوں فکر کرتی ہو جبکہ بقول اس کے وہ امی ابو سے بات کر لے گی۔“ اور پھر واقعی میرے پریشان ہونے سے کچھ بھی نہ ہوا۔ مول نے نہ صرف ابو سے کمال اعتماد سے بات کی بلکہ حد تو یہ کہ ابو مان گئے اور امی کو بھی اس نے نہ جانے کن دلیلوں سے قائل کر ہی لیا۔

اور ایک عام سے دن جب ابو آفس گئے ہوئے تھے۔ مول اور میں نے یونیورسٹی کی چھٹی کی ہوئی تھی۔ امی کچن میں مصروف تھیں اور فرزانہ باجی ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ مول گھر پر آئی ہوئی تھی۔ سادہ سے گرے اور ریڈ کائن کے سوٹ میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی شخصیت مزید با اعتماد اور پرکشش لگ رہی تھی۔ ہم دونوں اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور ساتھ آفاق احمد کا انتظار بھی۔ جنہوں نے ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے آنے کو کہا تھا اور مول نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ وہ صرف آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔

”مول تم نے گھر کا ایڈریس تو اچھی طرح سمجھا دیا تھا نا؟“ گھڑی کی سوئی گیارہ تیس کی طرف روانہ تھی اور مجھے تشویش ہو رہی تھی کہ موصوف

آیا ہے حالانکہ خلقت وہاں تک بھی پہنچ گئی ہے مگر چھو کوئی نہ سکا۔" وہ مایوسی سے بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میرادل چاہتا تھا کہ میں اس بے حس لڑکی کو جھنجھوڑا لوں۔ اس پیارے سے شخص کی خاطر خوب لڑوں اور میں اس سے لڑ بھی پڑی مگر اس آسمان، زمین کے درمیان معلق لڑکی کی باتیں سن کر ایک لمحے کو تو مجھے اپنی اور اس کی دوستی پر شک ہوا کہ آخر اس نے مجھ سے دوستی کس بنیاد پر استوار کی ہوئی ہے۔

"پہلی بات تو یہ ہے نشاط کہ مجھے اتنی شدت کی محبت پسند نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے محبت کرنا میری چڑ بنالی ہے، مجھے نہیں اچھا لگتا، وہ اتنی بھاگتی، دوڑتی، تیز دنیا میں وہ پرانے عاشقوں کی طرح میرے لیے آہیں بھرتا ہے۔ وہ قطعاً پریکٹیکل نہیں ہے۔ اس کی باتیں، حرکتیں بس وہ لفظوں کا کھلاڑی ہے اور تمہیں خبر ہے اس کا اشارہ اسد ہے ایسے لوگوں کو میں اچھی طرح سمجھ لیتی ہوں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"کیسے؟" میں اس کی عجیب و غریب منطق پر حیران ہوتے ہوئے پوچھنے لگی حالانکہ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ نفسیات اس کا Pet مضمون ہے۔ لوگوں کے بارے میں اس کی رائے بڑی پختہ ہوتی تھی البتہ ستاروں کے علم سے اس کی گہری دلچسپی اور شوق مجھ سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ اس کے پاس اس علم پر ڈیل کار نیگی جیسے بڑے بڑے مصنفین کی کتابیں موجود تھیں۔ اس کی ستارہ شناسی پر گہری نظر تھی۔

سرکمال کے پیریڈ میں ایک بحث چھڑی تھی اور مول سبقت لے جاتی ہمیشہ کی طرح..... یہ تو طے تھا کہ اسے اشارہ کا اس قدر کر بڑھا کہ ہر اشارہ پر وہ کم از کم چار گھنٹے سے زیادہ بول سکتی تھی۔ خیر اسے کسی بھی چیز کو جاننے کا دعویٰ تھا اور اپنے اس دعوے کو وہ ہمیشہ ثابت کر دیتی تھی۔ جیسے اس وقت ثاقب رحمانی کے اشارہ کو چیلنج کر رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے، اس اشارہ کے لوگ شاہانہ

جذبات ہی نہیں اور ضرورت بھی کیا ہے ثاقب رحمانی کو اس فضول سی لڑکی کے ساتھ دماغ کھپانے کی۔ محبت تو اس کی چڑ لگتی ہے۔

☆☆☆

"کیا حال ہے نشاط بی بی آپ کے؟" میں لاہریری کے کونے میں کئی اپنا ٹھینس مکمل کرنے میں مصروف تھی۔ آج مول میرے ساتھ نہیں تھی تب ہی ثاقب رحمانی میری طرف چلا آیا۔

"بینیس۔" میں نے کہا۔

"وہ کہاں ہیں آج؟" وہ متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"موصوفہ کا نام کیوں نہیں لیتے؟" حالانکہ مجھے علم تھا وہ اس کو ہمیشہ ہی وہ، آپ، جناب جیسے لفظوں سے مخاطب کرتا تھا مگر پھر بھی مجھے الجھن ہوتی۔ "کیا ڈرتے ہیں مول سے یا اس کے رعب حسن سے مرعوب ہیں؟" میں خود ہی جواب دیے جا رہی تھی تب ہی ثاقب رحمانی نے بے اختیار کہا۔

"وہ موم نہیں ہے مول ہے اور موم تو نرم ہوتی ہے ملائم ہوتی ہے مول پتا نہیں کیا ہے؟ اگر وہ موم ہوتی تو پکھل گئی ہوتی مگر نہ جانے یہ کیسی پتھر دل ہے، وہ مجھے روز زخمی کرتی ہے اپنے لہجے سے۔ تم ہی بتاؤ میں کس طرح اسے اس کے نام سے پکاروں۔ اگر نام لینے پر بھی اس نے دفعہ لگا دی تو پھر؟" زخمی لہجے میں کہتے، کہتے ثاقب آخر میں مسکرا دیا۔

"نہیں ثاقب اگر تمہارا جذبہ سچا ہے تو اس سنگ دل پر ضرور اثر ہوگا۔" میں نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ گئی۔ "انشاء اللہ سب صحیح ہو جائے گا آخر کب تک وہ تمہاری محبت سے دامن بچا سکے گی۔" تب وہ بولا۔

"سب کچھ ایسے ہی ہو جائے، جب ہے ناں چاند میری کھڑکی میں آجائے تب ہے ناں آپ کے دلا سے بیکار ہیں نشاط۔ بس چاند کا نظارہ دور سے ہی بھلا لگتا ہے۔ چاند کسی کے ہاتھ کب

تھا۔ کمپرنگ کرتے وقت کلاس کے ہر لڑکے، لڑکی پر اس کے ریمارکس اتنے سچے اور مزے کے تھے کہ سب ہی ہنس، ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔ تب ہی اس کی نگاہ انتخاب مول پر پڑی۔

اس کی مول سے دلچسپی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ پہلے تو اس نے ہلکے پھلکے انداز میں مول کی بہت سی عادتوں پر ریمارکس دیے جس سے سب ہی محظوظ ہوئے مول اپنے انداز میں مطمئن سی پروگرام دیکھتی رہی مگر اچانک ہی نہ جانے کیا ہوا ثاقب رحمانی بے اختیار مول کی انارپستی پر بول اٹھا۔

اسے خبر ہے ہم اس پر جان دیتے ہیں انا پرست ہے اظہار روبرو چاہیے ثاقب شرارتی ہے یہ سمجھ کر سارے کلاس فیلو ہی انجوائے کر رہے تھے مگر کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ وہ باتوں، باتوں میں ہی دل کا حال کہہ جاتا ہے اور اس وقت بھی اس نے موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس کی محبت میں اتنی شدت تھی کہ اس کی آج سے مول کو وحشت ہوتی تھی اور وہ اس سے کتراتے پھرتی تھی مگر اس لمحے تو مول کو جانے کیا ہوا تھا کہ وہ اپنی سیٹ سے اٹھی اور "چلو نشاط" کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

میں عجیب گوگوسی کیفیت اور جھج، جھج سی پہلے تو کھڑی رہی۔ میری نگاہ بے اختیار ہی ثاقب رحمانی کی طرف اٹھ گئی۔ جس کی نظریں مول کا تعاقب کر رہی تھیں۔ کیا کچھ نہیں تھا اس کی آنکھوں میں، زخمی سے لہجے میں بولا۔

"ارے آپ کیوں رک گئیں؟ جائیں تیزی سے جائیں ورنہ غصہ بھٹتے دیر نہیں لگتی۔" بظاہر اس نے ہنستے ہوئے بات ختم کی مگر مجھے نہ جانے کیوں مول کے پیچھے جاتے ہوئے اس پر غصہ آئے جا رہا تھا جو ثاقب رحمانی کی محبت سے انکاری ہے پھر مجھے ایک دم ثاقب رحمانی پر غصہ آنے لگا۔ جس نے محبت کی بھی تو اس بے حس لڑکی سے جس کے پاس

ہوتیں مگر وقت پر سب کے ہی کام آتی ہیں۔ آزمائش کے اس سفر میں مول وجاہت یزدانی کے آزمانے کا ہنر بہت سوں پر چلا مگر ہر ایک کو اس نے اپنے تجربوں کی نذر کر دیا۔ دوسرے معنوں میں رو کر دیا۔ ہر سال کی طرح وہ اس سال بھی جب لندن جانے لگی اپنے اٹکل کے پاس تو ہر دفعہ کی طرح اس نے مجھ سے پوچھا۔

"اس بار کیا لاؤں تمہارے لیے؟" اور ہر بار کی طرح میرا یہی جواب تھا۔

"کچھ بھی نہیں، بس تم جلدی آجانا۔" یہ حقیقت تھی وہ وہاں چاکے بھی مجھے نہیں بھولتی تھی۔ وہ چار ماہ کے لیے جاتی مگر اس کے خط مجھے اس کی یہاں موجودگی کا احساس دلاتے رہتے اور شاید یہ ہماری دوستی کی پائنداری تھی کہ اس کے خط سے مجھے اپنے ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ اتفاق یہ ہوتا کہ جن دنوں وہ باہر ہوتی ان ہی دنوں میں میری برتھ ڈے آ جاتی اور اس جنم دن کا نیا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی اس کا فون آ جاتا۔ یہی نہیں جب وہ واپس لوٹتی تو تحائف تو میرے لیے لاتی ہی تھی مگر برتھ ڈے کا اسٹیشنل گفٹ میرے نہ، نہ کرنے کے باوجود زبردستی مجھے دیتی۔ ہماری دوستی کو رشک سے دیکھنے والی آنکھیں بے شمار تھیں۔ مجھ سے متعلقہ لوگ ہماری دوستی کو نہ جانے کیسے، کیسے القابات سے نوازتے۔ میں چھوٹی، چھوٹی باتوں پر خوش ہونے والی عام سی لڑکی تھی۔ کسی بھی مذاق کو دیر تک انجوائے کرتی رہتی مگر اس معاملے میں مجھے مول بے حس لگا کرتی۔ وہ اپنے موڈ کے تابع ہو کر ہنستی بلکہ زیادہ تر مسکرانے پر ہی اکتفا کیا کرتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا کوئی رنگا رنگ سا پروگرام تھا۔ سیکنڈ سمسٹر کے اختتام کے بعد یہ فنکشن منعقد کیا گیا تھا۔ ثاقب ہماری کلاس کا بے حد چلبلا لڑکا تھا۔ اپنی بذلہ سخی کی وجہ سے سب کو محظوظ کر رہا

ستارہ ہو کہ دل

نہیں گئیں۔ وہ آگیا تالیوں کی گونج میں عارف نے مایک اس کے ہاتھ میں تھمایا جیسے یہ اسی کا حق ہو۔ تالیاں ابھی تک اس کے اعزاز میں رقصاں تھیں۔ غزل کی فرمائش ہو رہی تھی اور کسی کی خواہش رو کرنا اس کی عادت نہ تھی۔ میں اور مول اس سچ سے بے حد قریب کی سیٹوں پر براجمان تھے۔ ہال میں ایک سکوت سا چھایا ہوا تھا۔ کئی لمحے خاموشی کی سی کیفیت میں گزر گئے پھر ساز اور آواز نے ماحول میں ارتعاش سا پیدا کر دیا۔ ثاقب کی دلسوز آواز ماحول پر پھیلے سکوت کی چادر کو توڑنے لگی۔

”شب ڈھلی چاند بھی نکلے تو سہی ورد جو دل میں ہے چکے تو سہی وہ قیامت ہو، ستارہ ہو کہ دل کچھ نہ کچھ ہجر میں ٹوٹے تو سہی ہم سب وہیں پر ہی بسالیں خود کو وہ سبھی راہ میں روکے تو سہی دل اسی وقت سنہل جائے گا دل کا احوال وہ پوچھے تو سہی اس کی نفرت بھی محبت ہوگی میرے بارے میں وہ سوچے تو سہی اس کے قدموں میں بچھا دوں آنکھیں میری بستی سے وہ گزریے تو سہی“

”واہ یار کیا خوب غزل تھی۔ تم نے تو اس مغرور حسینہ کے لیے دل کھول کے رکھ دیا۔ وہ قیامت اگر دل رکھتی تو ضرور تمہاری محبت میں ڈوب جاتی۔“

ثاقب کے گروپ کا منچلا عامر اس کی غزل کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ اس بے چارے کو بھی کیا خبر وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ سب اس کی غزل پر تبصرہ کر رہے تھے جو اس کے درد کی عکاس تھی۔ سارے دوست کن آنکھوں سے مول کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ثاقب نے اتنی درد بھری آواز میں غزل گائی تھی کہ محفل میں دیر تک اس کا سحر چھایا رہا۔ ہر کوئی

میں ایسا ہی بے پروا ہوتا تو مجھے ان کی پروا کیوں ہوتی؟ دیکھیے گادہ پچھتا میں گی ایک دن، انہوں نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ وہ کہہ کر جا چکا تھا۔

اور پھر ثاقب رحمانی ٹوٹا ہی چلا گیا۔ وہ آنکھیں جو مول کے رستے میں بچھ بچھ جاتیں ان آنکھوں میں اداسی کے گہرے سائے اتر آئے تھے۔ وہ مجھ سے اسی اپنائیت سے ملتا تھا مگر اس کی ذات میں خلا پیدا ہو گیا تھا اور وہ تھا زندگی کا خلا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ یونیورسٹی کے دن پورے کر رہا ہے۔ مول کے لیے تو وہ اجنبی تھا ہی مگر اس کے اطوار اوروں کے لیے بھی اجنبی ہو گئے۔ اس کے دوست احباب اس کی دلی کیفیت سے واقف تھے۔ اکثر اسے چھیڑتے کہ ”نا کام عاشق، زخمی ہیرو، سرمایہ دارانہ نظام کا شکار ہو گیا۔“ وہ ہنستا مگر نظر انداز کر دیتا کہ اگر وہ کچھ کہتا تو جملے اور پھینکے جاتے۔ وہ بلا کا حاضر جواب تھا مگر اب جواب میں اس نے چپ سا دھلی تھی۔ وہ بے نیاز بن کر مول کے سامنے سے گزر جاتا البتہ مجھ سے گھڑی بھر کے لیے سلام دعا ضرور کرتا تھا۔

یونہی کتنے ہی دن بوجھل، بوجھل سے گزر گئے۔ امتحان سر پر آ گئے۔ آخری سال تھا۔ اسی مصروفیت میں بہت سارے دن نکل گئے اور پھر الوداع پارٹی نے پوری کلاس کو یکجا کر دیا تھا۔ یہ فیروزیل یونیورسٹی کی آخری خوشگوار گھڑی تھی۔

ہر آنکھ اشک بار تھی۔ اس بار بھی ہلکا پھلکا فنکشن ارنج کیا گیا تھا مگر اس سچ کا روح رواں ثاقب رحمانی اس سچ سے غائب تھا۔ ایک اور کلاس فیلو عارف نے مایک ہاتھ میں تھاما ہوا تھا مگر جو رونق محفل تھا سب ہی اس کی بے حد کمی محسوس کر رہے تھے۔ وہ ہال میں موجود ہی نہیں تھا۔ بار بار اسی ایک نام کی پکار تھی۔ سب اسے اس سچ پر دیکھنے کے متمنی تھے اور اسے سننا چاہتے تھے اور چاہنے والوں کی دعائیں رائگاں

”تو یہ طے ہوا کہ تم اپنی زندگی کے فیصلے ستاروں کی روشنی میں کروں گی؟“ میں نے جواب دے بغیر سوال واغا۔

”یہ تو انڈر اسٹوڈنٹ بات ہے نشاط۔“ اس نے اپنی نظریں مجھ پر مرکوز کیں۔

”تو کیا مول، ثاقب رحمانی نے تمہارے دل میں اتنی سی بھی جگہ نہیں بنائی کہ.....“ مجھ سے ثاقب رحمانی کی حمایت میں کچھ کہا بھی تو نہیں جا رہا تھا۔

”دل میں اور وہ بھی جگہ؟“ وہ مسخر بھرے لہجے میں ہنسی۔ ”مجھے چڑ ہے اس کی حرکتوں سے، میرے نزدیک وہ ایک لالہ ابالی انسان سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور یہ بات ازبر کر لو نشاط کہ آج کے بعد ہمارے درمیان یہ موضوع کبھی نہیں آئے گا اور تم اسے اچھی طرح سمجھا دینا ورنہ میرا سمجھنا اور طرح کا ہوتا ہے۔“ اور جب میں نے اپنی دانست میں ثاقب رحمانی کو سمجھنا چاہا ہی تھا تو وہ بولا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے، کیا محبت بھی ان بندھنوں کی پابند ہوتی ہے؟ نہیں یہ ستاروں کی چال نہیں یہ ان کی اپنی چال لگتی ہے۔ انہوں نے محسوس ہی نہیں کیا میرے جذباتوں کو اگر وہ محسوس کر لیتیں تو.....“ وہ چپ سا ہو گیا۔ ”انہیں ستاروں کا زعم ہے اور یہ زعم انہیں توڑ دے گا ایک روز دیکھنا۔“ وہ ٹوٹ رہا تھا اور میں اسے ٹوٹتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”انہوں نے میرے پیار کو اس رخ سے دیکھا۔ آپ ہی کہے کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ آخر وہ آپ کی طرح کیوں نہیں ہیں نرم سی۔“ وہ بے رنگی سے بولا۔

”ستارہ اس کا میزان تھا پیار میرا گمان تھا میں تو اپنی ہی ذات میں گن رہا اور گمان بھی نہ ہوا کہ وہ نہیں ہے میرا۔“ وہ جیسے اپنے آپ سے ہی باتیں کر رہا تھا۔ ”انہوں نے میری توہین کی ہے اگر

مزاج کے ہوتے ہیں۔ بس محفلوں میں لوگوں کی نظروں کا مرکز بننا پسند کرتے ہیں۔ ان کی زندگی ساری عمر ان ہی ہنگامہ خیزیوں میں گزرتی ہے اور اگر کوئی محفل نہیں بھی ہے تو بھی انہیں یہ ہنر حاصل ہوتا ہے کہ محفل کا سماں پیدا کر دیتے ہیں اور لوگ ان کی طرف کھینچے چلے جاتے ہیں۔ بس خوش لباس رہنے کا فن جانتے ہیں۔“ گو یہ ساری باتیں ثاقب رحمانی کی شخصیت پر دلالت کر رہی تھیں۔

”مگر مول تم یہ بھی تو سوچو سچائی اور وفا داری ان پر ختم ہے۔ طبیعت کی جولانی اور بے پروائی کے باوجود بھی یہ گھر سے محبت کرتے ہیں پھر اس شخص میں شکربھی.....“

”بس، بس۔“ وہ مجھے ٹوکتے ہوئے بولی۔ ”جو مجھے کہنا تھا میں نے کہہ دیا۔ میرے سامنے وہ جس عمل کا مظاہرہ کرتا ہے میرے لیے وہ ناقابل برداشت ہے۔“ وہ قدرے سختی سے بولی۔

”معلوم ہے مول، وہ تمہیں کس قدر ٹوٹ کر چاہتا ہے۔“

”ہونہہ..... مجھے پروا نہیں ہے۔ بس ایسے لوگ میرے آئیڈیل نہیں ہیں۔ پوری کلاس کے سامنے اس نے مجھ سے محبت کر کے مسئلہ کشمیر بنایا ہوا ہے سارے ہی مجھے معنی خیز نظروں سے گھورتے ہیں اور یہ میری سراسر توہین ہے۔ تم اس سے صاف صاف کہہ دو نشاط کہ وہ میرا راستہ نہ روکا کرے پھر ایسے لوگوں سے میری کبھی نہیں بن سکتی..... میری انڈر اسٹینڈنگ لیو سے ہو ہی نہیں سکتی۔ میں لبرال ہوں اور تمہیں تو پتا ہے لبرال کے بہترین دوست Aquarius, Gemini ہیں اور میری زندگی کی کامیابی کا راز یہی ہے اور پھر تم بھی تو ہو۔ تمہی کہو کہ میری اور تمہاری دوستی کتنے خوشگوار انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔“ وہ تائید طلب نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

دو لاکھ کی بی بی کی گھر سے ملے



جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگرنشت

یا قاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد

رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے

ارسال کریں ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر

رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

آپ کی طرف سے اپنے پتے کی تبدیلی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے

ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجے پر

بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شریعہ (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 111-پکیشنز ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کو رنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

بہت سے بوجھل دن امتحانوں کی مصروفیات میں گزر گئے۔ باجی کی شادی جیسے میری مصروفیات ختم ہونے کی منتظر تھی کیونکہ میں جیسے ہی امتحان سے فارغ ہوئی ای نے تیاری میں تیزی شروع کر دی۔ مبالغہ آرائی سے قطع نظر مول، فرزانہ باجی کی شادی میں پیش، پیش تھی۔ ابو تو ویسے ہی اس کے معترف تھے ہم روزانہ شاپنگ کے لیے جاتے اور خدمات کے لیے مول حاضر ہوتی۔ وہ اپنی گاڑی لیے ہمارے بہت سے بکھیروں کو بننا دیتی۔ شادی کی تمام رسومات، مہندی سے لے کر شادی اور ویسے کی تقریب تک اس نے ای اور ابو کی یکساں ذمہ داریاں اٹھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

ابو نے بہت کہا دے دے بے لفظوں میں کہ ”کم از کم پیٹرول تو ہماری طرف سے ڈالوا بیٹا۔“ مگر مول برا مان گئی۔

”کیا آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں سمجھتے انکل؟“ وہ غلوہ بھرے انداز میں اور کچھ کچھ روٹھ کر بولی تو ابو جلدی سے بولے۔

”ارے نہیں بیٹا، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ ابو اس کی عنایتوں کے آگے شکر گزار ہوتے۔

شادی میں اس کے والدین کو بھی انوائٹ کیا تھا مگر نہ جانے اس کے گھر والے کیوں نہیں آئے؟ اور وہ ان کے نہ آنے کا ازالہ بھی اپنے ڈھیروں غلوں سے کر دیا کرتی۔ فرزانہ باجی کو اس نے ایک بے حد خوب صورت سونے کا نازک ساسیٹ دیا تھا جو امی، ابو نے بے حد تکلف سے لیا۔

باجی کی شادی کے ہنگامے بھی آہستہ آہستہ سرو پڑتے گئے۔ ہمارا رزلٹ آچکا تھا۔ مول کی وجہ سے بلکہ اس کی مہربانی سے میرے نمبر بہت اچھے تھے مگر ایک مسئلہ آن پڑا تھا۔ مجھے جاب کی اجازت لینا تھی اب سے۔ یہی ایک مرحلہ دشوار نظر آ رہا تھا۔ ہمارے خاندان میں آج تک کسی لڑکی نے اسکول میں بھی جاب

چلتے آخری بار ان کی بابت معلوم ہی کر لیا جائے تو کچھ لمحے تو میری منہ می میں بند ہو جائیں گے۔“ وہ اپنی منہ می کو کھولتے ہوئے بولا۔

”ثاقب! تم اسے بھول نہیں سکتے؟“ میں تقریباً چڑ کر بولی۔

”کیا انوکھا سوال کرتے ہو؟“ وہ کرب سے شعری انداز میں بولا۔

”دیکھو ثاقب محبت کوئی صحیفہ آسمانی نہیں ہے کہ تم تمام عمر صرف ایک ہی نام پر عقیدت کے پھول چڑھاتے رہو۔ ایک لمبی زندگی ہے تمہارے پاس، ایک بے حس لڑکی کی خاطر جس کے نظریات ستاروں کے بیچ و خم میں الجھے ہیں، کیوں خود کو الجھاتے ہو؟“ میں نے رساں سے کہا۔

”تمہاری یہ باتیں، یہ نصیحتیں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں لڑکی..... ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اتنا الجھ گیا ہوں کہ سلجھنا بہت مشکل ہے اور اس کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے کہ میں شہر تو کیا یہ ملک ہی چھوڑ جاؤں گا یہاں میرے لیے کچھ نہیں۔“

”ایک لڑکی کی خاطر باقی رشتوں سے منہ موڑنا اتنا آسان ہے کیا؟“

”نہیں نشاط، دل وحشی ابھی قابو میں نہیں ہے۔ بہت دور جا کر شاید دل کی باتیں پچھتاوا بن جائیں تو میں لوٹ آؤں گا۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو نشاط اور وہ بھی اچھی ہوں گی مگر اپنے لیے۔ بس تم دعا کرنا میرے لیے کہ دل مضطرب کو قرار آ جائے تو بات بنے۔“ یونہی بہت سی بوجھل، بے ربط باتیں اور دعائیں دیتے ہوئے وہ رخصت ہو گیا۔

ثاقب رحمانی کو جانا ہی تھا اور وہ چلا بھی گیا۔ میں نے اسے روکا بھی نہیں..... کیسے اسے روک سکتی اور کس بل پر جبکہ وہ ظالم لڑکی تو اس کے ذکر سے بھی گریزاں تھی۔

☆☆☆

اپنی جگہ اسی غزل کے چادو میں جکڑا ہوا تھا اور شاید مول بھی۔

میں نے دیکھا، اس بے تاثر لڑکی کا چہرہ کوئی مدھم سا تاثر دے رہا تھا مگر ایک اجنبی سا..... فنکشن ختم ہو چکا تھا۔ تمام اسٹوڈنٹس ٹولیوں کی صورت میں بٹے ہوئے تھے۔ تب ہی مول سر امتیاز کے بلاوے پر چلی گئی اور میں ثاقب اور اس کے گروپ کی طرف متوجہ ہو گئی اور وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف بڑھا آیا۔

”کیسی ہوا چھی لڑکی؟“ وہ میرے قریب ہی بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اچھی ہوں۔“ میں اس کی اپنائیت پر بھلا اور کیا کہتی۔ ”یہ کیا ہو رہا تھا؟“ میں نے اس کے دوستوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ارے کچھ نہیں بس وضاحتوں کے درمیان سفر کر رہا تھا اور تمہیں تو خبر ہے اب دروغ چھپانے کے لیے ایسا ہی پردہ اختیار کرنا پڑے گا۔ اپنے اقرار کو انکار کہنا ہی پڑے گا۔“ اس نے چھوٹے ہی اپنا حال دل بیان کیا۔

”ایک تو تم شاعر لوگ حساس بہت ہوتے ہو۔ حادثہ خواہ کسی بھی نوعیت کا کیوں نہ ہو غزلوں کے انبار لگا دیتے ہو، چھوٹی، چھوٹی باتوں پر شعر حاضر ہے۔“

”بس جناب!“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مزاج ہی کچھ اس نوعیت کا ہے، نارمل گفتگو ہو ہی نہیں سکتی در نہ گلہ کس بات کا تھا۔“ وہ افسردگی سے بولا۔ ”خیر چھوڑیں وہ کیسی ہیں؟“ بہت عرصے کے بعد ثاقب نے مول کا پوچھا تھا اور پوچھ کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”وہ ویسی ہی ہیں جیسا انہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے اس کے انداز میں جواب دیا۔

”بس نشاط بی بی گھڑیاں ختم ہونے کو ہیں چلتے،

کہا۔ ”ابو مرے کی بات تو یہ ہے کہ ہم دونوں میں آج تک لڑائی ہی نہیں ہوئی اسے کوئی مصروفیت ہوگی اسی لیے نہیں آرہی۔“

”ارے بیٹا تم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ تم ہی اس کی خیر خیریت معلوم کر لو۔ وہ تو تمہاری راک ذرا سی تکلیف پر پریشان ہو جاتی ہے۔“ امی تڑپ کر بولیں۔

میرے والدین اس کی محبت سے لبریز تھے پھر مجھے اپنی کوتاہی کا بھی احساس تھا۔ میں نے سوچا کہ آج کلینک سے فارغ ہوتے ہی اس کے گھر کا چکر لگاؤں گی مگر مول خود ہی آگئی اس کے چہرے کی رونق کچھ کم دکھائی دی تو میں نے سبب پوچھا اور وہ اصل سبب بتانے والوں میں سے نہ تھی اور مجھے اصرار زیادہ کرنا مناسب نہ لگتا سو میں نے اس کے موڈ کے تابع بات بدل دی اور اوجھڑا دھر کی بات شروع کر دی۔

تب ہی انیلا انجم آگئیں۔ ان سے میری اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔ مول سے میں نے اس کا تعارف کروایا تو وہ مول سے بڑے تپاک سے ملیں۔ ان سے بات کرتے کرتے فیشن اور لباس پر بات ہونے لگی۔ مول کا تو خیر یہ فیورٹ موضوع تھا کیونکہ وہ خود بہت بڑی ڈیزائنر تھی۔ اس لیے بدلتے ہوئے موسم کے ساتھ اور پرانے لوٹ آنے والے فیشن کے بارے میں وہ بے لاگ بول رہی تھی اور انیلا انجم کی بھرپور توجہ اسی کی طرف تھی وہ دیکھی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اور اسے سن رہی تھیں اور دھیرے دھیرے مول سے ان کا تکلف ختم ہو گیا اب گفتگو میں وہ بھی بھرپور حصہ لے رہی تھیں۔

اور یہ بات میں نے نوٹ کی کہ اس وقت ان کے چہرے کے بدلتے زاویوں اور ہاتھوں کی حرکات و سکنات میں بے چینی کم ہے ج کی وہ کیفیت جو ان کی اینٹارٹی کو ظاہر کرتی تھی وہ اس وقت جیسے

جوب کچھ بتا کر بھی بے چین رہیں ان کی وحشت کا علاج اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی اصل وحشت بیان کریں۔

یہ خاتون انیلا انجم بھی کچھ اسی قسم کی تھیں۔ بظاہر رکھ رکھاؤ والی خاتون نظر آتی تھیں۔ دونوں ہاتھوں کو آپس میں جکڑے ہوئے بات کرتیں مگر گفتگو کے زیر و بم کے دوران ان کے ہاتھوں کی حرکت عجیب ہوتی تھی۔ لہجے کی سختی سے ہاتھوں کو مزید کس لینتیں۔ نارمل بات کرتے کرتے ایک دم عجیب و غریب انداز میں باتیں کرنے لگتیں۔ کتنی ہی دیر تک میری باتوں کا جواب نہ دے باتیں اور جب دس، پندرہ منٹ کے بعد بات کرنے کے قابل ہوتیں تو کہتیں۔

”ہاں تو آپ نے کیا پوچھا تھا؟“

یہ کیس اتنا عجیب و غریب تھا کئی دنوں تک میں الجھی، الجھی رہی۔ انیلا انجم ڈہری اذیت کا شکار تھیں۔ ستم تو یہ تھا کہ وہ اپنے گرد حصار کھینچ کر کہتی تھیں۔ ”پلیز مجھے خوش رکھو۔“

انیلا انجم تقریباً ہفتے میں تین بار میرے پاس آتی تھیں۔ میں ان سے دنیا بھر کے موضوعات پر باتیں کرتی تھی۔ یونہی چھوٹی، چھوٹی باتوں سے میں ان کو جانا چاہتی تھی، پہچانا چاہتی تھی۔ ان کی پرت، پرت کھلتی شخصیت سے ہی میں کوئی نتیجہ اخذ کرنا چاہتی تھی اور ایسا ہوتا مجھے ممکن بھی نظر آ رہا تھا۔

کئی دنوں سے مول سے بھی ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ جب سے میں نے جاب کی تھی۔ ایسا بھی ہوا نہیں تھا۔ وہ تو خیال رکھنے والوں میں سے تھی۔ ابو، امی بھی جیسے اس کے عادی ہو گئے تھے۔

”بیٹا! کیا بات ہے مول کیوں نہیں آرہی، کیا آپ دونوں میں کوئی لڑائی ہو گئی ہے؟“ ابو نے بار بار پوچھا۔

”ارے نہیں ابو۔“ میں نے ہنس کر

اس روز بھی ایک خاتون بیٹھی اپنی زندگی کے نشیب و فراز بتا رہی تھیں۔ ان کی باتوں میں ایک جملے کی بہت تکرار تھی۔

”بس جی مجھے خوش رہنا نہیں آتا۔ میرے شوہر میرا اتنا خیال رکھتے ہیں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے۔ روپیہ، پیسہ، نوکر، چاکر سب ہی تو ہیں بس میں مطمئن نہیں رہتی۔ خلا سار ہوتا ہے۔“

”آپ کے بچے کتنے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”جی چار بچے ہیں۔ دو لڑکے، دو لڑکیاں، سب شادی شدہ ہیں۔ ایک بیٹا یہیں ہے مگر الگ رہتا ہے جبکہ دوسرا بیٹا کینیڈا میں ہے اس نے وہیں شادی کر لی ہے۔ سب اپنی، اپنی جگہ خوش ہیں۔“ خاتون نے اپنی اولادوں کے بارے میں بڑے مطمئن انداز میں کہا۔

”تو آپ کو ان کی کمی محسوس نہیں ہوتی؟“ ”نہیں کی کیا، سب لوگ اپنی، اپنی جگہ خوش اور مطمئن ہیں۔“ خاتون نے آرام سے کہا۔ ”سب کی اپنی، اپنی زندگی ہے، وہ جیسے چاہیں گزاریں پھر ان کی خوشی میں، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ جب ان کا دل چاہتا ہے مجھ سے ملنے آ جاتے ہیں۔ اولاد کے پاؤں میں جب بیڑیاں پڑ جاتی ہیں تو پرانی بیڑیاں اسے چھینے لگتی ہیں پھر بھی میرے بچے اور بچیاں بہت اچھے ہیں کہ انہوں نے ہمیں یاد تو رکھا ہوا ہے۔ مجھے کسی سے بھی کوئی گلہ نہیں ہے۔ میں سب کو جانتی ہوں اور سمجھتی ہوں۔ بس مجھے خوش رہنا نہیں آتا اور میں چاہتی ہوں کہ میں خوش رہوں اور مطمئن رہوں۔“ وہ خاتون بتا رہی تھیں مگر یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کھولنا نہیں چاہ رہی ہوں۔ اپنی ذات کا بھرم بھی عجیب ہوتا ہے۔ کم از کم بندہ اس سے توشہ چھپائے جس سے علاج درود ملے مانگ رہا ہے۔

ان کے دماغ کی الجھنیں اس قدر جلدی تھیں لیکن اگر وہ کھولتیں تو ہر باتھ لگ سکتا تھا اور وہ لوگ

نہیں کی تھی۔ کجا کہ کسی اسپتال یا کلینک میں سائیکاٹرسٹ کے طور پر۔ مول کے سامنے بھی یہی موضوع زیر بحث آیا تو کہنے لگی۔

”تم فکر نہ کرو تمہیں اجازت دلوانا میرا کام ہے۔“ نہ جانے اس نے ابو کو کن، کن دلیلوں سے منایا کہ وہ مان گئے اور اس نے بے حد خوش ہو کر بتایا کہ انکل کو اس نے بہ آسانی راضی کر لیا ہے۔ اس کے لہجے میں ایک مان، ایک فخر تھا۔ اپنی بات کا زعم کہ اس کی بات کوئی رد نہیں کر سکتا۔

مول کی ”میں“ اکثر ہی مجھے چڑانے والی ہوتی تھی مگر نہ جانے کیوں میں اسے، اس کی عادت ثانیہ سمجھ کر اکثر ہی نظر انداز کر جاتی کہ کچھ بھی سہی پر وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ کئی دنوں تک وہ اسی بات پر مسرور رہی کہ اس نے مجھے ابو سے اجازت دلوانے میں بہت بڑا معرکہ انجام دیا ہے۔

”ارے جناب، ہم کہیں اور کوئی نہ مانے ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔“ وہ اتر کر بولی تو میں جل کر کہنے لگی۔

”ٹھیک ہے، تمہارے اندر یہ خوبی ہے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرو نہ کہ اس کا چرچا کرتی رہو۔“

”چرچا نہ ہوگا تو لوگ معترف کیسے ہوں گے؟“ اس کی ڈھٹائی عروج پر تھی۔ تب میں بھی خاموش ہو گئی مگر اس کی یہ بات مجھے گراں گزر رہی تھی۔ میں ہمیشہ بحث سے گریز کرتی تھی کیونکہ بحث مجھے گفتگو کی موت لگا کرتی اور طبیعت مزید مکرر ہو جاتی تھی۔

ایک اچھے پرائیویٹ کلینک میں مجھے بحیثیت سائیکاٹرسٹ جاب مل گئی تھی اور پھر زندگی بہت مصروف ہو گئی۔۔۔۔۔ روزنت نئے لوگوں سے میرا واسطہ پڑتا تھا۔ طرح، طرح کے ذہنی مریض جب مجھے اپنی کیفیات بتاتے تو احساس ہوتا کہ زندگی اس کا نام بھی ہے۔

نے اپنے گرد جو خول تانا ہوا تھا اس میں دراڑیں سی پڑنے لگیں۔ مول اور میں نے ان کے شوق کو ان کے علاج کے لیے استعمال کیا۔ مول نے آہستہ آہستہ ان کو اپنی دوستی کے سحر میں جکڑ لیا اور بہ آسانی ان کو نارمل اور بااعتماد لوگوں کی صف میں لاکھڑا کیا۔ وہ اچھی مال دار خاتون تھیں۔ آہستہ آہستہ مول کی صحبت نے ان پر خوشگوار اثر ڈالا۔ کب کا پچھڑا اطمینان ان کے چہرے پر قس کرنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ جینے کا گریسکھ لیا ہو۔ انہوں نے ایک بوتیک کھول لیا۔ ساتھ ہی ایک چھوٹے سے کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ کا بھی آغاز کیا اور ان کی توجہ اس طرف مبذول ہوتی چلی گئی سارا دن وہ اسی میں مصروف رہیں۔ تنہائی کی ماری انیلا انجم نے اپنے لیے محفل ڈھونڈ لی۔

ایک تو ہم سائیکا ٹرسٹ لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ مریض اپنا آپ ہمارے سامنے کھول کر رکھ دے تب ہم اس کو شفا دیں گے۔ ارے یہ نہیں سوچتے کہ جس طرح کمرے کے چھوٹے، چھوٹے سوراخوں سے روشنی کا پتا چلتا ہے بالکل اسی طرح چھوٹی، چھوٹی باتوں سے انسان کے باطن کا پتا چلتا ہے اور کامیاب بات یہ تھی کہ انیلا انجم کے کیس میں دوسری بات لاگو ہو گئی اور ان کی ذات کا بھرم بھی رہ گیا۔ اکثر وہ مجھ سے ملنے آتی رہتی تھیں۔

مجھے جاب کرتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ فرزانہ باجی کے آنگن میں دو پھول کھل چکے تھے۔ ابو ریٹائرڈ ہو گئے تھے۔ امی بہت بیمار رہنے لگی تھیں۔ ابو نے اپنے دور پار کے عزیزوں میں میری ممکن کردی تھی۔ جنید میرے دور کے کزن تھے۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھے اور دو ماہ بعد میری شادی تھی۔ اپنا اشار والا قانون مول نے میری ذات پر بھی لاگو کیا مگر یہ شاید پہلا موقع تھا کہ اسے جنید سے مل کر میری قسمت پر رشک آیا اور پھر یہ بتانے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے

تو دل و دماغ میں ایک بوجھ سا تھا اور آج کا تمام منظر ایک فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے چلتا رہا۔ مول اور میری دوستی کے بیچ کوئی اشتباہ لمحہ نہیں آیا تھا مگر ہمیشہ میرے اس کے رویوں میں توازن رہا تھا اور میں سمجھتی ہوں کہ میں نے ہمیشہ اس کے رویوں اور عادتوں پر انکساری دکھائی تھی مگر آج انیلا انجم کے بارے میں اس کی جذباتی باتیں یہ سب میری سمجھ سے باہر تھیں۔

وہ ہمیشہ جذبات سے بالاتر ہو کر حقائق پر مبنی باتیں کرتی تھی۔ اس کے نظریات ہمیشہ ٹھوس ہوتے تھے۔ وہ امید و بیم کی کشتی پر کبھی نہ سوار ہوتی تھی۔ وہ بڑی بہادری سے ہر کام کرتی تھی۔ اس کے لہجے میں کسی کمزوری کا شائبہ نہ تھا مگر آج اس کا انداز..... یوں ہی سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن جب میں کلینک میں بیٹھی مصروف تھی تب ہی مول کا فون آ گیا۔ ”سنو نشا! تم انیلا انجم کے کیس کو ڈیل کرتے وقت اس پوائنٹ پر ضرور غور کرنا کہ اس کے لیے مصروفیت بہت ضروری ہے بلکہ ہو سکے تو ان کے رجحان کو دیکھتے ہوئے انہیں ایسا مشورہ دو جس سے ان کے شوق کو تقویت مل سکے، سمجھ رہی ہوں تم میری بات؟“ وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”ہاں مول، میرے دماغ میں بھی یہی نکتہ جڑ پکڑ رہا تھا کہ ایسے لوگوں کے اعصاب کو آزمانے سے بہتر ہے کہ ان کی چھوٹی، چھوٹی باتوں سے وہ گھر تلاش کیا جائے جو ان کو خوشی دے سکتا ہے۔“ میں مطمئن ہوئی کہ چلو مول نے اس کیس میں تو میرے ساتھ شہر کیا۔

”ہاں، ہاں۔“ اس نے میری تائید کی۔ ”تم دیکھنا انیلا انجم کو چند دنوں کے بعد۔“ اور یہ اعجاز چند دنوں کے بعد مول کے تعاون سے ظاہر ہوا۔ انیلا انجم

ہے، وہ اس آگ کی بھی سے گزر کر کنڈن تو بن جاتا ہے مگر اپنا آپ جلا ڈالتا ہے۔ یہ کسی کو پتا نہیں چلتا کہ وہ کس طرح جلا؟“ عجیب باتیں کر رہی تھی مول مگر وہ میرے تاثرات سے بے پروا کہہ رہی تھی۔

”ہمارے ارد گرد، ہم سے متعلق رشتے مانتے حتیٰ کہ ہمارے خون میں بسنے والے جب ہمارے وجود سے منکر ہو جاتے ہیں تو روح میں اسی طرح کی وحشت ہوتی ہے۔ ایسے ہی گھاؤ میں دیکھ رہے ہیں۔ روکیا ہوا فرد خود پر تو یہ قسم سہہ لیتا ہے مگر خود نکلتا نہیں ہے کہ اپنا آپ ظاہر کرنا بہت بڑا المیہ ہے..... بڑا ظلم ہے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو مول، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ میں نے اسے تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں بس۔“ وہ جیسے سنہلکتے ہوئے بولی۔ ”بس تمہاری مریضہ کی اسٹڈی کر رہی تھی۔“

آخر میں بھی سائیکا ٹرسٹ ہوں اب یہ اور بات ہے کہ پروفیشنل نہیں ہوں۔“ بڑے مزے سے اس نے کہا اور پھر بات کا رخ ہی بدل گیا۔ کافی عرصے کے بعد وہ آئی تھی تب ہم دونوں نے آؤٹنگ کا پروگرام بنالیا اس روز میں نے اور مول نے شاپنگ بھی کی اور ایسی دوسری بہت سی تفریح جو ہماری دلچسپیوں میں شامل تھیں۔ شام ڈھلے وہ ابو، امی سے ملنے میرے گھر بھی چلی آئی اور ہمیشہ کی طرح ان سے بہت اچھی طرح ملی۔ امی اس کے گئی روز تک نہ آنے کا گلہ کرتی رہیں اور وہ ان کے ہاتھ تھام کر اپنے نہ آنے کی وضاحت کرتی رہی۔ اس روز اتفاق سے فرزانہ باجی بھی آئی ہوئی تھیں۔ گھر میں اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ امی نے شام کے کھانے پر خاصا اہتمام کیا تھا۔ ظاہر بات ہے امی، ابو اسے بغیر کھانا کھائے جانے ہی نہ دیتے۔

مول کے جانے کے بعد میں تھک ہار کر بستر پر لیٹی

کہیں معدوم ہو گئی تھی۔

یہ لمحہ میرے لیے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی کا باعث بھی تھا یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے مرض کا درماں ہو رہا تھا۔ اس روز انہوں نے بہت سارا وقت میرے کلینک میں گزارا۔ اس کی بنیادی وجہ مجھے مول کی ذات نظر آئی۔

ہاں واقعی یہ مول ہی تو تھی جس نے جیسے انجانے میں ان کے غم کو بانٹ لیا تھا اور اس روز مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ مول ان کی زبان سمجھتی ہے۔ ان کی نظر سمجھتی ہے، وہ ان کی نبض شناس ہے۔

”کیا آپ کل بھی آئیں گی؟“ انیلا انجم نے جاتے ہوئے بہت اچھے انداز میں خدا حافظ کہا اور بڑے ملائم لہجے میں مول سے پوچھا۔ اس سوال پر مجھے اچنبھا سا ہوا اور مول نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”حیرت انگیز، خوش کن۔“ ان کے جانے کے بعد میں نے جیسے زیر لب کہا۔

”کیا حیرت انگیز اور خوش کن؟“ مول نے شاید میری بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔

”یہی کہ یہ خاتون میرے لیے مسئلہ بنتی جا رہی ہیں۔“ پھر میں نے ان کی پہلے دن سے آمد اور باقی دنوں کا حال تفصیل سے اس کے گوش گزار کر دیا وہ سن کر بولی۔

”نشا! تم نے سنا ہے ناں سچ تو یہ ہے کہ رہی ساکھ امی کی قائم گھر کے حالات کو جس شخص نے گھر تک ہی رکھا ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی ذات کے بھرم سے باہر نہیں آتے۔ عزت نفس ان کی دیرینہ ساتھی ہوتی ہے۔ اکیلے فرد کی جنگ اپنے آپ سے، بڑی اذیت لیے ہوئی ہے اور یہ اذیت کا عمل ہی ہوتا ہے جس میں وہ بڑے صبر آزمایا مرام سے گزرتا ہے کہ ہر مرحلہ واقعی اس کے لیے ایک آزمائش ہے، امتحان

کہ اس نے میری شادی کو کتنے بھرپور انداز میں انجوائے کیا کہ غیروں کی نظروں نے بھی اسے سراہا۔ میں نے بار بار اس سے کہا اور خصوصاً جب وہ لندن جانے لگی کہ وہ بھی اب شادی کر لے۔ کب تک یوں ادھر سے ادھر ڈولتی رہے گی۔ اس کی زندگی مجھے سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ہول سا اٹھتا تھا اس کو دیکھ کر کہ بس مجھ کو لے کی طرح ادھر سے ادھر پھرتے رہنا اس کا شغل تو کم جنون بن چکا تھا۔

”تمہیں کیا خبر، میری بے خبر..... اس ادھر ادھر ڈولنے میں ہی میری نجات ہے۔“ ہمیشہ کی طرح اپنا جواب اس نے کھرا رکھا تو میں نے پھر زور دیتے ہوئے کہا۔

”نہیں مول، مجھے تمہاری بے حد فکر رہتی ہے۔“ چھوڑو ناں اشارہ چکر۔ تم Aquarius کے زعم میں ہی رہیں تو پھر ساری عمر شادی جیسی نعمت سے محروم رہو گی۔“

”اوکے، اوکے نشاط کیونکہ تم میری دوست ہو اس لیے تمہیں میری فکر رہتی ہے رہا سوال اشارہ کے زعم کا تو یہ زعم میرا ورثہ ہے اور اپنے ورثے کی حفاظت ہی تو سیکھی ہے میں نے۔“ اس کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ ایک پروہ سا پڑا رہتا تھا اس کے اطراف بھی۔ ہر بار شاہانہ انداز میں کہہ کر بات ضائع کر دیا کرتی۔

اس بار اس کے جانے کا مجھے بہت ملال تھا نہ جانے کیوں؟ اب کے اس نے آنے میں دن بھی بہت لگا دیے تھے۔ جانے کے بعد اس کا صرف ایک ہی بار فون آیا تھا اور دو خط۔ میں نے اسے خط میں لکھا تھا کہ ”اکیلے پھرنے کی اذیت کو ختم کر دو اور خدا کے لیے گھر بنا لو۔“ جواب میں اس نے لکھا تھا۔

”ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم بھی اکیلے تھے کبھی ہم نے بھی ان تنہائیوں کے درد جھیلے تھے اگرچہ شہر میں دل کے لیے

لاکھوں جھیلے تھے، ہزاروں رنگ میلے تھے مگر اتنی بہت سی رونقوں میں ہم اکیلے تھے پھر اک دن ہم نے ان تنہائیوں سے دوستی کر لی اکیلے رہ کے جینے کا قرینہ آگیا ہم کو یہ عالم ہے کہ تنہائی کا اب موسم نہیں رکھتے اکیلے ہیں مگر تنہائیوں کا غم نہیں رکھتے کوئی بھی دکھ ہو، دل مضطرب پیہم نہیں رکھتے اکیلا دیکھ کر تم کو نہ جانے کیوں خیال آیا کبھی ہم نے بھی ان تنہائیوں کے درد جھیلے تھے کبھی ہم بھی اکیلے تھے!“

اس نے یہ میرے آخری خط کا جواب دیا تھا۔ اس کے بعد نہ پھر اس کا فون آیا نہ ہی کسی خوب صورت تحریر نے میرے دردازے پر دستک دی۔ ان دنوں میں بے حد پریشان رہتی۔ ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔ مول کے ہفتے میں تین بار فون آتے تھے۔ میں مول سے ملنے، اسے دیکھنے کو بے چین تھی۔ جنید کو میری اور مول کی دوستی کا بہت اچھی طرح احساس تھا۔ وہ میری ڈھارس بندھاتے۔

”ہو سکتا ہے کہ کوئی ابھن یا پریشانی ہو یا اسے وقت نہ مل رہا ہو۔ کوئی ایسی بات ضرور ہے ورنہ تم ہی تو کہتی ہو وہ تم سے کبھی غافل نہیں رہی۔“

”ہاں واقعی، وہ مجھ سے کبھی غافل نہیں رہی۔“ میں نے سوچا۔ سبھی میں نے اس کے گھر فون کیا تو وہاں سے بھی اس کی سوتلی بہنوں یا ماں نے کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں دیا اور پھر وہ ہو گیا جس کا میں نے سوچا تو کیا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میرے انتظار کی آس کو اس خالم لڑکی نے توڑا نہیں بلکہ وہ دو دن بعد آ رہی تھی۔

ہاں وہ آ رہی تھی اپنے پورے وجود سمیت وہ آ رہی تھی۔ اس نے میرے ضبط کا خوب امتحان لیا تھا۔ اس بار میں نے سوچا تھا اس کی بے نیازی پر اسے بری طرح جھاڑوں کی مگر ہمیشہ کی طرح اس بار

بھی میں اس کے سامنے ہار گئی اور وہ مر کے بھی سرخو رہی۔ ہاں وہ مر گئی..... یقین نہیں آ رہا ناں آپ کو..... آنا بھی نہیں چاہیے۔ میری وحشت کا بھی یہی عالم تھا۔ میں بھی یقین و بے یقینی کے مراحل سے گزری۔ اپنے آپ کو باور کرنے کی سعی کی کہ ہاں ایسا ہو چکا ہے۔ میری سوچ جیسے بے جان ہو چکی تھی۔ اعضا شل ہو چکے تھے مگر گواہی دینے والی ہر نظر متحرک تھی اور کہہ رہی تھی۔ اس کا وجود بے معنی ہو چکا ہے مگر اس کی موت کوئی معمولی نہیں تھی میرے لیے بلکہ غیر معمولی موت تھی۔

وہ ہجر کی راتوں کا اشارہ وہ ہم نفس وہ ہم سخن ہمارا سدا رہے اس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ دو دن بعد اس کی ڈیڈ باڈی آ رہی تھی۔ اس کی دادی اماں کا فون آیا تھا کہ ار پورٹ پر تمہاری موجودگی لازمی ہے اور ہمیشہ جب مول واپس آتی تھی تو میرے لیے ڈھیروں تحائف لاتی تھی مگر اب کے اس نے مجھے سب سے انوکھا تحفہ دیا تھا۔ اپنا آپ امر کر دیا تھا وہ برین ٹیو مر کا شکار تھی مگر مجھے اس کا علم نہیں تھا۔

قدرت بھی بڑے، بڑے امتحان لیتی ہے۔ قاقب رحمانی نے کہا تھا میں لوٹ کر جب آؤں گا جب میں سمجھوں گا کہ اس کی یاویں پچھتاوا بن گئی ہیں مگر ستم تو یہ تھا کہ جس جہاز سے مول کا بے جان وجود آ رہا تھا اسی میں وہ بے خبر سوار تھا اور جب ار پورٹ پر اس نے مجھے دیکھا تو یکبارگی خوشی سے چیخ کر بولا۔

”ارے نشاط تم.....! تمہیں کیسے خبر کہ میں آ رہا ہوں؟“ وہ بے حد پرجوش ہو کر بولا۔ تب ہی میرے سوتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے جنید کی طرف دیکھا اور جو کچھ جنید نے بتایا وہ وہیں کھڑے کھڑے بچوں کے انداز میں پھوٹ، پھوٹ کر رو دیا اور پھر مول یزدانی اوس میں بھیگی مٹی

نوجوان مصنفوں کو مشورہ

نوجوان مصنفوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ہنر کا قریبی مطالعہ کریں۔ ایسا کرنے کے لیے ان کا اپنے ادب سے واقف ہونا لازمی ہے۔ آپ کو یہ نظر آئے گا کہ بعض نوجوان مصنفین کسی غیر ملکی مصنف سے اس وجہ سے واقف ہوئے ہیں کہ انہوں نے اس کے نام کا تذکرہ ٹیلی ویژن پر سنا ہے یا وہ کسی ایسی محفل میں موجود تھے جہاں اس مصنف کی تصانیف پر گفتگو کی گئی تھی لیکن اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہوں نے مذکورہ مصنف کی کون، کون سی تحریریں پڑھی ہیں تو وہ خجالت کا شکار ہو جائیں گے اور اپنی کرسیوں پر تلملانے لگیں گے کیونکہ انہوں نے اس مصنف کی کوئی بھی تحریر پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہوگی۔ لکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ لکھنے والا اپنے پیش روؤں کے تجربے سے سیکھے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو صرف اپنے تصورات کی چہار دیواری میں قید ہو کر رہ جائے گا۔

اقتباس: از نجیب محفوظ

پسند: ثوبیہ ظہور، انک

میں زمیں بوس ہو گئی۔ منوں مٹی تلے میری بہادر دوست سو گئی۔

☆☆☆

”اچھی نشاط! جس روز سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ میرا وجود میرے خون کے رشتوں کے لیے بے معنی ہے۔ تب میں نے زندگی کا مفہوم سمجھ لیا تھا۔ اپنی محرومیوں کو شکست دینے کے لیے میں نے وہ طاقت حاصل کی تھی کہ میرے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ پاپا نے جب اپنے علم کو بنیاد بنا

198 ماہنامہ پاکیزہ منی 2014ء

وجاہت یزدانی کے اس بڑے گھر میں میری پرورش مختلف رویوں میں ہی ہوئی اور روٹیوں نے ہی مجھے بڑا کیا۔ مقابلے کی فضا اس گھر میں مجھے

میں ہر سال اپنی ماں سے ملنے لندن جاتی تھی۔ انہوں نے بھی دوسری شادی کر لی تھی اور رفقہ انکل ان کے لیے بہت اچھے شوہر ملا بت ہوئے تھے۔ گو وہ میرے ساتھ اچھے تھے اور ان کے بچے بھی ٹھیک تھے مگر ان سب کی نظروں میں میری حیثیت اپنی سگی بیٹی، بہن جیسی نہیں تھی لیکن میں بھی دل برداشتہ نہیں ہوئی۔ میں صرف اپنی ماں کی وجہ سے دھال جاتی تھی کچھ بھی تھا یہ ڈور ایسی تھی جو مجھے ان کی طرف پھینکتی تھی اور میں چاہتی تھی میں ان سے اپنے آپ کو منسلک رکھوں اور خود کو یقین دلا سکوں کوئی تو

خود کو نظر انداز کیے جانے کا دکھ میرے اندر خود اعتمادی بن کر پلٹا رہا۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے پیار دیا ہے تو پیار ملا ہے۔ میں نے خود پر کیے جانے والے مظالم کا کسی سے انتقام نہیں لیا۔ بس ایک خواہش تھی کہ کوئی مجھے سمجھ سکے اس سلسلے میں یہ ضرور ہوا کہ جو کھیل کئی سال پہلے وجاہت یزدانی نے کھیلا، کئی چہرے میری راہ میں آئے جن میں ثاقب رحمانی سرفہرست تھا کہ وہ میرے لیے مخلص تھا مگر وہ تو Aquarius نہیں تھا۔ یوں وہ ٹوٹ کر میری زندگی سے نکل گیا مگر Aquarius بندہ مجھے کبھی نہیں ملے گا اس کا مجھے پتا تھا کیونکہ یہ میری اپنی چال تھی۔ وجاہت یزدانی کے سارے بچوں کی اپنی، اپنی زندگی تھی مگر ان کی زندگی مطمئن اور خوش باش تھی۔ میں نے کبھی کسی چیز کو اپنے اوپر سوار نہیں کیا تھا بلکہ میرا خیال تھا کہ میں خود اپنی مسیحا ہوں کیونکہ میں بچپن سے اپنے کمپلیکس کا علاج کرتی چلی آرہی تھی اور جو شخص آپ معالج ہو اس کا علاج ناممکن کیسے ہو سکتا ہے مگر یہ میری غلط فہمی تھی اور پھر ایک روز لندن میں ہی سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے درد کی شدت سے میں بے حال ہو گئی تو مئی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ شروع، شروع میں تو کیس زیادہ سیریس نہیں تھا۔ میں باقاعدگی سے علاج کرواتی رہی مگر جب ڈاکٹر نے فائل تیسری دفعہ کے ایک کے بعد مئی کے ہاتھوں میں تھمائی تو برین ٹیومر پڑھ کر می پھوٹ، پھوٹ کر رو دیں لیکن پھر پتا نہیں کب کہاں غلطی ہوئی کہ ساری امیدیں دم توڑ گئیں اور میں خالی ہاتھ رہ گئی۔ تمہیں یاد ہے

نیو کی لاجسری اینڈ فرسٹ کلاس ایئر
ساؤتہسٹم اور جارجسری کی بہت موزوں
رومانس اور سوسائٹی ڈراما کی جانی جی



بہن دوست

شیم ناز صدیقی

اجانک سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی تھی۔
مجد سے آتی فجر کی اذان کی آواز کان میں پڑی تو
احساس ہوا کہ فجر کا وقت ہو گیا ہے۔ میں بیدار ہو گئی
مگر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ میرے نزدیک میری
اماں سفید لباس میں اداس بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی
نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے کانوں میں فجر
کی اذان کی آواز آرہی تھی اور یہ آواز مجھے یقین دلا
رہی تھی کہ میں مکمل طور پر جاگ رہی ہوں۔
اس رات میں بہت اپ سینٹ سوئی تھی۔ زندگی
میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ میں بھی کچھ
پریشانیوں میں الجھی ہوئی تھی۔
اماں کا ہاتھ میری پیشانی پر تھا۔ میں ان کے
ہاتھ کا لمس محسوس کر رہی تھی۔ اماں میرے اتنے
نزدیک تھیں کہ میں سوچ رہی تھی آنکھیں کھول لوں

سے خود کو موت کی وادی کی طرف بڑھتا ہوا دیکھوں
گی۔ می میرا بہت خیال رکھ رہی ہیں۔ میں نے
ان سے قسم لی ہے وہ میری موت پر تو کم از کم
شریک ہوں گی یعنی اگر میری موت یہاں ہو بھی
گئی تو انہیں مجھے لے کر اپنی زمین پر اپنے لوگوں
کے درمیان آنا ہوگا۔ کم از کم وجاہت یزدانی بھی
اس روز موجود ہوں گے اور آنے والے اس دن کا
مجھے شدت سے انتظار ہے۔ مجھے یقین ہے اب تم
سے وہ ملاقات نہ ہوگی جس کی تمہیں تمنا ہوگی مگر تم
میرے مرنے کا اتنا ملال نہ کرنا کیونکہ رنج کی
باتوں کو بھلانے میں ہی مزہ ہے اور مرنے میں کیا
مزہ ہے اس کو بھی دیکھ لیں گے، ہمیشہ خوش رہو۔
مولیٰ

”تو یہ تھا مولیٰ وجاہت یزدانی تمہاری کھری
شخصیت کا راز جس کو سمیٹنے کے لیے تم نے دیوانہ وار
مقابلہ کیا۔“
میں نے مولیٰ کے خط کو پڑھ کر تہ در تہ بند
کرتے ہوئے سوچا۔ ”تم نے اپنے ارد گرد ایک ایسی
فصیل کھڑی کی تھی کہ کوئی اسے پار نہیں کر سکتا تھا۔ تم
پاگل تھیں مولیٰ کچھ تعلق، کچھ ناتے، کچھ دوستیاں ایسی
ہوتی ہیں جن کو آزمائشوں کے باٹ سے نہیں ٹولا
جاتا مگر تم ڈی ہوئی تھیں اور ڈسنے والے خائف
ہوتے ہیں۔ دل کی ڈور سے جڑی تحریریں ناقص
رحمانی کو ازبر ہیں مولیٰ اور تمہاری قبر اس کی ختم ہوئی
زندگی تک مہکتی رہے گی۔ اب تم ہی کہو مولیٰ ان اشار
کے لوگوں پر سچائی، وفاداری ختم نہیں ہے؟ لیکن آج
تم کچھ نہیں کہو گی کہ تم نے مجھے بھی آزمایا ہے تو غلط
ہی پایا۔ مگر دل اور ستاروں کے بیچ تم نے بڑا ظلم
کیا ہے۔ بڑا ظلم۔۔۔ لوگوں کا کیا ہے وہ تو کہتے ہی
رہیں گے کہ ہماری دوستی۔۔۔ کتابوں میں ہی خوشبو
کے مانند تھی۔“

ناں وہ دن جب میں تمہارے پاس آئی تھی اور تم نے
کچھ میری طبیعت کے بارے میں پوچھا تھا تو یہ اسی
کا اثر تھا پھر میرے سر جن نے مجھے بتایا کہ میرے
پاس زندگی کے چند مہینے رہ گئے ہیں۔ میں امید کی
ہلکی سی روشنی کی تلاش میں کہاں، کہاں بھٹکتی رہی
لیکن سب بے فائدہ، سب بیکار۔۔۔ اور پیاری نشاط
تم سوچ رہی ہو گی کہ اتنا بڑا راز میں نے تمہیں آج
تک نہیں بتایا تم یہ بھی سوچ رہی ہو گی کہ میں تمہاری
دوست نہیں ہوں۔ یہ سب آزمانے کے بعد ہی تو
کھلا کہ تم ہی تو میری دوست تھیں کہ آزمائش تو میری
کھٹی میں پڑ گئی تھی۔ تم سے مل کر تو لگا کہ ہماری دوستی
میں آسودگی زیادہ ہے۔ پیاری دوست، تم ہی
دوست تھیں جیسی تو نہیں بتایا تھا۔ جب لندن، امریکا
کے بڑے، بڑے اسپیشلسٹ میرے لیے کچھ نہیں
کر سکے تو تمہیں بتا دینے سے میرے مرض میں کون
سافر فرق پڑ جاتا سوائے اس کہ تمہیں دکھ ہوتا اور
دوستوں کو دکھ تو نہیں دیا جاتا ناں۔ میں تو کسی سے
سکھ شیر کرنے کی بھی قائل نہیں اور پھر ایسے دکھ تو
شیر کرنے کے لیے نہیں ہوتے۔

اس اسپتال کے کمرے میں زندگی بڑی
عجیب لگتی ہے اور احساس ہوتا ہے کہ زندگی بس غلی
کے کچے رنگوں کی طرح ہے بہت خوب صورت
لیکن انتہائی ناپائدار بھی۔ زندگی نے جو کچھ بھی دیا
وہ مجھے میری کوششوں سے دیا ورنہ زندگی کبھی کسی
کے لیے اتنی محک نہیں ہوتی۔ تمہارے امی، ابو کی
محبت کی بھی میں حصے دار ہوں۔ ان سے کہنا کہ
میری قبر پر فاتحہ خوانی کو ضرور آتے رہے گا۔ میرا
اور کون ہے ان کے سوا۔ فیکٹری اور بوتیک اب
تمہاری ذمے داری ہے۔ انیلا انجم کا دکھ تم سمجھ گئی
ہو گی۔ نہ جانے کون سا بل مجھے موت کے
قریب کر دے۔ گزرتا ہوا ہر دن میری زندگی کو کم
کرے گا اور میں کچھ نہیں کر سکوں گی بس خاموشی

کہ نہیں..... میں اسے خواب نہیں کہہ سکتی تھی۔
میں جاگ رہی تھی۔ میری صرف آنکھیں بند تھیں
لیکن ذہن جاگ رہا تھا۔ اذان کی آوازیں کر میں
ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

میری نظر دائیں طرف پڑی تو میں بری طرح
چونک گئی۔ اماں سچ مچ میرے بالکل قریب سفید
لباس میں خاموش بیٹھی تھیں۔ جیسے ہی میں نے کچھ کہنا
چاہا..... دوسرے لمحے وہاں کوئی نہیں تھا۔ بس صرف
اماں کی قربت کا لمس اور احساس باقی تھا۔ بہت دیر
تک میں اسی لمس کی خوشبو کے احساس میں گم صم بیٹھی
رہی۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اماں ابھی ابھی
میرے اتنے قریب تھیں اور پھر آنکھ سے اوجھل بھی
ہو گئیں مگر اب اماں مجھے شدت سے یاد آرہی تھیں۔
اماں جنہیں میرے بغیر ایک بل قرار نہیں آتا تھا یہ
کیفیت ان کی بیماری کے دوران ہوتی تھی۔ وہ مجھے
ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ
اپنا ہر کام مجھ سے ہی کروا کر مطمئن ہوتی تھیں۔

اماں جو قدم قدم پر مجھے پکارتی تھیں اور میں
ان کی ایک آواز پر دوڑ کر ان کے کمرے میں پہنچ
جاتی۔ ان کی آواز کی بازگشت اب بھی اکثر میرے
کانوں میں گونجتی اور اس بازگشت پر میں بے چین اور
بے قرار ہو جاتی ہوں آج پھر اماں کے ساتھ گزارا
ہوا ایک، ایک لمحہ میرے ذہن کے کیوس پر روشن
ہورہا ہے اور میں یادوں کی پگڈنڈی پر سر پٹ
دوڑنے لگی ہوں۔

☆☆☆

”نازیہ..... نازیہ کہاں ہو.....؟“ اماں کی
آواز مسلسل میرے کانوں سے ٹکر رہی تھی..... میں
نے سلام پھیرا اور اٹھ کر اماں کے کمرے میں آ گئی۔

”جی اماں کچھ چاہیے.....؟“

”ہاں بیٹا تھوڑا سا پانی دے دو حلق خشک ہو رہا
ہے۔ تم کہاں تھیں اتنی دیر سے آوازیں دے رہی ہوں۔“

”عشا کی نماز پڑھ رہی تھی اماں..... آپ کی آنکھ
لگ گئی تھی تو میں نے سوچا نماز سے فارغ ہوں۔“
”اچھا تو پڑھ چکی نماز.....؟“
”نہیں اماں، سلام پھیر کر آئی ہوں۔“

”اچھا جاؤ نماز مکمل کر لو.....“ انہوں نے خالی
گلاس مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

عشا کی نماز سے فارغ ہو کر میں کچن میں
آ گئی، مجھے اپنے اور اماں کے لیے روٹی ڈالنی تھی،
آج تو گھر پر صرف میں اور اماں تھے سب گھر والے
آپا کے بیٹے کی برتھ ڈے پر گئے ہوئے تھے۔ میں
اماں کی وجہ سے نہیں گئی تھی۔ میں انہیں کھانا کھاتے
دیکھے جارہی تھی پر ذہن کہیں اور تھا۔

☆☆☆

میری ماں صرف اچھی ماں ہی نہیں تھیں بلکہ
اچھی اور مثالی بیوی بھی تھیں ایسی سکھڑ اور سلیقہ شعار
کہ ہم سب کو اپنے ہاتھ سے کپڑے سی کر پہنا تھیں
یہاں تک کہ ابا پیٹنٹ شرٹ کے علاوہ قمیض یا جامہ بھی
شوق سے پہنتے تھے۔ اماں، اباجی کے کپڑے بھی خود
گھر پر ہی سیتی تھیں۔

ہمارے اباجی کھانے پینے کے بہت شوقین تھے
اور اماں کے ہاتھ..... میں تولدت بھی بہت مگی۔
گویا کہ وہ ہر کام کی ماہر تھیں۔ وقت بہت تیزی سے
گزر رہا تھا۔ ہم سب بہن بھائی سمجھ دار ہو رہے تھے۔
وہ دن بڑے خوب صورت تھے۔ زندگی بڑی
حسین لگتی تھی۔ جب والدین کا سایہ کسی گھنی چھاؤں
کی طرح سر پر موجود ہو تو زندگی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا
ہے، عجیب بے فکری کا دور ہوتا ہے۔ وقت پر لگا کر
حیزی سے اڑنے لگا اماں، اباجی، نانا، نانی اور دادا
دادی بن گئے۔ گھر میں بچوں کی چہکاریں گونجنے
لگیں۔ اماں نے اپنی ازلی بیماری کے ساتھ ساتھ
نہایت خوش اسلوبی اور ذہنی داری سے اپنے امور
خانہ داری انجام دیے تھے۔ کبھی اپنی ٹی بی جیسی بیماری

کو دکھ کا پہاڑ بنا کر ہاتھ پاؤں چھوڑ کر نہ بیٹھیں اور ان
کی ہمت و حوصلہ دیکھ کر ہم بھی مطمئن ہو جاتے۔ اماں
کو کبھی غصہ نہیں آتا تھا۔ اباجی غصے کے بہت تیز تھے مگر
اماں کے ٹھنڈے مزاج کی وجہ سے اباجی کا غصہ صابن
کے جھاگ کی طرح جلدی سے بیٹھ جاتا۔ آپا کی شادی
کے بعد ہی اماں، ابا میری بھی شادی جلد کرنا چاہتے
تھے۔ سال پر سال دبے پاؤں سرکتے جا رہے تھے۔
بڑے بھیا کی شادی کے بعد تو اباجی کچھ زیادہ ہی فکر
مند ہو گئے تھے کہ اب میری شادی ہو جانی چاہیے کہ
میں بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر بھی اور اباجی
میرے فرض سے جلد از جلد سکدوش ہونا چاہتے تھے۔
اماں نے میرا جہیز تو آپا کے جہیز کے ساتھ ہی جمع کرنا
شروع کر دیا تھا کہ ہم دونوں اوپر تلے کی بہنیں تھیں مگر
وقت جیسے دوڑنے لگا۔ اباجی یہ آس لیے دنیا سے چلے
گئے کہ میں ان کے سامنے اپنے گھر کی ہو جاؤں۔ ابا
جی کیا گئے دنیا سے کہ گھر پر ویرانی چھا گئی۔ گھر کا ایک
فرد کیا کم ہوا لگتا تھا گھر میں سناٹا چھا گیا ہے۔ دل کو
یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اباجی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے
ہیں۔ اباجی کیا رخصت ہوئے، اماں کی جینے کی امنگ
ہی ٹوٹ گئی۔ اباجی کی جدائی میں اماں مہینوں میں ایک
دم ہی بوڑھی نظر آنے لگیں۔ اماں کے بال جو اب تک
سیاہ تھے ان میں تیزی سے سفیدی چمکنے لگی تھی۔

بھاگتے دوڑتے وقت نے اماں کو میری طرف
سے مایوس کر دیا تھا۔ رشتے آتے مگر طے نہیں ہو
پاتے تھے یا لڑکے والوں کی طرف سے انکار ہو جاتا
یا اماں کی طرف سے انکار بس رشتہ طے نہ ہونے کا
کوئی نہ کوئی بہانہ ہو جاتا۔ میں نے اماں سے کہا
عدیل کی شادی کر دیتے ہیں، وہ مجھ سے تین سال
چھوٹا تھا۔ اماں نے مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے میں
نے کوئی انوکھی بات کہہ دی ہے۔ کچھ رک کر بولیں۔
”اور تم کیا بونہی بہن بھائیوں کی خدمت کرتی
رہو گی؟“

رہو گی؟

”اماں میں اپنی زندگی سے بہت مطمئن
ہوں۔ آپ ربیعہ کے لیے سوچیں۔“
”نہیں، پہلے تم اپنے گھر کی ہو جاؤ مجھے ابھی
ربیعہ کی اتنی فکر نہیں ہے، وہ تم سے بہت چھوٹی ہے۔
مجھے تمہاری فکر زیادہ ہے جس تیزی سے تمہاری عمر
بڑھ رہی ہے میں اس سے خوف زدہ ہوں۔“ وہ ماں
تھیں اپنے انداز میں سوچتی تھیں۔ میں خود کو بہت
خوش نصیب سمجھتی تھی کہ مجھے اتنی ساری محبتیں حاصل
تھیں صرف ایک محبت کی کمی سے میری زندگی
میں کوئی خلا نہیں تھا۔ ضروری تو نہیں انسان جو چاہے
وہ سب اس کی مرضی کے مطابق ہو جائے۔

اماں بڑے بھیا کے بیٹے اذلان کو بہت چاہتی
تھیں پہلے بیٹے کی پہلی اولاد جو تھی..... وہ سب کی آنکھ
کا تارا تھا تو آپا کی بڑی بیٹی سمیلہ اماں کی پہلی نواسی
نے بھی اماں کی بے پناہ محبتیں حاصل کی تھیں۔ اماں تو
اسے پندرہ، پندرہ دن اپنے پاس رکھتی تھیں۔ اماں نے
بڑے بھیا اور آپا کے بچوں کو خوب گودوں کھلایا تھا۔

اچھا خاصا وقت اور گزر گیا۔ بڑی آپا اور
بڑے بھیا کی شادی کے بعد کسی اور کی شادی کا
سلسلہ ہی شروع نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ
اماں میرے رخصت ہونے کا انتظار کر رہی تھیں
اور پھر آخر کار سب کے بہت زیادہ اصرار پر اماں
عدیل کی شادی کرنے پر تیار ہو گئیں..... ایک بار پھر
گھر میں رونق اتر آئی۔ ایک عرصہ گزرنے کے بعد
گھر میں شادی کی تقریب ہو رہی تھی۔ سب ہی بہت
خوش اور مسرور تھے۔ ان دنوں اماں اپنی پرانی بیماری
کی وجہ سے بہت پریشان تھیں، دو چار قدم گھر میں
چلتیں تو سانس پھولنے لگتی مگر ان دنوں وہ خوش بھی
بہت تھیں۔ ان کے بچوں کے ساتھ پوتے پوتیاں
نواسہ، نواسی بھی اس خوشی میں شریک تھے ہر وقت
گھر میں ایک رونق سی رہتی۔

عدیل کی شادی بہت دھوم دھام سے ہو گئی تھی

اور اب اماں گھر میں پھر سے چھوٹے بچے کی چہکار کے لیے بے چین تھیں اور پھر اللہ نے ان کی جلد ہی سنی۔ شادی کی اپنی ورسری آئی تو شاہانہ کی گود میں دو مہینے کی اجالا آچکی تھی۔ اجالا کی آمد سے جیسے پورے گھر میں اجالا سا بکھر گیا تھا۔ اماں تو پوتی کو دیکھ کر بہت نہال ہو گئی تھیں ہم سب کی آنکھ کا تار بھی وہ بڑی آپا پیار سے اسے خوب صورت جہاں کہتی وہ تھی ہی اتنی پیاری..... میری آنکھوں کا نور جو پیدا ہوتے ہی میری گود میں آئی اور میں نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا جو میرے دل کی ٹھنڈک..... ربیعہ کی جان تو چاچو اور سب کی لاڈلی..... وقت پھر اپنی ڈگر پر چل پڑا..... اماں کی آنکھوں میں اب بھی میری شادی کا خواب سجا ہوا تھا جب کوئی رشتہ آتا وہ آنکھوں میں خواب سجالتیں مگر جب قسمت ساتھ نہ دے تو سارے خواب ٹوٹتے چلے جاتے ہیں۔ اماں کا خواب بھی بار بار بکھر رہا تھا ٹوٹ رہا تھا اور ان کے چاروں طرف مایوسی کے اندھیرے تھے۔

☆☆☆

وہ گرمیوں کے دن تھے اماں نے صبح ہی کہا تھا ”نازیہ آج جا کر لان کے سوٹ لے آنا ربیعہ کو بھی ساتھ لے جانا.....“ میں اور اماں صبح سویرے ہی اٹھتے تھے۔ شروع سے ہی صبح سات بجے انہیں چائے پینے کی عادت تھی یوں اماں کے ساتھ مجھے بھی عادت پڑ گئی۔ میں کچن میں جا کر چائے کا پانی رکھ دیتی اور اماں واش روم سے فارغ ہو کر آ جاتیں..... چائے پیتے ہوئے باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا، آج کیا کچے کھا، کیا لانا ہے کہاں جانا ہے۔ چھوٹی بہن ربیعہ ہمیشہ اماں کے پاس ہی مونی تھی۔ اسے دیر سے سوکر اٹھنے کی عادت تھی۔ ہم دونوں بہنیں کم اور دوست زیادہ لگتے تھے جبکہ وہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹی تھی لیکن ہم دونوں میں بے تکلفی بہت تھی۔ ہم دونوں چائے پی کر فارغ ہوتے تو شاہانہ اٹھ جاتی۔ عدیل

اور خلیل بھی اٹھ جاتے آفس جانے کے لیے میں اور شاہانہ مل کر صبح کا ناشتا بنانے میں مصروف ہو جاتے۔ اس دن بھی سب کاموں سے فارغ ہو کر میں اماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ شاہانہ دوپہر کا کھانا دسترخوان پر لگا رہی تھی کہ ہم تینوں دوپہر کا کھانا اماں کے کمرے میں ان کے ساتھ ہی کھاتے تھے۔ جبینی میں نے کھانے کے دوران ربیعہ سے کہا۔

”ربیعہ کھانے سے فارغ ہو کر فائنٹ تیار ہو جاؤ شاہانہ کے لیے حیدری جانا ہے۔“

”اماں مجھے بھی دولان کے سوٹ لینے ہیں۔“ ربیعہ نے فوراً کہا تو اماں مسکراتے ہوئے بولیں۔

”تم دونوں کو شاہانہ کے لیے بھیج تو رہی ہوں، نازیہ سے کہہ دیا ہے سب کے لیے دو، دو سوٹ لان لے کر آئے۔“

”اومائی گریٹ اماں.....“ ربیعہ نے ایک دم ہنستے ہوئے کہا۔

”بس بس زیادہ مکھن نہ لگاؤ بس ذرا جلدی لوٹ آنا۔“ میں برتن سمیٹ کر کچن میں آ گئی۔

ہم دونوں بہنیں تیار ہو کر بازار جانے والے تھے شاہانہ بچی کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں تھی۔ اماں بیڈ کے سرہانے ٹیکے سے ٹیک لگائے آرام سے بیٹھی تھیں۔

”اچھا جاؤ دیر نہیں کرنا جلدی آنا۔“ ہم دونوں بہنیں باہر کے دروازے کی طرف بڑھے تھے کہ اماں کی چیخ نے ہمارے بڑھتے قدم روک لیے..... ہم دونوں نے مڑ کر اماں کے کمرے کی طرف گھبرا کر دیکھا۔

اماں اپنی جگہ بیٹھی ہوئے، ہولے ہولے کانپ رہی تھیں اور ان کے منہ سے مسلسل چیخیں نکل رہی تھیں۔ میں اور ربیعہ تیزی سے اماں کے قریب پہنچ گئے۔ شاہانہ بھی بچی کو گود میں لیے اپنے کمرے سے دوڑی چلی آئی۔

”کیا ہوا ہے..... اماں.....“ میں نے ان کے کندھوں کو تھامتے ہوئے پوچھا مگر اماں کچھ بتا ہی

نہیں رہی تھیں۔ ان کا پورا جسم بری طرح سے لرز رہا تھا۔ اچانک نہ جانے اماں کو کیا ہو گیا تھا ہم دونوں بہنیں بری طرح رونے لگیں۔ شاہانہ نہ بھی اماں کی کیفیت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ ہم تینوں کے علاوہ گھر میں کوئی بھائی بھی اس وقت موجود نہیں تھا۔ شاہانہ نے محلے کے کسی لڑکے سے کہہ کر ٹیکسی منگوا لی کہ اماں کو اسپتال لے کر جانا بہت ضروری تھا۔ اماں نے بڑی مشکل سے ٹوٹے ٹوٹے لفظوں میں بتایا تھا کہ جیسے ان کے جسم میں کرنٹ دوڑ رہا ہے۔ تکلیف کی شدت کی اذیت سے ان کے ہونٹ اور آنکھ کے پونے تک پھڑ پھڑا رہے تھے اماں کی اذیت ناک تکلیف دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میری اور ربیعہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

نہ جانے کس طرح اماں ہم لوگ لے کر اسپتال پہنچے۔ بھائیوں کو فون کیا وہ سب بھی اطلاع ملتے ہی اسپتال پہنچ گئے۔ چند گھنٹوں میں اماں کے ڈھیروں ٹیسٹ ہو گئے۔ انہیں فوری طور پر اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا تھا۔ ڈاکٹر نے فالج کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ اماں ایک ہفتہ اسپتال میں زیر علاج رہیں..... تو کافی بہتر ہو گئیں۔

اسپتال سے چھٹی مل گئی تھی ڈاکٹروں نے دوا میں تجویز کر دی تھیں۔ ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا اسپتال سے آئے کہ اماں کو اچانک ایک صبح اسی طرح درد ہوا پھر بے ہوش ہو گئیں۔ فوراً اماں کو اسپتال پہنچایا گیا۔ اماں آئی سی یو میں تھیں ہم سب بہت پریشان تھے کسی کو قرار نہیں تھا۔ جب ڈاکٹر نے اماں کا سی ٹی اسکین کرایا اور رپورٹ آئی تو ہم سب بہن بھائیوں کو ایک چپ سی لگ گئی۔ اماں کو برین ٹیومر ہو گیا تھا۔ اس بری خبر نے ہم سب کو ہراساں کر دیا تھا۔ اماں نے ساری زندگی ٹی بی کے ساتھ بڑی ہمت اور حوصلے سے زندگی گزاری تھی کہ اب یہ اذیت ناک بیماری بھی انہیں ہونی تھی۔ جب انہیں

ماں کے نام

ستارے بھی تم ہوئے
چاند بھی سو گیا
سارا جہاں
اے ماں
تیرے بغیر اداس ہو گیا
دل لحد لحد پکھل رہا ہے
جیسے میرے اندر سب کچھ مر رہا ہے
میرے چار سو
تہائی ہے ویرانی ہے
زندگی اپنی نہیں جیسے پرانی ہے
تیرے بغیر
میں ہر لمحہ جیتی
ہر لمحہ مرتی ہوں
کوئی اسم مجھے بتا جاتی
کوئی تو ہنر مجھے سکھا جاتی
کہ جن کی مائیں مرجاتی ہیں
وہ پھر
کیسے خوش ہو پاتے ہیں
وہ پھر
کیسے جی پاتے ہیں
شاعرہ: نسیم نیازی، لاہور

اچانک جھٹکے لگتے پورا جسم اس طرح پھڑ پھڑاتا کہ اماں کی یہ بے بسی اور تکلیف دیکھ کر ہم سب کی آنکھوں سے اشک جاری ہو جاتے۔ اب اماں کی ایسی حالت ہو گئی تھی کہ ایک ہفتہ کسی طرح گھر میں گزرتا تو دوسرے ہفتے اسپتال میں ایڈمٹ ہونا پڑتا۔ جب سے اماں کو برین ٹیومر تشخیص ہوا تھا وہ چاہتی تھیں میں ہر وقت ان کے پاس ان کے قریب

www.paksociety.com

We Are Anti Waiting WebSite

twitter.com/paksociety1

206 ماہنامہ پاکیزہ مئی 2014ء

بھی تھے۔ میرے اور آپا کے ہاتھوں میں تسبیح تھی اور ہونٹوں پر اماں کی زندگی کی دعا..... سحری کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے اور آپا نے سحری کے لیے چند لقمے لیے تھے۔ عدیل نے صرف پانی کے چند گھونٹ لیے دل بہت گھبرا رہا تھا۔ دل کی بے چینی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ہم سب آئی سی یو کے سامنے ٹہلنے لگے۔ اماں کی حالت بگڑ چکی تھی۔ انہیں خون کی الٹی ہوئی تھی۔ سحری کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ فجر کی اذان شروع ہو چکی تھی کہ ہم سب پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ڈاکٹر نے آئی سی یو سے باہر آکر بڑے بھیا کو بتایا کہ اماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ ہم سب بری طرح رونے لگے بڑے بھیا روتے ہوئے کہنے لگے۔

”اماں ساری زندگی کسی نہ کسی بیماری سے جنگ لڑتی رہیں مگر آج اماں جنگ ہار گئیں..... ہم تہی دست ہو گئے۔“ ہمیں یاد تھا اباجی بھی نویں روزے کو وقت سحر جدا ہو گئے تھے۔

”کیسے خوش نصیب تھے میرے اماں اور اباجی انہیں رمضان شریف کا مبارک مہینہ ملا تھا۔“ میرے کانوں میں آج بھی اماں کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔ نازیہ کہاں ہو اور میں اس آواز پر بے چین ہو جاتی ہوں۔

اماں کی دوسری برسی کے بعد میری بھی شادی ہو گئی۔ مگر اماں کے نہ ہونے کا ملال رہا کہ ان کی آنکھوں میں میری شادی کے خواب ہی سجے ہوئے تھے۔ آج میری بہن ربیعہ مدرزڈے پر مجھے دس کرنی ہے کہ آپ بھی تو میرے لیے ماں جیسی ہیں مگر میں کہتی ہوں مدرزڈے کوئی ایک دن نہیں بلکہ ہماری پوری زندگی ماں کی محبت کی چھاؤں اور پھر یاد کے سائے میں ہی گزرتی ہے۔

ہم تہی دست تو ہو گئے مگر ماں کی دعائیں آج بھی ہمارے ساتھ ہیں۔

نے انہیں بخار کی دوا کھلائی مگر بخار تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

وہ رات ہماری جاگتے گزری میں بار بار اٹھ کر اماں کا بخار چیک کر رہی تھی۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں ماتھے پر رکھ رہی تھی۔ اماں کا بخار کچھ کم ہوا تو وہ سو گئیں۔ مگر ہم سب بہن بھائی جاگ رہے تھے۔ فجر کے وقت اماں کا بخار ایک دم تیز ہوا اور جھٹکے لگنے شروع ہو گئے۔ ہم فوری طور پر اسپتال لے گئے۔ انہیں ایک سو پانچ بخار تھا۔ بی پی شوٹ کر رہا تھا۔ اماں آئی سی یو میں تھیں۔ ہم سب اپنی پیاری ماں کی زندگی کی دعائیں کر رہے تھے۔

اماں کے سب بچے نواسیاں، نواسے، پوتے، پوتی اور اماں کی بھانجی وغیرہ سب موجود تھیں مگر انہیں کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ تو بے ہوش تھیں۔

سب اماں کو دیکھنے آئی سی یو میں جا رہے تھے ایک، ایک کر کے..... میں آئی سی یو میں اماں کو دیکھنے گئی بارگئی..... ہر بار دیکھا اماں کی ایک آنکھ کھلی ہوئی تھی اور نظر ایک طرف کوٹھہری لگی تھی۔ اس کھلی آنکھ میں کسی کا انتظار بے قراری کی جھلک نمایاں تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا اماں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھیں۔ ان کی نظر میں انتظار کی سی کیفیت تھی۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔

”اماں آپ کو جس کا انتظار ہے وہ نہیں آیا۔ وہ نہیں آسکتا اس کی اپنی مجبوری ہے۔ نہ جانے کس پریشانی میں گھر گیا ہے۔“ ہاں اماں کو اپنے بیٹے مشتاق کا انتظار تھا جو ملک سے باہر تھا۔ وہ رات تمام راتوں سے زیادہ کالی رات تھی۔ ربیعہ کارور کو برا حال تھا۔ وہ اماں سے بہت زیادہ لپیٹ چکی تھی۔ سب کو اس کی فکر تھی۔ اماں کو کچھ ہو گیا تو اس کو کیسے سنبھالا جائے گا۔ اسے سمجھا کر شاہانہ کے ساتھ گھر بھیج دیا گیا تھا۔

میں اور آپا اسپتال میں موجود تھے تینوں بھائی

اسی طرح وہ بھی اپنی مرحومہ ماں کا ذکر کرتی رہتیں۔ ان کا چہرہ روشن سا ہو جاتا اماں جتنی بار بھی اپنی ماں کی باتیں جانتیں ہم اتنی ہی توجہ سے سنتے جیسے کہ پہلی بار سن رہے ہوں، اماں اپنی چھوٹی بڑی یادوں کو اپنے ذہن کے کیوس پر تازہ کرتی رہتی تھیں انہوں نے ماں کی یاد کو وقت کی گرد سے مٹنے نہیں دیا تھا۔ وہ یاد کے آئینے کو شفاف کرتی رہتی تھیں اور آج بھی اماں یاد ماضی میں کھوئی ہوئی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ کھانا کھا کر اور رات کی دوا کیں وغیرہ لے کر وہ ماں کی یاد میں کھوئی ہوئی تھیں..... اور میں بھی شاید ان کی تقلید کرتے ہوئے آج اپنی ماں کی یادوں کو کھنگال رہی تھی۔ ☆☆☆

اماں کو دماغی ٹیومر کی بیماری میں مبتلا ہوئے پورا سال گزر گیا تھا اور میں اماں کے ساتھ بھی اسپتال میں تو کبھی گھر میں خدمت میں لگی ہوئی تھی سب بہن بھائی اماں کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ رمضان کا پہلا عشرہ شروع ہو چکا تھا اور اماں ایک بار پھر اسپتال میں ایڈمٹ ہوئی تھیں ہم سب چاہتے تھے اماں جلد از جلد ٹھیک ہو جائیں۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی علاج پر رقم پانی کی طرح خرچ ہو رہی تھی۔ اماں غنودگی میں تھیں مگر چند دنوں بعد اماں کافی بہتر ہو گئیں۔ ڈاکٹر نے روم میں آکر کہا آج ہم ان کی چھٹی کر رہے ہیں۔ اس دن رمضان شریف کا چھٹا روزہ تھا۔ ہم لوگ اماں کو گھر لے آئے تھے۔ دوسرے دن اباجی کی برسی تھی۔ اباجی کی برسی پہ سب بہن بھائی اکٹھا ہوتے تھے۔ آج بھی سب موجود تھے۔ اماں بیڈ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا اماں آج اباجی کی برسی ہے انہوں نے گردن ہلاتے ہوئے میری طرف دیکھا ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بڑے بھیا اماں کے قریب آکر بیٹھ گئے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

”اماں کو تو اچھا خاصا بخار ہو رہا ہے۔“

ہوں اس کا جواب دے.....“ اماں ہنسنے لگیں۔

”نازیہ باجی آپ نے عدیل بھائی کی شادی میں سدرہ کو دیکھا تھا؟“

”اچھا وہ گرین سوٹ والی.....“ ربیعہ نے فوراً ہی ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا تو مجھے بھی یاد آ گیا۔

”اچھا وہ.....“ ہاں وہ لڑکی تو پیاری سی تھی..... کون لوگ ہیں کہاں رہتے ہیں کیسا خاندان ہے۔“ اماں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”اماں سدرہ نے اسی سال گریجویشن کیا ہے کاسٹ کا تو مجھے نہیں پتا مگر کافی پیسے والے لوگ ہیں۔“ فیصل نے بتایا تو اماں بولیں۔

”بس تو پھر رہنے دو مجھے تو اپنے جیسے لوگ چاہئیں..... اور پھر وہی سدرہ جو تمہارے دوست کریم کی بہن ہے ناں بیٹا تھوڑا تو میں بھی ان لوگوں کے بارے میں جانتی ہوں وہ لوگ ہمارے خاندانی پس منظر سے میچ نہیں کرتے۔ بس اس طرح کے ہوں جیسے میری دونوں بڑی بہنوں کے گھرانے ہیں۔“ اماں نے انکار کرتے ہوئے فیصل کو سمجھانا چاہا..... فیصل کا منہ لٹک گیا..... اور مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ فیصل سدرہ کو پسند کرتا ہے۔ یہ انکشاف بھی آج ہی ہوا تھا۔ ☆☆☆

”نازیہ، نازیہ ارے کتنی روٹیاں پکا رہی ہے۔“ اماں کی آواز میرے کانوں سے ٹکرانی تو میں ایک دم چونک گئی۔ اُن کے بارے میں سوچتے سوچتے میں کتنی دور نکل گئی تھی۔

”جی اماں، میں آرہی ہوں۔“ میں نے جلدی سے دو روٹیاں اور پکائیں اور کھانا نکال کر اماں کے کمرے میں آ گئی۔

”اتنی دیر سے کچن میں کیا کر رہی تھی؟ اب اماں کو کیا بتاتی کہ اتنی دیر میں کتنی یادیں ذہن میں تازہ ہو گئی تھیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ جس طرح میں اپنی ماں کو دیکھ کر جیتی تھی

دوسرا اور آخری حصہ

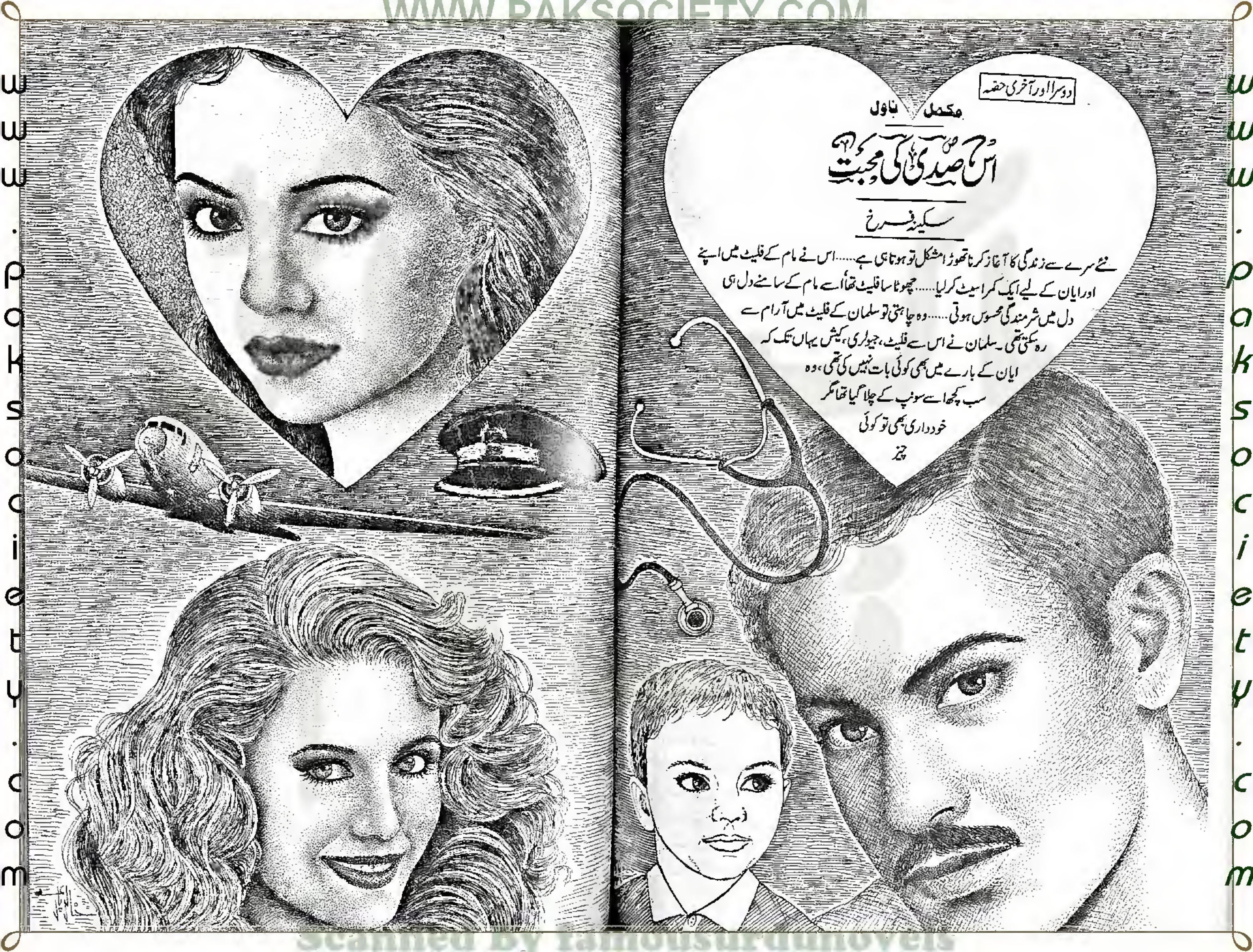
مکمل ناول

اس صیدی کی محبت

سکینہ سرخ

مئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا تھوڑا مشکل تو ہوتا ہی ہے..... اس نے مام کے فلیٹ میں اپنے اور ایان کے لیے ایک کمر سیٹ کر لیا..... چھوٹا سا فلیٹ تھا اسے مام کے سامنے دل ہی دل میں شرمندگی محسوس ہوتی..... وہ چاہتی تو سلمان کے فلیٹ میں آرام سے رہ سکتی تھی۔ سلمان نے اس سے فلیٹ، جیولری، یکیش یہاں تک کہ ایان کے بارے میں بھی کوئی بات نہیں کی تھی، وہ سب کچھ اسے سوئپ کے چلا گیا تھا مگر خود داری بھی تو کوئی

چیز



ہوتی ہے۔ وہ صرف ایمان کو اپنے ساتھ لے آئی تھی اور سب کچھ وہیں چھوڑ آئی تھی۔

مام اس کی دلجوئی میں کوئی کمی نہ چھوڑتے مگر اس کی بے قراری کو قرار نہیں تھا۔ اس نے ایمان کا ایڈیشن مام کے گھر کے قریب ہی اسکول میں کروادیا تھا اور خود اپنی حجاب پہ جانا شروع کر دیا۔ بظاہر تو سب چیزیں سیٹ ہوئی تھیں مگر ایمان..... وہ اتنا آسان ثابت نہیں ہوا تھا جتنا ایمان نے سوچا تھا۔ ایمان اور سلمان کے ساتھ رہنے والا معصوم، بے ضرر، کھلنڈرا اور خوش باش ایمان پہلے خاموش ہوا..... پھر ضدی اور اس کے بعد بدتمیز..... اس کی تان بابا پہ آکے ٹوٹی..... اس کے ہونٹوں پر صرف ایک سوال تھا..... ”بابا کب آئیں گے؟“ ایمان کو اس کی حالت دیکھ کر اپنا بچپن یاد آیا۔

مام کے لاکھ سمجھانے اور جھوٹ بولنے کے باوجود وہ حقیقت تک پہنچ گئی تھی۔ ڈیڈ کی یادوں کے دھندلے سے خاکے اور ان کی تصویر ہمیشہ اس کے حواسوں پر سوار رہی..... ڈیڈ سے محبت اور نفرت کے امتزاج سے جنم لینے والے عجیب و غریب محسوسات ہمیشہ اس کے ساتھ رہے..... مام اسے کبھی مطمئن نہ کر سکی تھیں تو بھلا وہ کیسے ایمان کو مطمئن کر دیتی..... وہ تو اس عہد کا بچہ تھا، کمپیوٹر، نیٹ اور موبائل فون کے دور کی پیداوار تھا..... اپنے باپ کو جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا ایک دم کیسے بھول جاتا..... اور اس کے نہ بھولنے کا مطلب، ایمان کے لیے ایک مسلسل عذاب..... سو اس نے ایمان سے کھل کے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”تمہارے بابا نے ہم سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ اس نے ہمت جمع کر کے اس سے کہہ دیا۔ ”کیوں..... آپ نے ان کے ساتھ کیا کیا تھا؟“ وہ خفگی سے بولا۔

ایمان نے حیرت سے اس سات سالہ مرد کو دیکھا۔ وہ شکل صورت اور انداز میں بالکل سلمان کی کاپی تھا۔ ”تمہیں لگتا ہے اس میں میرا قصور ہے.....؟“ ایمان کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔ انسان ہر ایک سے جھوٹ بول سکتا ہے، کسی کو نظروں سے گرا سکتا ہے اور خود بھی کسی کی نگاہوں میں چھوٹا بن سکتا ہے، اتنی تکلیف نہیں

ہوتی جتنی اولاد کی زبان سے بے اعتباری کے دو جملے اس کے ہوتے ہیں۔

”مجھے کیا معلوم.....؟“ اس نے کندھے اچکائے۔ ”یہ میری غلطی نہیں ہے..... وہ خود پاکستان میں اپنے والدین کے ساتھ رہنا چاہتے تھے اس لیے وہاں چلے گئے.....“ وہ قدرے غصے سے بولی۔ ”تو..... پاکستان میں اپنے والدین کے ساتھ رہنے کا مطلب ہمیں چھوڑ دینا تو نہیں ہونا چاہیے۔“ اس نے جرح کی۔

”انہوں نے ہمیں بھی پاکستان لے جانا چاہا تھا.....“ ایمان نے دل پر پتھر رکھ کے اعتراف کیا..... ایمان نے اب تک مہذب شہریوں کی طرح اپنے اور سلمان کے اختلافات کو بچے سے دور رکھا ہوا تھا مگر یہ بچہ.....؟ ”تو ہم ان کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟“ وہ خفگی سے بولا۔

”اس لیے کہ ہم پاکستان میں نہیں رہ سکتے۔“ ایمان ناراضی سے بولی۔ ”کیوں نہیں رہ سکتے.....؟“ وہ حیرت سے بولا۔ ”تم پاکستان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ وہاں رہنا آسان نہیں ہے..... ہم جس ماحول کے عادی ہیں وہاں ایسا ماحول نہیں ہے..... سب کچھ مختلف ہے۔“ اس نے ایمان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں پاکستان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا..... لیکن وہاں بابا ہوتے، وہ ہمارا خیال رکھتے پھر وہاں دادا وادی بھی ہوتے وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتے.....“ وہ جلدی سے بولا۔

”بہر حال اب کچھ نہیں ہو سکتا.....“ ایمان نے جلدی سے بات ختم کی۔

”کیوں نہیں ہو سکتا.....؟ آپ بابا کو بتائیں کہ ہم پاکستان آ سکتے ہیں.....“ وہ اس کا ہاتھ تمام کے بولا۔ ”دیکھو ایمان، ابھی ہم تانی کے گھر اتنی مشکلوں سے سیٹ ہوئے ہیں، فی الحال کہیں بھی جانا ممکن نہیں۔“ اس نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے سلمان کا ہاتھ تھپتھپایا۔ ”مگر کیوں.....؟“ وہ جھنجھلا کے بولا۔

”اس لیے کہ پاکستان جانے کے لیے بہت

سارے روپوں کی ضرورت ہوگی فی الحال میرے پاس نہیں ہیں۔“ اس نے اسے بھلانے کی کوشش کی۔ ”بابا سے منگوالیں.....“ اس نے جھٹ مسئلے کا حل پیش کیا۔

وہ چند منٹ بغور اپنے بیٹے کی شکل دیکھتی رہی جو اس وقت صرف اور صرف سلمان کا بیٹا محسوس ہو رہا تھا..... ”تمہیں ہر قیمت پر بابا ہی کے ساتھ رہنا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”جی.....“ ایمان نے زور سے سر ہلایا۔ ”اور میں..... میرا کیا ہوگا.....؟“ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

”آپ کو بھی ہمارے ساتھ رہنا ہوگا.....“ اس نے ہمارے پر زور دے کر کہا۔ ”اوکے.....“ ایمان نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائی۔

ایمان کو اپنی کامیابی کی اتنی جلدی امید نہیں تھی۔ وہ ایک دم خوش ہو کر بولا۔ ”ہم کب جائیں گے؟“

”بہت جلد.....“ ایمان نے اسے گلے لگالیا۔ وہ اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو ایمان سے چھپاتا چاہتی تھی۔

☆☆☆

اسے آئے ہوئے کافی دن گزر گئے تھے مگر بابا کا موڈ ٹھیک ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ اس سے زیادہ بات چیت نہیں کر رہے تھے، وہ مسلسل ایمان سے کاٹیکٹ کی کوششوں میں مصروف تھے اور ناکامی کی صورت میں ان کے ماتھے کی سلوٹوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے ذرائع سے معلوم کیا تھا، ایمان اس کا فلیٹ چھوڑ کے جا چکی تھی، اس نے اپنا نمبر بھی بدل لیا تھا..... وہ چاہتا تو کسی نہ کسی طرح اس سے رابطہ کر سکتا تھا مگر وہ خود ہی ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اور ایمان ٹھنڈے دل و دماغ سے اس معاملے کے بارے میں سوچ بچار کر سکیں مگر بابا..... وہ تو نہ خود سکون میں تھے نہ اسے رہنے دے رہے تھے۔

”میں نے کہا بھی تھا عائلہ سے کہ واپسی پر یہاں کا

چکر ضرور لگائے..... اب دیکھ لو اسے، کراچی سے واپس آئے ہوئے دو ماہ سے زیادہ ہو رہا ہے مگر توفیق ہی نہیں ہو رہی کہ ملنے آجائے، بس خالی فون کر کے خیریت کا تبادلہ کر لیتی ہے اور دو چار بہانے کھڑے نہ آنے کا جواز بناتی ہے۔“ ای اسے چائے کا کپ تھما کے جھنجھلا کے بولیں۔ شاید بابا نے بھی انہیں کچھ سچ و شیریں سنایا تھا جس کی بجز اس وہ عائلہ پر نکال رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے چائے کے گھونٹ بھرنے لگا..... اسے عائلہ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”اب دیکھو، پنڈی اور اسلام آباد میں فاصلہ ہی کتنا ہے..... تمہارے بابا کی تو شدید خواہش تھی کہ وہ اس پوسٹنگ کے دوران ہمارے ساتھ ہی رہے مگر محترمہ بہانے بنا کر وہیں مقیم ہو گئیں، اس پر مہربانی کرتی رہیں کہ وہ ایک اینڈ ہمارے ساتھ گزار لیا کرتی تھیں اب اس سے بھی گئیں..... تمہارے بابا..... کی صحت ٹھیک ہوتی تو وہ خود نہ جانے کتنے چکر اس کے پاس لگا لیتے اب مجبور ہیں تو بیٹھ کر کڑھتے رہتے ہیں۔“ وہ بہت غصے میں نظر آ رہی تھیں۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی بڑی ہو.....“ سلمان نے انہیں ٹھنڈا کرنا چاہا۔

”میں کچھ نہیں جانتی..... کل ہفتہ ہے، تم اس کے پاس جاؤ اور اسے زبردستی یہاں لے آؤ، تمہارے بابا کا علاج صرف اسی کے پاس ہے۔“ وہ اس بار جھکے ہوئے لہجے میں بولیں۔

”کون..... میں.....؟“ وہ زور سے چونکا۔ ”ہاں تم.....“ وہ پھر سے تیز ہو گئیں۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے..... کم از کم یہ کام وہ ہرگز کرنا نہیں چاہتا تھا..... اس کی خاموشی دیکھ کر ای پھر بولیں۔

”سلمان تم ہمیشہ ہر چیز گڑبڑ کیوں کر دیتے ہو..... کرتے پہلے اور سوچتے بعد میں ہو..... اور ساری گڑبڑ کا آغاز وہاں سے ہوا جب تم نے عائلہ سے شادی کا انکار کیا..... اگر تم عائلہ سے.....“ وہ کہتے کہتے رکیں۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر بولیں۔ ”تو شاید زندگی اتنی مشکل نہ ہوتی..... نہ تمہاری اور نہ میری.....“ وہ انہیں اور

کمرے سے باہر نکل گئیں۔
 ”عائلہ سے شادی.....“ اس نے کوفت کے عالم میں سوچا۔ ”سارا قصور ایمان کا ہے..... اگر وہ ساتھ آجاتی تو شاید یہ دن دیکھنا نہیں پڑتا..... ایمان اور ایمان کی موجودگی میں بابا کا موڈ یقیناً اچھا رہتا..... وہ ٹھیک ہوتے تو ماما بھی خوش رہتیں..... کسی کو عائلہ کی یاد نہیں آتی.....“ اس نے سارا ملکہ ایمان پر ڈال دیا۔
 ”صدی عورت..... نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ اور میرا بیٹا.....“ اس کی نگاہوں میں ایمان کی شکل گھوم گئی۔ خون نے ایک دم جوش مارا۔
 ”ایمان میرا بیٹا ہے اور میرا ہی رہے گا، چاہے میرے پاس ہو یا دور.....“ اس نے خود کو تسلی دی۔

☆☆☆

”دنیا میں بہت سارے کام انسان کو دوسروں کی خوشی کے لیے کرنے پڑتے ہیں۔“ امی نے اسے صبح ناشتے کے بعد ہی جانے کا حکم دے دیا تھا۔
 ”آپ بھی چلیں.....“ وہ کچھ بدکا۔
 ”میں جا کے کیا کروں گی.....؟ آدھے گھنٹے کا تو راستہ ہے فافٹ جاؤ اور وہ جس حالت میں ہے اٹھا کے لے آؤ۔“ انہوں نے جلدی سے کہا۔
 ”آپ بھی کمال کرتی ہیں، میری جیسے اس سے بڑی بے تکلفی ہے، جاؤں اور اٹھا کے لے آؤں..... نہ جانے وہ میس میں ہوگی یا کہیں نکل ہوگی۔“ وہ جھنجھلایا۔
 ”وہ وہیں ہے..... بے چاری بڑی بیمار ہے۔“ ذرا آئے ناں، علاج کرتی ہوں اس کا۔“ امی نے ٹھیک کر کہا۔
 ”تھک آ کے اس نے چابی اٹھائی اور منہ بناتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ سلمان کو دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ اسے سلمان کی آمد کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔ اسے سلام کرنا، بیٹھے کو کہنا سب کچھ اس کے ذہن سے نکل گیا اور وہ ہوتقوں کی طرح کھڑی اس کی شکل دیکھتی رہی۔
 ”السلام علیکم.....“ ناچار سلمان نے خود ہی سلام میں پہل کی۔
 ”وعلیکم السلام..... پلیز بیٹھے.....“ اسے ایک دم ہوش آیا۔
 ”چاہے کتنی ڈگریاں حاصل کر چکی ہو..... کندھوں پر رینک بھی سجالیا ہو..... مگر رہی وہی ہونق کی ہونق.....“ سلمان نے بیٹھتے ہوئے سوچا۔ بارہ برس بعد بھی اس کا

امپریشن سلمان کی نگاہوں میں بہتر ہونے سے بال، بال بچ گیا تھا۔ سلمان کو اسے دیکھ کر شدید مایوسی ہوئی..... وہ شاید کسی بہتر عائلہ وقار کا تصور لے کر آیا تھا۔
 چیزوں کو جب غلط ہوتا ہوتا ہے، خود بخود ہوتی چلی جاتی ہیں..... وہ رات کے کپڑوں میں تھی جو تلکبے ہو چکے تھے..... نہ منہ ہاتھ دھو یا تھانہ فریش ہوئی تھی..... اوپر سے سر میں ڈھیروں تیل بھی تھوپ رکھا تھا..... چھٹی منانے کا آئینہ یا اسے بڑا مہنگا پڑا تھا۔ وہ سلمان کی آمد کی خبر سن کر اتنی حواس باختہ ہوئی کہ اپنے حلیے کا خیال ہی نہیں رہا۔
 ”چاچو تو ٹھیک ہیں ناں.....؟“ سلمان کے چہرے پر سب کچھ نارمل نظر آتے ہوئے دیکھ کر اس نے گہری سانس لے کر پوچھا۔
 ”ہاں..... بالکل ٹھیک ہیں، تمہیں یاد کرتے رہتے ہیں.....“ سلمان نے بے نیازی سے کہا۔
 ”ان سے بات ہوئی تھی..... میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں نہیں آسکوں گی اور انہوں نے مان لیا تھا۔“ اس کے ذہن میں آیا کہ شاید چاچو نے انہیں اسے لانے کو بھیجا ہے..... اس لیے جلدی سے یوٹی۔
 ”انہوں نے مان لیا ہوگا مگر ای..... نہیں مانی ہیں وہ تمہارا انتظار کر رہی ہیں..... چلو۔“ سلمان نے کچھ اس طرح کہا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”میرے پاس فالٹو دقت نہیں ہے۔“

”لیکن میری طبیعت کچھ خراب ہے اس لیے میں جا نہیں سکوں گی.....“ اس کے حواس بحال ہوئے تو اسے اپنے حلیے کا خیال آیا اور اس نے اپنے تیل لگے بالوں کو دوپٹے میں چھپاتے ہوئے جلدی سے کہا۔
 سلمان نے بغور اس کی طرف دیکھا۔
 ”طبیعت تو تمہاری بالکل ٹھیک لگ رہی ہے، البتہ حلیہ خراب ہے، جاؤ حلیہ ٹھیک کرو اور چلو۔“ اس نے حکم سنایا۔

”وہ دراصل.....“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔
 ”باقی باتیں گھر جا کے.....“ سلمان نے اپنی رست وراج پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں وہی پرانا رعب اور بے نیازی تھی جس سے وہ اپنے بچپن میں خائف رہا کرتی تھی۔ ناچار اسے اٹھنا پڑا۔ تیار ہوتے

ہوئے وہ سلمان کے بارے میں ہی سوچتی رہی..... گزرے ہوئے وقت نے سلمان پر بہت اچھا اثر چھوڑا تھا..... وہ پہلے سے کہیں زیادہ صحت مند اور خوب نظر آ رہا تھا..... صرف مزاج پہلے ہی کی طرح تھا..... کڑوا، کسلا..... کچھ لوگوں کو قدرت اتنی فیاضی سے نوازتی ہے کہ ان پر رشک آتا ہے..... وہ دوسروں کو اپنے آگے کچھ بھی نہ سمجھیں تو یہ ان کا حق محسوس ہوتا ہے۔

اسے سلمان میں ہمیشہ کشش محسوس ہوتی تھی مگر سلمان نے اسے کبھی اہمیت نہیں دی..... وہ اس کے گھر میں بن بلائے مہمان کی طرح ہر وقت پہنچی رہتی تھی اور اس کے باپ، ماں اور بہن کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتی تھی..... بس ایک سلمان تھا جو اسے گھاس ڈالنے کا روادار نہیں تھا..... سلمان کی بے نیازی کے پیچھے کون سا محرک تھا، یہ وہ کبھی نہیں جان پائی تھی۔ سلمان نے اسے ٹھکرادیا، ایمان سے شادی کرنی، اسے کسی بات پر اعتراض نہیں تھا..... اس نے کون سا کبھی اپنے رویے سے اسے کوئی امید دلائی تھی۔

”اچھا ہوا جو عزت رہ گئی.....“ اس نے سوچا.....
 ”اچھا ہوا جو میرے پاگل پن کی سلمان کو کبھی ہوا نہیں گئی ورنہ آج میں اس سے آنکھیں کیسے ملاتی۔“ اس نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دی۔

”اور اس عزت کے رہ جانے کی خوشی منانے کے سلسلے میں جو کچھ تم کر رہی ہو اس کا انجام جانتی ہو.....؟“
 ہیر ڈرائیر سے بال سکھاتے ہوئے اس کے ہاتھ لمحے بھر کو ساکت ہو گئے۔

”شادی کر لو عائلہ ورنہ ابھی صرف ماں اور بہنیں اعتراض کر رہی ہیں، کل کو ساری دنیا تم پہ انگلی اٹھائے گی..... حقیقت عموماً تلخ ہوتی ہے..... اب اور کس بات کا انتظار ہے..... آج وہ آیا ہے، کل کو اس کی بیوی اور بیٹا بھی آجائیں گے۔“ اس نے ہینڈ بیک میں ضرورت کی دو چار چیزیں ڈالیں، ہونٹوں پر ہلکی سی لب اسٹک لگائی اور کمرے سے باہر آ گئی..... وہ اب خود کو پُر اعتماد محسوس کر رہی تھی۔ سلمان اسی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا، اس کے ہاتھ میں سیل فون تھا..... نہ جانے کسی سے میسجنگ کر رہا تھا یا کوئی گیم کھیل رہا تھا، اس قدر محو تھا کہ عائلہ کی آمد کی

علم ہوا تو انہوں نے ناراضی سے انہیں دیکھ کر کہا۔
”کیوں.....؟ میں جانتی ہوں، وہ نہ آنے کے لیے بہانے بنا رہی ہے۔“ ارسلہ فوراً بولیں۔

”میں بھی جانتا ہوں کہ وہ نہ آنے کے بہانے بنا رہی ہے اور تم یقیناً اس کے بہانوں کی وجہ بھی جانتی ہو۔“ انہوں نے مٹی سے کہا۔

”اگر اس کی وجہ سلمان ہے..... تو میرے حساب سے یہ بالکل بیکار وجہ ہے..... برسوں گزر چکے ہیں اس واقعہ کو، میرے خیال میں اسے اب بھول جانا چاہیے۔“ ارسلہ نے جلدی سے کہا۔

”تمہارے حساب سے، تمہارے خیال میں وغیرہ، وغیرہ..... تم اپنا حساب اور اپنا خیال اپنی حد تک ہی محدود رکھو تو بہتر ہوگا۔ ہر ایک کا اپنا خیال اور اپنا حساب ہوتا ہے، عائلہ جو کچھ اپنے لیے سوچ رہی ہے وہی درست ہے۔“ وہ مزید برہمی سے بولے۔

”اچھا..... یہ بات ہے تو یہ اصول تو آپ پر بھی لاگو ہو سکتا ہے بریگیڈیر صاحب.....“ وہ طنز سے مسکرائیں۔

”دیکھو..... عائلہ بہت ہی حساس بنی ہے..... اس نے میرے لیے، میرے بچوں سے بڑھ کر کیا ہے اور وہ مجھے میرے بچوں سے زیادہ عزیز ہے..... مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا ہوں۔ کم از کم اسے پریشان تو نہیں کرنا چاہیے۔“ انہوں نے بیگم کی بات کو گول کرتے ہوئے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔

”آپ کا کیا خیال ہے میں عائلہ کی دشمن ہوں.....؟ بریگیڈیر صاحب..... حقیقت تو یہ ہے کہ عائلہ مجھے بھی بے حد عزیز ہے..... میرے ذہن میں بھی سلمان کے لیے ہمیشہ عائلہ ہی کا خیال رہا..... مگر کچھ چیزوں کا تعلق ہمارے چاہنے یا سوچنے سے نہیں بلکہ قسمت سے ہوتا ہے..... جو گزر گیا اس کا ماتم کرنا بیکار ہے..... آگے کا سوچیں.....“ وہ افسردگی سے مسکرائیں۔

”اب عائلہ کی شادی ہی سارے مسئلوں کا حل ہے..... اس کی شادی ہو جائے تو میں سکون سے مر سکوں گا، ورنہ مجھے موت کے بعد بھی بے سکونی رہے گی۔“ ان

خلوص اور عہد کی پاسداری جیسی روایات کو مشرق کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں خواہ مخواہ مشرقی لوگوں کو سارے کریڈٹ دے دیتے ہیں مگر مام کے کيس میں تو سب کچھ الٹا ہو گیا تھا۔ مام نے مغربی عورت ہوتے ہوئے اس شخص سے وفا بھائی جو انہیں بے قصور بیچ منجھدار میں دھوکا دے کر چھوڑ گیا تھا۔ چاہے وہ دل میں اس سے کتنی نفرت کرتیں مگر تنہا کسی روایت کی طرح محنت کرتے ہوئے انہوں نے اس کی اولاد کو اپنے پیروں پر کھڑا تو کر دیا تھا..... کوئی کیا کر لیتا جو مام اسے بچپن میں کسی ملاجی ادارے کے سپرد کر کے اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کر لیتیں اسے بالکل اسی طرح بھلا دیتیں جیسے ڈیڈ۔ نے بھلا دیا تھا۔ اس نے مام کا سر سہلاتے ہوئے عقیدت سے ان کے ماتھے پر بوسا دیتے ہوئے سوچا۔ وہ نیند کی دواؤں کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ مام کا سوچتے سوچتے اس کی سوچوں کا رخ اپنی طرف مڑ گیا۔

”اور میں..... جو ساری عمر باپ کی شفقت اور اس سے ملنے والے تحفظ کے احساس کو ترستی رہی..... جس شخص کو سب کچھ سمجھ کے زندگی کا سانچا چنا وہ بغیر کسی ٹھوس جواز کے بے یار و مددگار چھوڑ گیا۔ اکلوتا لاڈلا بیٹا مجھ سے خواہ مخواہ بدظن ہو کے باپ کے پاس جانا چاہتا ہے..... جس خوش خبری کے انتظار میں میں نے اور سلمان نے..... بے شمار پلاننگز کی تھیں اس کی آہٹ ملتے ہوئے خوشی کے بجائے یہ خیال آئے کہ یہ خوشی واقعی خوشی ہے یا بوجھ..... جس سے جتنی جلدی ہو چھٹا چھڑا لیا جائے..... کیا رہا میرے پاس.....؟“ وہ کراہی..... اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر مام کے سنہری بالوں میں جذب ہو گئے..... وہ بے آواز رونی رہی۔

اس کا ڈپریشن روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے کبھی خود پر ترس آتا کبھی سلمان پر غصہ.....
”مام..... آپ تو جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔“ ان نے آنسو پونچھتے ہوئے مام کو دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔ فی الوقت اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی۔

☆☆☆

”تمہیں عائلہ کو لانے کے لیے سلمان کو نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔“ بریگیڈیر وقاص کو جب بیگم کی کارگزاری کا

ہو جاتی۔“ اس نے جواب دیا۔

”پھر بھی اتنی پابندیوں سے بھرپور ملازمت کو جاری رکھتے ہوئے دوسروں کے لیے وقت نکالنا بڑی بات ہوتی ہے..... تم نے یقیناً مشکل سے ہی شیج کیا ہوگا..... بہر حال میں تمہارا احسان مند ہوں..... میرے حصے کی فتنے داری تمہیں اٹھانی پڑی۔“ اس کے لہجے میں احسان مندی کے بجائے غرور کی بو آ رہی تھی..... نہ جانے سچ تھا یا عائلہ کو محسوس ہوا۔

”آپ کو احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جو کچھ میں نے کیا وہ احسان نہیں تھا بلکہ میرا فرض تھا.....“ اس نے قدرے تیز لہجے میں جواب دیا۔

”اوکے..... جیسا تم سمجھو.....“ اس نے بھر کدھے اچکائے۔

پھر سارے راستے دونوں کے درمیان مزید بات چیت نہیں ہوئی..... گھر آ گیا اور وہ خاموشی سے کار سے باہر آ گئی۔

”شکریہ.....“ اس نے رسوا کہا۔

”نہیں شکریے کی ضرورت نہیں ہے..... میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے بلکہ اپنی ماں کے حکم کی تعمیل کی ہے۔“ اس نے کدھے اچکائے اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ عائلہ نے چند سیکنڈ اس کی پشت کو گھورا اور پھر اس کے پیچھے چل دی۔

☆☆☆

مام کا فلو بڑھ گیا تھا..... بے چاری بستر پر جا پڑی تھیں تو اسے اندازہ ہوا کہ مام نے اس کی کتنی ساری ڈسٹے داریوں کا بار اٹھایا ہوا تھا۔

وہ تو بس اسپتال اور جاب تک ہی محدود ہو کے رہ گئی تھی..... مگر کے کاموں کے علاوہ ایمان کے اسکول کا پک اینڈ ڈراپ، اس کی پڑھائی، اسے کہنی دینا خود بخود مام کے حصے میں آ گیا تھا اور وہ خوش دلی سے سب کچھ نبھاتے تھیں..... اس کے لیے مام بہت بڑا سہارا تھے انہیں اس حالت میں دیکھ کر ایمان کا حوصلہ جواب دینے لگا۔

”زندگی میں پہلے ہی مسائل کم تھے کیا.....؟“ اسے مام پہ افسوس ہوتا..... لوگ نہ جانے کیوں وفا

اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔

”چلیں.....“ وہ اس کے سر پر ہنچ کر بولی۔

”ہاں.....“ وہ ایک دم چونکا..... فون سے نظریں اٹھا کر اس کے اوپر ڈالیں اور جیسے ہٹانا بھول گیا..... اسٹاکس لباس، خوب صورتی سے کٹے ہوئے بالوں اور ہلکے، ہلکے میک اپ کے ساتھ وہ بہت پرکشش لگ رہی تھی، تھوڑی دیر پہلے والی عائلہ وقار سے قطعی مختلف..... عائلہ کو ہلکی سی الجھن ہوئی اس نے قدم آگے بڑھا دیے..... اگلے ہی لمحے وہ اس کا ہم قدم تھا۔

اسے سلمان کے ساتھ چلتے ہوئے ایک انجانے سے تحفظ کا احساس ہوا۔ کار میں بیٹھنے تک دونوں کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے سلمان ہی نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”تو تمہارا آری میں جانے کا خواب پورا ہو گیا۔“ جی.....؟“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”اچھی لائف ہوتی ہے..... آئی مین، جن کو پسند ہے ان کے لیے اچھی ہوتی ہے۔“ اس نے کدھے اچکا کے کہا۔

”میں آری میں چاچو کی وجہ سے مٹی ہوں.....“ اس نے اسے کچھ جتانے کی کوشش کی۔

”جانتا ہوں، جو کام میں نہ کر سکا وہ تم نے کر دکھایا..... واہ.....!“ اس نے ایک دم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا..... وہ ایک دم گڑبڑا گئی۔

”تمہیں بھی تو شہر، شہر گھومنے کا شوق تھا خیر کہاں کہاں سرور کر چکی ہو؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”پاس آؤٹ ہونے کے بعد ملتان ہی ایم جی وہاں تین سال رہی پھر اس کے بعد جہلم پھر ابھی پنڈی.....“ اس نے اپنے سفر کی روداد سنائی۔

”بابا کے ایک کے وقت تم جہلم میں تھیں ناں.....؟“ اس نے کریدا۔

”جی.....“ اس نے سر ہلایا۔

”اسی نے بتایا تھا، تم نے بابا کا بہت خیال رکھا۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”جہلم سے اسلام آباد دور ہی کتنا ہے..... اچھا ہے جو اس وقت میں ان سے قریب تھی اگر دور ہوتی تو مشکل

سارے دکھ درد بھول گئی تھی۔ سلمان کو ایمان سے محبت تھی لیکن اسے ایک بیٹی کی تمنا بھی تھی۔ بلکہ وہ اکثر کہتا تھا کہ اسے کم از کم چار بچے چاہئیں۔ ایمان اوپر، اوپر سے آنکھیں دکھائی لیکن دل ہی دل میں اس کی خواہش بھی یہی تھی کہ اس کی بہت بڑی بیٹی ہو۔ وہ محبت اور رشتوں کے تحفظ کو ترسی ہوئی تھی۔ اکیلی مام کا ساتھ اور محبت شاید اس کے اطمینان کے لیے ناکافی تھا۔ تنہائی اس کے لیے کسی عفریت سے کم نہ تھی۔ ایمان کی خود سری، مام کی بیماری گوکہ وہ اسپتال سے گھر آچکی تھیں مگر پوری طرح ٹھیک نہیں تھیں، سلمان کی سنگ دلی۔ وہ کس، کس کو روتی۔ ڈپریشن کے علاوہ اور کیا نتیجہ نکلتا تھا؟

☆☆☆

لنچ پر چاچی نے کافی اہتمام کروادیا تھا۔ سلمان غائب تھا۔ اور چاچو ہمیشہ کی طرح اس سے خفا۔ چاچی اسے اصرار کر کے کھلا رہی تھیں۔ اور وہ ان کی خوشی کی خاطر کھائے جارہی تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے اچانک چاچو کو کچھ یاد آیا۔

”تمہیں شاہنواز یاد ہے؟“ شاہنواز بخاری۔۔۔۔۔ آئی مین میجر شاہنواز بخاری۔۔۔۔۔ عاتکہ ایک دم چونکی۔

”شاہنواز بخاری۔۔۔۔۔ کرل نواز بخاری کے بیٹے؟“

”ہاں، ہاں وہی۔۔۔۔۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

”کیا ہوا شاہنواز کو؟“ ارسلہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہوا تو کچھ نہیں۔۔۔۔۔ بس اس کی پوسٹنگ ہوگئی ہے پنڈی ایم ایچ۔۔۔۔۔“ انہوں نے نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔“ عاتکہ کو کچھ یاد آیا۔ ”تو جس آئی

اسپیشلسٹ۔ میجر ڈاکٹر شاہنواز کی آمد کی خبر گرم ہے وہ بھی

موصوف ہیں۔۔۔۔۔“ عاتکہ نے اڑتی پڑتی خبروں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اب اسے متوجہ ہونا پڑا۔

”جی چاچو۔۔۔۔۔ سنا ہے میں نے بھی، وہ شاید اگلے

ہفتے تک پہنچ جائیں۔“

سر لینے کا مشورہ دینے آئے تھے۔ مگر چاچو۔۔۔۔۔ انہوں نے پہلی بار اس موضوع پر کچھ کہا تھا۔ اس سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔

”وقار بھائی اور بھابی بتاتے رہتے ہیں کہ تمہارے بہت سے اچھے رشتے موجود ہیں۔۔۔۔۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔۔۔۔۔ تم بھی اب ویر مت کرو۔“ انہوں نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

وہ بھی اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔۔۔۔۔ اسے عجیب سی شرمندگی کا احساس ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

اسے سلمان کے جانے کے بعد بارہا اس کی یاد آئی۔۔۔۔۔ کبھی غصہ آیا تو کبھی رونا۔۔۔۔۔ مگر اسے سلمان کی ضرورت پہلی بار محسوس ہوئی تھی۔

اس نے ایمان کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ وہ روتے روتے سوچا تھا۔۔۔۔۔ اس کے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں۔

ایمان کا غصہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ ماں سے برسر پیکار رہنے لگا تھا۔ اس دن بھی اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس نے ماں سے صاف، صاف کہہ دیا تھا۔

”اگر آپ ڈیڈ کے پاس نہیں جانا چاہتیں تو آپ کی مرضی۔۔۔۔۔ صرف مجھے ان کے پاس بھیج دیں۔“ ایمان کے لیے یہ دوسرا بڑا جھکا تھا۔۔۔۔۔ وہ شوہر کے بعد بیٹے کو بھی کھونے کی ہمت اپنے اندر نہیں رکھتی تھی۔ اور ایمان اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔۔۔۔۔ اسے ہر قیمت پر باپ کے پاس ہی جانا تھا۔

”اور اس کا باپ۔۔۔۔۔؟ وہ پاکستان میں اپنے خاندان کے ساتھ مزے میں ہوگا۔۔۔۔۔ اسے اپنے بیٹے کے لیے ٹاپ محسوس کیوں نہیں ہو رہی؟ کیا وہ واقعی اب ہمارے لیے اپنی زندگی کی ساری گنجائشیں ختم کر چکا ہے؟“ ایمان کے ذہن میں ان گنت سوالات تھے۔

اسے اپنی بے وقعتی کا احساس ہونے لگا۔

سلمان کے ساتھ گزرا ہوا وقت۔۔۔۔۔ اس کی کہی ہوئی باتیں اسے یادوں کی شکل میں آکر تکلیف پہنچانے لگی تھیں۔ سلمان کے ساتھ اس نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔۔۔۔۔ اتنا اچھا کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی کے

بولیں۔

”آجائے گا۔۔۔۔۔ کسی کام سے گیا ہوگا۔۔۔۔۔“ پھر عاتکہ کی طرف مڑ کے بولیں۔

”چلو بھی اب تم آگئی ہو، اپنے چاچو سے کپ شپ کرو، میں تمہارے لیے اچھا سا لنچ بنوا رہی ہوں۔“ آج سارا دن وہ بریگیڈیر صاحب کی توپ کے گولوں سے محفوظ رہنے والی تھیں، یہ خیال ان کے لیے جانفزا تھا۔۔۔۔۔ وہ فوراً اس جگہ سے ہٹ جانا چاہتی تھیں۔

”میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“ عاتکہ اٹھنے لگی۔

”ہرگز نہیں، تم اپنے چاچو کے ساتھ بیٹھی رہو ان کی سنتی اور اپنی سناتی رہو۔۔۔۔۔ ویسے بھی تمہیں آرام کرنا چاہیے۔“ وہ جلدی سے کہتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

”ہاں، ہاں بالکل آئیں جانے دو۔۔۔۔۔ یہ تو آج یوم نجات منائیں گی ورنہ روز کتنا بھی بھاگیں میرے ہتھے چڑھ ہی جاتی ہیں اور نہ چاہتے ہوئے انہیں مجھے برداشت کرنا پڑتا ہے۔“ چاچو نے انہیں کمرے سے نکلنے دیکھ کر زور سے ہانک لگائی۔

”چاچو آپ بھی ناں بس۔۔۔۔۔“ وہ محبت سے ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کے بیٹھ گئی۔

”یہاں آؤ اور میرے پاس بیٹھو۔۔۔۔۔“ انہوں نے اسے اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جی چاچو۔۔۔۔۔“ وہ اٹھ کر ان کے برابر آ بیٹھی۔

”تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ ایک دم بولے۔

”جی کہیے۔۔۔۔۔“ وہ ہمدن گوش ہو گئی۔

”عاتکہ۔۔۔۔۔ تم اب شادی کرلو۔“ وہ اچانک بولے۔

عاتکہ چاچو سے کم از کم اس فرمائش کی قطعی توقع نہیں کر رہی تھی۔ سویری طرح گڑبڑا گئی۔

”جی۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ بیٹا تم نے ہمیشہ میرا مان رکھا ہے۔

مجھے تم پر فخر ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم میری اس بات کو رد نہیں کرو گی۔“ انہوں نے آہستہ آہستہ کہا۔

ماما۔۔۔۔۔ بابا، شہلا آئی، عاتکہ آئی یہاں تک کہ اس

بار کاشف بھی اس سے اشاروں کنایوں میں شادی

کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

”اس کی شادی کوئی بہت بڑا ایٹھ نہیں ہے۔ اس کے لیے بے شمار رشتے آتے رہتے ہیں۔ وہ خود ہی تیار نہیں ہوتی۔“ انہوں نے حیرانی سے کہا۔

”تو یہی تو ایٹھ ہے بیگم صاحبہ۔۔۔۔۔ حیرت ہے کہ آپ نہیں سمجھ پارہی ہیں۔۔۔۔۔“ انہوں نے پڑمردگی سے کہا۔

وہ ایک دم چونکیں۔

”السلام علیکم۔۔۔۔۔!“ عاتکہ کی آواز ان کی پشت سے ابھری۔

”وعلیکم السلام!“ دونوں ایک ساتھ بولے۔۔۔۔۔ عاتکہ چاچو کے قدموں میں جا کے بیٹھ گئی انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”کیسی ہے میری بیٹی۔۔۔۔۔؟“ عاتکہ کے لیے ان کا لہجہ محبت سے بھرپور اور شہد سے زیادہ میٹھا تھا۔۔۔۔۔ ارسلہ نے مسکراہٹ دبا کے بیٹے کی طرف دیکھا۔

وہ انہی کی طرف دیکھ رہا تھا مگر اس کی نگاہوں میں شکایت سی تھی۔

”ہونہ۔۔۔۔۔ یہی چاہو سیان تو بابا کو اچھی لگتی ہیں۔“ سلمان نے بے دردی سے سوچا۔

وہ چاچو سے مل کر چاچی کے گلے آگئی۔

”پھر کیسی رہی۔۔۔۔۔؟“ وہ اس کے کان میں منگنا لیں۔۔۔۔۔ جواباً اس نے انہیں شکایتی نگاہوں سے دیکھا۔

”چلو۔۔۔۔۔ ہر بار ہماری بیماری آزاری میں تم آ کے

ہماری خدمت کرتی ہو اس بار میں نے تمہیں، تمہاری خدمت کرنے کے لیے بلوایا ہے۔“ وہ نہیں۔

”نہیں، اب طبیعت ٹھیک ہے میری۔“ وہ جلدی سے بولی۔

سلمان کے لیے محبت بھرے یہ نظارے دیکھنا

دوبھر ہو گیا۔۔۔۔۔ وہ مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”اب یہ صاحب زادے کہاں چل دیے؟“

بریگیڈیر صاحب نے چونک کر بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ

ہمیشہ مشکل سوالات کا رخ ارسلہ کی طرف کر دیتے تھے۔

ان کا دل چاہا کہ کہیں کہ جہاں آپ وہاں میں۔۔۔۔۔ مجھے کیا

معلوم۔۔۔۔۔ مگر چہرے پر خواہ مخواہ کی مسکراہٹ سجا کے

سلمان کا گراف اسی قدر نیچے آ جاتا۔ نہ جانے کچھ تھا یا اس کا وہم..... اور رہی سہی کسر عالمک نے آری میں جا کے پوری کر دی تھی۔

”بابا کی لاڈلی۔“ اس نے چڑ کر سوچا۔ ”بلکہ چچی.....“ اس نے اپنی سوچ کی سچ کی۔

اس کا رخ زید کے اسپتال کی طرف تھا۔ زید بھی اس کا بچپن کا دوست تھا۔ اس کے والد بھی آری آفیسر تھے..... اتفاقاً تین جگہوں پر ان کی پوسٹنگ بریگیڈیر وقاص کے ساتھ ایک ہی اسٹیشن پر رہی..... وہ دو سال کی پوسٹنگ لکھنے گزارنے سے ان کی اور بچوں کی دوستی تو بچی ہوئی ہی تھی..... جب سے وہ اسلام آباد واپس آیا تھا زید اور دانیال کے پاس ہی اس کا زیادہ وقت گزرتا تھا۔ زید کا پی سیٹل زندگی گزار رہا تھا..... اس کی بیوی بھی ڈاکٹر تھی، بہن اور بہنوئی بھی ڈاکٹر سو پورے خاندان نے مل کر اپنا ایک چھوٹا سا اسپتال قائم کیا تھا جو اپنی اچھی سروس اور ماحول کی وجہ سے لوگوں کا اعتماد جیت چکا تھا۔

زید نے اسے بھی کسٹنس کی آفر کی تھی..... سلمان نے اپنی کوالیفیکیشن اور تجربے کی بنیاد پر یقیناً اس سے کہیں بہتر کی امید رکھی ہوئی تھی مگر کسی اور جگہ بات نہ بن پانے کی وجہ سے وہ اب اس آفر کو قبول کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔ اسپتال پہنچنے پر پتا چلا کہ ڈاکٹر زید راؤنڈ پر ہیں..... وہ اس کے کمرے ہی میں بیٹھ گیا..... زید کا اسٹنٹ ڈاکٹر فہد کمرے میں داخل ہوا۔

”اوہ..... سر آپ..... السلام علیکم.....“ وہ اسے دیکھ کر چونکا۔

”وعلیکم السلام..... کیا حال چال ہیں بیک میں.....؟“ وہ مسکرایا۔

”بالکل ٹھیک..... آپ سنائیں۔“ وہ اخلاقیات نبھانے اس کے سامنے آ بیٹھا۔

”میں بھی بالکل ٹھیک ہوں..... تم اگر بڑی ہو تو اپنا کام جاری رکھو.....“ اس نے جلدی سے کہا۔

”ڈیوٹی ٹائم میں بڑی تو رہنا ہی پڑتا ہے.....“

سر زید بھی بس اتنے ہی ہوں گے۔“ وہ مسکرایا۔ جیسی ڈاکٹر زید مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔

”سر اس سے پہلے کہ میں آپ دونوں دوستوں کی

”چھوڑیں بھی اب..... آپ ہر بار.....“ ارسلہ بے بسی سے بولیں۔

”صبا کینیڈا میں ہوتی ہے.....؟“ عالمک نے ماحول بوجھل ہوتے ہوئے دیکھ کر جلدی سے پوچھا۔

”ہاں..... اس کی شادی وہیں ہوئی ہے.....“ بخاری کے بچے سے..... دو بچے ہیں اس کے بھی.....“ انہوں نے بتایا۔

”اور شاہنواز..... اس کے بیوی بچے.....؟“

چاچی کو کچھ یاد آیا۔

”شاہنواز نے ابھی تک شادی نہیں کی.....“

بھنے کے بعد اسے سانس لینے کی فرصت ہی نہیں ملی.....

کورسز، ہارڈ ایریا، اسکاٹمنٹ وغیرہ..... سب نے مل کر اسے کنوارا رہنے پر مجبور کر دیا.....“ انہوں نے قہقہہ لگایا۔

”کرٹل بخاری.....“ ارسلہ کچھ کہنے لگیں۔

”کرٹل نہیں بھئی بریگیڈیر بخاری..... وہ بھی میری طرح اسی رینک پر ریٹائر ہوئے تھے..... کیا بھول گئیں آپ.....؟“ وہ جلدی سے بولے۔

”یاد ہے..... بس زبان پر کرٹل چڑھ گیا ہے۔“ وہ جھینپ کے بولیں۔

”میرے لیے بھی ان کی زبان پر کیپشن چڑھ گیا تھا..... جب تک کرٹل نہیں بن گیا کیپشن ہی کہتی رہیں۔“

وہ ہنسے اور عالمک کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تو بہ ہے آپ سے بھی..... میں جائے گا کہہ سکے آتی ہوں.....“ ارسلہ نے وہاں سے اٹھ جانے میں عاقبت سمجھی..... ان کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔

عالمک کو ہنسی آ گئی..... چاچو کا ہلکا پھلکا موڈ اسے بھی مطمئن کر گیا تھا۔

☆☆☆

عالمک کی موجودگی میں اسے گھر پہرے رکے رہنا بہتر معلوم نہیں ہوا..... بابا کا کیا بھروسہ اس کے سامنے ہی کلاس لینے سے باز نہ آئیں..... کم از کم عالمک کے سامنے اسے اپنی ہنک منظور نہیں تھی۔

اسے عالمک وقار سے بچپن ہی سے پُر خاش تھی.....

عالمک اس کے بابا کی جتنی توجہ دیتی تھی، بابا کی نگاہوں میں

”اگر میں ملتان نہ آتی تو اس جگہ کو بھلا کیسے دیکھ پاتی.....؟“ اسے ملتان کینٹ اور صدر سے ملے کر رہنا

ملتان سب کچھ بے حد پسند آئے تھے۔ اولیائے دین کی سرزمین کی فضا میں ایک عجیب سا سکون تھا جو اس نے اس کم عمری میں بھی محسوس کر لیا تھا۔

وہاں اس نے شاہنواز بخاری کو پہلی دفعہ دیکھا تھا..... ضد، اکڑ پن اور بے نیازی میں وہ سلمان سے کسی

طور کم نہیں تھا۔ دونوں لڑکے سر شام ہی اپنی، اپنی کرکٹ کٹ اٹھا کے گراؤنڈ کی طرف نکل جاتے..... کبھی جم چلے جاتے، صبا نادیہ اور وہ اکٹھا اپنی وکچپیوں کے سامان

ڈھونڈا کرتیں..... چاچی اور صبیحہ آٹنی واک کے لیے نکل جاتیں اور چاچو انکل بخاری کے ہمراہ جم کا رخ کرتے..... اس نے سب سے زیادہ ملتان کینٹ میں

اپنے ایک ماہ کے قیام کو انجوائے کیا تھا اور وہ اس کے حافظے میں محفوظ تھا۔

شاہنواز بخاری سے دوسری ملاقات اس کی آری میڈیکل کالج میں ہوئی تھی..... جس سال اس کا وہاں ایڈمیشن ہوا تھا..... شاہنواز پاس آؤٹ ہو کے جا رہا

تھا..... شاہنواز نے تو اسے قطعی نہیں پہچانا مگر وہ شاہنواز کو پہچان گئی تھی۔ وہ اپنی اکیڈمک لائف میں آؤٹ

اسٹینڈنگ پر فارمنس دینے کے بعد ویسے بھی سب کی نگاہوں میں تھا..... پہلے سے بھی زیادہ اکڑ اور

بے نیازی سے بھرا انداز عالمک کو اس کے قریب جانے سے روکے..... وہ عالمک کے کالج میں آتے ہی پوسٹنگ پر

چلا گیا تھا مگر اس کے نام کی بازگشت کافی عرصے تک کوئی نہ رہی تھی..... اس نے شاہنواز کے بارے میں ساری

یادیں چند لمحوں میں کھنگال لیں۔

”شاندار کیریئر رہا ہے شاہنواز کا..... بڑے اچھے

کورسز کیے ہیں اس نے..... سیاجن میں پوسٹنگ تھی اس کی، شاندار کارکردگی دکھا کے آ رہا ہے۔ اس سال بورڈ

ہے اس کا سائنٹسٹ کرٹل بن جائے گا.....“ چاچو نے دقت سے کہا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ ارسلہ نے سر ہلایا۔

”اگر سلمان نے بھی آری جوائن کی ہوتی تو.....“

چاچو کہتے کہتے رک گئے۔

”بخاری سے بات ہوئی تھی میری اس نے بتایا۔“

”بھائی اور صبیحہ بھابی کیسے ہیں؟“ ارسلہ نے پوچھا۔

”ٹھیک ہیں سب..... حرے میں.....“ بریگیڈیر وقاص مسکرائے۔

”بڑے دنوں کے بعد آپ لوگوں کی بات چیت ہوئی ہے..... کہاں غائب ہو گئے تھے سب.....“ ارسلہ

نے فیض کو برتن اٹھانے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”غائب تو کہیں نہیں ہوئے تھے بس مصروف تھے..... صبا کے پاس کچھ غرضہ کینیڈا رہ کر آئے ہیں.....“

پھر عمرے کے لیے چلے گئے..... اب میری یاد آئی موصوف کو.....“ انہوں نے ڈانٹنگ چیئر سے اٹھتے ہوئے لاڈلج کا رخ کرتے ہوئے جواب دیا۔ عالمک ان

کے پیچھے پیچھے تھی..... چاچو کی باتیں ماضی کے دروازے کھول رہی تھیں۔ کرٹل بخاری، چاچو کے کورس میٹ تھے

پھر ملتان کینٹ میں پوسٹنگ کے دوران ان کے ٹیکسٹ ڈور نمبر بھی..... فورٹ کالونی میں دونوں کے گھر ساتھ

ساتھ تھے۔ چاچو اور وہ دونوں اس وقت لیفٹیننٹ کرٹل تھے اور اپنی، اپنی یونٹس کمانڈ کر رہے تھے۔

شاہنواز ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا..... سلمان کا کلاس فیلو..... دونوں اس وقت نامکھ میں تھے..... صبا

نادیہ کی کلاس فیلو تھی..... صبیحہ آٹنی، چاچی کی بیسٹ فرینڈ..... سو دونوں خاندانوں میں بہت دوستی اور قربت تھی، وہ

گرمیوں کی چٹیلوں میں ملتان جا رہی تھی تو گھر میں سب نے ڈرایا تھا۔

”بے وقوف..... ملتان کی گرمی تمہیں روسٹ کر دے گی.....“ شہلا آپی نے کہا تھا۔

”مگرو، گرمی، گدا، گورستان۔“ ملتان کے چار گھاف مشہور ہیں.....“ نامکھ آپی نے اس کی معلومات میں

اضافہ کیا۔

”ہم تو وقاص بھائی سے کہہ رہے ہیں کہ وہ خود ہی پوری فیلو کو لے کر کراچی آ جائیں اور تم وہاں جانے کی

ضد کر رہی ہو.....“ ای نے اسے گھر کا..... لیکن اس کی ضد ختم نہیں ہوئی اور اس نے ملتان جا کے دم لیا..... اور وہاں پہنچ کے اس نے اپنے فیصلے کو بار بار سنا رہا۔

طریقے سے کام کر کے دیکھ لیں..... میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں.....“ زید نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”تھینک یو..... میں برسوں سے جوائن کر لوں گا.....“ سلمان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی.....
لیکن اس کا ذہن پھر بھی الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

چاچو کا گھر اس کے لیے اجنبی نہیں تھا..... وہ بچپن سے ہی ان کے پاس بے تکلفی سے رہنے کی عادی تھی..... کتنے اسٹیشنز اور کتنے گھر اس نے چاچو کے حوالے سے ہمیشہ اپنے ہی سمجھے تھے..... اور یہ تو ویسے بھی ان کا ذاتی گھر تھا..... لیکن اس گھر پر اسے کبھی پہلے جیسا استحقاق محسوس نہیں ہوا..... اس سے تو اچھے وہ سرکاری گھر تھے جہاں اجنبیت کا احساس نہیں تھا..... اب کیا ہو گیا ہے.....؟ سارا فرق شاید سوچ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ گھر ایمان کا ہے..... چاہے وہ یہاں نہ رہتی ہو تب بھی..... اور میں خود اس گھر میں رہتے ہوئے بھی ہمیشہ اجنبی رہوں گی.....“ اس نے ہونٹ چباتے ہوئے سوچا۔

رات ہو چکی تھی..... وہ گیسٹ روم میں سونے کے لیے آ چکی تھی..... دن بہت اچھا اور ہلکا پھلکا گزر رہا تھا..... شاید اس کی وجہ یہ بھی رہی ہو کہ سلمان رات میں دیر سے گھر واپس آیا تھا..... اس وقت جب کھانا ختم ہو رہا تھا..... اور وہ باہر سے کھا کے آیا تھا اور سیدھا اوپر ہی چلا گیا..... شاید اس کے معمولات کی تبدیلی عاملہ کی وجہ سے تھی۔

”میں نے ان کا آخری بکاڑا کیا ہے.....؟“ عائشہ نے سوچا۔ بچپن اور نوجوانی میں وہ اسے قابل توجہ نہیں سمجھتا تھا..... اس نے اس کو شریک حیات بنانے کے قابل بھی نہیں سمجھا..... ٹھیک مگر اب کیا ہے.....؟“ اب اس طرح انور کرنا اسے اپنی ہلک محسوس ہو رہا تھا۔

”اسی کو پتا چلے گا کہ میں نے ویک اینڈ یہاں گزارا ہے تو وہ بہت خفا ہوں گی..... ہفتے کی دونوں چھٹیاں بستر میں گزار لیتی تو زیادہ اچھا ہوتا.....“ مگر اب کیا ہو سکتا تھا وہ تو یہاں آ گئی تھی اور کل کا دن بھی گزارنے والی تھی۔
”چاچو تو خوش ہوئے ہیں ناں..... اور چاچی بھی.....“ اس نے اپنے دل کو تسلی دی۔

زور دے کر کہا۔
”میرے بھائی تم مانویا نہ مانویہ حقیقت ہے..... یہ جو ہمیں اسپتال ہر روز بے شمار لوگوں سے کھینچ بھرے ہوئے نظر آتے ہیں..... سرکاری اسپتال میں تو وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہاں مفت کا علاج دستیاب ہے وہ بھی اگر ہو جائے تو.....“ وہ کہتے کہتے رکا..... پھر بولا۔ ”مگر برائیوٹ اسپتال میں حقیقتاً بیمار کم اور بیماری کے خوف میں مبتلا لوگ زیادہ آتے ہیں..... وہ لوگ بڑے، بڑے ناموں والے ڈاکٹرز کے پاس..... جا کے اپنا چیک اپ کروانے پر اطمینان محسوس کرتے ہیں باریک باریک ٹیسٹ کروانا خیر سمجھتے ہیں اور آج کل تو ویسے بھی معلومات بہت ہو گئی ہیں لوگوں کو..... ڈاکٹرز کے پاس بیٹھ کر برابر سے معلومات کا تبادلہ ہوتا ہے بہر حال ڈاکٹرز کی تجویز کردہ دوائیں کھا کے وقتی طور پر وہ مطمئن ہو جاتے ہیں..... مگر اس کے بعد پھر سے انہیں یہ خیال ستانا شروع کر دیتا ہے کہ نہ جانے اب تک ان کے خون میں مزید کون، کون سی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہوں گی۔ کہیں کوئی خرابی تو واقع نہیں ہو گئی اور یہ سوچ کر وہ دوبارہ ڈاکٹر کے پاس دوڑے چلے آتے ہیں اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب خواہ مخواہ کے ٹیسٹ اپنا اثر دکھانا شروع کر دیتے ہیں اور واقعی انہیں علاج کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔“ زید نے تفصیلاً بتایا۔

”چلو یہ تو ان پیسے والوں کی کہانی سنار ہے ہو جن کے پاس دولت بہت زیادہ ہے اور خرچ کرنے کا انہیں کوئی بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔“ سلمان نے اس کی بات پر پورا یقین نہ کرتے ہوئے کہا۔

”بات پیسے کی نہیں ہے سلمان..... نفسیات کی ہے..... ہم لوگ اندیشوں، خوف اور واہموں میں جلا تو م بننے چلے جا رہے ہیں اور اپنی انہی کمزوریوں کی وجہ سے جگہ جگہ خوار ہو رہے ہیں۔“ زید نے افسوس سے کہا۔
”بہر حال میں اپنے کسی بھی مریض کا کوئی غیر ضروری ٹیسٹ نہیں کرواؤں گا یہ تمہیں ابھی سے بتا رہا ہوں بعد میں مجھ پر کوئی دباؤ مت ڈالنا.....“ سلمان نے وارننگ دی۔

”ڈاکٹر سلمان..... یو آر ویلکم..... آپ ضرور اپنے

معاشرے میں سروائیو کرنے کے لیے بہت کچھ ایسا بھی کرنا پڑتا ہے جو خود انہیں بھی ناگوار گزرتا ہے۔“ زید نے صاف، صاف بات کی۔

”میں جانتا ہوں..... لیکن اور فارماسیوٹیکل کمپنیز کا ایک ڈاکٹر سے کیا رشتہ ہے..... اور ڈاکٹر کہیں مجبور ہوتا ہے تو وہ کہیں دباؤ میں آ جاتا ہے اور کبھی، کبھی لالچ کا شکار بھی ہو جاتا ہے مریض کے غیر ضروری ٹیسٹ کروانے اور اسے غیر ضروری ادویات استعمال کروانے والے ڈاکٹرز کا ضمیر بالآخر سو جاتا ہے اور اسے سب کچھ مارل لگنے لگتا ہے۔“ سلمان نے رخ انداز میں کہا۔

”تم ابھی یہاں کے لوگوں کی نفسیات سے واقف ہی نہیں ہوئے ہو.....“ زید نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ سلمان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”جب میں نے پریکٹس شروع کی تھی، میں تمہیں اس دور کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔“ ڈاکٹر زید نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میرے پاس درمیانی عمر کی ایک خاتون آئیں..... انہیں ایک معمولی سا عارضہ تھا۔ میں نے مرض کی تشخیص کی، احتیاطاً ایک ٹیسٹ بھی کروالیا..... رپورٹ کلیئر تھی سو میں نے انہیں ایک دو ضروری دوائیں دے کر فارغ کر دیا..... مجھے یقین تھا کہ اس سے جلد ٹھیک ہو جائیں گی..... غیر ضروری ٹیسٹ کروائے نہ تھے..... دواؤں کی لمبی قطاریں تحریر کیں..... یہ میری ایمانداری تھی مگر ہوا کیا..... وہ خاتون مطمئن ہی نہیں ہوئیں..... میں جہاں کام کرتا تھا وہ اسی اسپتال میں مجھ سے سینئر ایک بڑے نام والے ڈاکٹر کے پاس تشریف لے گئیں انہوں نے ان کی ای سی جی، الٹراساؤنڈ، ایکس رے اور ڈیٹرون بلڈ ٹیسٹ کروائے..... دکھانا تو کچھ تھا ہی نہیں، ہوتا تو خیر..... اس کے بعد انہیں مہنگی، مہنگی آٹھ دس دوائیں تجویز کر دیں اور وہ نسخہ لے کر خوش، خوش چلی گئیں..... ایسے لوگوں کے بارے میں بھلا تم کیا کہو گے.....؟“ اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

”یقیناً ایسی سوچ کے لوگ بھی ہوتے ہیں لیکن تم سب کو ایک ہی لالچی سے نہیں ہانک سکتے۔“ سلمان نے

محفل میں مغل ہوں..... پلیز یہ واؤ چز سائن کر دیں اور مجھے اجازت دیں۔“ فہد نے جلدی سے زید کے سامنے فائلز رکھتے ہوئے کہا۔

زید نے سائن کر کے فائل فہد کے حوالے کی اور وہ اجازت لیتے ہوئے باہر چلا گیا۔
”لیب کے ریلز تھے۔“ ڈاکٹر زید نے اسے مطلع کیا۔

”کیا مطلب..... کیا تمہارے اسپتال میں لیب کی بھی سہولت ہے؟“ وہ حیرانی سے بولا۔
”نہیں یار..... اسپتال میں تو صرف بلیکشن پوائنٹ ہے..... سیمپلو یہاں سے کلکٹ کر کے لیب بھیج دیے جاتے ہیں اور وہاں سے رپورٹ تیار ہو کے آ جاتی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اور ہر رپورٹ..... تمہیں کتنے پرسنٹ مل جاتا ہے؟“ سلمان نے چبھتا ہوا سوال پوچھا۔ جواب میں زید نے زور دار قہقہہ لگایا..... پھر خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”مریضوں کے ٹیسٹ تو کروانے ہی پڑتے ہیں، اس میں عجیب کیا بات ہے..... اور تمہیں اعتراض کس بات پر ہے..... ٹیسٹ پر یا کیشن پر؟“
”اعتراض کرنے والا میں کون ہوں..... مگر مریضوں کے بے شمار غیر ضروری ٹیسٹس کے میں حق میں نہیں ہوں اور آج کل یہی ہو رہا ہے.....“ اس نے کندھے اچکائے۔

”پورا ملک ہی کیشنز پہ چل رہا ہے، مختلف قسم کے مافیاز کے ہاتھوں کھیل کھیلا جا رہا ہے۔“ اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

”ہاں مگر نہ جانے کیوں میڈیکل پروفیشن کے ساتھ جو ایک تقدس کا احساس وابستہ ہے وہ اس قسم کی باتوں سے مجروح ہو جاتا ہے۔“ سلمان نے جواب دیا۔
”دیکھو سلمان، اب جب تم پاکستان آ ہی گئے ہو اور یہاں کے سیٹ اپ میں شامل ہونے کے بارے میں سنجیدہ بھی ہو تو تمہیں اس قسم کی بے شمار کڑوی گولیوں کو نگلنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے..... اسپتال اور ڈاکٹر پہ بھی بہت سارے پریشرز ہوتے ہیں..... انہیں اس

”کیا ہوا.....؟“ اس نے پریشان ہو کے پوچھا۔
 ”نیچے آ جاؤ..... بابا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے..... اسپتال لے جانا ہوگا.....“ وہ کہہ کر فوراً مڑ گیا۔
 ”اللہ خیر.....“ اس کے دل سے صدا نکلی۔

اس نے بالکل وقت ضائع نہیں کیا..... اپنا موبائل اٹھایا اور جس حلیے میں تھی اسی طرح سلمان کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ نیچے چاچی کی حالت غیر تھی..... ان کی آنکھیں رو رو کے سوجھی ہوئی تھیں..... چاچو نیم غنودگی کے عالم میں تھے۔

”کیا ہوا.....؟“ اس نے چاچو کی نبض تھاتھتے ہوئے چاچی کی طرف دیکھا۔

”صبح فجر کی نماز کے لیے اٹھے تو تھوڑے ست تھے..... کہنے لگے کہ درد ہو رہا ہے اور کمزوری محسوس کر رہا ہوں..... اس کے تھوڑی دیر بعد گر گئے..... میں سلمان کو بلانے کے لیے دوڑی..... سلمان آ گیا اس نے انہیں دیکھا ایبویٹنس کے لیے فون کیا..... نہ جانے اب کیا ہوگا.....“ وہ ہاتھ مل کے دوبارہ رونے لگیں..... چاچو کی نبض بہت آہستہ چل رہی تھی..... اس نے ان کا ہاتھ آہستہ سے بیڈ پر رکھ دیا اور چاچی کو گلے لگا کے تھپتھپنے لگی..... خود اس کا انداز دل بیٹھا جا رہا تھا۔

”ایبویٹنس آگئی ہے۔“ سلمان نے آ کے بتایا۔
 انہیں اسٹریچر کی مدد سے ایبویٹنس میں منتقل کیا گیا..... سلمان ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا..... اس نے بھی ساتھ جانے کی کوشش کی تو سلمان نے اسے روک دیا۔

”نہیں..... تم امی کے ساتھ رکو..... میں اسپتال پہنچ کے کال کروں گا۔“ سلمان کا لہجہ حتی تھا..... اس وقت اس کی نظر میں وہ صرف عالمہ تھی..... ڈاکٹر عالمہ نہیں..... اسے سلمان کا انداز بہت برا لگا..... لیکن چاچی کو سنبھالنا بھی ضروری تھا..... اس نے انہیں پانی پلایا اور تسلی دینے لگی۔

”پریشان مت ہوں..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
 ”عالمہ مجھے ابھی اسپتال جانا ہے..... تم مجھے وہاں لے چلو.....“ انہوں نے بے بسی سے کہا۔
 ”ہم دونوں چلیں گے.....“ اس نے انہیں لپٹاتے

ایمان ایک سمجھ میں نہ آنے والے خوف کے حصار میں چلی جاتی..... مام اسے آتش دان کے قریب بٹھاتیں..... گرما گرم چاکلیٹ والا دودھ پینے کو دیتیں اور لاسٹوائٹ اور سنڈریلا کی کہانیاں بھی سناتیں اس کا دھیان ضرور بٹ جاتا مگر خوف اپنی جگہ رہتا.....

وہ کافی بڑی ہو گئی تھی مگر مام کے ساتھ سوتی تھی..... اسے اکیلے سونے سے ڈر لگتا تھا۔ بڑے ہو کے اس نے یہ جانا کہ وہ اس وقت عدم تحفظ کا شکار تھی۔

وہ دوبارہ صوفے پر آ کے بیٹھ گئی..... باہر کی برف پڑ رہی تھی کہ نمبر پچھتر سے نیچے جا چکا تھا..... لیکن اس کا گھر گرم تھا..... آتش دان تو اب پرانی چیز بن چکا تھا..... اب تو گھر اور اپارٹمنٹ سینٹرلی ایر کنڈیشنڈ ہونے لگے تھے جن سے باہر کی سردی یا گرمی کا اندر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اس کے باوجود اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے..... اسے اپنے بچپن والے گھر کا آتش دان یاد آیا..... جہاں مام اور ڈیڈ بیٹھ کر اپنے ہاتھ تپا کرتے تھے..... ڈیڈ اسے گود میں بٹھالیتے اور وہ بھی اپنے ننھے سنے ہاتھوں کو آگے بڑھاتی..... ڈیڈ اس کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیتے اور اس کے ہاتھ دو منٹ میں گرم ہو جاتے پھر وہ چلے گئے..... اور ایمان کے ہاتھوں کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر گئے۔ ان کے جانے کے بعد اکیلی مام اسے اس خوف سے بھی باہر نکال نہیں پاتیں..... یہ کام سلمان نے کیا تھا..... سلمان کے مضبوط ہاتھوں کو تھامنے کے بعد اس کا بچپن کا خوف آہستہ آہستہ مٹنے لگا تھا..... مگر اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے طویل مسافت کے بعد وہ وہیں آ کے کھڑی ہو گئی تھی جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

”کاش ایک بار..... صرف ایک بار تم مڑ کے دیکھ لو سلمان..... میں مارنے لگی ہوں۔“ وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

☆☆☆

وہ فجر کی نماز پڑھ کر لیٹی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی..... ایک تو اتنی صبح کا وقت..... دوسرے دستک کا انداز..... اس نے گھبرا کر دروازہ کھولا..... سامنے سلمان تھا۔

”میری خواہش ہے ایمان کہ تم بڑے ہو کر وکیل بنو.....“ ایمان نے اپنا سر پکڑتے ہوئے بے چارگی سے کہا۔

”نہیں..... مجھے تو ڈیڈ کی طرح سرجن بننا ہے۔“ وہ بدک کر بولا۔

سرجن تو وہ خود بھی تھی لیکن ایمان صرف اور صرف اپنے باپ کو آئیڈیل قرار کرتا تھا۔ اس نے آپ دونوں کی طرح کہنے کے بجائے صرف ڈیڈ کا نام لیا۔

”ٹھیک ہے، تم اپنے ڈیڈ کی طرح سرجن ضرور بننا..... مگر ان کے جیسے انسان مت بننا۔“ اس نے حلیے کا دوسرا حصہ زرب لب کہا۔

وہ اپنے باپ کی شخصیت کا پرتو تھا..... سارے آثار یہی تھے کہ وہ دوسرا سلمان بننے والا ہے۔ کچھ کچھ مغرور..... خدی اور تھوڑا تھوڑا خود غرض..... اپنی چلانے اور منوانے والا بھی..... اس نے بیٹے کی شکل دیکھتے ہوئے سوچا۔

”تو آپ میری بات کب کر داری ہیں.....؟“ وہ اپنی بات پوچھتا تھا۔

”دیکھو اگر ہم اپنی روائی سر پر انداز رکھیں گے تو تمہارے ڈیڈ کو، دادا اور دادی کو زیادہ خوشی ہوگی..... پہلے سے بتا دیا تو سارا سسٹمز ہی ختم ہو جائے گا۔“ اسے بروقت بات سوچھی۔

وہ تھوڑی دیر وہیں بیٹھا ایمان کو گھورتا رہا جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو..... پھر ایک دم اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایمان نے تاسف سے اسے جاتے ہوئے دیکھا..... اس نے ٹھنڈی سانس لی اور کھڑکی سے پردہ سر کا کے باہر کی طرف دیکھا۔ برف باری کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ کے اطراف کا سارا حصہ برف سے ڈھک چکا تھا۔

لندن کا موسم بادلوں کے بغیر نامکمل ہے۔ کبھی یہ بارش تو کبھی برف برساتے نظر آتے ہیں جو کچھ بھی کریں تو ہر وقت سر پر تو ضرور موجود رہتے ہیں۔ سردیوں کی صبحیں دھند تو شامیں افسردگی لے کر نمودار ہوتی ہیں..... ایمان کو بچپن سے ہی اس موسم سے عجیب سی وحشت محسوس ہوتی تھی..... برف باری شروع ہوتی اور

سوچتے سوچتے نہ جانے کب وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ اگلی صبح زیادہ خوشگوار نہیں تھی..... چاچو کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔

☆☆☆

”میں نے تم سے پراس کیا تھا ناں کہ ہم جلد ہی پاکستان جائیں گے.....“ ایمان نے ایمان کے ہتھکڑا لے بالوں کو پیار سے چھو کے کہا۔ اس نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ پچھلے پورے ہفتے سے اس نے ماں کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔

اسے پھر سے سلمان کی یاد کا جنون چڑھا ہوا تھا اور وہ بات بے بات ایمان سے جھگڑ رہا تھا۔

”آپ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہیں، آپ مجھے کبھی پاکستان لے کر نہیں جائیں گی، آپ سمجھتی ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ میں ڈیڈ کو بھول جاؤں گا؟“ اس نے غصے سے ماں کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

”تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“ اس نے یہ مشکل برداشت کرتے ہوئے پوچھا۔

”آپ مجھے اپنے روٹین میں ہی مصروف نظر آ رہی ہیں..... اسپتال کی ڈیوٹی، گریڈ ماکے ساتھ شاپنگ اور اپنی فرینڈز کے ساتھ وقت گزارنے کے علاوہ اور کیا کر رہی ہیں؟“ وہ پھر غصے سے بولا۔

”بے وقوف لڑکے کسی دوسرے ملک جانے کے لیے پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت پڑتی ہے..... اور بھی بہت ساری فارمیٹیز ہوتی ہیں..... پہلے سارے..... ڈاکومنٹس تیار ہو جائیں اس کے بعد پیکنگ کا نمبر آتا ہے ناں..... پھر مجھے اسپتال سے اور تمہیں اسکول سے چھٹی بھی تو لینا ہوگی اس لیے تھوڑا صبر کرو میں نے ویزے کے لیے اپلائی کیا ہوا ہے۔“ اس نے اسے سمجھایا۔

”واقعی.....؟“ اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک نظر آئی۔

”ہوں.....“ وہ مسکرائی۔

”اچھا تو میری ڈیڈ سے بات کر داریں..... میں انہیں اپنے آنے کا بتانا چاہتا ہوں۔“ اس نے دوسری فرمائش کی۔

اور پھر اٹھ کر الماری کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

رات دس بجے بریگیڈیرو قاص کو ہوش آ گیا.....
ڈاکٹرز کے مطابق اب ان کی حالت خطرے سے باہر
تھی..... ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ یہ ایک معجزہ ہی تھا..... سب
کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہونے لگیں۔

انہیں سی سی یوشنٹ کر دیا گیا تھا اور باری باری
سب کو ان سے صرف چند منٹوں کی ملاقات کی اجازت
بھی دے دی گئی تھی..... مگر بات کرنے کی نہیں۔

”بڑے ابا یہ سب آپ کی آمد کے طفیل ہوا
ہے..... بھائی کے لہو نے بھائی کو قریب پا کے جوش
مارا..... اور ہارٹ ریٹ، پلس، بلڈ پریشر سب کچھ نارمل
ہو گیا۔“ سلمان نے مسکراتے ہوئے کہا..... اس کے
چہرے پر سترہ گھنٹوں کی شدید ٹینشن کے بعد پہلی مرتبہ
سکون نظر آیا۔

”نہیں، بیٹا..... یہ تو بس اللہ پاک کا کرم ہے.....
میں سارے راستے بہت تکلیف میں رہا..... بہت بے بسی
محسوس کرتا ہوا آیا..... مگر یہاں پہنچ کے جیسے دعا میں قبول
ہو گئیں۔ میرے بھائی نے مجھے دیکھ کر آنکھیں کھولیں اور
سلام بھی کیا.....“ وقار صاحب کی آنکھیں اشک بار
ہو گئیں۔

”بس اب آپ سب لوگ گھر جائیں..... میں بابا
کے پاس رکوں گا۔“ سلمان نے سب کی طرف دیکھ کر
کہا۔

”نہیں، میں یہیں رکوں گی.....“ ارسلہ جلدی سے
بولیں۔

”ای سی سی یو ہے..... یہاں پر کسی بھی انٹینڈنٹ
کو ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ نہ ہی وزیٹرز ہر
وقت جمع ہو سکتے ہیں..... آپ لوگ جائیں آرام
کریں..... صبح پھر آ جائے گا۔“ اس نے سمجھایا۔

”جب اجازت نہیں ہے تو تم کیسے رکو گے؟“
انہوں نے جرح کی۔

”میں بھی باہر ہی بیٹھا رہوں گا..... کبھی کبھار اندر کا
چکر لگا لوں گا اور بس.....“

”عالمکہ تم لے جاؤ سب کو۔“ وہ ماں سے کہتا ہوا

کو اطلاع دی تو وہ وہ حسب توقع بے حد پریشان ہو گئے۔
”میں پہلی فلائٹ سے پہنچ رہا ہوں۔“ انہوں نے
فورا کہا۔

بابا کے آنے کی اطلاع چاچی کو دیتے ہوئے وہ خود
بھی دل ہی دل میں اطمینان محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

”وہ بھی وہیں ہے۔“ سعدیہ نے شوہر کی طرف
دیکھا۔

”ہاں..... ظاہر ہے۔“ انہوں نے بھویں
اچکائیں۔

”اب تو سلمان موجود ہے اپنے والدین کے
پاس..... پھر.....؟“ انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔

”وقاص کی حالت بہت کڑی ہے..... یہ ایسا
وقت نہیں ہے کہ ہم بیکار کی باتوں میں الجھیں۔“ انہوں
نے بیوی کی بات کاٹتے ہوئے خفگی سے کہا۔

”اللہ پاک وقاص بھائی کو صحت دے..... اور
عالمکہ کو عقل.....“ وہ یہ کہہ کر چپ ہو گئیں۔

”میرا بیگ تیار کر دو..... میری آج شام چار بجے
والی فلائٹ کفرم ہو گئی ہے۔“ وقار نے کہا۔

”کتنے دنوں کے لیے جائیں گے؟“ انہوں نے
پوچھا۔

”فی الحال تو چند دنوں کا پروگرام ہے..... باقی
جیسی صورت حال ہوگی اس کے حساب سے اپنا پروگرام
بنالوں گا..... بس اللہ خیر رکھے..... وقاص مجھ سے عمر میں
چار برس چھوٹا ہے..... وہ بے چارہ اتنے برسوں سے اتنی
تخت بیماری جھیل رہا ہے اور مجھے دیکھو.....“ انہوں نے
ٹھنڈی سانس بھری۔

”توبہ ہے بھئی..... خود اپنی صحت کو کیوں ٹوک
رہے ہیں..... اللہ تعالیٰ آپ کو صحیح سلامت رکھے۔“
سعدیہ برامان کے بولیں۔

”ایک بج رہا ہے، تین بجے تک انر پورٹ پہنچنا
ہے، میں تیاری شروع کرتا ہوں، تم میرا سامان رکھنا
شروع کرو۔“ انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اچھا ہے، آپ وہاں ہوں گے تو مجھے عالمکہ کی
طرف سے بھی پریشانی نہیں ہوگی۔“ سعدیہ زربلب بولیں

چاچی اس کے پیچھے لگیں۔

اسپتال تک کے راستے میں دونوں کے دل زور
زور سے دھڑک رہے تھے..... اور وہاں پہنچ کر عالمکہ کو
یوں محسوس ہونے لگا جیسے اب دھڑکن رک جائے گی.....
ایمرجنسی کے باہر سلمان کھڑا لگا۔

چاچی بے تابی سے بیٹے کے گلے لگ کے رونے
لگیں..... وہ آہستہ آہستہ ماں کو تھپکیاں دیتا رہا۔

”ای خود کو سنبھالیں..... ابھی ڈاکٹر زعیم سے
میری تفصیل سے بات ہوئی ہے..... بابا کا ہارٹ ریٹ
بہتر ہو رہا ہے..... اچھی امید رکھیں اور دعا کریں۔“
اس نے انہیں سمجھایا۔

”تم تو خود ہارٹ اسپیشلسٹ ہو..... تم باہر
کیوں کھڑے ہو..... جاؤ ناں اپنے بابا کے پاس.....“ وہ
روتے ہوئے بولیں۔

”امی..... یہ میرا اسپتال نہیں ہے..... اب بابا ان
کی ذمہ داری ہیں..... میں از خود اندر نہیں جا سکتا.....
مگر آپ فکر مت کریں میں ہر لمحہ ان کے ڈاکٹر کے ساتھ
رابطے میں ہوں۔“ اس نے ماں کو بٹھایا۔

”تم امی کے پاس ٹھہرو.....“ وہ اس کی طرف
مڑا۔

”تم کہاں جا رہے ہو.....؟“ وہ تڑپ کے
بولیں۔

”میں ایک چکر لگا کے آتا ہوں..... فکر مت
کریں..... انشاء اللہ اچھی خبر لاؤں گا۔“ وہ کہتا ہوا آگے
بڑھ گیا۔

وہ چاچی کے سرد ہوتے ہوئے ہاتھوں کو اپنے
ہاتھوں میں تھام کے ان کے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔

”میرا دل کہتا ہے چاچو ٹھیک ہو جائیں گے۔“ وہ
پر یقین لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”انشاء اللہ.....“ چاچی کی بھی کبھی آواز ابھری۔
”میں بابا کو فون کر دوں.....“ اس نے اپنا موبائل

آن کیا۔

بابا کو اطلاع دینا بھی ضروری تھا..... دونوں
بھائیوں کا ایک دوسرے کے سوا اور تھا بھی کون.....
چاچی نے فوری طور پر نادیدہ کو بتانے سے منع کر دیا تھا۔ بابا

ہوئے کہا۔

ایک، ایک لمحہ صدی بن کے گزر رہا تھا..... سلمان
نے کال نہیں کی..... دو گھنٹے گزر گئے تھے۔

”عالمکہ چلو..... میں اب اور نہیں رک سکتی.....“
انہوں نے بے چین ہو کے کہا۔

”چاچی انہیں کال ملائیں..... پہلے بات کر لیتے
ہیں۔“ چاچی نے اپنا موبائل ادھر ادھر دیکھا..... ان کے
ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”عالمکہ تم کال کر لو..... میرے اندر ہمت نہیں
ہے۔“ وہ رک رک کے بولیں۔

عالمکہ نے ان کے موبائل پر سلمان کا نمبر ڈھونڈا
اور جلدی سے کال ملائی۔

”ہیلو.....“ دوسری ہی تہل پر سلمان نے کال
ریسیو کی۔

”چاچو کیسے ہیں؟“ اس نے فوراً پوچھا۔
”ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا..... ڈاکٹر ز کو شش کر رہے

ہیں، دعا کرو.....“ اس نے آہستہ سے کہا۔
”ایک ہوا ہے.....؟“ اس نے ڈرتے، ڈرتے

پوچھا۔
”بہت ہلکا سا..... شکر ہے زیادہ نقصان نہیں ہوا
ہے..... لیکن ہارٹ ریٹ، پلس اور بی پی بہت لو

ہے..... یہ مسئلہ ہے۔“ اس نے تفصیل بتائی۔
”ہم لوگ آجائیں.....؟“ اس نے پوچھا۔

حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کہے ہم آ رہے ہیں مگر ٹھوڑا
لحاظ آڑے آ گیا۔

”امی کو مت لاؤ..... انہیں تسلی دے دو کہ بابا اب
بہتر ہیں۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... میرا خیال ہے انہیں میں ساتھ لے آتی
ہوں..... وہ اکیلے پریشان ہوں گی..... اور اب بھی بہت

پریشان ہیں..... رکیں گی نہیں۔“ عالمکہ نے کہتے ہوئے
فون بند کر دیا..... سلمان کا جواب سننے کی کوشش نہیں کی۔

”چلیں چاچی.....“ اس نے انہیں دیکھ کر کہا۔
”کیسے ہیں وہ.....؟“ وہ جلدی سے بولیں۔

”بہتر ہیں.....“ اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے
کہا۔

اللہ کے دربار میں عاجزانہ دعا

کب سے کھڑی ہوں درپہ تیرے بن کے سوالی
دامن میں بجز اشکِ ندامت کے کچھ نہیں
پھیلاؤں کیسے دستِ طلب تیرے سامنے
تو ہے قریب میری رگ جاں سے اس قدر
چو کھٹ تھہری چھوڑ کے جائیں بھی تو کہاں
مسلم کا خون اس قدر ارزاں ہے آج کل
ہم پارہے ہیں اپنے گناہوں کی سزائیں
ہے آج مسلمان بہت راندہ درگاہ
اس کے گناہ معاف کرتا ہے مرے اللہ
تجھ کو پکارتے ہیں جو مشکل میں پڑیں ہم
تو اپنے کرم سے بھی محروم نہ کر ہمیں
تیرا ہی آسرا ہے اللہ ہمیشہ
آئے ہیں بڑی دور سے ہم بن کے سوالی
دامن تہوارے دین کا تھامے ہوئے ہیں ہم
اک نظر کرم ہم پہ بھی مولا لے کل جہاں
کر ہم پہ کرم اپنا ہمیں تنہا نہ چھوڑنا

نذرانہ عقیدت: فریدہ افتخار

چھٹیاں ختم ہو جائیں گی اور میں چلی جاؤں گی.....
سردیوں کی چھٹیاں ہوتی ہی کتنی ہیں..... "ناویہ خٹکی سے بولی۔

"اچھا بابا اس دیک اینڈ پر آ جاؤں گی اس سے پہلے کا شیڈول بہت سخت ہے۔" اس نے ہار مان لی۔
"بابا بھی تمہیں ہر وقت یاد کرتے رہتے ہیں.....
میں نے کہا بابا..... سگی بیٹی ہوں میں..... پانچ مہینوں کے بعد آپ میری شکل دیکھ رہے ہیں اور اگلے چند دنوں میں میں واپس بھی چلی جاؤں گی میری کوئی پروا نہیں ہے آپ کو.....؟ وہ ہنستے رہے..... تم نے کیا جادو کیا ہے میرے بابا پر.....؟" اس نے مصنوعی حلقی سے کہا۔

"اچھا اب جلو کڑھومت..... میرے مریضوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے..... میں تمہیں

تھے۔
بریگیڈیر وقاص اور ارسلہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے ایمان اور ایمان لندن میں اور صاحبزادے کی مہینوں سے ادھر کچھ گڑبڑ ہی لگتی ہے۔" بریگیڈیر وقاص نے کھل کے کہہ دیا..... ارسلہ نے شرمندہ نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھا اور وقار زور سے چوٹے۔

"یہ تو اچھی بات نہیں..... تم نے معاملات سلجھانے کی کوشش نہیں کی؟"

"کوشش تو تب کروں گا جب کوئی سرا میرے ہاتھ میں آئے گا..... نہ تو ایمان سے کاٹ ٹکٹ ہو پارہا ہے اور نہ ہی سلمان کچھ سننے کو تیار ہے....." وہ خفگی سے بولے۔

"ابھی تو آپ اسپتال سے واپس آئے ہیں خدا کے لیے کسی قسم کی ٹینشن مت لیں۔" ارسلہ جلدی سے بولیں..... وہ چاہ رہی تھیں کہ موضوع تبدیل ہو جائے۔

"بالکل..... تم پریشان مت ہو..... ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے۔" وقار نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ سب اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

☆☆☆

بابا کراچی واپس چلے گئے تھے اور وہ اپنی جاب پہ واپس آ گئی تھی۔

چاچو کی حالت کافی بہتر تھی۔ سلمان کی جاب کا آغاز ہو گیا تھا..... وہ کافی معروف تھا..... ناویہ کی آمد یقیناً چاچی اور چاچو کے لیے آسانیاں لائی تھی لیکن ناویہ اس کی غیر حاضری بہ خفا تھی۔

"تمہیں تو یقین نہیں ہو رہی ہے کہ آکر اپنی شکل دکھا جاؤ۔" اس نے فون پر اس سے شکایت کی۔ "پنڈی سے اسلام آباد لگتا ہے کراچی جتنا دور ہو گیا ہے۔"

"بس یار پانچ دنوں کی چھٹی کا خمیازہ بھگت رہی ہوں..... اب دوسرے چھٹی پہ ہیں اور ان کے حصے کا کام کرنا پڑ رہا ہے....." وہ ہنسی۔

"ٹھیک ہے تم کام کرتی رہو..... میرے بچوں کی

کی ذمے داریوں میں مصروف ہو جاتی ہیں..... گھر کا کام اگر چلا جائے تو ساری روٹیں ساتھ لے جاتا ہے۔
ماں، باپ کو اکیلا کر جاتا ہے۔" بریگیڈیر وقاص غصے سے سانس لے کر بولے۔

"مجبوری ہو یا مصلحت، بہت ساری باتیں برداشت کرنی ہی پڑتی ہیں..... کاشف کو شارجہ میں اتنی اچھی جاب مل گئی ہے کہ اس کے بہتر مستقبل کے لیے ہمیں اس کی جدائی کا کڑوا گھونٹ بھرنی پڑا۔" وقار نے آرزوگی سے کہا۔

"سچ کہتے ہیں آپ..... بچوں کو اپنے لیے ذمہ داری اپنے قریب رکھنا خود غرضی ہے..... سلمان کے جانے کا مجھے بھی بہت غصہ تھا مگر اس کی آمد پہ میں سوچتا ہوں کہ شاید میرا غصہ غلط تھا..... ماں، باپ اولاد پر جب بھی اپنے فیصلے مسلط کرتے ہیں انجام اچھا نہیں ہوتا..... اولاد مجبوراً مان لے تو وہ ناخوش نہ مانے تو ماں باپ ناخوش، خواہ خواہ کی محاذ آرائی شروع ہو جاتی ہے....." بریگیڈیر وقاص نے اعتراف کیا۔

"کچھ بھی ہو بھائی صاحب جوان بیٹے کی موجودگی سے والدین کو بڑی ڈھارس رہتی ہے..... اب دیکھیے سلمان کے یہاں ہونے سے کتنا مشکل وقت آسانی سے گزر گیا۔" ارسلہ جلدی سے بولیں۔

"اس دفعہ تو میرے سارے اپنے ہی میرے پاس تھے..... سلمان بھی موجود تھا، بھائی جان بھی دوڑے پلے آئے، ناویہ کو تو خیر اطلاع دیر سے دی تھی، اب وہ بھی آ رہی ہے اور میری یہ بیٹی تو ہوتی ہی میرے پاس ہے۔" بریگیڈیر وقاص نے نگاہیں عائدہ پر مرکوز کر دیں۔

"یہ تو ہے، ان کے دوسرے اٹیک میں تو نہ سلمان آ پایا تھا اور نہ ہی ناویہ، وہ پریکٹس بھی اور آپ بھائی جان عمرے کی ادا بھی کے لیے گئے ہوئے تھے اگر عائدہ آ کے سب نہ سنبھالتی تو....." ارسلہ نے ایک جھرجھری لی..... عائدہ بھینپ سی گئی۔

"چلو مشکل وقت اللہ کی مہربانی سے آسان ہو جاتا ہے، کوئی نہ کوئی وسیلہ تو بن ہی جاتا ہے، یہ بتاؤ سلمان کی فیملی پاکستان کب تک آ رہی ہے.....؟" وقار نے وہ سوال پوچھ لیا جس کے پوچھے جانے سے سب ڈر رہے

عائدہ کی طرف گھوما۔ اس نے سر ہلایا۔
واپسی کا دل نہ چاہتے ہوئے بھی سب کو واپس جانا تھا..... لیکن بریگیڈیر وقاص کی سنبھلتی ہوئی حالت پہ سب کو اطمینان ضرور تھا۔

☆☆☆

"بچی بات تو یہ ہے کہ آپ نے ہمیں ڈرا دیا تھا....." ارسلہ نے ویکی ٹیبل سوپ کا پیالہ ان کے سر ہانے رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اسپتال میں پانچ دن گزارنے کے بعد گھر واپس آ گئے تھے..... ان کی حالت تسلی بخش تھی۔

"اللہ نے بہت کرم کیا..... اس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے....." وقار نے بھائی کو سہارے سے بٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے سب کو بہت پریشان کیا....." انہوں نے سوپ پیتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہیں چاچو، پریشانی آپ کی وجہ سے نہیں بلکہ آپ کی بیماری کی وجہ سے تھی۔" عائدہ مسکرائی۔

"تم گھر آ گئے ہو، میں بھی اب واپسی کا سوچ رہا ہوں۔" وقار نے کہا۔

"ابھی تو میں آیا ہوں، میرے آتے ہی آپ واپسی کا کیوں سوچ رہے ہیں..... کچھ دن تو رکیں....." بریگیڈیر وقاص جلدی سے بولے۔

"بابا، چاچو بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں..... چاچی نے نادیہ کو بھی حالات تمھوڑے نارمل ہونے کے بعد بتا دیا ہے..... وہ بھی پہنچنے والی ہے..... پھر ہم سب چاچو کی صحت یابی کا جشن منائیں گے، آپ چلے گئے تو بھلا کیا مزہ آئے گا۔" عائدہ نے جلدی سے باپ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بالکل بھائی جان..... میں نے تو اس پریشانی میں آپ کی کوئی خاطر مدارات بھی نہیں کی..... اب اس کا موقع تو دیں....." ارسلہ جلدی سے بولیں۔

"اچھا بھی اچھا..... لیکن صرف دو دن اور..... اس کے بعد نہیں، سعد یہ گھر پر اکیلی ہیں۔" وہ جلدی سے بولے۔

"ٹھیک کہتے ہیں آپ بھائی جان، بھابی واقعی اکیلی ہوں گی..... ظاہر ہے بیٹیاں بے چاریاں تو اپنے گھر

ہوئے ماں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
 ”عالمہ آ رہی ہے؟“ وہ چونکیں۔
 ”جی ای، اس نے آج شام آنے کو کہا تو ہے آج ہی دوپہر میری بات ہوئی ہے میں اسے کئی دن سے خوب سن رہی ہوں۔ آتا ہی پڑے گا اسے۔“ نادیاہ ہنسی۔
 ”زیر دستی مت کیا کرو تم لوگ۔۔۔۔۔ دیسے بھی وہ موقع ملے ہی آ جاتی ہے۔۔۔۔۔ اگر کوئی مسئلہ ہوتا ہے تب ہی نہیں آ پاتی۔“ بریگیڈیر وقاص نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”السلام علیکم۔۔۔۔۔“ عالمہ کی آواز ابھری۔
 ”وعلیکم السلام۔۔۔۔۔ اسے کہتے ہیں کہ شیطان کا نام لو اور وہ موجود۔۔۔۔۔“ نادیاہ نے اٹھ کے اس کے گلے لگتے ہوئے جملہ کسا۔
 ”جی نہیں، اسے کہتے ہیں بڑی عمر ہے آپ کی۔“ عالمہ نے صبح کی۔
 ”ادھر آؤ۔۔۔۔۔“ چاچو نے خوش ہو کے بائیں پھیلائیں۔
 وہ ان کا پیار لیتی ہوئی ان کے برابر میں جا بیٹھی۔
 ”میجر شاہنواز، میٹ میجر عالمہ وقار۔۔۔۔۔“ انہوں نے ان دونوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ٹاکس ٹو میٹ پو۔۔۔۔۔“ شاہنواز کی نگاہوں میں عالمہ کے لیے سانس تھی۔
 ”سیسم میٹر۔۔۔۔۔“ عالمہ بھی مسکرائی۔
 ”یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وقت پیچھے کی طرف سرک گیا ہو۔۔۔۔۔ مجھے تو ملتان کینٹ میں گزارے ہوئے دن یاد آنے لگے ہیں۔۔۔۔۔ شاہنواز، نادیاہ، عالمہ سب موجود ہیں، صبا اور سلمان کی کمی ہے۔۔۔۔۔ صبا تو آ نہیں سکتی لیکن سلمان تھوڑی دیر تک آ جائے گا۔۔۔۔۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج رات کا کھانا سب ساتھ مل کر کھائیں گے۔۔۔۔۔“ ارسلہ جلدی سے بولیں۔
 ”بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔۔۔۔۔“ بریگیڈیر وقاص نے تائید کرتے ہوئے کہا۔
 شاہنواز کے پاس رکنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔۔۔۔۔ اس کی نگاہیں گاہے بگاہے عالمہ کی طرف اٹھ رہی تھیں۔۔۔۔۔ اس کی نگاہوں کی چوری بریگیڈیر وقاص کی نگاہوں سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

ابھی سے احتیاط کروں گا تو شاید آگے آرام سے جی لوں۔“ وہ مسکرایا۔
 ”بیک مین پینتیس برس بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ہم سے پوچھو جو ساٹھ سے اوپر ہونے کے باوجود سب کچھ کھا لیتے ہیں۔۔۔۔۔“ بریگیڈیر صاحب نے گاجر کے حلوے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”بالکل ان کو دیکھو جو ساٹھ سے اوپر ہونے کے باوجود بھی سب کچھ کھا لیتے ہیں اور ہر تھوڑے عرصے کے بعد اسپتال پہنچتے ہوئے ہوتے ہیں۔“ ارسلہ نے حلوے کا پیالہ ان کی پہنچ سے دور کرتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن یہ ضرور ہے کہ پینتیس برس کا ہونے کے بعد تمہیں شادی ضرور کرنی چاہیے۔۔۔۔۔ اور لیٹ مت کرو۔۔۔۔۔ ویسے کیا ہے کوئی نظر میں۔۔۔۔۔؟“ بریگیڈیر صاحب نے حلوہ پہنچ سے باہر ہوتے دیکھ کر چائے کی پیالی پر اکتفا کرتے ہوئے شاہنواز کو مخاطب کیا۔
 ”شادی۔۔۔۔۔! ہو جائے گی وہ بھی۔۔۔۔۔“ شاہنواز جھینپ کے بولا۔
 ”ممنکن ہوئی ہے تمہاری؟“ ارسلہ نے کریدا۔
 ”میں آنٹی ابھی تو نہیں۔۔۔۔۔ بس می اب اسی مہم کو سر کرنے نکلی ہیں۔“ وہ تابعداری سے بولا۔
 ”وش یو آل دا بیسٹ۔۔۔۔۔ شادی زندگی کا اہم فریضہ ہوتا ہے اس کا تعلق بڑی حد تک قسمت سے ہوتا ہے مگر انسان کے بس میں جتنا ہے اسے بہت سمجھداری سے کام لیتا چاہیے۔“ بریگیڈیر وقاص نے اس کے شانوں کو تھپکتے ہوئے کہا۔
 ”کیسے ہیں شاہنواز بھائی۔۔۔۔۔؟“ نادیاہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔
 ”اوہو۔۔۔۔۔ تو آپ بھی نہیں ہیں۔۔۔۔۔“ شاہنواز کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔
 ”میں یہاں ہوں نہیں۔۔۔۔۔ آئی ہوئی ہوں۔۔۔۔۔“ وہ ہنستے ہوئے آ کے بیٹھ گئی۔
 ”میری بیماری نے سب کو اکٹھا کر دیا ہے۔“ بریگیڈیر وقاص مسکرائے۔
 ”عالمہ نہیں پہنچی۔۔۔۔۔ کہہ تو رہی تھی کہ مغرب سے پہلے آ جائے گی۔“ نادیاہ نے وال کلاک پہ نظر دوڑاتے

”زیر دست آنٹی لیکن سلمان کدھر ہے۔۔۔۔۔؟“ اس نے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔
 ”اس کی جاب ذرا نئی، نئی ہے اسی لیے کافی دیر تک اسپتال ہی میں رہتا ہے۔ تمہارے آنے کی خبر اسے دے چکا ہوں۔۔۔۔۔ پہلی فرصت میں ملے گا تم سے۔“ بریگیڈیر وقاص نے سر ہلایا۔
 ”بہت اچھا لگ رہا ہے آپ لوگوں سے مل کے۔۔۔۔۔ امید ہے سلمان کے ساتھ پھر اچھی ملاقاتیں رہیں گی۔“ وہ خوش ہو کے بولا۔
 ”ارے ہاں، تم عالمہ سے ملے۔۔۔۔۔ میجر عالمہ وقار۔۔۔۔۔“ بریگیڈیر صاحب کو ایک دم یاد آیا۔
 ”سر میں نے کل ہی جوائن کیا ہے، ابھی میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ لیکن امید ہے کہ جلدی ہو جائے گی۔۔۔۔۔“ وہ شائستگی سے بولا۔
 ”اسی سال میجر بنی ہے۔۔۔۔۔ انشاء اللہ آگے تک جائے گی۔“ بریگیڈیر وقاص نے پریقین لہجے میں کہا۔
 ”جی سر۔۔۔۔۔ اور سلمان اکیلے ہی آیا ہے۔۔۔۔۔ اس کے بیوی، بچے۔۔۔۔۔؟ شاید ایک بیٹا ہے ناں اس کا۔“ شاہنواز نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔
 اس سے پہلے کہ بریگیڈیر وقاص دوبارہ ہر ایک کی طرح اس کے سامنے بھی اپنی بھڑاس نکالنا شروع کر دیتے ارسلہ نے جلدی سے کہا۔
 ”اس کی بیوی اور بیٹا بھی جلد آ جائیں گے۔۔۔۔۔ تم یہ گاجر کا حلوہ تو چکھو، یاد ہے تمہیں کتنا پسند تھا۔۔۔۔۔ تم اور سلمان مل کر چوری چھپے حلوے کا پورے کا پورا ڈونگا صاف کر دیا کرتے تھے۔۔۔۔۔“ ارسلہ نے جلدی سے گاجر کا حلوہ اس کے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”اوہ۔۔۔۔۔ تھینک یو آنٹی۔۔۔۔۔“ اس نے تکلفاً تھوڑا سا حلوہ اپنی پلیٹ میں نکالا۔
 ”یہ کیا بھی اور لو۔۔۔۔۔ میرا تو خیال تھا کہ تم پورا بول صاف کر جاؤ گے۔“ انہوں نے حیرت سے اس کو دیکھتے حلوے کو دیکھا جو شاہنواز نے اپنی پلیٹ میں نکالا تھا۔
 ”بس آنٹی اب میں پندرہ سالہ شاہنواز بخاری نہیں ہوں جو سب کچھ کھا جاتا تھا اور ڈکار بھی نہیں لیتا تھا۔۔۔۔۔ میں اب پینتیس سال سے اوپر کا ہو چکا ہوں۔

شام میں کال کرتی ہوں۔۔۔۔۔“ اس نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔
 ☆☆☆
 ”کیسے ہو بیک مین۔۔۔۔۔؟“ بریگیڈیر وقاص نے میجر شاہنواز سے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔
 ”فائن سر۔۔۔۔۔“ وہ مسکرایا۔
 ”تمہیں یہاں پا کر بہت خوشی ہوئی۔۔۔۔۔“ انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔
 ”جیسے ہی جوائن کیا آپ کی بیماری کی خبر ملی۔۔۔۔۔ میں آپ سے ملے بغیر رہ نہیں سکا۔“ اس نے فوراً کہا۔
 ”یہ تمہاری محبت ہے۔۔۔۔۔ باپ کیسا ہے تمہارا۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے پوچھا۔
 ”پاپا ٹھیک ہیں۔۔۔۔۔ آپ کو کال کرنا چاہ رہے تھے مگر آپ کا سیل فون آف ہے۔“ اس نے کہا۔
 ”جب سے اسپتال سے آیا ہوں میرا فون بیگم کی کسٹڈی میں ہے، فون ہی کیا میں خود بھی انڈر اریسٹ ہوں ان کے۔“ انہوں نے ہلکا سا تہقہ لگایا۔
 ”یہ بہت ضروری ہے۔۔۔۔۔ ورنہ آپ کے لیے آنے والی بی بی کالیں آپ کو آرام تھوڑی ہی کرنے دیں گی۔“ ارسلہ کمرے میں داخل ہوئیں ان کے پیچھے، پیچھے ٹرائی لاتے ہوئے فیض اندر داخل ہوا۔
 ”السلام علیکم آنٹی۔۔۔۔۔ کیسی ہیں آپ۔۔۔۔۔؟“ شاہنواز تعظیماً کھڑا ہو کے بولا۔
 ”وعلیکم السلام۔۔۔۔۔ بیٹے، میں بالکل ٹھیک ہوں، تم سناؤ۔۔۔۔۔“ انہوں نے مسکرا کے کہا۔
 ”بالکل فٹ۔۔۔۔۔“ وہ ہنسا۔
 ”ماشاء اللہ نظر آ رہا ہے مجھے۔“ وہ مسکرائیں اور اسے تعریفی نگاہوں سے دیکھا۔
 ”اتنا تکلف۔۔۔۔۔“ اس نے بیٹھتے ہوئے ٹرائی کی طرف اشارہ کیا۔
 ”میں نے سوچا تمہیں بیس، اکیس برسوں کے بعد تمہاری وہ پسندیدہ چیزیں کھلا دوں جو تم بچپن میں سلمان کے ساتھ مل کر شوق سے کھاتے تھے۔۔۔۔۔“ وہ ہنس کر بولیں۔

تھی۔ یہ اور بات کہ وہ ایک مسلمان بچی کی حیثیت سے اس کی پرورش نہیں کر سکی تھیں مگر اسے اچھے برے کا فرق ضرور بتایا تھا۔ مسلمان کے ساتھ شادی بھی شاید اس کے لاشعور کا فیصلہ تھا جہاں یہ احساس موجود تھا کہ وہ ایک مسلمان لڑکی ہے۔ اس کے اندر مام جتنی ہمت تھی تھی۔ وہ مسلمان کے بیٹے کو تو کسی نہ کسی طرح سنبھال لیتی مگر مسلمان کی بیٹی کو اس معاشرے میں تنہا پالنے سے قاصر تھی۔

ایمان خوش ہو کر اس کے گلے آگے۔ کئی مہینوں کے بعد ایمان نے اس طرح محبت کا اظہار کیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ پیچھنے لگی۔ اندر ہی اندر وہ احساس جرم کا شکار ہو رہی تھی۔ معصوم بچہ اس کا سہیلی کو اپنی خواہش کا نتیجہ سمجھ رہا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ اس کی ماں کی مجبوری بھی تھی۔

”ہم کب تک روانہ ہو جائیں گے؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”شاید ایک مہینہ لگ جائے۔“ وہ خود پر جبر کر کے مسکرائی۔

”تو پھر اتنے پہلے سے پاسپورٹ مجھے کیوں دکھایا؟“ وہ پھر خفا ہو گیا۔

”یہ تو تمہاری سالگرہ کا تحفہ ہے۔ کل بھلا کون سی تاریخ ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”بچپس۔۔۔۔۔“ وہ چونکا۔۔۔۔۔ وہ اپنی سالگرہ کا دن تک بھول چکا تھا۔ ورنہ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنی سالگرہ منانے کے حوالے سے بہت جذباتی ہو جاتا تھا۔ کئی ماہ پہلے سے ماں، باپ سے مختلف فرمائشیں شروع ہو جاتی تھیں۔ سالگرہ کا فنکشن خوب دھوم دھام سے منانے کے بعد رات کے وقت اس سے پوچھتا۔

”ماما اب میری سالگرہ کب آئے گی؟“ آف پورا سال انتظار کرنا پڑے گا۔۔۔۔۔“ وہ ہنس کے اسے گلے لگاتی۔

”بے وقوف۔۔۔۔۔ سال تو بس یوں گزر جاتا ہے۔“ وہ چٹکی بجاتے کہتی۔

پچھلی سالگرہ پر مسلمان نے اسے لپ ٹاپ گفٹ کیا تھا۔۔۔۔۔ ڈھیروں کی تعداد میں کھلونے بھی دلوائے

☆☆☆

”اب خوش۔۔۔۔۔“ ایمان نے ایمان کے ہاتھوں میں پاسپورٹ تھمایا۔۔۔۔۔ وہ پہلے حیران ہوا پھر خوشی سے اچھل پڑا۔

”پاسپورٹ۔۔۔۔۔؟“

”ہوں۔۔۔۔۔“ وہ مسکرائی۔

”تو اس کا مطلب ہے ہم پاکستان جا رہے ہیں۔“ وہ پرجوش ہو کے بولا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ وہ پھر مسکرائی۔

”کب۔۔۔۔۔؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”عنقریب۔۔۔۔۔“ اس نے پیار سے بیٹے کا سر سہلایا۔

مسلمان نے اس کے ساتھ جو کیا سو کیا، اس نے ایمان کے ساتھ تو بالکل بھی اچھا نہیں کیا تھا۔ ایمان کی شخصیت باپ کے بغیر بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ وہ اکثر کھانا نہیں کھاتا۔۔۔۔۔ پڑھائی کی طرف توجہ نہیں دیتا۔۔۔۔۔ بچپز سے بد تمیزی اور کلاس فیلوز سے لڑائیاں بھی کرنے لگا تھا۔ اس کے اسکول سے شکایتیں آنے لگی تھیں۔ ایک ذہین، مہذب اور خوش مزاج بچے کے اندر یہ تبدیلیاں یقیناً بڑی خوفناک تھیں۔

ایمان کو اسے ہینڈل کرنے میں بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کبھی لالچ، کبھی پیار تو کبھی سختی سے ایمان کو سمجھانا پڑا تھا۔ ایمان کا خیال تھا کہ کچھ عرصے کے بعد وہ آہستہ آہستہ نارمل ہو جائے گا مگر وہ نارمل ہونے کے بجائے خاموش ہوتا چلا گیا۔۔۔۔۔ کچھ دنوں سے وہ اپنے خول میں سمٹتا جا رہا تھا۔ اس نے ایمان سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ لیکن یہ بات بھی ایمان کے لیے پاکستان جانے کے فیصلے کا سبب نہیں تھی۔ پاکستان جانا اس کی مجبوری کسی اور وجہ سے بنا تھا۔ الٹرا سائڈ رپورٹ سے یہ پکٹیر ہو گیا تھا کہ اس بار اس کی بیٹی اس دنیا میں آنے والی تھی۔ یہ خبر اس کے لیے مسلمان کی موجودگی میں تو بے حد خوشی کا سبب بنتی۔ مگر مسلمان کی غیر موجودگی میں یہ خبر روح فرسا تھی۔ مام نے خواہ اسے اپنے پردوں کے نیچے چھپا کے پالا تھا۔ مام مسلمان نہیں ہوئی تھیں مگر وہ تو مسلمان باپ کی بیٹی تھی۔ یہ بات مام نے اس سے کبھی نہیں چھپائی۔

تھے۔ اور اس بار۔۔۔۔۔ وہ سالگرہ کا دن بھول چکا تھا۔ وہ کس ذہنی کرب سے گزر رہا تھا ایمان کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہوا۔ اس کی تکلیف کی شدت شاید ایمان کی تکلیف کی شدت سے زیادہ تھی۔

”ہم پورا مہینہ تیاریاں کریں گے۔ تم دادا دادی اور بابا کے لیے اچھے، اچھے کفٹن خریدنا۔ اپنے لیے شاپنگ کرنا۔۔۔۔۔ شاید ہمیں وہاں بہت زیادہ رہنا پڑے۔“ اس نے ایمان کو سمجھایا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

”اور کل ہم اپنے پیارے ایمان کی سالگرہ بھی تو بہت دھوم دھام سے منائیں گے۔“ مام کمرے میں داخل ہوئیں۔

”آپ کو یاد تھی میری سالگرہ۔۔۔۔۔؟“ وہ دوڑ کے تانی سے لپٹ گیا۔

”بالکل۔۔۔۔۔ میں نے سارے انتظامات چکے، چکے کر لیے تھے۔ یہ تمہاری سالگرہ اور فیروز ویل دونوں ہوگی۔ پھر تو اگلی سالگرہ تم اپنے بابا کے ساتھ مناؤ گے ناں۔۔۔۔۔“ مام نے محبت سے اس کا سر چوما۔

”تھینکس گرینڈ ماما۔۔۔۔۔“ وہ مسکرایا۔

ایمان بھی اٹھ کے ماں کے قریب آگئی۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔

”جہاں رہو خوش رہو، میری بچی۔۔۔۔۔ خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے۔“ مام نے ایمان کو بھی گلے لگایا۔

☆☆☆

”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔۔۔۔۔“ ارسلہ نے جائے کامگ ان کی سائنڈ ٹیبل پر رکھ کے ان کے قریب بیٹھنے ہوئے کہا۔

”فرمائیں۔۔۔۔۔“ بریگیڈیر وقاص اخبار تہ کر کے رکھتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

”آپ نے مسلمان کے متعلق کیا سوچا ہے؟“ انہوں نے آہستہ سے پوچھا۔

”مسلمان کے متعلق۔۔۔۔۔ میں کون ہوتا ہوں مسلمان کے متعلق سوچنے والا۔۔۔۔۔ صاحبزادے خود ہی کانی ہیں اپنے بارے میں سوچنے کے لیے۔“ انہوں نے رخ

لجے میں جواب دیا۔

”میرا مطلب تھا کہ۔۔۔۔۔“ انہوں نے کچھ کہنا چاہا مگر بریگیڈیر وقاص نے ان کی بات کاٹتے ہوئے تیز لجے میں کہا۔

”دیکھیں بیگم صاحبہ، آپ کے ذہن میں جو کچھ بھی ہے کھل کے کہیں۔۔۔۔۔ پہیلیاں مت بچھوائیں۔“

”دیکھیں مسلمان اب مسئلہ پاکستان اچکا ہے۔۔۔۔۔“

جواب بھی ماشاء اللہ اچھی لگ گئی ہے۔۔۔۔۔ سیٹ ہو گیا ہے وہ، ہمیں اس کے بارے میں کچھ سوچنا چاہیے۔“ انہوں نے گھما پھرا کے اپنی بات مکمل کی۔

”مثلاً کیا سوچنا چاہیے۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے بیگم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”ایمان سے اس کی سپریشن ہو چکی ہے۔۔۔۔۔ میں نے اس چھ سات ماہ کے عرصے میں مسلمان کے منہ سے اس کا ذکر تک نہیں سنا۔۔۔۔۔ نہ ہی اس نے کاتھلیک کرنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ تو کیا وہ ساری زندگی یونہی اکیلا رہے گا۔۔۔۔۔؟ ہمیں اس کی دوسری شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“ انہوں نے ہال آخرا اپنی بات مکمل کر دی۔

”میں تو انتظار کر رہا ہوں کہ ملی تھیلے سے کب باہر آتی ہے۔۔۔۔۔ صاحبزادے ایمان کا ذکر نہ کر کے اس رشتے کو تو ختم نہیں کر سکتے جو ان دونوں کے درمیان ابھی باقی ہے۔ سپریشن کا مطلب طلاق نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ قانونی طور پر میاں بیوی میں سپریشن کی مدت سوچنے سمجھنے کے لیے ملتی ہے کہ ایک مخصوص عرصے تک دونوں ایک دوسرے سے الگ رہ کر اچھی طرح غور کر سکیں کہ آیا انہیں دوبارہ اکٹھا رہنا ہے یا پھر طلاق لے کر الگ ہو جانا ہے۔“ بریگیڈیر صاحب نے تفصیل سے سمجھایا۔

”وہ سب میں نہیں جانتی۔۔۔۔۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ کی خواہش بھی کہ مسلمان کی شادی عاقلہ سے ہو۔۔۔۔۔ عاقلہ ابھی تک کنواری ہے۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے ہی کی قسمت ہوں۔۔۔۔۔“ ان کا بات جملہ منہ ہی میں رہ گیا تھا کیونکہ بریگیڈیر وقاص نے تندو تیز لجے میں ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”یہ سب کچھ آپ سوچ سمجھ کے کہہ رہی ہیں یا بغیر سوچے سمجھے۔۔۔۔۔؟ بجائے اس کے کہ آپ اپنے بیٹے کا گھر

233 ماہنامہ پاکیزہ منشی 2014

”تمہیں ہی شوق تھا اس پابندیوں میں جکڑی نوکری کو کرنے کا..... گھر سے دور، ماں باپ سے دور..... کسی آوارہ بچے کی طرح بے یار و مددگار یہاں وہاں ڈولتی رہتی ہو..... میرا دل جلتا ہے عالمہ تمہیں دیکھ کر..... شاید میں سکون سے مر بھی نہ سکوں.....“ ماما کی آواز بھرا گئی۔

”ماما پلیز..... کیا ہو گیا ہے آپ کو..... خود کو سنبھالیں۔“ عالمہ گھبرا گئی۔

”میں ہی سنبھالوں خود کو..... تم کچھ نہ کرنا..... اپنی ساری زندگی ایسے ہی برباد کر لینا..... کچھ نوکری کے پیچھے اور کچھ چاچو کے پیچھے.....“ ماما نے غصے میں فون بند کر دیا۔

وہ حیرانی اور دکھ سے اپنے سل فون کو دیکھتی رہ گئی۔ ٹی بی ایک ختم ہو گیا تھا..... وہ تھکے تھکے قدموں سے کلینک کی طرف بڑھ گئی۔

”ایکسکیوزی۔“

اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

میجر شاہنواز اس سے چند قدموں کے فاصلے پر تھے اور اس کی طرف آرہے تھے۔ وہ رک گئی اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

”السلام علیکم.....“ ان کا لہجہ خوشگوار تھا۔

”والسلام.....“ وہ جیسے اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آئی۔

”میں نے سوچا کہ آپ کو تو فیش نہیں ہوگی..... میں ہی مل لیتا ہوں.....“ انہوں نے قدرے شوخی سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ انہیں اچانک کیا ہو گیا ہے؟“ اچھے خاصے سنجیدہ بلکہ کسی حد تک اکڑ، مغرور شخص، جسے اس نے کبھی ہلکے پھلکے بے تکلفی والے انداز میں نہیں دیکھا۔ اس وقت ایک مختلف انداز میں سامنے کھڑا تھا۔

اس کا دل چاہا کہ وہ کہے۔ ”آپ سے کس خوشی میں ملتی.....؟“ میرا ڈی پارٹمنٹ دوسرا ہے آپ کا کچھ اور..... میں جو نیر آپ سینٹر..... پھر بھلا ہمارے درمیان ایسی کون سی بے تکلفی کی فضا تھی جو میں آپ کے در پر حاضری دیتی.....؟“ لیکن خود پہ کنٹرول کرتے ہوئے

شاہنواز نہ مانے تو عالمہ کی دل آزاری ہو۔“ انہوں نے تفصیل بتائی۔

”خود ہی سب کچھ کرتے رہے اور مجھے بھٹک بھی نہیں لگنے دی۔“ ارسلہ کے ہونٹوں پر شکوہ چلا۔

”اس کے لیے معذرت..... گھر میں چاہتا تھا کہ ساری باتیں اچھی طرح سے طے پا جائیں پھر اس کا اعلان ہو.....“ انہوں نے شانے اچکائے۔

بالکل..... اور میں تو غیر ہوں ناں، شاید پڑوس ہوں..... مجھے بھلا شامل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب شادی طے ہو جائے اور کارڈ چھپ جائیں تو ایک مجھے بھی بھیج دیجیے گا..... آکے شریک ہو جاؤں گی۔“ انہوں نے غصے سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ بریگیڈیر وقاص کا قہقہہ دور تک ان کا پیچھا کرتا رہا۔ وہ بڑے دنوں کے بعد خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔

☆☆☆

”تم تو بالکل پنڈی کی ہو کے رہ گئی ہو..... تمہاری شکل دیکھے ہوئے کتنے ماہ گزر چکے ہیں۔ ابھی پھر تم آنے سے انکار کر رہی ہو.....“ ماما کا غصہ بڑھنے لگا تھا۔

”آپ سمجھنے کی کوشش کریں ناں..... آج کل ڈاکٹرز کی شارٹ میج ہو گئی ہے..... میرے ساتھ جو اور تھیں ان کی پوسٹنگ آگئی وہ چلی گئیں اور ان کی جگہ جو پوسٹ ہوئی ہیں وہ ابھی تک پہنچی نہیں..... ایسے میں بھلا مجھے چھٹی کیسے ملے گی.....؟“ اس نے دہائی دی۔

”تو وہ کیوں نہیں پہنچی بھی..... اسے بلوائیں ناں.....“ ماما نے جرح کی۔

”وہ بے چاری اس لیے نہیں پہنچ پائی کہ اس کی ریلیف نہیں پہنچی ہے..... اور وہاں کے سی ایم ایچ والے اسے نہیں چھوڑ رہے ہیں۔“ عالمہ نے ماں کو سمجھایا۔

”بھئی یہ تو کڑی سے کڑی ملی ہوئی ہے اور خواہ مخواہ کی مصیبت تمہاری۔“ ماما کو پھر غصہ آ گیا۔

”ای نوکری میں ایسے مراحل آتے رہتے ہیں..... پھر فوج کی نوکری میں اصول و ضوابط تھوڑے زیادہ ہی سختی کے ساتھ منوائے جاتے ہیں..... بہر حال آپ پریشان مت ہوں..... دو یا تین ہفتوں میں بہتری کی امید ہے۔“ اس نے ماں کو دلاسا دیا۔

دیتے، جو اپنے بزرگوں کی بات رو کر دیتے ہیں انہیں زعمی میں اپنے پاس اتنا حوصلہ ضرور جمع رکھنا چاہیے کہ جب بھی کسی مقام پر ان کی بات کو رد کیا جائے اور ان کے فیصلے سے انحراف کیا جائے تو وہ اسے برداشت کر سکیں۔ اس طرح میدان چھوڑ کے نہ بھاگیں.....“ ان کے لہجے میں ایک دم پرانا فوجی دبدبہ لوٹ آیا..... ارسلہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”نہ جانے دونوں کے درمیان کیا چل رہا ہے۔“ انہوں نے اکتا کر کہا۔

”عالمہ کے لیے تو میں نے فیصلہ کر لیا ہے..... میجر شاہنواز سے بہتر کوئی نہیں.....“ بریگیڈیر وقاص نے قدرے نرم آواز میں کہا۔

”مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ آپ ایسا ہی کریں گے..... میجر شاہنواز اور بریگیڈیر بخاری کا ذکر کر کے میں یونہی تو نہیں ہونے لگا ہے.....“ انہوں نے شوہر پر گہری نگاہ ڈالی۔

”اور آپ نے سوچا اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں، آپ یہ شوشہ چھوڑ دیں۔“ انہوں نے جواباً بھی پر گہری نگاہ ڈالی۔

”آپ میری نیت پر خواہ مخواہ شک کر رہے ہیں۔ میں نے تو صرف بگڑے ہوئے معاملوں کو سدھارنے کا سوچا تھا۔“ وہ خفگی سے بولیں۔

”آپ کی نیت بھلے سے نیک ہو..... مگر اس میں خود غرضی کی جھلک نظر آتی ہے..... چیزوں کو ضرور ٹھیک کریں مگر اس طرح جس میں سب کا فائدہ ہو۔“

بہر حال میں نے شاہنواز اور بخاری دونوں سے اس رشتے کے بارے میں بات کر لی ہے..... وہ دونوں بخوشی تیار ہیں اب صرف وقار بھائی سے بات کرنی ہے۔“ انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

”اور عالمہ.....؟“ ارسلہ نے چہچہتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”عالمہ میری بیٹی ہے، اسے میرے کسی فیصلے پر ہرگز اعتراض نہیں ہوگا..... مجھے تو صرف شاہنواز اور اس کے والد کی مرضی دریافت کرنی تھی، وہ میں نے کر لی میں نہیں چاہتا تھا کہ پہلے عالمہ سے بات کروں اور پھر اگر

تجاہ ہوتے ہوئے دیکھ کر اسے بچانے کی کوشش کرتیں کجا کہ آپ اس کی دوسری شادی کا پروگرام بنا رہی ہیں اور وہ بھی عالمہ کے ساتھ.....؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.....“

”میں تو صرف آپ کی اور عالمہ کی وجہ سے کہہ رہی تھی..... آپ کی بھی یہی خواہش تھی اور شاید عالمہ کی بھی..... جو وہ ابھی تک.....“ وہ کہتے کہتے خود ہی رک گئیں..... ان کا لہجہ بجھا ہوا تھا..... پھر دوبارہ بولیں۔

”میں نے تو ابھی سلمان سے بھی کچھ نہیں پوچھا ہے۔“

”پوچھیے گا بھی مت..... اب سلمان کے لیے ایمان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے..... اور جہاں تک میری خواہش کا معاملہ ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو چکی ہے۔ عالمہ میری بیٹی ہے..... اس کی شادی کا فیصلہ میں کروں گا اور وہ اس فیصلے کو مانے گی..... یہ میرا یقین ہے.....“ انہوں نے پریقین لہجے میں کہا۔

”آپ نے ایمان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی؟“ ارسلہ نے کچھ سوچ کے پوچھا۔

”آپ کا خیال ہے کہ میں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھا ہوا ہوں.....؟ اگر وہ اپنے قلب پر ہوتی تو میں کب کا اس سے رابطہ کر چکا ہوتا..... وہ وہاں نہیں ہے اور اس کے پڑوس میں سے کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں گئی ہے..... اس نے پرانے اسپتال سے جا ب بھی ختم کر دی ہے..... ایمان کا اسکول بھی بدل گیا ہے..... اسے ڈھونڈنے میں وقت تو ہو رہی ہے مگر یہ کام ناممکن نہیں..... درمیان میں میری طبیعت اتنی خراب نہ ہوتی تو یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوتا.....“ انہوں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”ایمان بہت حساس بچہ ہے..... سلمان کو کم از کم بیٹے سے رابطہ رکھنا چاہیے تھا۔“ ارسلہ نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

”مجھے بھی سب سے زیادہ ٹکرائی کی ہے۔“ انہوں نے بھی سر ہلایا۔

”سلمان کچھ کھل کے نہیں بتاتا..... اسے ایمان پہ غصہ ہے، اپنی بات رد کیے جانے کا ملال ہے..... شاید وقت کے ساتھ اس غصے میں کمی آجائے؟“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

”جو لوگ کسی دوسرے کی رائے کو اہمیت نہیں

”آج سارا دن تمہارے بابا ایمان کو یاد کرتے رہے ہیں..... پچھلی سالگرہ پہ اس نے دادا سے بہت ساری فرمائشیں کی تھیں جو انہوں نے پوری بھی کی تھیں اور اس سال..... اس سال وہ پوتے کو فون پر مبارک باد بھی نہیں دے سکے..... نہ ہی ان لوگوں کا کوئی فون آیا۔ تم کھل کے بتاتے کیوں نہیں.....“ وہ زچ ہو کے بولیں۔

”کھل کے کیا بتاؤں.....؟ جب مجھے خود ہی کچھ بتا نہیں۔“ وہ ایک دم پھٹ پڑا۔

”کیا مطلب.....؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”مطلب یہ ای کہ ہمارے رشتے میں بہت بڑا خلا آچکا ہے۔ میں نہیں جانتا کیا ہونے والا ہے..... دیکھیں، میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں..... آپ لوگوں کی تہائی اور بابا کی بیماری کی وجہ سے میں نے پاکستان شفٹ ہونے کا فیصلہ کیا..... ایمان نے اس کی مخالفت کی..... میں اس کے باوجود بھی یہاں آ گیا..... یہ سوچ کے کہ ایمان کتنی حراحت کرے گی..... ایک دو ماہ کے بعد بالآخر ہار مان لے گی..... مجھے اس کی محبت پر خواہ مخواہ ہی یقین تھا..... مگر اس نے کیا کیا.....؟ اس نے میرا گھر چھوڑ دیا..... اپنا سیل نمبر تبدیل کر لیا..... میں نے اس کے بارے میں پتا کروایا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اس نے مجھے ایک دفعہ بھی یاد نہیں کیا..... ایک دفعہ بھی کال نہیں کی..... اور میرے لیے اس تک پہنچنے کے سارے راستے بند کر دیے..... اس کا کیا مطلب ہے.....؟“ وہ رک رک کر کہتا گیا..... اس کی آواز میں دکھ تھا۔

”وہ کیا چاہتی ہے.....؟“ ارسلہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

”صاف نظر آ رہا ہے..... وہ مجھے زیر کرنا چاہتی ہے..... ہرانا چاہتی ہے..... اور یہ میں ہونے نہیں دوں گا.....“ وہ غصے سے بولا۔

”ایمان کا سوچو سلمان.....“ ارسلہ نے اسے سمجھایا۔

”ایمان میرا بیٹا ہے، میرا ہی رہے گا..... لیکن ایمان نے میرے دل میں اپنی محبت کھودی ہے۔“ وہ حلق سے

کہا۔

”فیض نیند کا کچا ہے..... ویر تک جاگ نہیں سکتا..... زبردستی جاگے گا تو صرف کھانا نکالنے میں نہ جانے کتنے برتن توڑے گا.....“ انہوں نے کھانا ٹیبل پر لگاتے ہوئے جواب دیا۔

”تو ٹھیک ہے، آئندہ سے میں کھانا باہر ہی کھا لیا کروں گا.....“ اس نے سالن نکالتے ہوئے جواب دیا۔

”کیوں..... گھر کے ہوتے ہوئے تم کھانا باہر کیوں کھاؤ گے.....؟ سلمان ویسے تو یہ کام بیویوں کے آنے کے بعد ان کے ہی کرنے کے ہوتے ہیں..... مگر بیوی نہیں ہے تو کیا ہوا، ماں تو ابھی زندہ ہے ناں.....“ انہوں نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ نوالہ منہ کی طرف لے جاتے ہوئے اس کا ہاتھ لمحے بھر کو ساکت ہوا۔

”بیوی..... بیوی اور بچہ.....“ پچھلے چند ماہ میں اسے ان کی یاد تک نہیں آئی تھی۔ نہ جانے انہوں نے جان بوجھ کے بیوی کا تذکرہ چھیڑا تھا یا اتفاقاً ایک بات کہہ دی تھی۔ اس نے خاموشی سے نوالہ منہ میں ڈال لیا اور ہلکے ہلکے چبانے لگا..... اسے اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گئی ہوئی بھوک ایک دم غائب ہو گئی ہو۔

”آج پچیس تاریخ تھی..... ایمان کی سالگرہ.....“ ارسلہ ایک دم بولیں۔

”جی.....“ وہ بے دھیانی کے عالم میں بولا۔

”تم نے ایمان کو خوش کیا.....؟“ انہوں نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وش.....؟“ وہ چونکا۔

”یا پھر تمہارے پاس بھی ان لوگوں کا کانٹیکٹ نمبر نہیں ہے۔“ وہ طنز سے بولیں۔ وہ خاموش رہا۔

”سلمان..... تمہیں میں نے کتنی دفعہ کہا کہ تم میری ایمان سے اور ایمان سے بات کرو اور تم ملتے رہے..... تمہارے بابا نے تم سے ایمان کا نمبر مانگا تم نے بہانے بنا دیے..... تمہیں یہاں آئے سات ماہ ہونے کو ہیں مگر کوئی بات واضح نہیں ہو رہی۔“ انہوں نے بالآخر پوچھ لیا۔

”ای..... یہ کون سا وقت ہے اس موضوع کو چھیڑنے کا۔“ اس نے کھانے سے ہاتھ روک کے پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

پریشان چھوڑ کے چلا گیا۔

پہلے بابا کی باتوں نے پھر شاہنواز کی اس حرکت نے اس کا ذہنی سکون ورہم برہم کر دیا تھا..... وہ غائب دماغی سے اپنی سیٹ پر جا کے بیٹھ گئی..... مریضوں کی طویل قطار اس کی منتظر تھی..... اس نے اپنے حواس جمع کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

☆☆☆

بابا کی بیماری کی وجہ سے اس نے اسپتال قدرے دیر سے جوائن کیا..... مگر جب کیا تو اندازہ ہوا کہ آؤسے کا آوا بگڑا ہوا ہونا کسے کہتے ہیں..... گو کہ ڈاکٹر زید کا اسپتال بہت سارے دیگر اسپتالوں سے بہت بہتر تھا مگر سلمان کو تو باہر کام کرنے کا مزہ ملا ہوا تھا وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر چڑھ جاتا..... ایک پرائیویٹ اسپتال ہونے کے ناتے یہاں کے چارجز کافی زیادہ تھے اور اسی مناسبت سے وہاں پیسے والوں کی پہنچ ہی ممکن تھی..... لیکن نہ جانے کیوں اسے قدم، قدم پر یہ احساس ہو رہا تھا کہ کسی ہسپتال کے انٹرنیٹ کے بجائے کسی کاروباری ادارے میں کام کر رہا ہو..... مریضوں کا عدم تعاون، انتظامیہ کی بے پروائیاں، ڈاکٹرز کی کوتاہیاں، ناقص اور غیر معیاری ادویات اور سب سے بڑھ کر ہر چیز کے آسمان تک پہنچے ہوئے چارجز..... وہ جب ترقی یافتہ ممالک کے اسپتال کا مقابلہ یہاں کے اسپتالوں سے کرتا تو اسے افسوس کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی ہوتی۔ کچھ چیزیں تو بس سے باہر تھیں مگر کچھ چیزیں جو ٹھیک ہو سکتی تھیں وہ اس نے ٹھیک کرنے کی کوششیں شروع کر دیں..... وہ بے تحاشا مصروفیت کا شکار ہو گیا تھا..... گھر بس سونے ہی کے لیے چاہا تا..... باقی دنیا میں کیا چل رہا تھا اسے اس کی خبر نہیں تھی۔ اس رات بھی وہ گھر پہنچا..... بابا سوچکے تھے۔

ای جاگ رہی تھیں..... وہ بے چاری جب تک اپنے سامنے اسے کھانا نہ کھلا لیتیں انہیں چین نہیں آتا تھا۔

”اوہ..... آپ ٹیبل پر کھانا رکھ کے سو جا یا کیجیے..... میں جب آؤں گا کھالوں گا.....“ اس نے شرمندگی سے کہا۔

”ٹھنڈا کھانا؟“ وہ مسکرائیں۔

”فیض سے کہہ دیا کریں.....“ اس نے جلدی سے

بولی۔ ”کوئی کام تھا سر.....؟“

”کام..... نہیں کام کیوں ہوگا..... بس آپ ایک دفعہ کے بعد نظر ہی نہیں آئیں..... حالانکہ میں کئی دفعہ سر کی طرف گیا ہوں.....“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔ سر سے ان کی مراد بریگیڈیر وقاص تھے..... ”انکل“ سے ”سر“ تک کا سفر ان کی سبجری کا کمال تھا۔

”ایک دو دفعہ تو گئی ہوں اس کے بعد بھی..... زیادہ نہیں جاسکی کیونکہ آج کل اسپتال ہی میں مصروفیت بہت زیادہ ہے۔ آپ کو تو پتا ہی ہے۔“ اس نے قدم آگے بڑھائے اور میجر شاہنواز اس کے ساتھ ہی چلتے گئے۔ اسے ہلکی سی کوفت کا احساس ہوا..... ”دراصل میں..... فی الحال اکیلی ہی ہوں اولی ڈی میں..... اور رش بہت زیادہ ہے۔“ اس نے بات مکمل کی۔

”بالکل میں جانتا ہوں..... اسپتال میں آپ کی فرض شناسی کے بہت چرچے ہیں۔“ انہوں نے تعریفی نگاہ اس پر ڈالی۔

اس نے جواباً کچھ نہ کہا..... کارڈور سے گزرتے ہوئے اپنی کلینک کے دروازے پر وہ رک گئی۔

”اب یہ میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ رہے ہیں؟“ اس نے جھنجھلا کے سوچا۔

”آپ یقیناً یہ سوچ رہی ہوں گی کہ میں آپ کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ رہا ہوں۔“ اس نے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر مسکرا کر کہا۔

عالمہ اس قدر درست ماسٹر ریڈنگ پر چونک گئی اور گڑبڑا کر بولی۔

”اوہ سوری..... شاید میں جلدی کی وجہ سے آپ کی بات بغور نہیں سن سکی..... اصل میں کام کا پریش.....“ اس کی بات میجر شاہنواز نے اچک لی۔

”کوئی بات نہیں..... مجھے صرف اتنا کہنا تھا کہ اس بار لاگ ویک اینڈ پر آپ اپنے چاچو کے گھر ضرور جائیے گا..... ہو سکتا ہے میں بھی آپ کو وہاں ملوں۔“

”جی.....“ اس نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔

”جی..... اوکے بابے.....“ وہ جس طرح حیران کرتا ہوا اس کے ساتھ یہاں تک آیا تھا ویسے ہی حیران و

کہ اس کے اپنے پاس بھی گاڑی ہوتا کہ وہ کسی کے اوپر انحصار نہ کرے۔

یہ کوئی مشکل کام تو نہیں تھا..... اس نے اپنی گاڑی خرید لی..... گو چھوٹی کار تھی مگر براڈ نیو تھی..... اپنی کمائی سے خریدی ہوئی کار دیکھ کر اسے یک گونہ اطمینان محسوس ہوا اس مرتبہ وہ خود ڈرائیو کرتی ہوئی چاچو کے گھر روانہ ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ میجر شاہنواز اسے کال کر کے اپنے ساتھ لے جانے کی آفر کرتے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ نکل جائے..... لیکن وہ اسے حیران کرنے پر تھے تو بھلا کوئی موقع کیسے ہاتھ سے جانے دیتے۔

وہ چاچی کے گھر پہنچی تو گیارہ بج رہے تھے اس نے بارن دیا..... فیض نے دروازہ کھولا۔

”اوہ..... نئی گاڑی..... مبارک ہو باجی۔“ اس نے کار دیکھ کر خوشی سے باجیس پھیلائیں وہ کار ڈرائیو دے پر کھڑی کرتی ہوئی باہر آئی۔

”شکریہ.....“ اس نے مسکرا کے فیض سے کہا۔

گیٹ پہ بارن کی آواز سے وہ چونک اٹھی۔ ”اس وقت کون آ گیا؟“ اس نے چونک کر اسی طرف دیکھا۔ فیض نے دوبارہ گیٹ کھول دیا۔

میجر شاہنواز کی گاڑی اندر داخل ہو گئی۔

”ہائیں.....“ اس نے بہ مشکل اپنے حیرت سے کھلتے ہوئے منہ کو بند کیا۔ دوسرا جھکا اسے تب لگا جب میجر شاہنواز کے ساتھ چاچو بھی گاڑی سے اترتے دکھائی دیے۔

”چاچو آپ صبح، صبح کہاں گئے تھے..... طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی؟“ وہ گھبرا کے ان کے نزدیک آتے ہوئے بولی۔

”طبیعت تو سو فیصد ٹھیک ہے..... یہ دیکھو.....“

انہوں نے سینہ تان کے ہاتھ پھیلائے۔ ان کے اس طرح کہنے پر عائشہ نے بغور جائزہ لیا۔ وہ واقعی ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے..... عائشہ کی نگاہ فیض پر پڑی۔ جو کار کی ڈکی سے گالف کٹ نکال کر گھر کے اندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

چاچو نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔

بات کا ذکر بھی کیا تھا۔

”نہ جانے کون سی خاص بات ہو سکتی ہے۔“ اس نے سوچا۔

اسے یاد آیا کہ میجر شاہنواز نے بھی تو اسے اس ویک اینڈ پر چاچو کے گھر آنے کی تاکید کی تھی۔

”کیوں..... یہ کیا راز ہے بھی..... اس ویک اینڈ پر کیا ہونے جا رہا ہے۔“ اس نے دوبارہ کروٹ

بدلی..... سوچتے، سوچتے اس کی پلکیں نیند سے بوجھل

ہونے لگی تھیں..... وہ فوراً ہی نیند کی وادیوں میں اتر

گئی..... نیند سے پہلے اس کے تصور کے پردوں میں

آخری تصویر شاہنواز کی تھی۔

☆☆☆

ایمان کی آٹھ سالہ زندگی کی یہ پہلی سالگرہ تھی جب

اس کا باپ اس کے ساتھ نہیں تھا..... صرف ساتھ ہی

نہیں تھا بلکہ اس نے اسے فون پر بھی مبارک باد نہیں دی

تھی۔ اس نے کیا سوچا ہوگا.....؟ وہ خفا ہوا ہوگا..... یقیناً

خفا ہی ہوا ہوگا..... اس کی اور ایمان کی انا کی اس جنگ

میں اس معصوم بچے کا کیا تصور ہے.....؟ سلمان نے

پاکستان آنے کے بعد پہلی مرتبہ ٹھنڈے دل و دماغ سے

سوچا۔

”لیکن ساری کی ساری غلطی میری تو نہیں.....“

ایمان کو اس طرح رابطے منقطع کرنے کی کیا ضرورت

تھی؟“ اس نے کوفت محسوس کی۔

”کیا کروں..... کیا واپس انگلینڈ جا کر ایک کوشش

اور کر کے دیکھ لوں.....؟ پھر آریا پار..... اگر ایمان نہیں

مانی تو اس بار سارے رشتے ختم کر آؤں گا..... اور اپنے

بچے کو بھی ساتھ لے آؤں گا.....“ بچے کی یاد آئی تو خون

جوش مارنے لگا..... اور وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ یہ اور

بات کہ ایمان کے لیے اب بھی اس کا غصہ برقرار تھا۔

☆☆☆

چاچو کے گھر جانے کے کئی طریقے ہوا کرتے

تھے..... بھی چاچو اسے ڈرائیو اور گاڑی بھیج کے بلوا

لیتے..... کبھی وہ خود ٹیکسی پر چلی جاتی..... سلمان کے آنے

کے بعد ایک آدھ دفعہ وہ اسے لینے آ گیا تھا..... اور یہ

عائشہ کو سب سے زیادہ برا لگا تھا..... اس مسئلے کا حل یہی تھا

جب بیڈ پر لیٹی تو بجائے نیند آنے کے ذہن میں لائقانی سوچوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اسے لگتا وہ بلا مقصد ہی جیسے چلی جا رہی ہے۔ ”کیا یہ زندگی یونہی گزر جائے گی.....؟ ضروری تو نہیں کہ زندگی میں جو چاہا جائے وہ ہو بھی جائے۔ ایسے خوش نصیب لوگ تو کم ہی ہوتے ہیں جو وہ سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں جن کی انہیں خواہش ہوتی ہے..... سلمان وقاص جیسے.....“ اس نے سوچا۔ لیکن سلمان وقاص کی زندگی کا گورکھ دھندا اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”نہ جانے بیوی اور بچے کو کہاں چھوڑ آئے ہیں؟“

اس نے کروٹ لیتے ہوئے سوچا۔ چاچو سے اسے سلمان

اور ایمان کے کسی اختلاف کی ہلکی سی سن گن تول گئی تھی مگر

وہ تفصیل نہیں جانتی تھی اور نہ ہی اس نے کرید ا تھا۔

”مرد سے زیادہ ظالم اور خود غرض اور کون سی مخلوق

ہے.....؟ اور مرد بھی سلمان جیسا..... جس نے ساری

زندگی صرف اپنی خوشیوں اور خواہشات کو مقدم رکھا اور

اسے بھی کسی کا دل رکھنے کا خیال آیا ہی نہیں..... اس بار

بھی اسی کی غلطی ہوگی۔“ عائشہ کے دل نے معاملہ جانے

بغیر سلمان کے خلاف فیصلہ سنا دیا۔

وہ ایمان سے کبھی نہیں ملی تھی..... یہاں تک کہ وہ

اسے جانتی بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ سلمان کو ضرور جانتی

تھی..... بلکہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اور جوں، جوں اس کی

شخصیت کے اسرار و رموز کھل رہے تھے، عائشہ کی نگاہوں

میں وہ اپنا مقام کھوتا جا رہا تھا۔

”کیا یہ وہ شخص ہے جس کے کھوجانے پر میں نے

اپنی زندگی کے اتنے سال گنوا دیے؟“ وہ اب خود سے

پوچھنے لگی تھی۔

”صرف اپنی خوشی کے لیے جینے والے لوگوں کی

زندگیوں میں بار بار ایسے مقام آتے ہیں جب انہیں اپنی

خوشی کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کی خواہشات اور

خوشیوں کو پھل کے آگے بڑھنا ہوتا ہے اور وہ یہ سب کچھ

بڑے آرام سے کر گزرتے ہیں..... ایسے لوگوں پر بھروسہ

کرنا بے وقوفی ہے.....“ عائشہ کو احساس ہوا۔

اگلے دن اسے چاچو کے پاس جانا تھا۔ چاچو نے

بطور خاص اسے فون پر آنے کے لیے کہا تھا..... کسی خاص

بولے۔

”رشتے ایسے نہیں ٹوٹتے..... کچھ بھی ہے..... وہ

تمہاری بیوی تو ہے..... طلاق تو نہیں دی ہے تم نے.....

اگر اس رشتے کو قائم نہیں رکھنا چاہتے تو پھر سارے سلسلے

ختم کر دو..... طلاق دے دو اس کو اور اپنے بیٹے کو اپنے

پاس بلوالو..... اس طرح معاملے کو مٹاؤ.....“ انہوں

نے بیٹے کے شانوں کو تھپتھپایا۔

”طلاق.....؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”سلمان تم پاکستان میں شادی کر لو..... اپنی زندگی

برباد مت کرو.....“ وہ پھر بولیں۔

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

”کیوں ممکن نہیں ہے.....؟ بس میں نے کہہ دیا

..... یا تو ایمان کے ساتھ اپنے معاملے کو کوئی حتمی صورت

دے دو..... یا یہاں شادی کر لو.....“ وہ بھی کھڑی

ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے اے..... اس موضوع پر کسی اور دن

بات کر لیں گے.....“ وہ اکتا کر بولا اور شب بخیر کہتا ہوا

تیزی سے زینے کی طرف بڑھ گیا۔

ارسلا اس کی پشت دیکھتی رہ گئیں۔ انہوں نے تہیہ

کر لیا تھا کہ اب ہر صورت اس معاملے کو سلجھا کے رہیں

گی۔

☆☆☆

میجر شاہنواز نے اسے حیران کرنے کا تہیہ کیا ہوا

تھا۔ ان کا ہر روز صبح، صبح اسے پابندی سے سلام کرتا ہی

اس کی برداشت کا امتحان تھا..... زیادہ بات چیت تو نہیں

ہو پاتی تھی مگر ان کا دیکھنا ہی کافی ہو جاتا تھا..... انتہائی

سنجیدہ اور سویر پر سنیلٹی والے میجر شاہنواز کو ہو کیا گیا ہے،

وہ ان کے دیکھتے رہنے پر پزل ہو جاتی..... انہوں نے

آنکھوں سے تیر چلا نا بلکہ میزائل داغنا کیسے اور کب سیکھ

لیا..... وہ ہر بار آمتا سامتا ہونے پہ یہی سوچتی۔ زندگی

عجیب سی ہو چکی تھی۔

اسپتال میں مصروفیت حد سے سوا ہو گئی تھی۔ کراچی

میں ماما ناراض تھیں..... چاچو کی طرف کچھ مصروفیت کی

وجہ سے اور کچھ دانستہ طور پر وہ جانہیں رہی تھی..... میجر

شاہنواز نے الگ ستار رکھا تھا۔ وہ تھک کے چور ہو کے

”بھئی آج شاہنواز کا موڈ گالف کا ہو رہا تھا سو وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گیا..... بڑے عرصے کے بعد گالف کورس میں قدم رکھا..... مزہ آگیا.....“ انہوں نے خوش ہو کے بتا دیا۔

”آپ نے زیادہ exertion تو نہیں کی؟“

عائد نے تشویش کے عالم میں انہیں دیکھا۔

”ارے نہیں بھئی، دو چار سے زیادہ شائس لگانے نہیں دیے صاحبزادے نے..... زیادہ تر میں گالف کورس کے سرسبز و شاداب ماحول اور تازہ ہوا ہی سے لطف اندوز ہوا ہوں.....“ وہ جلدی سے بولے۔

میجر شاہنواز اس گفتگو کے دوران جیبوں میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے کھڑے رہے۔

”زبردستی پوز مارنے کی کوشش.....“ عائد نے جل کے سوچا۔ وہ ان سے دامن بچا کے بھاگی تھی اور وہ اس سے پہلے وہاں موجود.....

”چلو بھئی اندر چلو..... یہاں کیوں کھڑے ہو تم لوگ.....“ بریگیڈیر وقاص نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا..... اس کے ساتھ ہی ان کی نظر عائد کی کار پر پڑی۔

”کون آیا ہے..... یہ کس کی گاڑی ہے.....؟“ وہ چونکے۔

”یہ میڈم کی کار ہے..... پرسوں انہوں نے شوروم سے نکلوائی ہے..... کل اس کی خوشی میں سب کو مٹھائی کھلائی ہے..... سوائے میرے..... اور آج خود ڈرائیو کرتی ہوئی یہاں تشریف لائی ہیں۔“ میجر شاہنواز نے مسکراتے ہوئے اس پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔

”پل، پل کی خبر ہے موصوف کو.....“ وہ دل ہی دل میں سچ و تاب کھا رہی تھی۔

”ارے واہ..... مبارک ہو بھئی.....“ چاچو نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

”مگر سران سے یہ تو پوچھیں، انہوں نے مٹھائی سب کو کھلائی تو میں نے کیا قصور کیا تھا.....؟“ شاہنواز کے لہجے میں شرارت بھری ہوئی تھی۔

عائد کا دل چاہا کہ کوئی کرار اس کا جواب دے.....

مگر اس کے سینر ہونے کا لحاظ آڑے آگیا۔

”مجھے معلوم تھا سر آپ مجھے یہاں ملیں گے، اس لیے آپ کے حصے کی مٹھائی میں یہاں سے لے آئی ہوں۔“ وہ قدرے چبا کے بولی۔

”اوہ شکریہ، شکریہ.....! اس عزت افزائی کا کہ آپ نے مجھے اپنے خصوصی لوگوں میں شامل کیا۔“ وہ مسکرایا۔

”چلو بھئی..... تمہاری چاچی نے حیدر سے ناشتے کا اہتمام کر رکھا ہوگا..... ناشتا کیا اب تو بیچ ہی کر س گے اور اس کے بعد عائد کی لائی ہوئی مٹھائی کھائیں گے۔“ بریگیڈیر وقاص نے اندرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا، وہ چاچو کے ساتھ آگے بڑھی۔ میجر شاہنواز ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

☆☆☆

”پروپوزل تو بہت اچھا ہے۔“ سعدیہ کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

”میں نہ کہتا تھا کہ خدا کے ہاں میرے اندر صبر نہیں..... دیکھو وقاص نے اس کی محبت کا حق ادا کر ہی دیا..... شاہنواز، سلمان سے ہر اعتبار سے بہتر ہے..... چند مہینوں میں پروموٹ ہو کر ریٹائرمنٹ کر لیں گے۔“ عائد نے گہرائی سے تعلق ہے..... وقاص کے بہت پرانے جاننے والے ہیں.....“ وقاص کے چہرے پر بھی اطمینان تھا۔

”بس اب عائد کوئی گڑبڑ نہ کرے..... پہلے بھی اچھے، اچھے رشتوں کو منج کر چکی ہے۔“ سعدیہ کے لہجے میں اعدائے تھے۔

”عائد سے بات کرنے کی ذمہ داری بھی وقاص نے لے لی ہے..... بس اب دعا کرو کہ سب کچھ خوش اسلوبی سے ہو جائے۔“ وہ آہستہ سے بولے۔

”رشتہ سٹے ہو جائے گا تو چٹ مٹنی پٹ بیاہ کر دیں گے۔ کتنا اچھا ہوگا دونوں ایک ساتھ ہوں گے..... ایک ساتھ پوسٹنگ ہو جائے گی اور ایک ہی اسٹیشن پر رہیں گے.....“ وقاص صاحب اس سے زیادہ اطمینان بخش اور کون سی بات ہوگی ہمارے لیے.....“ سعدیہ کی آنکھیں جھجک رہی تھیں۔

”کچھ رشتے ایسے سٹے ہوتے ہیں کہ لڑکا اور لڑکی کو دیکھ کر صرف ایک ہی جملہ ذہن میں آتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے ہی کے لیے بنے ہیں.....“ وقاص مسکرائے۔

”باقاعدہ رشتہ کب آئے گا.....؟“ وہ بے تابی سے بولیں۔

”شاید ایک آدھ ہفتے میں بات آگے بڑھے گی.....“ وقاص نے مجھے کل فون کیا تھا تو وہ کہہ رہا تھا کہ بریگیڈیر بخاری کو میرا نمبر دے دیا ہے۔“ انہوں نے بتایا۔

سعدیہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آنے لگیں..... ان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی تھی..... ایک ماں کا دل بیٹی کی خوشیوں کے لیے دعا گو تھا لیکن انجانے خدشات سے متشکر بھی..... یہی صورت حال وقاص کی بھی تھی..... عائد کی شادی ان کی ایک بہت بڑی خواہش کے ساتھ ساتھ ذمے داری بھی تھی۔

☆☆☆

”برنج تو ہو گیا اب یہ جاکیوں نہیں رہے ہیں..... کیا سارا دن ہمیں گزاریں گے؟“ عائد نے میجر شاہنواز کو چاچو کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھ کے کہیں لگاتے دیکھ کر کوفت کے عالم میں چاچی سے پوچھا..... یہ اور بات تھی کہ بول صرف بریگیڈیر وقاص ہی رہے تھے..... میجر شاہنواز موڈ ہو کے ان کے زمانے کے قہقہے سنتے چلے جا رہے تھے۔

”کیوں تمہیں اس کا بیٹھا رہنا برا لگ رہا ہے کیا.....؟“ وہ مسکرائیں۔

”مجھے برا تو نہیں لگ رہا..... مگر وہ چاچو کے پاس قبضہ جما کے بیٹھ گئے ہیں..... مجھے بھی تو چاچو سے بات چیت کرنی تھی۔“ وہ شکایتا بولی۔

”تو تم بھی جا کے بیٹھ جاؤ۔“ چاچی نے اسے چھیڑا۔

”جی نہیں..... یہ چلے جائیں گے..... پھر میں چاچو کے پاس جا کے بیٹھوں گی۔“

”مگر آئے مہمان کو کبھی تو دینی ہے ناں..... آج تو ہفتے کا دن ہے..... سلمان کا آف نہیں ہوتا وہ اسپتال گیا

ہوا ہے اور مجھے کچن دیکھنا ہے..... ویسے بھی تمہارے چاچو کو کوئی فوجی اور وہ بھی جو نیئرل جائے تو بہت خوش ہوتے ہیں..... ان کے پاس واقعات اور تجربات کا ایک ذخیرہ ہے جو وہ اپنی فیلڈ کے لوگوں ہی کو سنا کے خوش ہوتے ہیں۔“ چاچی نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ یہ محفل اب جلد برخواست نہیں ہونے والی..... چلیں پھر میں آپ کے ساتھ کچن میں ہیلپ کر دیتی ہوں..... کیا بنانے جارہی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”تمہارے چاچو پر ہیزی کھانا کھانا کھا کے بور ہو چکے ہیں..... آج ان کے لیے ہلکے مسالے والی کوئی ڈش بناؤں گی اور تم کیا کھاؤ گی اپنی پسند بھی بتا دو۔“ وہ کینٹ میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے بولیں۔

”میری پسند کور بنے دیں چاچی پہلے یہ بتائیں کہ کیا وہ موصوف رات کا کھانا کھا کے ہی تشریف لے جائیں گے؟“ وہ چڑ کے بولی۔

”جی نہیں..... موصوف تشریف لے جا رہے ہیں..... رات کا کھانا پھر کبھی سہی۔“ عائد کی پشت پر آواز ابھری اور وہ بلا مبالغہ کئی انچ اچھل پڑی..... امریکن اسٹائل اوپن کچن کا یہی نقصان ہوتا ہے..... وہ کب لاؤنج سے اٹھ کر وہاں آیا اسے خبر ہی نہیں ہوئی..... اور اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے..... وہ رینگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی اور اب شرمندگی کے عالم میں فرش کو گھور رہی تھی۔

”او کے آنٹی..... بس آپ سے اجازت لینے آیا تھا..... برنج کا بہت شکریہ.....“ اب وہ چاچی کو مخاطب کر کے بولا۔

چاچی ہاتھ میں مسالے کا ڈبا پکڑے ہلکی سی شرمندگی کے عالم میں کھڑی تھیں..... اس نے عائد کی بات سن لی..... تو کیا سوچتا ہوگا.....؟ عائد شاید ناواقف تھی مگر وہ تو جانتی تھیں کہ اب شاہنواز سے کیسا تعلق ہونے جا رہا تھا..... انہوں نے شاہنواز کا چہرہ دیکھا جس پر ہمیشہ کی شرارت کی جگہ سنجیدگی تھی۔

”اوہ بیٹا شکریہ کی کیا بات ہے..... تمہارا اپنا گھر ہے میں تو کہتی ہوں کہ رک جاؤ، ڈنر کے بعد ہی جانا.....“

لان میں میری طرح کرکٹ کھیل، کھیل کر لائیں تو رہا ہوتا یا بھاگ، بھاگ کے گھاس خراب کر رہا ہوتا۔ مگر ای بابا اس کی اس حرکت پر اسے کچھ بھی نہیں کہتے۔ جیسے مجھے ہر اسٹیشن پر لان کی گھاس خراب کرنے پر ای سے ڈانٹ سنی پڑتی تھی۔ اس کے لب خواہ خواہ مسکرا اٹھے۔ ایمان کی ضد نے اس گھر کو اس رونق سے محروم کر دیا تھا۔

”اتنے مہینے گزر گئے۔ مڑ کے دیکھا بھی نہیں۔ خدا جانے میرے بیٹے کو لے کر کہاں غائب ہو گئی ہے ضدی عورت۔“ اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور دانت غصے میں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

”تم نے مجھے نیچا دکھایا ہے، اب میں تمہیں نیچا دکھاؤں گا ایمان۔ انتظار کرو۔۔۔ شاید ای ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔۔۔ مجھے اپنی زندگی کے لیے کوئی بہتر فیصلہ کر لینا چاہیے۔ دوسری شادی۔ مگر کس سے؟ وہ کون ہوگی جو مجھے سمجھ سکے، میرے ماں، باپ کو اپنے ماں باپ سے بڑھ کر عزت دے۔ اس گھر کو سنبھال سکے۔“

عائکہ بریگیڈیر وقاص کی کسی بات پر زور سے ہنسی۔ اس کے مترنم تھپتھپنے نے سلمان کو اس کی سوچوں سے ایک دم باہر نکال دیا۔ وہ زور سے چونکا۔

”عائکہ۔۔۔ ماں عائکہ وقاص سے بہتر اور کون ہو سکتی ہے۔۔۔ جو بچپن سے میرے گھر کے ماحول میں رچی بھٹی ہے، جو میرے ماں باپ سے مجھ سے بھی زیادہ محبت کرتی ہے، جو مجھے اور اس گھر کو سنبھال سکتی ہے۔ جو بابا کی خواہش ہے۔۔۔ اور ابھی تک کنواری ہے۔۔۔ میرے پروپوزل پہ خوشی سے اس کا ہارٹ فیل ہی نہ ہو جائے۔“ سلمان کی سوچوں میں ایک دم تکبر اتر آیا۔ اس خیال نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔ وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆

عائکہ کو کسی مُردے کے اچانک زندہ ہونے کی خبر ملتی تو شاید وہ اس قدر حیران نہ ہوتی جتنا وہ اس صبح کو پڑھ کے ہوئی تھی۔ موبائل اس کے بے جان ہاتھوں میں ساکت پڑا تھا اور اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔

ناک بات یہ ہے کہ اس راہ گزر پر پیچھے واپس جانے کا کوئی آپشن موجود نہیں ہوتا، ان غلطیوں پر افسوس تو کیا جاسکتا ہے انہیں سدھارا نہیں جاسکتا، بس تحمل مندی یہ ہے کہ اپنی غلطیوں اور تجربوں سے کچھ سیکھنا چاہیے اور آگے کی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ سانس لینے لگے۔

عائکہ ان کی طرف بغور دیکھ رہی تھی۔

”میں نہیں چاہتا کہ تمہاری زندگی میں کبھی کوئی ایسا لمحہ آئے کہ تمہیں پچھتانا پڑے۔۔۔ جو چیزیں کبھی زندگی اور موت کا مسئلہ محسوس ہو رہی ہوتی ہیں تھوڑا وقت گزرنے کے بعد سراسر حماقت محسوس ہوتی ہیں۔ تم سمجھ رہی ہو ناں میں کیا کہتا چاہتا ہوں؟“ انہوں نے ایک دم پوچھ لیا اور وہ بری طرح گڑبڑا گئی۔

”جی۔۔۔“

”گزری ہوئی حماقتوں کو یاد کر کے یا تو انسان ان پر ہنستا ہے یا شرمندہ ہوتا ہے۔ ہنسنا تب جاتا ہے جب اس حماقت کی وجہ سے کسی کا کوئی نقصان نہ ہوا ہو اور شرمندگی تب ہوتی ہے جب وہ حماقت کسی آزار کا سبب بن گئی ہو۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ تم آج سے چند سالوں کے بعد اپنی گزری حماقتوں پر ہنس رہی ہوگی، شاہنواز اور اپنے بچوں کے ساتھ۔“

عائکہ ان کے جملوں کے آخری حصے پر گڑبڑا گئی۔ اس کے بعد اس سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔ یہ آج چاچو کو کیا ہو گیا ہے؟ اس نے وہاں سے اٹھتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

پہلی بار تھا کہ وہ ویک اینڈ پر عائکہ کی موجودگی پر irritate نہیں ہوا۔ وہ عائکہ کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ پورے گھر میں آزادی کے ساتھ ادھر ادھر گھومتی ہوئی عائکہ گھر کا حصہ محسوس ہو رہی تھی۔ کبھی ای تو کبھی بابا کے پاس۔۔۔ کبھی کسی کام میں مصروف یوں لگ رہا تھا جیسے وہ انجینی ہو اور یہ گھر عائکہ کا ہو۔۔۔ یہ مقام تو ایمان کا تھا۔۔۔ اگر وہ میرے ساتھ آگئی ہوتی تو اس وقت عائکہ کی جگہ وہ نظر آتی۔۔۔ اور ایمان۔۔۔ وہ دادا کے ساتھ بیٹھا ان کے قصے سن رہا ہوتا اور اپنے سنار ہوتا۔ یا باہر

”کچھ نہیں چاچو۔۔۔ میں کب خاموش ہوں۔۔۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”تو بھی اب وہ خاص بات تم سے کر لوں، جن کو سوچ، سوچ کے میرا دل ناقواں خوشی سے جھوم رہا ہے۔ وہ ہنس کے بولے۔

”کیسی خاص بات چاچو۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”میں نے تمہارا رشتہ شاہنواز کے ساتھ طے کر دیا ہے۔“ وہ پھر مسکرائے۔

اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بغیر کسی تمہید کے، چاچو کے منہ سے اتنی بڑی بات اچانک سننا اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہاری شادی شاہنواز بخاری سے ہونا بہت مناسب ہے لیکن تمہاری مرضی بھی شامل ہونا بہت ضروری ہے، تو تم بتاؤ کیا کہتی ہو۔۔۔ میرا فیصلہ منظور ہے۔۔۔؟“ وہ بچوں کی طرح پُرجوش ہو کے بولے۔ عائکہ نے چاچو کو اتنا زیادہ خوش بڑے طویل عرصے کے بعد دیکھا تھا، وہ ان کی شکل دیکھتی رہ گئی اس کے منہ سے کچھ بھی نہ نکل سکا۔ سب کچھ طے کرنے کے بعد آخر میں اس کی رائے پوچھنے کا بھلا کیا مطلب تھا۔۔۔؟ ایسے میں چاچو اس کی مدد کو آئیں۔

”ایسے سوال کتنی پرستول رکھ کے پوچھے جاتے ہیں کیا۔۔۔؟ اسے سوچنے کا موقع تو دیں۔“

”ہاں، ہاں سوچو بھی ضرور سوچو، سوچ کے مجھے جلدی بتا دینا۔۔۔ اور یہ ذہن میں رکھنا کہ شاہنواز مجھے پسند ہے۔“ وہ مسکرا کے بولے۔

وہ کچھ نہ بولی صرف سر جھکا کے بیٹھی رہی، وہ جانتی تھی کہ اب اس کی ایک بھی چلنے والی نہیں۔۔۔ فیض کا بازار سے کچھ سامان لے کر آیا تھا، چاچو اس کے پیچھے چلے چل دیں۔۔۔ اور اس کا دل بھی یہی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی اٹھے اور منظر سے غائب ہو جائے۔

”جب انسان عمر کی منزلیں طے کرتا ہو اس مقام تک پہنچتا ہے جہاں ابھی میں کھڑا ہوا ہوں تو بہت ساری چیزوں کی حقیقت کھل جاتی ہے، پیچھے مڑ کے دیکھنے کے بعد اپنی بھی بہت ساری غلطیاں نظر آتی ہیں لیکن افسوس

وہ جلدی سے بولیں۔

”نہیں آنٹی، مجھے ایک ضروری کام ہے چلتا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے مڑنے لگا۔

”شاہنواز۔۔۔“ ارسلہ نے اسے جلدی سے پکارا۔

”جی آنٹی۔۔۔ پٹا تمہاری آمد کا بہت شکریہ۔۔۔“

بریگیڈیر صاحب تمہارے آنے، تم سے ملنے اور باتیں کرنے سے بہت خوش ہوتے ہیں۔۔۔ آتے رہا کرو۔“ انہوں نے محبت سے کہا۔

”جی ضرور۔۔۔“ وہ اس دوران پہلی بار مسکرایا اور عائکہ کو نظر انداز کرتے ہوئے ارسلہ کو خدا حافظ کہہ کر نکل گیا۔

”بہت بری بات ہے۔۔۔“ اس کے جاتے ہی ارسلہ، عائکہ کو خوشی سے دیکھ کر بولیں۔

”سوری چاچی، مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ یہاں آجائیں گے۔“ وہ شرمندگی سے بولی۔

”تم اتنا چڑتی کیوں ہو شاہنواز سے۔۔۔ اس نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔۔۔؟“ وہ جرح کرتے ہوئے بولیں۔

”میرا کیا بگاڑیں گے وہ۔۔۔ بس بچپن ہی سے عجیب سے مزاج کے ہیں۔۔۔ غصہ، غرور اور کسی کو کچھ نہ سمجھنا ان کی عادت تھی۔ وہی تاثر شاید ذہن میں بیٹھ گیا ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”نہیں عائکہ۔۔۔ شاہنواز بہت بدل گیا ہے۔۔۔ اس میں بہت سمجھداری اور پیچورٹی آئی ہے۔۔۔ اس کے اخلاق اور رکھ رکھاؤ میں تو بہت نمایاں بہتری آئی ہے۔ اور ظاہر ہے پہلے وہ بچہ تھا اب ایک سمجھدار مرد ہے۔۔۔ تم بھی کب کی باتیں یاد کر کے بیٹھی ہو۔۔۔“ انہوں نے عائکہ کو سمجھایا۔

”عائکہ۔۔۔؟“ چاچو کی آواز ابھری۔

”جی چاچو۔۔۔“ وہ چونک کے مڑی۔

”ادھر آؤ۔۔۔ میرے پاس بیٹھو آؤ۔۔۔“ انہوں نے کہا۔ وہ مرے مرے قدموں سے ان کے پاس پہنچی۔

”کہاں ہو بھئی۔۔۔؟“ وہ اسے دیکھ کر مسکرائے۔

”ادھر ہی ہوں۔۔۔“ وہ خاموشی سے ان کے سامنے جا بیٹھی۔

”کیا ہوا۔۔۔ میری بیٹی اتنی خاموش کیوں ہے آج؟“ انہوں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”کچھ چیزیں جن کی انسان تمنا کرتا ہے، جن کے لیے ہاتھ اٹھا کر رو کر دعا کرتا ہے، کبھی کبھی مل تو جاتی ہیں مگر بہت دیر سے..... اتنی دیر کہ جب ان کی اہمیت اور طلب کی شدت میں کمی آچکی ہو۔“ یہ پیغام اگر اسے دس گیارہ سال پہلے ملتا تو شاید وہ خوشی سے پاگل ہو جاتی..... مگر اب صرف سکتے میں تھی۔ سلمان نے اسے پرہیز کیا تھا..... انتہائی سادہ انداز میں۔

”تم مجھ سے شادی کرو گی.....؟“ اسے لگا شاید سلمان نے اس سے مذاق کیا ہے..... لیکن چند ہی منٹوں کے بعد سلمان کی کال نے اسے ایک دوسرا جھٹکا دیا۔

”میرا رنج مل گیا.....؟“ اس کا انداز تارل تھا۔

”جی.....“ وہ کسی ٹرانس کی حالت میں بولی۔

”میں نے سوچا ای بابا سے بات کرنے سے پہلے تم سے پوچھ لوں..... اگر تمہارا جواب ہاں میں ہے تو یہ کام میں جلد کرنا چاہوں گا۔“ وہ نے تے انداز میں بولا۔

اس کے لہجے میں عائدہ کو محبت اور طلب سے بڑھ کر کچھ اور محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس کا لہجہ حاکمانہ تھا..... یا شاید کاروباری اسے کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا اور وہ خاموش رہی۔

”تم سوچ لو..... جواب جلدی دے دینا۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

”عائدہ دقا..... وہ خوش نصیبی جس کی تم نے برسوں سے تمنا کی بالآخر تمہارے دروازے تک چل کے آئی گئی.....“ عائدہ نے موبائل کو بے دلی سے میز پر ڈال دیا۔ نہ جانے کیوں اس پیغام پر اس کا دل خوش نہیں تھا۔

وہ الجھنے لگی..... کچھ دنوں پہلے چاچو نے میجر شاہنواز کا پیغام اسے دیا تھا..... کراچی میں ماما، بابا..... اور یہاں چاچو، چاچی سب اس رشتے پر خوش تھے..... اگلے ویک اینڈ پر میجر شاہنواز کے والدین باقاعدہ رشتہ لے کر اس کے گھر جانے والے تھے..... وہ اس معاملے میں خاموش تماشا کی تھی کہ اچانک سلمان کا فون.....؟

”کیا اسے میجر شاہنواز کے پروپوزل کے بارے میں علم نہیں..... یا وہ یہ رشتہ نہیں ہونے دینا چاہتا ہے؟“ عائدہ خود کو ایک عجیب دور اسے پرکھ رہا محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

مریضوں کو دیکھتے ہوئے اس کا ذہن بدستور الجھائی رہا..... میجر شاہنواز اور سلمان کے بیوسٹے اس کے گرد چکر لگاتے رہے..... اس کے لیے فیصلہ دشوار ہوتا جا رہا تھا..... ایک طرف ماضی کی وہ آرزو تھی جو زندگی کی کسک بن گئی تھی، دوسری طرف ایک بہتر مستقبل تھا۔ ایک طرف دل تھا تو دوسری طرف عقل..... دل ہر ایک کے سلمان کی طرف جھک رہا تھا تو عقل شاہنواز کا ساتھ دے رہی تھی..... وہ سلمان کے آسیب سے بچنے کے لیے چاہے اسے کتنا برا کہتی اس سے دور بھاگنے کے لیے دل کو، سوتا ویلیں دیتی مگر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ نے عائدہ کی ساری کوششوں پر منٹ بھر میں پانی پھیر دیا تھا..... ہر چیز ایک دم پس پشت جاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی..... ایسے میں اسے نہ ایمان یا دعا کی نہ ایمان کا خیال آیا۔

اس لمحے اسے اپنی کمزوری کا ادراک ہوا..... ”کیا سلمان کی محبت کسی آکٹوپس کی طرح مجھے اس بری طرح جکڑ چکی ہے کہ میں اب اس سے چاہ کے بھی نجات نہیں پاسکتی.....؟“ اس نے سوچا۔

آخری مریض کو بھٹکانے کے وہ تھکے، تھکے قدموں سے اپنے کمرے سے باہر نکلی..... او پلی ڈی کا وقت ختم ہو چکا تھا..... ایک ڈاکٹر مریض اور اسٹاف کا ریڈور سے گزر رہے تھے وہ سر جھکائے آگے بڑھی اپنے سامنے دو بھاری بوٹوں میں مقید بیروں کو دیکھ کر جی جو گیا وہیں جم سے گئے تھے..... نظر اٹھائی تو میجر شاہنواز سامنے تھے۔

”السلام علیکم.....“ اس نے گڑبڑا کے کہا۔

”وعلیکم السلام.....“ وہ خلاف توقع سنجیدہ تھے۔

بریگیڈیر وقاص کے گھر دونوں کی آخری ملاقات وہی تھی جب شاہنواز اس کے ریمارکس سن کے قدرے ناراض ہو کے گیا تھا اور وہ وہی دن تھا جب انہوں نے اسے شاہنواز کے پروپوزل کے بارے میں بتایا تھا..... اس کے بعد وہ اسے اسپتال میں نظر نہیں آیا..... اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا..... وہ ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی..... اور اب اچانک انہیں سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”آپ خوش ہو رہی ہوں گی کہ میں کئی دنوں سے

آپ کو نظر نہیں آیا..... اور مطمئن ہوں گی کہ میں کہیں سر کمپ گیا ہوں گا اور آپ کی جان چھوٹی.....“ اس کا لہجہ افسردہ تھا یا طنزیہ وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر پائی۔ اس کی خاموشی پر وہ دوبارہ بولا۔

”پیار ہو گیا تھا میں..... شاید آپ کی بد دعاؤں سے طفیل۔“ جملے کا آخری حصہ اس نے زیر لب کہا مگر اس نے سن لیا۔

”کیا مطلب..... میں کیوں بد دعا دینے لگی آپ کو؟“ وہ حیران و پریشان ہو کے بولی۔

”کہیں بیٹھ کر بات کریں..... مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

”یہاں..... اسپتال میں.....؟“ وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

”جی نہیں..... میں..... آپ سے کسی مریض کی بیماری ڈسکس نہیں کرنے والا ہوں، مجھے جو ضروری بات کرنی ہے وہ میرے متعلق ہے..... میری زندگی کے متعلق.....!“ وہ جلدی سے بولا۔

عائدہ نے سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں جیسے پوچھ رہی ہو..... ”پھر.....؟“

”کل رات آفیسر زکب میں ڈنر اور تم بولا ہے..... وہاں ملتے ہیں، آئیں گی ناں آپ.....؟“ وہ ہاتھ باندھے تن کے کھڑا ہوا تھا..... عائدہ نے اس پر ایک نظر ڈالی۔

”ٹھیک ہے..... میں آ جاؤں گی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”شکریہ.....“ وہ اس پر ایک گہری نظر ڈال کے بولا اور اگلے قدموں واپس مڑ گیا۔ ”موصوف کے انداز

آج کچھ اکھڑے، اکھڑے لگ رہے تھے..... پہلے تو خواہ مخواہ فری ہونے کی کوششوں میں لگے رہتے تھے۔

یہاں تک کہ پروپوزل بھیجے کی باتیں بھی شروع ہو گئیں اب خود بخود ہی نہ جانے کس بات پر اتنا بگڑ گئے ہیں.....

لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں، جب کسی سے خوش ہوتے ہیں تو اسے خواہ مخواہ آسمان پر بٹھا دیتے ہیں اور جب ناراض ہو جاتے ہیں تو زمین پر پٹخ دیتے ہیں اور مزے کی بات یہ

ہوتی ہے کہ دوسرے کو اکثر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس سے کوئی کب اور کیوں خوش ہوا اور کب ناراض بھی ہو گیا.....“ عائدہ نے اس کی پشت دیکھتے ہوئے چند لمحوں

کے لیے سوچا۔ ”اس دن چاچو کے گھر کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں ہوئی تھی کہ جناب اتنے زیادہ تپ جائیں..... خیر.....“ اس نے کندھے اچکائے اور آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

فیصلہ اتنا دشوار ہو جائے گا عائدہ نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ عام حالات ہوتے تو وہ سلمان سے دائیں بائیں ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی مگر اب حالات بالکل مختلف تھے اگر وہ سارے مسئلے ایک طرف ڈال کے سلمان کے حق میں فیصلہ دے دیتی تو کیا ماما، بابا مان جاتے.....؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ماما، بابا کیا چاچو، جو شاہنواز کے لیے اسے ہموار کر رہے تھے اس پروپوزل کا سن کے شاید ایٹم بم کی طرح پھٹیں..... ان کا غصہ، ان کی بیماری اور عمر سے بالاتر تھا یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی..... کیا وہ سب کی مخالفت سمجھ کر سلمان کا ہاتھ تھامنے کی ہمت رکھتی ہے؟ اس نے خود کو ٹٹولا۔

”ساری دنیا بھی مخالف ہو جائے..... سلمان تو میرے ساتھ ہو گا ناں.....“ اس کا دل برسوں پہلے والا نادان دل بن گیا۔

اس کے گالوں پر ایک دم حیا کی سرخی دوڑ گئی..... اس نے نیچے پر پڑے اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹا اور اپنی پیشانی سہلانے لگی۔ وہ صبح سے کسل مندی کے عالم میں یونہی بستر پر پڑی تھی..... آج ویک اینڈ تھا اور اس کا آف تھا۔

”سلمان جب اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ نہیں رہا تو تمہارے ساتھ کیوں ہو گا.....؟“ دماغ نے پہلا وار کیا۔

”اس کی بیوی کا قصور ہو گا.....“ دل نے وکالت کی۔

”تم نے اس کی بیوی سے کتنی بار ملاقاتیں کی ہیں، تم اسے کیا جانو.....“ دماغ نے جرح کی۔

”میں سلمان کو تو جانتی ہوں.....“ اس کا دل ہرکا۔

”یاد کرو، چند دنوں پہلے تم اسے ہی مجرم گردان رہی تھیں.....“ دماغ نے ٹوکا۔

”اس وقت میں اس سے خفا تھی.....“ وہ جلدی سے بولی۔

”انگور کھٹے تھے.....؟“ دماغ نے تہقید لگایا۔

”آف.....“ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گئی۔

کا نقصان کرنے سے کیا فائدہ....." اس نے آتی ہوئی
انہی کو بہ مشکل روکتے ہوئے اسے چھوڑنے والے انداز
میں کہا۔

"بات یہ ہے کہ مجھے آپ اچھی لگی تھیں..... بہت
زیادہ..... اور میں پورے خلوص کے ساتھ آپ کو پروپوز
کرنا چاہ رہا تھا..... مگر آپ کا گریز اور یہ انداز دیکھ کر مجھے
ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آپ شاید میرے لیے ایسا کوئی
جذبہ اپنے دل میں محسوس نہیں کرتیں، اسی لیے میری شکل
دیکھ کر آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے بجائے چہرے پر
تاؤ آ جاتا ہے..... بہر حال میں ایک ایماندار شخص ہوں،
اور زندگی کا یہ اہم معاملہ بھی ایماندار کی بنیاد پر بننا
چاہتا ہوں اور آپ سے بھی یہی امید رکھتا ہوں کہ آپ
بھی یہ فیصلہ کسی زبردستی، دباؤ یا مجبوری کے بغیر پوری
ایمانداری کے ساتھ کریں، بس اسی لیے آپ کو زحمت دی
تھی۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"تو جس لیے زحمت دی ہے وہ کام کریں
تاں.....؟" وہ اس کی حلقی کا مزہ لیتے ہوئے بولی۔
"آپ.....!" وہ جھنجھایا..... "کیا آپ مجھ سے
شادی کریں گی؟"

"جی ہاں....." عائدہ نے زور سے سر ہلایا۔
"باوجود اس کے کہ آپ مجھے پسند نہیں
کرتیں.....؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔
"یہ آپ کو کس نے بتایا؟" عائدہ نے اس کی طرف دیکھا۔
"کسی نے نہیں..... میرا خیال ہے....." وہ آہستہ
سے بولا۔

"دیکھیے اگر آپ میری زبان سے اعتراف محبت
سننا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے
گا..... اس وقت کا جب یہ آپ کا حق بن جائے..... ابھی
نہیں..... میری اس معاملے میں سوچ بڑی واضح ہے۔ کسی
کو شادی کے لیے پسند کرنا غلط نہیں..... شادی اگر نصیب
میں ہو تو اس سے ضرور ہوگی اور حیا کا، بالخصوص ایک عورت
کی حیا کا تقاضا یہی ہے کہ بعد کے مراحل اس شرعی رشتے
کے قیام کے بعد ہی طے کیے جائیں تو اچھا ہے بلکہ درست
ہے..... عورت کا وقار اسی میں ہے شاہنواز صاحب، ورنہ
وہ اگر دوسروں کے بڑھے ہوئے ہر ہاتھ پہ لپک جائے یا

مسکراہٹ ایک دم غائب ہوگئی اور لہجہ تپ گیا۔
"ہاں یہ تو ہے..... مگر اب کیا ہو سکتا ہے....."
عائدہ نے ہونٹوں پر آئی ہوئی مسکراہٹ کو دہاتے ہوئے
جواب دیا۔

"تو میں آپ کو ایک موقع دیتا ہوں، آپ اپنی غلطی
سداہار لیں....." وہ خفا خفا سا بولا۔
"میں ایک غلطی کو ٹھیک کرنے کے لیے دوسری
غلطی کرنے کی عادی نہیں ہوں....." وہ ایک دم اس کی
طرف دیکھ کر بولی۔

"مطلب.....؟" وہ بدستور اسی لہجے میں بولا۔
"مطلب یہ کہ آپ گاڑی چلانا پسند کریں گے؟"
اس بار عائدہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
"سبحان اللہ..... آپ نے تو ابھی سے پریکٹس
شروع کر دی۔" وہ کندھے اچکا کے گاڑی اشارت کرتے
ہوئے بولا۔

"کیسی پریکٹس.....؟" عائدہ نے حیرت سے اس
کی طرف دیکھا۔
"تجربہ تو نہیں ہے مگر سنا ہے کہ شادی کا ہنسی مون
بیریز ختم ہوتے ہی بیویاں کانی کٹ سکھنی ہو جاتی ہیں.....
بے چارے شوہروں کو ہر وقت ڈانٹتی پھینکارتی اور جلی کٹی سناتی
رہتی ہیں۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا اور وہ
ایک دم شرمندہ ہوگئی۔ فوراً ہی خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔
"اچھا اتنی گراں قدر معلومات ہونے کے باوجود
بھی آپ شادی کا شوق رکھتے ہیں؟ حیرت ہے۔"
"اس میں حیرت کی کیا بات ہے..... کچھ لوگ
پاگل بھی تو ہوتے ہیں، اپنی پرسکون زندگی سے خواہ مخواہ
بور ہو کے ایڈ ونچر کرنا چاہتے ہیں....." اس نے
بے نیازی سے کہا۔

"اوہ....." جان کر کانی افسوس ہوا کہ آپ پاگل
ہیں....." اس نے پاگل کو کانی لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔
"میرا خیال ہے کہ جو بات آپ سے پوچھنے کے
لیے آپ کو ڈر پر لے جا رہا تھا وہ ابھی ہی پوچھ لوں؟" وہ
روٹھے، روٹھے انداز میں بولا۔

"ضرور پوچھ لیں، آپ نے سوچا ہوگا کہ پتا
نہیں جواب حسب توقع ملے یا نہیں ملے، خواہ مخواہ کھانے

ہوئے کسی قسم کی تنجک محسوس نہیں ہوئی..... وہ کون سا
کی محبت میں سراجا رہا تھا..... نہ ہی عائدہ کو اس نے بھی
اتنی اہمیت دی تھی کہ اس کے جذبات کا خیال رکھتا
لیکن کچھ بھی ہوا سے یہ ضرور اچھا لگتا تھا کہ وہ کسی کی پروا
کرے یا نہ کرے..... دوسرا اس کی راہوں میں بغیر زبان
پہ حرف شکایت لائے، پلکیں بجھائے کھڑا رہے..... اور
عائدہ سے زیادہ اچھی طرح اور کون اس کی اس ضرورت کو
پورا کرنے کے قابل تھا..... وہ دونوں ہاتھوں کو گردن کے
پیچھے پھنسائے تنکے پر سر رکھ کر نیم دراز ہو گیا..... اس کے
انداز میں ایک عجیب سی بے نیازی تھی..... اس نے
موبائل چیک کیا..... جواب ابھی تک نہیں آیا تھا۔
"شرمارہی ہوگی۔" اس نے سوچا۔ موبائل کی پیپ کی
آواز آئی۔ جواب آچکا تھا۔

☆☆☆

عائدہ نے تیار ہو کے خود کو آئینے میں دیکھا اور دم
بخورہ گئی..... اسے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ وہ خود ہے.....
اس نے بہت زیادہ اہتمام نہیں کیا تھا مگر چہرے پر آئی
روشنی اتنی زیادہ تھی کہ جس نے اس کے جس کو چار چاند
لگا دیے تھے..... وہ تو خود ہی اپنی کار میں جانا چاہ رہی تھی
مگر شاہنواز نے اسے پک کرنے پر زور دیا..... وہ اسے
لینے آنے والا تھا۔

وہ شاہنواز کے بارے میں سوچنے لگی..... پہلی بار
اسے یہ کام اچھا لگ رہا تھا۔ شاہنواز وقت پر پہنچ گیا۔
عائدہ کو دیکھنے کے بعد اس کی کیفیت بھی وہی ہوگئی تھی جو
کچھ دیر قبل عائدہ کی تھی۔

"ماشاء اللہ۔" وہ زبردست بڑبڑایا۔ عائدہ اس کے
ریبارکس نظر انداز کرتی ہوئی گاڑی میں جا بیٹھی۔

"بہت، بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے اس قابل
سمجھا....." وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر بولے۔
"ذاتی طور پر میں یوں کسی کے ساتھ سفر کرنے کو
پسند نہیں کرتی مگر آپ کی ناراضی کے ڈر سے آپ کی یہ
پیشکش قبول کرنی پڑی۔" اس نے گل افشانی کی۔

"اوہ..... بڑی مہربانی آپ کی جو آپ نے مجھ پر
اعتبار کیا لیکن اس کے باوجود میرا کیا بھروسہ..... ہو سکتا
ہے کہ آپ کو انخواہی کر لوں۔" اس کے ہونٹوں پر آئی

"وہ چیزوں کو ٹھیک کرنا جانتا ہے، اب بھی اپنی
غلطی سداہارنا چاہ رہا ہوگا اسے عقل آگئی ہوگی....." دل
اس کی مدد کو لپکا۔

"ایسے لوگوں کی عقلیں بھی اس حد تک کام کرتی
ہیں جہاں تک ان کا فائدہ ہو..... وہ اپنی غلطی دوسروں
کے مفاد میں نہیں بلکہ اپنے مفاد میں سداہار تے ہیں.....
کبھی اپنے نام کے لیے، کبھی اپنی اہمیت تو کبھی اپنی
خواہش کے لیے..... اور ہاں ابھی بھی صرف اور صرف
اپنی اتان کے لیے....." دماغ کا دارکاری تھا۔ وہ چونک
کے سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔

"دل دل میں مت کودو..... وحشتی چلی جاؤ گی،
نہیں رک جاؤ..... پلٹ جاؤ۔ ایک صاف ستھرے روشن
راستے کی طرف....." اس نے ہاتھوں کو مسلا جو پسینے میں
بھیک چکے تھے۔

"اگر ایمان، سلمان کی زندگی میں قدم بہ قدم
ساتھ رہتی تو کیا پھر بھی وہ تمہاری طرف ہاتھ بڑھاتا.....؟"
دماغ نے پوچھا۔

"نہیں....." دل نے اس بار ایماندار سے
جواب دیا۔

"تو تم اس کے لیے سیکنڈ آپشن ہو، مجبوری والا
آپشن..... تم اس کی آرزو نہ کبھی تھیں نہ کبھی ہوگی.....؟"
دماغ نے فیصلہ سنا دیا۔

دل خاموش تھا..... گویا ہار مان چکا تھا۔ وہ بیڈ سے
بچنے اترتی..... اسے شاور لینا تھا اور رات کے لیے
ایئرشل تیاری بھی کرنی تھی..... شاہنواز نے اسے آج پہلی
بار ڈر کے لیے انوائسٹ جو کیا تھا۔

☆☆☆

سلمان نے موبائل اٹھا کے چیک کیا..... نہ کوئی میسج
نہ ہی کوئی مس کال..... اسے عائدہ سے اتنا زیادہ وقت
لینے کی توقع نہیں تھی۔ نہ برسوں پہلے نہ اب..... عائدہ کا
اقرار اس کی زندگی کے بہت سارے مسائل کا حل ثابت
ہونے والا تھا..... "لیکن وہ اتنی ویر کیوں کر رہی
ہے؟" تنگ آ کے اس نے اسے دوبارہ ٹیکسٹ کیا۔

"waiting for your reply"
بغیر کسی القاب و آداب کے لکھا ہوا یہ میسج اسے عائدہ کو بھیجتے

میں گونجا۔
 ”انشاء اللہ۔“ وہ زرب لب بولی۔ دفعتاً موبائل کی
 پیپ نے اسے چونکا دیا۔
 سلمان کا میج تھا۔۔۔۔۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔
 کہانی کے ولن کے بارے میں تو وہ ایک دم بھول گئی تھی
 اس نے سوچا۔۔۔۔۔ پھر اسے ہنسی آ گئی۔۔۔۔۔ سلمان کا ہیرو
 سے ولن تک کا سفر اس کے دل میں چند لمحوں میں طے
 ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ ایک نئی ٹینشن۔۔۔۔۔ اس نے میج پڑھا اور فوراً
 ہی جواب ٹیکسٹ کر دیا۔
 ”please don't“ چند لمحوں کے بعد اس
 کا جواب موصول ہوا۔
 ”why?“ عائکہ کا خوشگوار موڈ ایک دم خراب
 ہو گیا۔۔۔۔۔ زندگی میں آنے والے پہلے خوب صورت ڈزکا
 سارا مزہ زائل ہونے لگا۔
 ”اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔“ اس
 نے جواب لکھا۔
 ”تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔۔۔۔۔؟“ اس
 نے پوچھا۔
 ”آپ ٹھیک سمجھ۔“ اس نے تحریر کیا۔
 ”تم بے وقوفی کر رہی ہو۔۔۔۔۔ تم میرے ساتھ
 میرے گھر میں بہت خوش رہو گی۔“ سلمان نے ایک
 کوشش کی۔
 ”میرے خیال میں، میں آپ کے ساتھ خوش نہیں
 رہ سکتی۔۔۔۔۔“ عائکہ کا جواب سلمان کے لیے غیر متوجہ
 تھا۔۔۔۔۔ وہ چند لمحے اسکرین کو گھورتا رہا ہو گا۔۔۔۔۔ یہ عائکہ
 نے سوچا۔
 ”مجھ میں کیا خرابی ہے۔۔۔۔۔؟“ اس نے پھر پوچھا۔
 ”آپ بہت کامیاب انسان ہیں، زندگی میں جو
 چاہا حاصل کر لیا۔۔۔۔۔ اور جو چیز بھی آپ کی مرضی کے
 راستے میں رکاوٹ بنی آپ نے اسے ایک ٹھوک سے دور
 پھینک دیا۔۔۔۔۔ آپ اصول پرست ہوں گے، سختی بھی ہوں
 گے مگر ایک کامیاب انسان ہونے کا مطلب اچھا انسان
 ہونا ہرگز نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ میں نے بہت سوچا۔۔۔۔۔ اور میں
 اس فیصلے پر پختہ ہوں کہ مجھے کامیابیوں کے پہاڑ سر
 کرنے والے کی نہیں صرف ایک دل جیتنے والے کی

کہیں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے کوئی قدم غلط
 اٹھالے تو اس کی کیا عزت رہ جاتی ہے۔۔۔۔۔؟“ اس نے اس
 کے سوال کا مدلل جواب دے ڈالا۔
 ”آئی ایم سوری۔۔۔۔۔؟“ شاہنواز بری طرح شرمندہ
 ہو گیا۔ جواب میں وہ خاموش رہی۔
 ”میں کل ہی ای اور بابا کو آپ کی طرف جانے کا
 کہوں گا۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔
 ”مجھے آپ پر فخر ہے۔۔۔۔۔ پہلے مجھے آپ صرف
 اچھی لگی تھیں۔۔۔۔۔ اب میں دل سے آپ کی عزت کرتا
 ہوں۔“ وہ کچھ لمحے ٹھہر کے پھر بولا۔
 وہ پھر بھی خاموش رہی۔۔۔۔۔ باقی کا راستہ خاموشی
 سے طے ہوا، دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم رہے۔
 گیر یمن کلب آ گیا۔۔۔۔۔ شاہنواز نے گاڑی پارک کر
 کے، جھٹ اتر کے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ اس کے
 انداز میں خلوص کے ساتھ احترام بھی شامل تھا۔
 عائکہ نے قدم باہر نکالا۔۔۔۔۔ وہ دونوں سبک خرامی
 سے آگے کی طرف بڑھ گئے۔
 ”میری زندگی کا ایک باب آج بند ہوا اور دوسرا
 کھلتے جا رہا ہے۔۔۔۔۔ میں پوری ایمانداری کے ساتھ یہ نیا
 سفر شروع کروں گی جس میں نہ دل میں کوئی ملال ہو گا اور
 نہ کوئی جھوٹ۔۔۔۔۔“ عائکہ نے ساتھ چلتے ہوئے شاہنواز کو
 دیکھ کر اپنے دل میں عہد کیا۔
 ☆☆☆
 ڈنر بہت کامیاب رہا تھا۔۔۔۔۔ شاہنواز اسے ڈراپ
 کر گیا تھا۔ عائکہ کو محسوس ہوا جیسے اس کے دل و دماغ سے
 ہر قسم کا بوجھ ہٹ گیا ہو۔۔۔۔۔ شاہنواز سے ملاقات بہت
 ضروری تھی۔۔۔۔۔ ایک خوش آئند زندگی کا پہلا آغاز۔
 دونوں نے بہت اچھے موڈ میں ڈنر کیا تھا، اپنی پسند
 ناپسند ایک دوسرے کے ساتھ شیر کی تھیں اور حیرت انگیز
 طور پر دونوں کی سوچوں میں بہت مماثلت تھی۔ رات وہ
 بہت دیر تک شاہنواز کی باتوں کو یاد کرتی رہی۔۔۔۔۔ نیند اس
 کی آنکھوں سے دور تھی۔۔۔۔۔ مگر پہلی بار یہ بے خوابی اسے
 اچھی لگ رہی تھی۔
 ”امید ہے کہ ہم دونوں مل کے بہت اچھی زندگی
 گزاریں گے۔“ شاہنواز کا کہا ہوا جملہ اس کے کانوں

میں بولا۔ جواب میں فیض کے قدموں کی چاپ کی آواز
 ابھری۔۔۔۔۔ وہ واپس جا رہا تھا۔
 ”کیا زندگی بدل رہی ہے۔۔۔۔۔؟ دوسروں کو نہ کرنا
 جس قدر آسان ہوتا ہے دوسروں کے منہ سے نہ سننا اسی
 قدر مشکل۔۔۔۔۔“ ایمان کے بعد عائکہ کے منہ سے نہ سننا اس
 کی انا کی شکست تھی جو اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔
 دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ اس نے غصے سے
 دروازے کو گھورا۔۔۔۔۔ تنہا کے اٹھا اور ایک جھٹکے سے دروازہ
 کھول دیا۔۔۔۔۔ سامنے کا منظر دیکھ کے جیسے ساکت ہو گیا۔
 ☆☆☆

ایئر پورٹ سے باہر نکل کر اس نے ایک طائرانہ نگاہ
 دوڑائی۔ ہر چیز بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ اس کی زندگی

ضرورت ہے۔۔۔۔۔ اور افسوس یہ ہنر آپ کو نہیں آتا۔
 آپ دل چاہتے نہیں بلکہ آرام سے توڑ دیتے ہیں۔۔۔۔۔ بیٹھ
 کے سوچیں آپ کی کامیابیوں اور آپ کی خواہشوں کی
 تکمیل کے اس سفر میں کتنے دلوں کی کرچیاں شامل
 ہیں۔“ عائکہ نے میج بھیج کر اپنا فون آف کر دیا۔ اب وہ
 سکون سے سونا چاہتی تھی۔
 ”تمہاری کامیابی کے اس سفر میں سب سے پہلے
 میرے ٹوٹے دل کی کرچیاں شامل ہوئی تھیں سلمان
 وقاص۔۔۔۔۔ لیکن یہ بات تمہیں کبھی معلوم نہیں ہوئی اور ہونی
 بھی نہیں چاہیے تم بس اپنے گمان میں رہو۔۔۔۔۔“ اس نے
 نیچے پر سر رکھتے ہوئے سوچا۔ انسان کی زندگی میں کئی کمزور
 لمحے آتے ہیں۔۔۔۔۔ عائکہ ایسے ہی کسی کمزور لمحے کی گرفت
 میں آ کے غلط فیصلہ کرنے سے بال بال بچ گئی تھی۔
 ☆☆☆

پوری رات آنکھوں میں کانٹے کے بعد اگلی صبح اس
 کے لیے انجمن کمال کا تحفہ لے کر آئی تھی۔ وہ بستر پر اوندھا پڑا
 ہوا تھا۔ آج اسپتال میں آف تھا ورنہ وہ شاید اس وقت
 اسپتال جانے کے قابل بھی نہیں تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا
 تھا کہ عائکہ جسے اس نے ساری عمر بے وقوف، اجنبی اور
 ذریعہ لڑکی سمجھ کے کبھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی وہ اسے
 اس بری طرح دھکار کے مسترد بھی کر سکتی ہے۔۔۔۔۔ اسے کم
 از کم عائکہ سے یہ توقع نہیں تھی۔

عائکہ سے شادی کر کے وہ ایک تیر سے کئی شکار
 کرنے جا رہا تھا، ماں، باپ کی پرانی خواہش کو پورا کرنا
 اور ان کی خدمت کے لیے ہمہ وقت عائکہ جیسی خدمت
 گار بہو کا حصول، ایمان کا غرور توڑنا اور اپنی برباد زندگی کو
 آباد کرنا۔۔۔۔۔ عائکہ کی ایک ہاں سے کتنے مسئلے حل
 ہو جاتے اور ایک نہ نے اسے آسمان سے زمین پر لا چکا
 تھا۔ وہ جھنجھلا کے سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ دروازے پر
 دستک کی آواز کے ساتھ فیض کی آواز ابھری۔
 ”چھوٹے صاحب، بیگم صاحبہ پوچھ رہی ہیں کیا رہ
 بج رہے ہیں آپ ناشتہ کے لیے نیچے آرہے ہیں یا آپ کا
 ناشتا اوپر لے آؤں۔۔۔۔۔؟“
 ”مجھے آج ناشتا نہیں کرنا ہے۔“ وہ کوفت کے عالم

سپنس، سرگزشت، پاکیزہ، جاسوسی
 سول ایجنٹ برائے یو۔ اے۔ ای

WELCOME BOOK SHOP

ویکم بک شاپ

پی او بکس: 27869 سکرامہ، دبئی
 فون: 04-3961016 فیکس: 04-3961015
 موبائل: 050-6245817 ای میل: welbooks@emirates.net.ae

WELCOME BOOK SHOP

معیاری کتابوں کا اعلیٰ مرکز

ویکم بک پورٹ

ریٹیل، ہول سیل، ڈسٹری بیوٹر، پبلشر، ایکسپورٹر
 مین اردو بازار، کراچی

فون: 32633151, 32639581 (92-21) فیکس: 32638086 (92-21)
 ای میل: welbooks@hotmail.com
 ویب سائٹ: www.welbooks.com

کی طرح.....
 ”بابا ہمیں لینے نہیں آئے.....؟“ اس کے یوں چاروں طرف نظر دوڑانے سے ایان نے یہ نتیجہ اخذ کیا۔
 ”نہیں.....“ اس نے قدم آگے بڑھائے۔
 ”کیوں.....؟ وہ حیران ہو کے بولا۔
 ”اس لیے کہ میں نے انہیں آنے کا نہیں بتایا تھا۔“
 ”وہ کیوں.....؟“ اس نے رک کر پوچھا۔
 ”سر پرانز.....“ وہ مسکرائی۔
 ”لیکن اب ہم ان کے گھر تک کیسے پہنچیں گے؟“
 وہ پریشان ہو گیا۔

”میرے پاس ان کا ایڈریس ہے۔“ اس نے کیب کو اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ڈرائیور کو پتا سمجھا کر وہ سامان گاڑی میں رکھوا کے بچوں کے ساتھ چھٹی سیٹ پر بیٹھ گئی۔
 اسے سلمان سے ملنے کی ذرہ برابر خوشی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم تھا کہ اتنے مہینے الگ رہنے کے بعد بغیر کسی خبر کے اس وقت سلمان اور اس کے ماں، باپ کا انہیں دیکھ کر کیا ری ایکشن ہوگا.....؟ ”ایشیائی مردوں کو دوسری شادی کرنے کا بھی تو بہت شوق ہوتا ہے، ہو سکتا ہے وہاں ہمارے استقبال کے لیے مسز سلمان بھی موجود ہوں.....“ اس نے طنزیہ انداز میں سوچا۔

اس نے ایک نظر بچوں پر ڈالی..... ایان شوق اور دلچسپی سے باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا اور مریم، کیری کاٹ میں بے خبر سو رہی تھی..... گاڑی اسلام آباد کی سڑکوں پر رواں دواں تھی..... کچھ برس قبل جب وہ سلمان کے ساتھ یہاں آئی تھی تو وہ بھی بہت ایکساٹڈ تھی..... سلمان کے ساتھ مطمئن اور خوش تھی مگر سلمان نے تحفظ کا احساس اسے دے کر چھین لیا تھا..... اب شاید ساری عمر وہ ویسا اطمینان محسوس کرنے کے قابل نہیں رہ گئی تھی..... اس کا بھروسہ ٹوٹ چکا تھا..... سلمان اس کے ساتھ رہتا یا نہیں اسے اس بات سے اب کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا..... مگر بچے..... شاید ان کو فرق پڑتا..... وہ اپنے باپ کے ساتھ رہ کر شاید کھوئے تحفظ کے اس احساس کو پانے میں کامیاب ہو جاتے..... اس کے یہاں آنے کا وہ مقصد بھی تھا۔

”ہم صحیح سمت جا رہے ہیں ناں.....؟“ اس نے کیب کے ڈرائیور سے دریافت کیا۔
 ”جی میڈم..... راستہ میرا دیکھا بھالا ہے، کئی دفعہ یہاں آچکا ہوں آپ بالکل ٹھیک سمت کریں.....“ اس نے تسلی آمیز لہجے میں جواب دیا۔
 ایان کے ہونٹوں پر ایک زخم خوردہ مسکراہٹ بھل گئی۔ کبھی کبھی دیکھے بھالے راستے بھی اجنبی ہو جاتے ہیں..... اور جو راستے تم ہو جائیں ان پر سفر تھا کا ہی ہے..... لیکن منزل کی طلب میں پاؤں کے چھالے کون گننا ہے..... اس کا ایسا ہی حال تھا۔

☆☆☆

”لڑکی تم کہاں غائب ہو..... فوراً آ جاؤ۔“ وہ اپنی زندگی کی اس خوشگوار صبح بہت فریض تھی، کافی کانگ لے کر بیٹھی ہی تھی کہ چاچو کا فون آ گیا۔
 آج اس کا کہیں جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، بالخصوص چاچو کے گھر جہاں وہ سلمان کا سامنا بالکل کرنا نہیں چاہتی تھی۔
 وہ کوئی مناسب بہانہ سوچ ہی رہی تھی کہ چاچو دوبارہ بولے..... ”بریکنگ نیوز ہے، ایسی کہ تمہیں یقین ہی نہیں آئے..... جلدی سے آ جاؤ.....“ انہوں نے اس کا جواب سنے بغیر کال منقطع کر دی۔
 ”بریکنگ نیوز.....؟ کیا ہو سکتی ہے۔“ وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔ چاچو کا لہجہ اور ان کا انداز کہیں سے بھی پریشانی والا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کافی پُر جوش نظر آ رہے تھے۔
 عائکہ نے وہاں جانے کے لیے کار کی چابیاں اٹھائیں۔

☆☆☆

گھر کے اندر کار ایڈور میں قدم رکھتے ہی اسے چاچو کے قہقہے کی آواز سنائی دی..... کسی بچے کے رونے کی آواز..... وہ حیران رہ گئی، کون آیا ہوا ہے.....؟ آوازیں لاؤنج سے آرہی تھیں..... وہ اسی طرف بڑھ گئی۔
 اندر کا منظر واقعی اس کے لیے غیر متوقع تھا..... سب سے پہلے چاچو نے نظر پڑی۔ چاچو کی گود میں کوئی بچہ تھا، عائشہ بچی کیوں کہ اس کے کپڑے پتک لکڑ کے تھے، کبھی سی بچی..... چاچو کی اس کی طرف پیٹھ بھی چاچو کے برابر میں سنہرے بالوں والا کوئی بچہ تھا..... اور دائیں

جانب..... سلمان کے ساتھ ایک خوب صورت لڑکی..... ”ایمان.....“ اس کے ذہن میں جھمکا کا ہوا۔
 ”السلام علیکم.....“ وہ آگے بڑھی۔
 ”السلام علیکم.....“ آؤ بھی آؤ..... دیکھو تو کون آیا ہے؟“
 ”ایمان میٹ یور آنٹی..... عائکہ وقار..... میجر عائکہ وقار.....“ چاچو نے پاس بیٹھے ہوئے بچے سے کہا۔
 وہ ایان سے ملی، ایمان سے ملی..... اسے وہ لوگ اچھے لگے۔ سلمان اس سے نظریں چرا رہا تھا۔
 شکر تھا کہ وہ نظریں ملانے اور سر اٹھانے کے چلنے سے قابل تھی..... جذبات کی رو میں بہہ کر اگر اس نے سلمان کے حق میں فیصلہ دے دیا ہوتا تو آج اس کا کیا مقام ہوتا.....؟ وہ ہمیشہ کے لیے اپنی نگاہوں میں گر جاتی..... ایمان اور ایان کے واپس آنے کے بعد عائکہ..... سلمان کے لیے بھلا کیا اہمیت رکھتی.....؟
 ”لیکن یہ بچی کون ہے.....؟“ اس نے چاچو کے برابر بیٹھتے ہوئے سوچا۔

”عائکہ یہ مریم ہے..... سلمان کے پاکستان آنے کے بعد پیدا ہوئی ہے۔“ چاچو نے شاید اس کی سوچیں پڑھ لی تھیں۔
 ”اوہ.....“ اس نے بچی کو آگے بڑھ کے گود میں لے لیا۔ بچی ہو ہو سلمان کی طرح تھی۔ وہی صورت اور دیکھی ہی مسکراہٹ.....

”آج میں بہت خوش ہوں عائکہ..... میری فیملی مکمل ہو گئی ہے..... اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایمان نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“
 ”بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔ مریم کی پیدائش کے بعد اس سے زیادہ صحیح فیصلہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔“ چاچو نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر اس فیصلے کی وجہ مریم کی پیدائش نہیں، مریم کے باپ کے غیر موجودگی ہے..... بچیوں کو باپ کی بہت ضرورت ہوتی ہے اگر مریم کا باپ اس کی پیدائش پر وہاں موجود ہوتا تو شاید میں یہ فیصلہ کبھی نہ کرتی لیکن اب مجبوری ہے۔“ مگر عائکہ کے بولنے سے پہلے ایمان بول اٹھی۔ ایمان کا لہجہ دو ٹوک تھا۔
 اس معاشرے کے لوگوں کی یہ بات اچھی ہوتی

ہے کہ وہ لگتی نہیں رکھتے۔ عائکہ نے سلمان کے دھواں، دھواں چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔
 ”تم بہت سمجھدار اور اچھی بچی ہو۔“ چاچو اسے دیکھ کے مسکرائے۔

”جب مصیبت سر پر پڑتی ہے تو سمجھ خود بخود آ جاتی ہے۔“ ایمان آہستہ سے بولی اور طنزیہ لہجہ میں۔
 ”میرے والد تیور آفریدی نے بھی کئی برس پہلے یہی کیا تھا..... وہ مجھے اور میری ماں کو بے آسرا چھوڑ کے پاکستان چلے آئے تھے..... ہم نے ان کے بغیر بہت مشکل وقت گزارا اور میں یہ سب کچھ اپنی بیٹی کے ساتھ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی..... میں نہیں چاہتی کہ سلمان یا میری ضد ایک دن ایسا لائے کہ مریم بھی اپنے باپ کو صرف تصویر کی شکل میں ہی پاس کے..... اور پھر اس کی تصویر سے بھی نفرت کرنے لگے اور جوان ہونے کے بعد ہر پاکستانی کو دیکھ کے چونک جائے اور اس سے جا کر پوچھے کہ کیا تم سلمان وقاص کے ملک سے آئے ہو اور کیا تم اسے جانتے ہو.....؟“ سلمان نے اسے چونک کے دیکھا، اسے اپنی اور ایمان کی پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ چاچو اس کی بات مکمل ہوتے ہی اٹھ کے اس کے قریب جا بیٹھے..... اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

”آج سے تم وقاص احمد کی بیٹی ہو..... جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ..... اب یہ گھر تمہارا اور ان بچوں کا ہے اور ہم تمہارے ماں، باپ ہیں۔“ اس نے سر جھکا دیا۔
 عائکہ کو ایمان اچھی لگی تھی..... اس کا انداز، اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا..... ساری کہانی عائکہ کی سمجھ میں آ چکی تھی..... اسے دل ہی دل میں ہنسی آئی۔

”واہ سلمان صاحب واہ..... آپ کسی رشتے کو تو بخش دیں..... ہر جگہ اپنی چلانے اور دوسروں کو زیر کرنے میں آپ کو کیا مزہ آتا ہے.....؟“ عائکہ نے بغور ایمان کی طرف دیکھا..... وہ ہنس ہنس کے چاچو سے کچھ کہہ رہی تھی..... ایان دادی کے پاس بیٹھا انہیں کچھ بتا رہا تھا۔ سلمان کی بیٹی اب سلمان کی گود میں تھی اور سوچتی تھی..... سلمان سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے ہار گیا ہو..... سچ تو تھا ایمان، سلمان کے مقابلے میں اپنی ضد چھوڑ کے، ہار کے بھی جیت چکی تھی اور سلمان جیت کے بھی ہار گیا تھا۔ اسے

”بہت بہت مبارک ہو..... اور ایک خوشخبری میں

دیں گے..... اچھی طرح اطمینان کریں گے عی

رشتوں اور ان کی اہمیت کو سمجھنا انسان کو اندر سے مطمئن

اسے جانتا ہوا دیکھ رہا، اس نے بیٹھے سے ہی اس کا
 نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔

نزہت اصغر

مایہ ناز مصنفہ اقبال بانو سے خوشگوار ملاقات



”بزم میں آنے والے تمام قارئین کی خدمت میں سلام اور دعاؤں کے تحفوں کے بعد عرض ہے کہ آج کی اس محفل میں اُس قلم کار سے دلچسپ اور برطف ملاقات کروائی جا رہی ہے جو پاکیزہ کے ابتدائی دنوں سے ہمارے ساتھ ہیں۔ اگرچہ ان کی دیگر مصروفیات کے باعث طویل وقفے آتے رہے مگر شاید کوئی ایک سال ایسا گزرا ہوگا کہ جب اقبال بانو کسی بھی تحریر کی صورت ہمارے ڈائجسٹ میں موجود

عالمہ بس یہی زندگی ہے اگر سمجھو تو..... تمہاری محبت اور محنت کو تمہارے والدین نے اس کی خوبیوں یا خامیوں سے مترا ہو کے قبول کیا ہے اور اسے اہمیت دی ہے۔ میرے نزدیک انسانی جذباتوں اور اس کے خالص پن سے زیادہ اہم اور کوئی چیز نہیں..... یہ بات میں نے اپنی زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں سے سیکھی ہے اور تمہیں بھی یہی سمجھانا چاہتا ہوں..... میں تمہیں تمہاری خوبیوں اور خامیوں سمیت بہت خلوص سے اپنانے جا رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم بھی مجھے اسی طرح قبول کر لو گی..... یقین کرو زندگی بہت اچھی گزر جائے گی ٹھیک ہے ناں.....؟“

”مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا.....“ وہ آہستہ سے مسکرائی۔

باہر ہوائیں ایک دم تیز ہو گئی تھیں..... اس نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کھولی خوشگوار جھونکا اس کے چہرے سے لگایا..... کراچی والے تو ایسی ہواؤں کے عادی ہیں مگر اسلام آباد میں ایسی ہوائیں اسے ساتھ بارش کا پیغام لے کر آتی ہیں، اس نے آسمان کی طرف دیکھا جو بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا..... تھوڑی دیر پہلے تو ایسا نہیں تھا..... چاند تارے سب منظر سے غائب تھے..... موسم ایسے ہی بدل جایا کرتے ہیں..... اچانک ہی منظر بدل جاتا ہے جیسے اس کی زندگی میں اچانک سب کچھ تبدیل ہو گیا تھا۔

محبت کیا ہے.....؟ کوئی طے شدہ فارمولا نہیں، نہ کوئی تفریق یا ضرب کا سوال..... محبت یا تو ہوتی ہے یا نہیں ہوتی..... اٹھارویں اور اکیسویں صدی کی محبت میں فرق تو ہونا ہی چاہیے..... کمزور، رونی، سسکتی محبت اتنا تو کر ہی سکتی ہے کہ تھوڑی سی طاقت ور ہو کے اپنا مقام تبدیل کر لے..... اس سے اس کے خالص پن میں کوئی فرق نہیں پڑتا البتہ حق دار کو حق مل جاتا ہے..... اسے شاہنواز سے محبت ہونے لگی تھی اور ہونی چاہیے بھی تھی۔

تیز ہوا میں بادلوں کو اڑا لے گئیں..... آسمان پھر سے صاف ہو گیا اور چاند پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہو گیا۔

”میرے لیے یہ پروٹوکول اور سلمان وقاص.....؟“ اس نے جواباً ہاتھ ہلایا اور واپسی کے راستے پر رواں ہو گئی۔ وہ خود کو بہت ہلکا بھلکا محسوس کر رہی تھی، یوں جیسے کسی بوجھ سے آزاد ہو گئی ہو..... کمرے میں پہنچ کے اس نے گہری سانس لی۔ میسج کی فونز اسے لگا تار سارے راستے سنائی دیتی رہی تھیں اس نے بیک سے موبائل نکالا۔ ماما، بابا، شہلا آپا، نالکہ آپا، کاشف، عاترہ اور میجر شاہنواز کے میسجز تھے..... باری باری وہ سب کے میسجز پڑھنے لگی..... سب نے اسے مبارک باد اور دعائیں بھیجی تھیں..... ماما اس وقت سدھیانے والوں کے ساتھ مصروف تھیں رات میں فون کرنے کو کہا تھا۔ شہلا آپی کا پیغام شرارت بھرا ہوا تھا، خاص طور پر ان کا آخری جملہ اس نے بہت انجوائے کیا انہوں نے لکھا تھا..... ”بہت ہی نیک اور شریف ہیں تمہارے ساس اور سرسرجوڑ کی دیکھو بغیر ہی رشتہ پکا کر رہے ہیں، تم یہاں ہو بھی نہیں اور وہ تمہارے لیے ہیرے کی انگلی بھی لے آئے ہیں اور وہ بھی بالکل صحیح ناپ کی.....“

وہ مسکراتے ہوئے پاؤں پھیلا کے بیٹھ گئی..... اب وہ شاہنواز کا میسج پڑھنے جا رہی تھی۔ جو سب سے طویل تھا..... اس نے لکھا تھا۔

”بہت ہی خوب صورت رات ہے..... تمہارے اس خوب صورت لونگ روم میں اس وقت تنہا بیٹھا تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں..... سب لوگ دوسرے کمرے میں بیٹھے میری اور تمہاری باتیں کر رہے ہیں اور میں کال کے بہانے یہاں آ گیا ہوں.....“

کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور آسمان پر پورا چاند بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے..... بالکل تمہاری طرح، کبھی سامنے آ جاتا ہے تو کبھی چھپ جاتا ہے۔ ٹھنڈی ہوائیں باغیچے میں کھیلے پھولوں کی خوشبو سے معطر ہو کے جھونکوں کی صورت میں اندر آرہی ہیں..... میرے سینے سامنے دیوار پر جو پینٹنگ آویزاں ہے اس کے بارے میں مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ تم نے اپنے کالج کے زمانے میں بڑے شوق سے بنا کے یہاں لگائی تھی..... یہ پینٹنگ گو آرٹ کا کوئی لا جواب شاہکار نہیں ہے مگر تمہارے والدین نے اسے بڑے اہتمام سے سالوں سے یہاں سجایا ہوا ہے.....



کے نیچے اور کتابوں کے بیچ میں نظر آنے لگے۔ تو میں کہہ رہی تھی کہ اگر کسی سے متاثر ہو کر لکھتی تو پھر میں ابن صفی کی طرح جاسوسی لکھتی اور میں سمجھتی ہوں کہ لکھنے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے ورنہ مجھ سے پہلے میرے خاندان میں کسی نے نہیں لکھا اور میں ٹھہری قلم کی مزدور۔

پاکیزہ: آپ کو کس قسم کی کہانیاں پڑھنا پسند تھا یا ہے؟ کیا آپ نے خود بھی اپنی پسند کے موضوعات پر لکھا؟

اقبال بانو: مجھے ہلکی پھلکی رومینک کہانیاں لکھنا اور پڑھنا پسند رہا ہے۔ مزاح بھی مزہ دیتا ہے۔ بہت پہلے فاطمہ شہناز مرتضیٰ مزاحیہ افسانے لکھا کرتی تھیں پڑھ کر لوٹ پوٹ ہوتے تھے مگر میں نے اپنی الگ راہ بنائی۔ متاثر میں بے شک کسی سے بھی ہوں مگر لکھتی میں اپنی مرضی اور اپنے انداز اور اپنے پسندیدہ موضوع پر ہوں اور میرا پسندیدہ موضوع محبت ہے۔ نصیحتوں کے لیے اور بہت سے لوگ موجود ہیں۔ کبھی کبھی رائٹرز افسانہ لکھتے لکھتے آخر میں اسے مضمون کی شکل دے دیتی ہیں جو مجھے پسند نہیں ہے۔

ابم نصار آئیں تو انہوں نے نئے رائٹرز کی ایک ٹیپ تیار کی اور اب پاکیزہ رائٹرز کا ایک بڑا حلقہ ہے۔ میں نے ہر پرچے میں لکھا اللہ کا کرم ہے ہر جگہ پزیرائی ملی بلکہ ایک بار ایک رسالے میں نسیم نیازی نے لکھا۔ ایک وقت تھا اقبال بانو کا تو تو بولتا تھا اور واقعی یہ سچ بھی تھا۔ اللہ کا احسان ہی کہوں گی۔ ایک وقت تھا میں ڈائجسٹوں میں لکھنے والی کم عمر رائٹرز تھی یعنی میرا پہلا افسانہ سولہ سال کی عمر میں دو شیزہ میں چھپا۔ پاکیزہ: آپ کیا سمجھتی ہیں یہ صلاحیت خداداد ہوتی ہے یا شعوری طور پر ہم اختیار کرتے ہیں وہ بھی کسی شخصیت کے کام سے متاثر ہو کر؟

اقبال بانو: میرے خیال میں ہر صلاحیت خداداد ہوتی ہے۔ دیکھیں نزہت، میں نے ابن صفی کو بہت پڑھا۔ چھٹی ساتویں کلاس سے ہی میں نے ابن صفی کی عمران سیریز پڑھیں کہ یہ ناصر ماموں کا شوق تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ ابن صفی وہ رائٹرز ہیں جنہوں نے لوگوں کو پڑھنے کی لت ڈالی۔ ڈائجسٹ وغیرہ تو بعد میں آئے ناں پہلے تو ہر بچے کے نیچے عمران سیریز نظر آتی تھی پھر ڈائجسٹ کا دور آیا تو ڈائجسٹ تکیوں

یقیناً بہت پیچھے جانا ہوگا۔ میرا خیال ہے 1978-79ء کی بات ہے جب میں اسکول میں پڑھتی تھی۔ میری ممانی پاکیزہ پڑھتی تھیں تو میں ان کے کمرے میں گھس جاتی اور ان کے رسائل کھنگالتی۔ بس مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق تو اپنی ممانی غزال ناصر کی وجہ سے ہوا اور میرا پہلا ناولٹ میڈا عشق وی توں پاکیزہ میں 1987ء میں شائع ہوا۔ جسے قاری بہنوں نے بے حد پسند کیا پھر چل سوچل۔

پاکیزہ: لکھنے لکھانے کا یہ شوق بیدار ہوتے ہی آپ رسالوں کی طرف آگئیں وہ بھی اتنے مشہور ڈائجسٹ وغیرہ؟

اقبال بانو: نہیں نزہت، لکھنے کا شوق پیدا ہوتے ہی میں اس طرف نہیں آئی۔ پانچویں کلاس میں تھی تو بچوں کی کہانی لکھی۔ ہمارے ہاں روزنامہ امن کراچی آتا تھا اس میں بچوں کا صفحہ ہوتا تھا۔ بچوں کی کہانیاں ہر بچے کی طرح میں بھی شوق سے پڑھتی تھی۔ دل چاہا میں بھی لکھوں سو کہانی لکھ کر بھیج دی جو اگلے ہفتے ہی چھپ گئی۔ آج تک یاد ہے اس کا نام کنجوس تھا۔ بچوں کے صفحے کے انچارج مشہور شاعرانو شعور تھے۔ انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی پھر میں نے روزنامہ امن کے ہی طالبات اور خواتین کے صفحات پر بہت لکھا اور انعام بھی حاصل کیے۔ اسی طرح لکھتے لکھتے ڈائجسٹوں کی طرف آگئی۔ میرا پہلا افسانہ دو شیزہ میں شائع ہوا سہارے کی تلاش اور ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ پاکیزہ میں بھی اسے افسانے بھیجے مگر حالانکہ میں اور پرچوں میں لکھتی تھی۔ پاکیزہ کی ایڈیٹر نادیرہ گیلانی ہوتی تھیں... انہوں نے میرے افسانے شائع نہ کیے۔ صفیہ ملک آئیں وہ بھی مخصوص رائٹرز کو شائع کرتی تھیں اور مجھے کبھی نہیں بتایا گیا کہ انہوں نے میرے افسانے کیوں شائع نہ کیے۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ مخصوص رائٹرز کو شائع کرتی تھیں۔ نئے رائٹرز انہوں نے نہیں تیار کیے البتہ۔

نہ ہوئی ہوں خواہ تبصرے کی صورت ہی سہی..... اقبال بانو نے افسانہ، ناولٹ اور ناول نگاری تینوں میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف کے ادبی تقاضے پورے کیے۔ بلکہ پھلکے، رواں اور خوب صورت انداز کی تحریریں ان کی پہچان بنیں۔ جو اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرتی نظر آئیں..... یہی وجہ ہے کہ آج بھی اقبال بانو کو سب بے تاب سے پڑھنا چاہتے ہیں سو ہم نے ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی قارئین کی فرمائش کو اہمیت دی اور ابھی کہنتہ مشق مصنفہ کی زوداد حیات لیے حاضر ہیں، امید ہے آج کی اس بزم میں قارئین کی بھرپور شرکت اقبال بانو کا شاندار استقبال کرے گی۔ تو آئیں سوالات کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکیزہ: جیسا کہ ہم اپنے ہر معزز مہمان سے پہلا سوال یہی پوچھتے ہیں کہ آپ کو پاکیزہ کی بزم میں آنا کیسا لگا تو آپ بھی اس بارے میں اپنے تاثرات بتائیں؟

اقبال بانو: پاکیزہ میں آنا..... مجھے ویسے ہی بہت اچھا لگتا ہے۔ میں جب، جب پاکیزہ میں آئی مجھے یہاں بہت خلوص، محبت اور پزیرائی ملی اور نزہت اب تو یہ بزم آپ نے میرے لیے ہی سجائی ہے تو بتائیں کیسے اچھا نہیں لگے گا؟ بلکہ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں اس بزم میں آ کر بہت خوش محسوس کر رہی ہوں ذرا سنبھل کر بیٹھ جاؤں پتا نہیں آپ کتنے مشکل سوال کریں! ایک بات میں پہلے بتا دوں کہ مجھ سے قتل اور فلسفیانہ گفتگو کی امید نہ رکھیے گا۔ مجھ سے نہ بڑے بڑے جملے لکھے جاتے ہیں اور نہ بولے جاتے ہیں۔ سادہ سی خاتون ہوں اور سادہ ہی باتیں کرتی ہوں مگر سچی اور کھری..... جی اب پوچھیے جو چاہیں۔

پاکیزہ: آپ کا اور پاکیزہ کا اولین ملاپ کب اور کیسے ہوا؟

اقبال بانو: پاکیزہ سے اولین ملاپ!



اقبال بانو اپنے بیٹے اسلمیل ٹیپو کے ہمراہ

مجاہد بھی شائع ہو چکے ہیں۔ یہ اردو میں ہیں۔
(ماشا اللہ! اللہ زور قلم اور زیادہ کرے، آمین)
پاکیزہ: ایک اچھا اور معیاری افسانہ،
ناولٹ اور ناول کیا ہوتا ہے؟
اقبال بانو: ایک اچھی اور معیاری تحریر
میرے خیال میں وہ ہے جس سے آپ لکھنے والا
خود مطمئن ہو اور قاری کو بھی پسند آئے۔ میرے خیال
میں جب ہم لکھتے ہیں تو صرف اپنے لیے نہیں لکھتے۔
اگر ایسا ہو تو پھر ہم اسے چھپوائیں کیوں؟ میرا خیال ہے
ہمیں قاری کی پسند کا خیال رکھنا چاہیے اس کے ساتھ
ساتھ اور اسے ایک اچھی اور معیاری تحریر بنانی چاہیے۔
پاکیزہ: آپ بھی لکھنے کے عمل سے گزری
ہوں گی کیا بغیر اپنے سینئر کے کام کا مطالعہ کیے اس
فیلڈ میں آگے بڑھ سکتے ہیں؟
اقبال بانو: اچھا لکھنے کے لیے مطالعہ

مناثر ہوں تو پھر لکھنا چھوڑنا پڑتا ہے۔
مگر میں نے لکھنا چھوڑا نہیں
کم کم ہی لکھتی ہوں کہ اندر بہت
بے چینی رہتی ہے۔ شروع سے
ہی خود پر ذمے داریوں کا بوجھ
ڈال لیا یا خود بخود ڈل گیا۔
کراچی میں اپنی ایجوکیشن
حاصل کرنے کے بعد ملتان آئی
تو دو سال بعد اماں جی کا انتقال
ہو گیا اور ان کی ساری ذمے
داریاں میرے کندھوں پر
آگئیں۔ بہنوں، بھائیوں کی
شادیاں کیں۔ شہر میں گھر
بنوایا۔ ہم شہر شفٹ ہوئے۔
بھائی کا گھر سنبھالا، رشتے
داریاں بھی نبھائیں تو قلم سے
دوستی نبھانا مشکل ہو گیا۔ وہ کہانی
جو میں دو دن میں لکھ لیتی تھی اب مہینوں میری فائل
میں نامکمل پڑی رہتی اب شادی کے بعد بھی یہی مسئلہ
ہے۔ بہت سی کہانیاں مکمل کرنی ہیں اللہ نے صحت اور
ہمت دی تو اس انشا اللہ ضرور پورا کروں گی۔
پاکیزہ: آپ کے افسانوں، ناولٹ یا
شائع شدہ ناول کی کیا تعداد ہے؟
اقبال بانو: میری کہانیوں کی تعداد
اگر بتاؤں تو تقریباً ساٹھ کے قریب ناولٹ اور مکمل
ناول ہیں۔ چار قسط وار ناول کتابی شکل میں چھپ چکے
ہیں۔ شیشہ گر، تجھے ہر جگہ پکارا، گونگے دکھ اور دروازہ
کھلا رکھنا۔ سرائیکی کی میں پہلی خاتون ناول نگار ہوں۔
میرا پہلا ناول سانول موڑ مہاراں چھپ چکا ہے۔
دوسرا ایویس کوئی رل ڈیکھے زیر طبع ہے اور پہلی صاحب
کتاب شاعرہ بھی ہوں میری سرائیکی نغموں کا مجموعہ
دل تانگہ تانگے ہے اور میرے سات ناولٹ کے

اکثر پوری کہانی پڑھنے کے بعد رائٹرز کا نام دیکھتی ہوں
اور داد ضرور دیتی ہوں۔ میری رائٹرز سے دوستی بھی
ہے اگر کبھی کسی کا افسانہ پسند نہ آئے تو صاف بتا دیتی
ہوں کہ مجھے اچھا نہیں لگا اور پھر ہفتوں ان کی کال
سے محروم بھی رہتی ہوں۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔
پاکیزہ: آپ کے خاندان والوں کے کیا
تاثرات تھے آپ کی اتنی کامیابی پر؟
اقبال بانو: میری کامیابی پر گھر والوں کے
تاثرات۔ ہا۔ جب اخبار میں کہانی چھپی تو امی بہت
ناراض ہوئیں کہ خاندان کی پہلی لڑکی کا اخبار میں نام آیا
تھا البتہ ابا جی خوش تھے۔ انہوں نے بہت حوصلہ افزائی
کی پھر جب ور یا اپنا راستہ بنالے تو روانی رکھی نہیں۔ خود
بخور رستے بننے چلے جاتے ہیں۔ سو جب ڈائجسٹوں
میں لکھنے لگی تو امی بھی پڑھتی تھیں اور خوش ہوتی تھیں۔
پاکیزہ: شادی شدہ زندگی میں کیا اتنا
وقت مل جاتا ہے کہ ایک خاتون اپنا لکھنے لکھانے کا
شوق پورا کرے؟
اقبال بانو: شادی شدہ زندگی میں واقعی
ایک خاتون کو اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔ اب بھلا روئے
بچے کو چھوڑ کر کون لکھے؟ میرا بیٹا میرے لکھنے کا بہت
دیر کی ہے۔ جب بھی میں لکھنے بیٹھوں اسے یاد آ جاتا
ہے کہ اسے نوڈلز بنا دوں، کبھی چائے پینی ہے کبھی
انڈوں کا حلوا کھانا ہے پھر میں قلم رکھ کر اس کی
فرمائش پوری کرتی ہوں اور پھر دنوں لکھنے کا موڈ نہیں
بنتا البتہ میرے شوہر بہت سپورٹ کرتے ہیں۔ وہ کبھی
میرے شوق میں حائل نہیں ہوئے۔ ماشا اللہ سسرال
بہت بڑی ہے آنا جانا گھر میں سب کا لگا ہی رہتا ہے تو
مجھے لکھنے کا موقع رات کو ملتا ہے اگر لکھنا چاہوں تو۔
پاکیزہ: جب گھر، بچے، رشتے داریاں
مناثر ہو رہی ہوں تو آپ کی ترجیح کیا ہوتی
ہے۔ ضرور لکھنا ہے یا چھوڑ دینا ہے؟
اقبال بانو: دیکھیں نزہت ذمے داریاں

افسانے کو ہی آپ اس طرح لکھیں کہ باقاعدہ پیغام
دے دیا جائے خود وضاحت کریں اپنے پیغام کی تو وہ
افسانہ نہ ہوا صیحت نامہ بن گیا تو مجھے ایسی کہانیاں پسند
نہیں۔ (آج کی نئی رائٹرز بخور پڑھ لیں)
پاکیزہ: کون سے عوامل یا حالات ایک
کہانی کا محرک بنتے ہیں؟
اقبال بانو: کوئی عوامل اور حالات نہیں
صرف لکھنے کو دل چاہے اور وقت ہو۔ آپ کو بتاؤں
مجھے صرف پہلا صفحہ لکھنا مشکل لگتا ہے اور اگر افسانے
کا اشارت مجھے پسند نہ ہو تو کئی صفحات ضائع کر دیتی
ہوں اور پھر تھوڑا سا بھی اشارت پسند آ جائے تو پھر
چل سو چل۔ کہانی خود بخود بنتی چلی جاتی ہے۔ کروار
خود ہی مراحل طے کرتے ہیں اور انجام تک پہنچ جاتے
ہیں۔ بھی کہانی اینڈ تک سوچی بھی تو ہمیشہ انجام بدل
جاتا ہے تو اب نہیں سوچتی۔
پاکیزہ: آپ کی تحریروں میں مرکزی
کردار اور موضوع کیا ہوتا تھا؟
اقبال بانو: نزہت! مرکزی کردار تو وہی
ہیں ازل سے ایک ہی کہانی ہے اماں حوا اور بابا آدم
کی محبت کی کہانی۔ بس ہر کوئی الگ الگ انداز میں
لکھتا ہے۔ تو میرا موضوع محبت ہے۔ میرے ہاں نہ
سازشیں ہوتی ہیں نہ ایک دوسرے سے حسد اور بغض
ہوتا ہے۔ سچ بتاؤں میرا بھی دل چاہتا ہے۔ ایسی
کہانیاں لکھنے کو مگر سازشوں کے تانے بانے بننے
میرے بس کی بات نہیں۔
پاکیزہ: کیا ہم رائٹرز کو اپنی اپنی پسند کے
اعتبار سے پڑھتے ہیں یا صرف ان کے کام کی اہمیت
کے اعتبار سے؟
اقبال بانو: میں رائٹرز کو ان کے کام کے
اعتبار سے پڑھتی ہوں لیکن ایک بات بتاؤں کہ مجھے
جس کہانی کا اشارت پسند آ جائے تو پڑھتی ہوں بلکہ
یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ نام دیکھے بغیر پڑھتی ہوں



اسٹیل نیو

اقبال بانو... مجھے بتادیں یہ کیا ہوتا ہے جزیں گپ؟ آج تک سمجھ نہیں آیا۔ ہم تو اپنے باپ سے بھی فریک تھے کہ ہر بات اباجی کو بتاتے۔ میرا بیٹا بھی مجھ سے بلکہ ہم دونوں سے فریک ہے۔ بچوں کے دوست رہیں تاکہ وہ باہر غلط لوگوں سے دوستیاں نہ کر سکیں۔

پاکیزہ... آپ کو اپنی تحریر کے حوالے سے کس حد تک ستائش ملی اور آپ کو کیا محسوس ہوتا ہے؟

اقبال بانو... ستائش تو ملی اور ملتی بھی رہتی ہے۔ کئی ایوارڈز لیے پاکیزہ سے بھی تین ایوارڈز حاصل کیے۔ دو شیزہ رائٹرز ایوارڈز میں بھی چار پانچ ایوارڈ لیے ہیں۔ سائنل سنگت ایوارڈ میری سرائیکی کتاب پر ملا اور بھی بہت سے ایوارڈ ملے ہیں اور سب سے بڑھ کر

کہہ دیا۔ ”سر تو کیا میں بھی آپ کو بتاؤں گی؟“ سب ہنس دیے۔ تب حسنی صاحبہ بولے۔ ”رات میں نے ایک ڈائجسٹ میں تمہارا افسانہ پڑھا تھا بہت رومیک تھا۔ میں نے سوچا تم سے پوچھوں گا۔ تب میرے بجائے میری دوست فرزانہ فرح نے کہا۔ ”سر بانو تو محبت سے گندھی ہوئی ہے اور اس کے اندر اتنی محبت ہے کہ وہ قلم کے ذریعے کاغذ پر لفظوں کی صورت میں بکھر جاتی ہے۔“ تب سر نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور بولے۔ ”آج پتا چلا..... شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار کیسے ہوتے ہیں۔“

پاکیزہ... آج آپ اپنی بیٹی، بھانجی، بھتیجی کو کیسا دیکھنا چاہتی ہیں؟

اقبال بانو... میں ہر لڑکی کو بہت میچورڈ اور بہادر دیکھنا چاہتی ہوں مگر ایسی بہادری نہ ہو کہ اپنے بڑوں کی تمیز بھی بھول جائے۔ ہاں زمانے سے فکر ضرور لے، آئرن لیڈی ہو۔ اگر میری بیٹی ہوتی تو میں اُسے ایسا ہی دیکھنا چاہتی۔ اصول پرست، سچائی پر ڈٹ جانے والی۔

پاکیزہ... اس لیے یہ سوال پوچھا کہ پہلے کی مائیں دوسرے انداز سے تربیت کرتی تھیں مگر آج چونکہ انٹرنیٹ کے دور میں لڑکی کو صرف گھر بٹھا کر گھریلو امور سکھا کر تربیت مکمل نہیں ہوتی، آپ کا کیا خیال ہے؟

اقبال بانو... بالکل صحیح کہا ہے آپ نے، واقعی آج کی ماں تو گھرداری بھی نہیں سکھا رہیں۔ اکثر گھر دل میں دیکھا ہے بچیاں آرام سے لیپ ٹاپ لیے بیٹھی ہیں اماں جان کچن میں ہیں یا پھر واشنگ مشین میں کپڑوں سے سرکھپا رہی ہیں۔ ارے بھی بیٹیاں کس لیے ہیں۔ مجھے تو بہت غصہ آتا ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے جو لڑکیاں ماؤں کا ہاتھ نہیں بتاتیں۔ کالج، یونیورسٹی سے آئیں گویا ماں پر احسان ہو رہا ہے پڑھ کر۔

پاکیزہ... جزیں گپ کیا ہوتا ہے؟ کیا آپ میں تھا یا اب آپ کی اولاد میں؟

کے ایام کے حوالے سے کوئی یادگار بات، کوئی واقعہ ہمارے قارئین کی نذر کیجیے؟

اقبال بانو... یادگار واقعات بہت سے ہیں اب کیا پوچھتی ہو جوانی کی باتیں..... سچ پر جانا بہت اچھا لگتا تھا۔ کلفٹن کے ساحل پر میں نے امت الصبور (مدیرہ خواتین ڈائجسٹ) ناظمہ طالب جو اپریل 2011ء میں کوئٹہ میں ٹارگٹ کلنگ میں شہید ہو گئیں۔ ہم قینوں سچ پر جاتے وہاں سمندر کنارے ہلتی چولوں والی کرسیوں پر بیٹھ کر گرم گرم مچھلی کھاتے تھے۔ وہ دن بہت یادگار ہیں۔ سڑک کنارے کھڑے ہو کر بارہا اہتل اور میں نے وہی بھلے اور چاٹ کھائی۔ ان دنوں چائنیز ریسٹورنٹ کا خاصا شور تھا ہم تینوں چائنیز جاتے۔ میں نے ان دنوں کو بہت انجوائے کیا ہے پھر یونیورسٹی میں میری دوست تھی روبینہ زریں۔ آج کل گورنمنٹ کالج، کورنگی میں پروفیسر ہے۔ ساڑھ جیسں پتا نہیں کہاں غائب ہے؟ ساڑھ غلام نبی سے تو آج بھی دوستی ہے فون پر بات بھی ہو جاتی ہے۔ تو میری دوستوں کے ساتھ گزرے دن یادگار دن ہیں۔ ہاں ایک یادگار واقعہ سن لیں۔ ایم اے فاسل کی کلاس تھی ہمارے پروفیسر ڈاکٹر یونس حسنی صاحب ہمیں اقبالیات پڑھاتے تھے۔ انتہائی محبت کرنے والے دوست نما استاد تھے۔ میں نے ادبی و علمی لحاظ سے بہت قابل اور مشہور و معروف اساتذہ سے پڑھا۔ جیسے ابوالخیر کشفی صاحب، جمیل اختر خان صاحب، حبیب فائق صاحب، اسلم انصاری صاحب اور یونس حسنی صاحب۔ ہاں تو حسنی صاحب ہمیں اقبالیات پڑھا رہے تھے ایک دم بولے ”بانو تم نے بھی محبت کی؟“ میں تو حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگی وہ مسکرا کر بولے۔ ”بتاؤ بھی؟“ میں نے ادھر ادھر دیکھا تقریباً سب کی نظریں مجھ پر تھیں میں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”سر آپ نے محبت کی ہے؟“ بے ساختہ بولے۔ ”کیا میں تمہیں بتاؤں گا؟“ تب میں نے بھی

بے حد ضروری ہے نہ بہت۔ بڑے رائٹرز کو پڑھ کر ہی تو ایک نیا لکھاری کہانی بنتا سیکھتا ہے۔ اور اپنے سینئرز کے کام کا مطالعہ کیے بغیر آگے بڑھا ہی نہیں جاسکتا۔ (بے شک یہ کلیہ ہر شعبہ زندگی میں قدم بڑھانے کے لیے کارگر ہے کہ پہلے اپنے پیش روؤں کے کام کا مطالعہ اور مشاہدہ ضروری ہے)

پاکیزہ... موجود دور کی کہانیوں اور بیس سال پہلے کی تحریروں میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟

اقبال بانو... بہت فرق ہے۔ میں نہایت سچائی سے کہوں گی کہ اب پہلے سے بھی اچھی کہانی لکھی جا رہی ہے مگر پھر بھی اس میں نرمی نہیں ہے۔ اصل میں وژن بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اب تو ایک ٹن دباؤ اور دنیا کی معلومات لے لو جبکہ ہمارے زمانے میں یعنی بیس سال پہلے یہ بات نہیں تھی اور یوں بھی وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں تو آتی ہی ہیں ناں جب ہر فیشن بدلتا ہے تو تحریروں میں بھی فرق پڑے گا۔ اب سوچ بہت بدل گئی ہے۔ لوگوں کو سمجھنے پر کھینے کی سمجھ آگئی ہے جبکہ ہمارے دور میں جس نے جو کہہ دیا وہ مان لیا آج کی لڑکی چاہے، قاری ہو یا رائٹر بہت شارپ ہے۔ کہانی بہت بدل گئی ہے۔ اب کہانی میں سے محبت اور سچائی ختم ہو گئی ہے۔ محبت زبردستی کی ہوتی ہے۔ دلوں میں کھوٹ ہوتا ہے عجیب سا احساس ہوتا ہے جیسے نئے گانے سنو تو مزہ نہیں آتا مگر ایک دور تھا کہ عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کو سن کر دل چاہتا تھا ہم بھی محبت کریں..... ہا ہا ہا ریشماں کو سنتے تھے کہ دے میں چوری چوری لالیاں آکھاں دے تو وہ بھی جو چوری چوری اکھاں لگانے والا معاملہ تھا اب نہیں رہا۔ تو میں یہ فرق محسوس کرتی ہوں۔ اب تو اباء، امی کے سامنے عشق ہو رہے ہیں اور اماں کہتی ہیں بیٹا یہ لڑکا نکلتے نہیں دینا۔ ایسی کہانیاں میں نے پڑھی ہیں اور بہت دکھ ہوتا ہے کہ ہم بچپن کو کیا پیغام دے رہے ہیں۔

پاکیزہ... اپنے اسکول، کالج اور جوانی

سینک، سینگ یا کچھ اور؟

اقبال بانو:..... مجھے کوئنگ کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ میرے شوہر اور بیٹے کو میرے ہاتھ کے یکے کھانے پسند ہیں۔ آپ کو بتاؤں شادی سے پہلے مجھے کچھ بھی پکانا نہیں آتا تھا گھر میں تھی تو بڑی پر چھوٹی بہنیں کوئی کام کرنے نہیں دیتی تھیں سب کچھ میں نے شادی کے بعد پکایا باقاعدہ سیکھا نہیں بس پکانے لگی تو خود بخود اچھا پکنے لگا البتہ شروع میں سالن میں مرج تیز ہو جاتی تھی۔

پاکیزہ:..... جدید زمانے کے ساتھ خود کو کس حد تک ایڈجسٹ کیا؟

اقبال بانو:..... ارے بھی اب ہم اتنے بھی پرانے نہیں ہیں نہ بہت۔ یہ سوال کر کے دل ہی توڑ ڈالا (ارے ایسی بات نہیں ہے اقبال بانو، ہم بھی تو آپ کے ساتھ ساتھ ہیں) ویسے جدید فیشن کی بات کرو۔ تو فیشن شروع ہی سے نہیں کیا۔ وہی جو شروع سے شلوار قمیض تھی آج بھی اسی اسٹائل کی پہنتی ہوں۔ چھوٹی قمیض آئے یا اب ٹخنوں تک کی قمیض ہے مگر میری لسانی وہی ہے گھٹنوں سے دو تین انچ لمبی اور شلوار کے پانچ دس انچ کھلے تو یہی شروع سے فیشن رکھا جو سدا بہار ہے۔ (مستعل مزاجی ہو تو ایسی، واہ کیا بات ہے)

پاکیزہ:..... ایک عورت کس طرح کامیابی سے گھر کے اندر اور باہر کے کام انجام دے سکتی ہے؟

اقبال بانو:..... نہ بہت میں سچ کہوں..... وہ عورت محترمہ عذرا رسول ہیں۔ میری عذرا صاحبہ سے اکثر بات ہوتی ہے اور بہت دیر تک۔ جس طرح وہ وقت کو اپنی مرضی سے چلا رہی ہیں ایسا کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ عذرا رسول کو بے حد ہمت اور حوصلہ دے۔ دین اور دنیا دونوں ایک ساتھ لے کر چل رہی ہیں۔ اور وقت کی جو تقسیم عذرا صاحبہ نے کی ہوئی ہے اگر اسی طرح ہر عورت کرے کہ گھر میں بھی وقت دے اور باہر بھی تو یقیناً کامیاب ہوگی۔ محترمہ عذرا رسول یقیناً خواتین کے لیے رول ماڈل

بھی رڈو بدل تو ہوتا رہتا ہے۔ خیر آپ کا حکم ہے تو سنیں۔ میری صبح فجر کی پہلی اذان کے ساتھ ہی ہو جاتی ہے پھر میں اٹھ بیٹھتی ہوں۔ اذانیں سنتی ہوں پھر وہی روٹین واش روم جانا، وضو کر کے نماز پڑھتی ہوں تقریباً سات بجے میں تسبیحات سے فارغ ہوتی ہوں۔ ٹیپو کو اسکول کے لیے تیار کیا اسے ناشتا کروایا آٹھ بجے اس کی وین آ جاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد اپنی میڈ کے ساتھ گھر کا کام کرواتی ہوں۔ دس بجے دوپہر کے کھانے کا انتظام کرتی ہوں۔ دو بجے ٹیپو آ جاتا ہے ہم مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد میں آج کل جو ڈراما لکھ رہی ہوں لکھتی ہوں۔ چار بجے عصر کے بعد چائے کا دور چلتا ہے۔ ٹیپو کو پڑھائی ہوں۔ ساتھ ہی رات کے لیے سالن اور چاول بننے ہیں۔ ساتھ کوئی بھی میٹھا بنا لیتی ہوں ویسے کھیر میرے ہاں ایوری ٹائم فرنچ میں رہتی ہے کہ میرے میاں میٹھا کھانے کے بہت شوقین ہیں۔ کبھی جلد سویرے سویرے فارم ہاؤس جانا ہو تو وہ ایک پیالہ کھیر اور ایک پیالہ دہی کھا کر ہی چلے جاتے ہیں۔ رات کا کھانا ہم آٹھ بجے کھاتے ہیں۔ ساتھ ہی آٹھ سے نو والا ڈراما ضرور دیکھتی ہوں۔ کسی بھی چینل پر یا پی ٹی وی پر۔ دس بجے تک ہم ماں بیٹا عشا کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ نماز کے بعد ٹیپو کو سلائی ہوں کہ میرے میاں بہت دیر تک نماز پڑھتے ہیں۔ ٹیپو کو سلا کر پھر میں کچھ نہ کچھ پڑھتی ہوں۔ پڑھنے کے بعد دو گھنٹے لکھتی ہوں اور بارہ ایک بجے سوتی ہوں پھر وہی صبح پانچ بجے فجر کی پہلی اذان پڑھ جاتی ہوں۔ روٹین بدلتی بھی ہے کبھی چلے گئے کوئی آگیا کہ یہ سب تو زندگی کے ساتھ ہے۔ ایسی کوئی اہم روٹین تو ہے نہیں..... لکھنے کے معاملے میں میاں جی بہت سپورٹ کرتے ہیں۔ (بہت خوب ناشا اللہ کافی منظم روٹین ہے)

پاکیزہ:..... گھر میں امور میں کس شعبے میں زیادہ دلچسپی ہے مثلاً کوئنگ، سلائی کڑھائی، گھر کی

پاس رہتی ہے جب چاہا پڑھ لیا جیسے حسینہ معین کا یا اصغر ندیم سید کا ہر ڈراما ہی شاہکار اور یادگار نہیں تھا لوگ اسے بھول گئے؟

اقبال بانو:..... ٹھیک کہا آپ نے ڈراما آج بھی لکھا جا رہا ہے لیکن میں یہ کہوں گی کہ آخر کب تک حسینہ معین اور اصغر ندیم سید لکھیں گے ان کی جگہ کسی نے تو لینی ہے مگر میں سمجھتی ہوں کہ ابھی ان کی جگہ خالی ہے وہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اچھا ڈراما لکھیں گے تو وہ ضرور اپنی جگہ بنالیں گے۔

پاکیزہ:..... کیا ٹی وی رائٹرز کی اس یلغار میں آپ کی جداگانہ پہچان بن پائی؟ جبکہ ڈائجسٹ میں تو آپ کا بلاشبہ ایک مقام ہے؟

اقبال بانو:..... میں سمجھتی ہوں کہ ڈرامے کی اس یلغار میں میری کیا کسی کی بھی جگہ نہیں بن پائے گی اور یقیناً سب رائٹرز واپس ڈائجسٹوں کی طرف آئیں گی، دوبارہ لکھیں گی ڈائجسٹوں میں۔ (بے شک درست فرمایا)

پاکیزہ:..... کون سے موضوعات ایسے رہ گئے ہیں جن پر آپ نے طبع آزمائی نہیں کی؟

اقبال بانو:..... بہت سے موضوعات ہیں جو رہ گئے ہیں اور میں انہیں لکھنا چاہوں گی۔ انشا اللہ اگر زندگی رہی اور صحت نے ساتھ دیا تو ضرور لکھوں گی۔ (ہماری دعائیں سدا آپ کے ساتھ ہیں)

پاکیزہ:..... چلیں اقبال بانو کچھ آپ ذاتی زندگی کے حوالے سے بتائیں آپ کی فیملی کتنے افراد پر مشتمل ہے؟

اقبال بانو:..... ہاں جی ضرور ضرور پوچھیں ذاتی زندگی کے بارے میں۔ ہم گھر میں تین افراد ہیں۔ میرے میاں جی اور میرا بیٹا ٹیپو..... یہ ہے میری چھوٹی سی فیملی۔ (کم بچے خوش حال گھرانہ، ہے ناں!)

پاکیزہ:..... آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟ ایک دن کا ڈرامہ روزنامہ مچھتا میں؟

اقبال بانو:..... ایک دن کا روزنامہ.....

میرے قارئین کی محبت اور غلوں سے جو اپنا وقت نکال کر میرے لکھے کو پڑھتے ہیں۔ (بے شک ایک لکھاری کے لیے یہی اصل ایوارڈ ہوتا ہے)

پاکیزہ:..... اب تو خیر ساری رائٹرز الیکٹرانک میڈیا کی طرف رواں دواں ہیں۔ آپ بھی ڈرامے کر رہی ہیں۔ ڈائجسٹ میں لکھنا اور اسکرپٹ لکھنا کیسا تجربہ رہا؟

اقبال بانو:..... میرے خیال میں افسانہ بہت ہی نرم ماٹوں سے جڑا ہوا ہے۔ جس میں آپ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں یعنی اپنے دل کے ارمان نکالے جاسکتے ہیں جبکہ اسکرپٹ میں بس جملے داغ..... جذبے نہیں لکھ سکتے۔ مجھے تو یہ اسکرپٹ خشک لگتا ہے پھر ڈراما تو ڈرامائی ہوتا ہے ناں۔

پاکیزہ:..... میرا اپنا ذاتی خیال ہے جو ڈائجسٹ پڑھنے والے ہیں وہ اسے کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ ڈراما تو کوئی دیکھتا ہے کوئی نہیں اور اب تو جھٹلوتے ہو گئے ہیں کہ ایک ہی وقت میں سب جگہ آرہے ہوتے ہیں تو میرا خیال ہے صرف ان کے جاننے والے یا رشتے دار ہی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ آپ کیا کہتی ہیں اس بارے میں؟

اقبال بانو:..... نہ بہت آپ کا خیال بھی درست ہے۔ ڈائجسٹ کو پڑھنے والے اسے بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ بے شک کتنے بھی ڈرامے آجائیں کہ ہر وقت ٹی وی کے آگے نہیں بیٹھ سکتے اور پھر جو مزہ ڈائجسٹ کی کہانی پڑھنے میں ہے وہ ڈرامے میں کہاں..... واقعی آپ صحیح کہہ رہی ہیں کہ ڈراما نگار کے جاننے والے ہی دیکھتے ہوں گے ڈراما کہ ڈراما کمرشل ہو گیا ہے اور پھر رائٹرز کو بھی تو پیسوں کی ضرورت ہے ناں۔ (بالکل درست، وہ بھی تو اسی معاشرے کے شہری ہیں)

پاکیزہ:..... میرا مطلب کہنے کا یہ ہے کہ بہت کم ڈرامے جو شاہکار ہوتے ہوں گے وہی یاد رہ جاتے ہیں جبکہ ڈائجسٹ میں چھپی چیز ہمیشہ ہمارے

قارئین سے گفتگو کیسی لگی؟

اقبال بانو! مجھے پاکیزہ قارئین سے بات کر کے مزہ آیا اور نرہت آپ کا شکریہ کہ آپ نے اتنی اچھی محفل میرے لیے سجائی..... بہت بہت شکریہ۔ ایک دفعہ پھر میں ادارہ پاکیزہ کی مدیرہ کا شکریہ ادا کروں گی اور ہاں محترمہ عذرا رسول کے خلوص و ایثار کو لاکھوں سلام جنہوں نے تمام رائٹرز اور ریڈرز کو ایک لڑی میں خوب صورتی سے پرویا ہوا ہے۔

پاکیزہ!..... آخر میں ہماری رائٹرز، قارئین اور دیگر دوستوں کے لیے کوئی بات، کوئی پیغام، کوئی سوچ؟ اقبال بانو!..... قارئین کے لیے پیغام یہی ہے کہ خوشیاں دو خوشیاں ملیں گی۔ دوسروں کے دکھ بانٹو، کسی کے درد کو اپنا سمجھو تو محبت اور خلوص پاؤ گے۔ رائٹرز اور قارئین خوش رہو، آباور ہو۔ آمین۔

عزیز قارئین! ہمیں پوری امید ہے کہ اقبال بانو کی دلچسپ و پرمزاح اور سچی کھری باتیں آپ کو یقیناً پسند آئی ہوں گی ہمیں امید ہے کہ قارئین کے لیے ہماری یہ محرک مصنفہ انشاء اللہ جلد ہی نئی کہانی منظر عام پر لائیں گی۔ اقبال بانو کا ایک مرتبہ پھر ہم شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اپنی مصروفیات اور کچھ کچھ طبیعت خرابی کے باوجود سالگرہ نمبر 2 کے لیے ایک بھرپور بات چیت کی اور ہمارے اس ایٹھ کو چار چاند لگائے۔ خدائے بزرگ و برتر کے حضور دعا گو ہیں کہ آپ کا قلم یونہی رواں رہے تاکہ ہمارے قارئین اور کئی مصنفات بھی فیض یاب ہوتی رہیں۔ چھوٹی سی اچھی سی بات کے ساتھ آپ سے اجازت کہ خوش رہنا اور خوش رکھنا سیکھیں۔ اللہ حافظ!

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

سفید پھولوں کی خوشبو مہکا دیتی ہے اور مٹی کی خوشبو پسند ہے۔ کھانے میں مجھے دال چاول اور فش پسند ہے۔ گھومنے کے لیے کراچی کا سمندر یا پھر بھور بن۔ پسندیدہ شعر ایک نہیں دو

سوچوں تو ساری عمر محبت میں کٹ گئی
دیکھوں تو ایک شخص بھی میرا نہ ہوسکا

☆

لو آج سے بدل لی ہم نے بھی اپنی زندگی
جو وفا کرے گا وہی دل میں رہے گا
پسندیدہ شاعروں میں غالب، علامہ اقبال، منیر نیازی، احمد فراز، محسن نقوی، پروین شاکر، نوشی گیلانی اور نئی شاعرات میں شگفتہ شفیق، نسیم نیازی، سعدیہ ہما شیخ، فصیحہ آصف خان بہت اچھا لکھتی ہیں۔
پاکیزہ!..... آپ کے نزدیک حقیقی مسرت کیا ہو سکتی ہے؟

اقبال بانو!..... حقیقی خوشی، آپ خوش رہیں خوشیاں بانٹیں، درگزر کریں، معاف کر دیں تو دیکھیں کسی خوشی ملتی ہے اور کیا پرسکون نیند آتی ہے۔

پاکیزہ!..... میاں جی آپ کو کیا کہہ کر پکارتی ہیں؟

اقبال بانو!..... ارے واہ..... بھئی میاں جی مجھے مولو کہتے ہیں جبکہ میں لاڈ سے جانو یا پھر سنجیدہ ہوں تو سب کے سامنے ملک صاحب۔

پاکیزہ!..... کوئی شدید خواہش جو اب تک پوری نہ ہوئی ہو؟

اقبال بانو!..... اللہ کا بہت شکر ہے کہ جو مانگا اس نے دیا۔ مجھے میری حیثیت سے بڑھ کر دیا ہے۔ جو نہیں مانگا وہ بھی عطا کیا اور جو نہیں دیا تو شاید وہ ہمارے لیے بہتر نہ تھا۔ تو میرے سوہنے رب کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے میری اوقات سے بڑھ کر مجھے نوازا ہے اور نوازا رہا ہے۔

پاکیزہ!..... ایک طویل گیپ کے بعد پاکیزہ

ہے) ان کے لبوں سے یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور یہ میرے لیے اعزاز ہے۔ عمیرہ احمد اللہ کرے آپ کو اس آفتاب کا ساتھ مبارک ہو، آمین۔ (ہم سب کی پُر خلوص دعائیں عمیرہ احمد کے ساتھ ہیں) اعزاز تو یہ بھی ہے جب عزیزہ سید میری تحریر کو پسند کرتی ہیں۔ مجھے عزیزہ سید کی تصوف والی تحریریں بہت پسند ہیں۔ عزیزہ کی ہر تحریر میں نے بڑھی ہے اور تلاش کر کر کے پڑھی۔ ساجدہ حبیب کے کشمیر کے موضوع پر لکھے ناولٹ ڈائجسٹوں کے لیے سرمایہ ہیں۔ ساجدہ کو بھی میں ضرور پڑھتی ہوں۔ دلشاد نسیم اور نگہت نسیم یہ دونوں بہت سنبھل کر اور مناسب الفاظ کے چٹاؤ سے لکھتی ہیں اور بہت اچھا لکھتی ہیں۔ خالدہ اسد، حمیرا راحت، عظمت عزی، ذکیہ بلگرامی صاحبہ کی سادہ مگر سلیبھی ہوئی کہانیاں مجھے بے حد اچھی لگتی ہیں۔ اب وہ بھی عرصے سے نہیں لکھ رہیں خیر کچھ تو ہمارے درمیان نہیں اللہ دیگران کو سلامت رکھے۔ ہماری غزالہ نگار اور کزئی، ان کی گتہ سیریز کے سارے افسانے زبردست رہے۔ آج کل کی رائٹرز میں عالیہ بخاری، راحت جبین، صائمہ اکرم، حمیرا حمید، عتیقہ بیگ، سائرہ رضا، نایاب جیلانی، شمیمہ عظمت علی، زمر نسیم وغیرہ کو بھی ضرور پڑھتی ہوں۔ بے شک پرانی رائٹرز ہوں یا نئی..... ڈائجسٹ میں ضرور پڑھتی ہوں۔ ہاں جس رائٹر کی تحریر پہلی بار پسند آجائے تو پھر آئندہ بھی پڑھتی ہوں ورنہ.....!

پاکیزہ!..... اچھا روایتی سوالات بھی کر ڈالوں۔ پسندیدہ رنگ، موسم، کھانا، پینک اسپاٹ، شعر، شاعر؟

اقبال بانو!..... بلیک اور پینک مگر پسند ہے۔ آج کل موسم بہار ہے کھیتوں میں سرسوں پھولی ہوئی ہے۔ آموں کے درختوں پر پور آ گیا ہے۔ کچھار اور آرٹو کے خوب صورت پھول میرے لان کو مزید خوب صورت کیے ہوئے ہیں۔ مالتوں اور لیمنوں کے

نذر، نیوائر اور میرے برتھ ڈے پر گفٹ کرتی تھیں۔ میری دوست بھی نجمہ اسلم، کونڈ سے مجھے بہت خوب صورت خطوط لکھا کرتی تھی اور میری تحریروں پر تبصرہ لکھتی مجھے کتابیں گفٹ کرتی کہ کلاسیکل ادب وہ بھی پڑھتی تھی تو میرے پاس بہت اچھا کلیکشن تھا بلکہ ہے۔ عبداللہ حسین، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی کو بہت پڑھا پھر اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی تحریروں کو دل سے پڑھا۔ کافی عرصہ بشری رحمن کی دیوانی رہی اور اب بھی میں مندرجہ بالا تمام رائٹرز کو ضرور پڑھتی ہوں۔ رفعت ناہید سجاد اور شوکت رانا الطاف کو بھی بہت پڑھا ہے۔

پاکیزہ!..... اپنے ہم عصر رائٹرز میں کون کون پڑھتی ہیں؟

اقبال بانو!..... میری ہم عصر رائٹرز نے لکھا اور اب بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اپنی انجم انصار انہوں نے مزاح لکھا یا افسانہ، پرفیکٹ لکھا ہے۔ انجم کے ناول بھی مجھے بہت پسند ہیں اور انجم میں یہ خوبی ہے کہ وہ جتنا اچھا مزاح لکھتی ہیں اتنا ہی اچھا افسانہ لکھتی ہیں۔ نگہت سیما مجھ سے سینئر ہیں لیکن مجھے ان کی تحریروں بہت پسند ہیں۔ وہ میرے ساتھ ساتھ بھی چل رہی ہیں۔ نگہت کا ایک افسانہ تھا گولڈن چانس وہ میرے دل کی رگوں میں رچ بس گیا اور پتا نہیں میں کتنی مرتبہ پڑھ چکی ہوں۔ بار بار پڑھا اور بے تحاشا روٹی۔ نگہت عبداللہ بھی اچھا لکھتی ہیں۔ عمیرہ احمد کی ہر تحریر پڑھی ہے۔ پاکیزہ میں چھپنے والے ان کے ناول عکس پر ہر ماہ تبصرہ کیا۔ عمیرہ سے بات ہوتی رہی اور مجھے خوشی ہے کہ عمیرہ احمد نے بھی میری تحریروں پڑھی ہیں حالانکہ وہ خود بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ایک روز کہنے لگیں بانو ہم نے تو آپ کو پڑھ پڑھ کر لکھنا سیکھا ہے۔ انہیں میرے 88ء میں چھپنے والے ناول دروازہ کھلا رکھنا کے کردار تک یاد ہیں۔ عمیرہ بہت بڑی رائٹر تو ہیں مگر بہت بڑی انسان بھی ہیں (یہ تو

گزارروں گا۔
۲: مجھے تحفے میں wrist watch اور کتاب لینا بہت پسند ہے اور دینا بھی یہی دو چیزیں ہوں لیکن کتاب دیتے ہوئے شخصیت کے ذوق کو مد نظر رکھتا ہوں۔

یاسر پیرزادہ (نیوز اینکر)

۱: بغیر کسی الیکٹرانک آئٹم کی مدد کے اس دل سے اپنے دل کی بات کرتا جو دل مجھے ہر پہلے یاد کرتا ہے، ایک شعر یاد آ رہا ہے۔
فاصلے دوری سے ہوا کرتے ہیں دل سے نہیں ملنے والے تو خوابوں میں بھی مل لیتے ہیں اور میں بھی خود میں موجود اس شخص سے قلبی ملاقات کر کے باطنی مسرت سے ہمکنار ہونے کا لطف اٹھاؤں گا۔ یہ ساعتیں رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔

۲: سالگرہ کے تحفے میں مجھے پرفیوم دینا پسند ہے اور زیادہ تر میں پرفیوم ہی دیتا ہوں اور اگر کوئی مجھے پرفیوم ہی دے تو خوشی ہوتی ہے کہ پرفیوم کی



یاسر پیرزادہ

کاش خوشیوں کی کوئی دکان ہوتی یا اس کی کوئی پہچان ہوتی بھر دیتی تمہارے دل کو خوشیوں سے قیمت اس کی چاہے میری جان ہوتی اور سچ تو یہ ہے کہ کسی کی بے بسی محسوس کر کے میرے بھی یہی احساسات ہوں گے جس سے یقیناً کوئی اور بھی گزر رہا ہوگا۔
۲: صرف اور صرف پرفیوم کہ پرفیوم کی خوشبو سے انسان کی پہچان ہوتی ہے کہ وہ کس پنچر کا ہے۔

ارسلان کھوکھر

(ٹی وی ہوسٹ، youth activist)
۱: ایسا محسوس ہوگا جیسے اچانک چاند پر پہنچ گئے سوئے زمین پر اٹھے تو چاند پر اور یہاں دھرتی کے



ارسلان کھوکھر

چاند کی آمد بھی غیر یقینی۔ ایسے میں نظام زندگی درہم برہم ہو جائے گا اور کیفیت کچھ یوں ہوگی کہ جہاں بھونچال بنیادِ فیصل و در میں رہتے ہیں ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں خوش امید کی سہارے یہ وقت

آج ہماری سائلگرہ ہے

شائستہ زریں

ہو، سی این جی بند، ہڑتال بھی ہو اور کسی عزیز ہستی کی مبارک باد اور آمد کا انتظار بھی، تب دلی جذبات و احساسات کیا ہوں گے؟
سوال ۲: سالگرہ پر کیسا تحفہ لینا اور دینا پسند ہے؟

عنبرین رزاق

(اسسٹنٹ رجسٹرار، انسٹی ٹیوٹ آف بزنس اینڈ ٹیکنالوجی ہیڈ آفس فیشن اسکول)
۱: اگر کوئی اپنی سالگرہ پر میری مبارک باد اور آمد کا منتظر ہوتا اور صورت حال آپ کے سوال کے مطابق ہوتی تو یقیناً یہ اشعار میرے جذبات و احساسات کی تفسیر ہوتے کہ



عنبرین رزاق

بلاشبہ محبت خوش گمانی میں مبتلا کر دیتی ہے لیکن یہ جتنی خوش گمان ہوتی ہے کبھی کبھی مقابل کی ذرا سی عدم توجہی سے بدگمان بھی اتنی ہی جلدی ہو جاتی ہے شاید اس لیے کہ جن سے دلی قربت محسوس ہوتی ہے، دکھ سکھ کے موقع پر دل سب سے زیادہ ان ہی کی طلب کرتا ہے۔ بالخصوص وہ خاص الخاص دن جو ہر انسان کی زندگی میں بہت اہم ہوتا ہے یعنی جنم دن، اس دن لاشعوری طور پر بے حد عزیز ہستی کی مبارک باد اور آمد کا شدت سے انتظار رہتا ہے اور حالات کچھ ایسے ہوں کہ بالمشافہ ملاقات کا امکان بھی نہ ہو اور مواصلاتی رابطہ بھی ممکن نہ ہو تب دل آس و نراس کی کیفیت سے گزرتا ہے کبھی مایوسی ڈیرے ڈال لیتی ہے تو کبھی آس کے دیپ روشن ہو جاتے ہیں ایسے میں تکمیلِ تمنا سے بڑھ کر سالگرہ کا تحفہ اور کوئی نہیں ہوتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تحائف کا لین دین تعلق کو مضبوط کرتا ہے۔ یہ بجا کہ تحائف کے لین دین اور انتخاب میں ہر انسان کا مزاج دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ تحفے کی بڑی خوبی دینے والے کا اخلاص ہے اور جنم دن پر ملاقات اور مبارک باد کے ساتھ چاہت سے دیے جانے والے تحفے کی بات ہی کچھ اور ہے کہ اس میں جذبوں کے دھنک رنگ بھی تو ہوتے ہیں ناں۔

سوانہی امور کے پیش نظر ہم نے سروے کے ذریعے معلوم کیا کہ
سوال ۱: آپ کی سالگرہ پر موبائل فون سروس بند ہو، بجلی نہ ہونے کے سبب فیس بک پر رابطہ بھی نہ



شہلا نواز

شہلا نواز (طالبہ)

۱: جلیں گے، گڑھیں گے، اپنے بال نوچیں گے، ستر کی دہائی کی غمزدہ ہیر و کنز پر فلماں گے، غمگین گانے..... زندگی جا چھوڑ دے پیچھا میرا اور کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہیں یہ بہاریں یہ سماں گا گا کر رورو کر تیکے کے تیکے بھگو دیں گے اور چائے کا ایک بڑا پیالہ صبر کے پیالے کے مانند پی کر غلط کرنے کی کوشش کریں گے۔

۲: کسی کو دینے کے لیے ایک بڑا سا تربوز اور اپنے لیے ڈائمنڈ رنگ پسند ہے۔ ارے یہ تو مذاق تھا، تحفہ دینے کے لیے اپنی جیب کو مد نظر



مہوش فاطمہ

مہوش فاطمہ (طالبہ، وائس)

۱: بے چینی ہوئی اور تھوڑا غصہ آئے گا۔

۲: ڈریس اور ہینڈ بیگ تحفے میں لینا پسند ہے کیونکہ مجھے نبت سے ڈریس اور ہینڈ بیگ کا کریر ہے، تحفہ دینے میں پرفیوم اور اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی پینٹنگ اور شوپیس دینا اس لیے پسند ہے کہ جب بھی تحفہ لینے والے پرفیوم لگائیں تو میری محبت کی خوشبو بھی محسوس کریں اور میری بنائی ہوئی پینٹنگ اور شوپیس دیکھیں تو احساس ہو کہ میں نے کتنی محبت سے ان کے لیے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔



یاسر عباس

یاسر عباس (طالبہ، وائس)

۱: بے چینی ہوئی اور تھوڑا غصہ آئے گا۔

۲: ڈریس اور ہینڈ بیگ تحفے میں لینا پسند ہے کیونکہ مجھے نبت سے ڈریس اور ہینڈ بیگ کا کریر ہے، تحفہ دینے میں پرفیوم اور اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی پینٹنگ اور شوپیس دینا اس لیے پسند ہے کہ جب بھی تحفہ لینے والے پرفیوم لگائیں تو میری محبت کی خوشبو بھی محسوس کریں اور میری بنائی ہوئی پینٹنگ اور شوپیس دیکھیں تو احساس ہو کہ میں نے کتنی محبت سے ان کے لیے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔



نور العین

۱: بس دل کی ایک ہی پکار ہوگی کہ یعنی آج سالگرہ نہ مناؤ، جب سب ٹھیک ہو جائے گا، معمول کے مطابق اور ہمارے سب اپنے جب ساتھ ہوں گے تب منالینا سالگرہ۔

۲: کوئی اچھی سی کتاب خاص کر معلومات عامہ پر مبنی کتاب سالگرہ میں بطور تحفہ لینا اور دینا دونوں ہی



نور العین

نور العین

۱: سخت کوفت ہوگی اور دل کرے گا کہ کہیں سے بھی کوئی مجزہ ہو جائے اور میرا انتظار ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ مجھ سے انتظار نہیں ہوتا میں بہت بے صبری ہوں۔

۲: مجھے کتاب لینا اور دینا پسند ہے کہ کتاب

یاسر عباس (فزیو تھراپسٹ، آر جے ریڈیو پاکستان کراچی)

۱: کچھ بھی ہو بس وہ شخص کچھ ضرور جائے۔ کیسے بھی کسی سے بھی لفٹ لے کر ہی آنا پڑے۔ بہ صورت دیگر میری کیفیت اس شعر کی غماز ہوگی۔

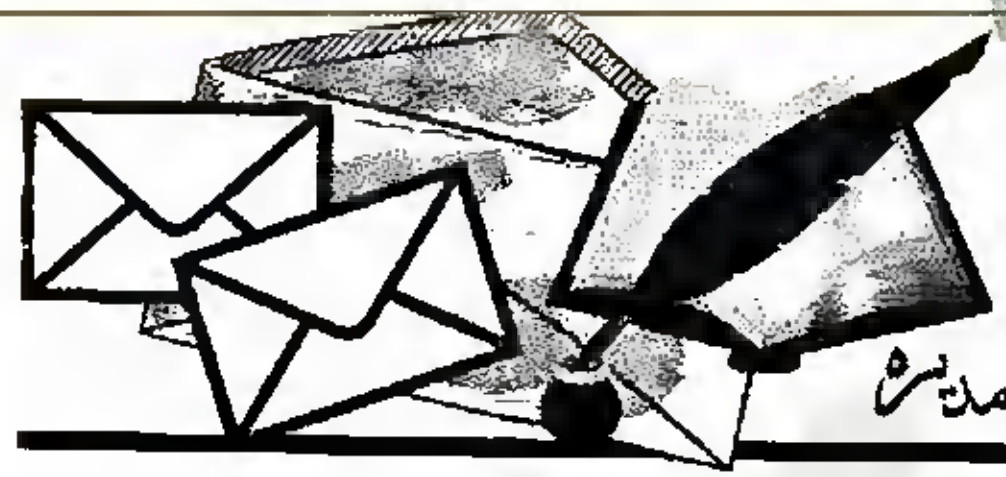
۲: سالگرہ کا سب سے بہترین تحفہ پیار اور دعاؤں کا لین دین ہے۔ اس کے علاوہ پرفیوم اور گھڑی تاکہ ہم دونوں کی زندگی خوشبو سے مہکتی رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ہمارا پیار بھی بڑھتا رہے۔

صورتوں میں پسند ہے۔

ثانیہ ملک

۱: سخت کوفت ہوگی اور دل کرے گا کہ کہیں سے بھی کوئی مجزہ ہو جائے اور میرا انتظار ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ مجھ سے انتظار نہیں ہوتا میں بہت بے صبری ہوں۔

۲: مجھے کتاب لینا اور دینا پسند ہے کہ کتاب



بہنوں کی محفل

مدد

عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!

محمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

ہر ماؤں کا عالمی دن..... اس لحاظ سے تو اہم ہے کہ ہم سوچیں کہ ہم کس کیمنگری میں کھڑے ہیں..... اپنی ماؤں کا خیال رکھتے ہیں یا نہیں..... ورنہ ماؤں کا دن تو ہر روز ہے..... کہ ان کا حق تو ہم ادا ہی نہیں کر سکتے..... اکثر بیٹیاں اپنی ماؤں سے اس وجہ سے ناراض ہوا کرتی ہیں کہ وہ ان پر روک ٹوک زیادہ کرتی ہیں مگر جب وہ خود ماں کے منصب پر فائز ہوتی ہیں تو یہی کہتی نظر آتی ہیں کہ ماؤں کی روک ٹوک بھی غلط نہیں ہوا کرتی..... پیاری بہنو..... آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ خوب صورت پودے باہرے بھرے درخت جب ٹیڑھے میڑھے پھیلنا شروع ہو جاتے ہیں تو مالی انہیں کاٹ پیٹ کر ٹھیک کر دیتا ہے..... اسی لیے بچوں کو بھی اس روک ٹوک پر داویلا نہیں چھانا چاہیے..... کیونکہ یہ بھی پودے ہیں اور ان کے بھلے کے لیے ہی ہوا کرتا ہے اسی لیے ان کو غلط راہوں سے بچانا آپ کا فرض ہے..... ماں کا یہ فرض..... باپ سے بھی زیادہ ہے۔

اپنی بہنوں سے آج ایک چھوٹی سی بات مزید کرنی تھی..... سہیلیوں کی مہندیوں، شاویوں پر یا خاندان میں کزنز کے ہاں تقریبات پر آپ اپنی بیٹیوں کے ساتھ خود جائیں اور انہیں واپس اپنے ساتھ لے کر آئیں ایسا نہ کریں کہ رات کو وہاں ہلاکلا کرنے کے لیے آپ انہیں چھوڑ کر آ جائیں..... اور کسی بچی کا کوئی نقصان ہو جائے..... یہ چھوٹی، چھوٹی باتیں..... بھائی اور باپ نہیں سوچ سکتے..... یہ صرف ماں ہی خیال کر سکتی ہیں..... تو پلیز کسی کی خوشی میں آپ اتنی پامال بھی نہ ہوں..... کہ اسے فرائض سے بھی لاتعلق ہو جائیں..... گزشتہ دنوں آنے والے ایک فون نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے..... پلیز آپ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں پلیز..... اور آئیں اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے صرف ایک بار درود پڑھا لیں پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ آیت کریمہ یہ ہے۔

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصور واروں میں سے ہوں (نوٹ) یہ حضرت یونس کی مشہور دعا ہے کہ جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ سے کی تھی۔ یہ آیت کریمہ کہلاتی ہے۔ اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں اور اب آپ اپنی مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالیں کہ کیا کچھ ہو رہا ہے مگر اس سے قبل ایک اہم بات اور ہے کہ آپ کی تجاویز کو نظر رکھتے ہوئے آئندہ ماہ سے دین کے صفحات میں تھوڑی تبدیلی کی جارہی ہے..... معروف مصنفہ اختر شجاعت کی دینی تحریریں پڑھ کر یقیناً آپ کو بے حد خوش ہوگی۔ ہاں..... پڑھ کر اپنی آرا سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر اپنے نام سے شروع ہونے والے اسکول کی افتتاحی تقریب میں کراچی تشریف لائے اور اچھی تعلیم کے موضوع پر باتیں کیں..... اسکول کی انتظامیہ کی جانب سے خوب صورت شیلڈ ڈاکٹر عبدالقدیر نے تقریب میں موجود ممتاز شخصیات کو درس جس میں آپ کی باجی انجم انصار کو بھی شیلڈ ملی اس موقع پر انہوں نے اپریل کا سالگرہ نمبر اور اپنی ایک کتاب کھری کھری ان کو پیش کی۔ واضح رہے کہ اس کتاب کا حساب ڈاکٹر عبدالقدیر کے ہی نام ہے۔

☆ دو مئی کو آٹس کوئل، کراچی میں آپ سب کی ایک پسندیدہ مصنفہ کے اعزاز میں ایک تقریب ہو رہی ہے جو بہنیں اس میں

رکھتے ہوئے کتاب، جیولری، میک اپ کی اشیا پسند ہیں، ہمراہ دعائیں اور پھول۔ ویسے ہم نے ایک دوست کو ایک مرصعہ فون کارڈ بھی دیا تھا تنقید دینے لینے کے لیے صرف اور صرف سچی دعائیں پسند ہیں کیونکہ پُر خلوص اور سچی دعا کا کوئی مول نہیں اور ہمیں اپنے پیاروں کی جیب پر بار ڈالنا بھی پسند نہیں۔

قارئین ایک شعر کا مصرع اول ہے..... جو آنا چاہو ہزار رستے نہ آنا چاہو تو عذر لا کھوں اور یہ شکوہ اس وقت کتنا گراں گزرتا ہے ناں جب انسان اپنے پیاروں کی خوشی میں شریک ہونے کی ہر ممکن کوشش کرے اس کے باوجود اس کی بے بسی کو اس کی کوتاہی قرار دیا جائے رابطے کے تمام وسائل بالخصوص مواصلاتی ذرائع بھی چپ کی چادر اوڑھ لیں تب علامہ اقبال کا خیال درست ہی معلوم ہوتا ہے کہ..... ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت اس صورت حال سے سمجھوتا ہی بہتر ہے کہ اس سے تعلق میں دراڑ بھی نہیں پڑتی اور آپ جن کے منتظر ہوں انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ ان کی مبارک باد اور آمد کے بناؤ لگرفتہ بھی ہیں..... اور ان کی بے بسی محسوس بھی کر رہے ہیں۔ سالگرہ کے تحفے میں کتابوں کا لین دین ہمیں بہت پسند ہے، دل خوش کن امر ہے کہ آج کے نوجوانوں میں بھی یہ شوق پروان چڑھ رہا ہے حسب سابق ہماری اور ادارہ پاکیزہ کی جانب سے پاکیزہ کے قارئین کے لیے ان کی سالگرہ پر (جب بھی آئے) یہ دعا یہ سوغات۔

ہوتوں پہ آئی تیرے جنم دن پر یہ دعا سایہ فگن ہو سر پہ ترے سکھ کا آفتاب کوئی بھی غم نہ آئے تری زیست کے قریب روشن رہے یہ چہرہ تیرا مثل ماہتاب

☆☆☆

مجھ سے ملیے

مجھے ایشل شادیان کہتے ہیں..... میرا تعلق ضلع بدین کے تعلقہ گولارچی سے ہے۔ جو گیس اور تیل کے ذخائر بھی نعمت سے مالا مال ہے۔ پاکیزہ سے میرا تعلق بہت پرانا ہے۔ کتابوں سے دوستی ہے اور انہیں بہت سنبھال کے رکھتی ہوں اسی لیے پرانے پاکیزہ بھی نئی حالت میں ہیں جنہیں دیکھ کر کزنز حیران ہوتے ہیں۔ شاعری کرنا، ڈائجسٹ پڑھنا اور نئی ڈشز بنانا میری ہابیز ہیں، کوکنگ کا مجھے جنون کی حد تک شوق ہے، شاعری بھی کافی عرصے سے کر رہی ہوں جو صرف موبائل کے ذریعے فرینڈز تک محدود بھی پھر بہت کر کے پاکیزہ میں لکھنا شروع کیا آئی نے کافی حوصلہ افزائی کی اسی لیے ایک لکھاری کے طور پر آپ کے سامنے ہوں۔ مجھے پھول، تارے، چاند، ٹمگن، بارش، چھپچھاتے پرندے، غروب آفتاب، سبز، بتلیاں غرض ہر وہ شے جو ایک شاعر کو اچھی لگتی ہے میں بھی پسند ہے۔ خاص طور پر غروب آفتاب کا منظر آنکھوں کو بہت بھاتا ہے، ہر شام ایک نیا منظر ہوتا ہے، ڈریس میں شلواری قمیص اور فراک اچھی لگتی ہے، میرے فوٹو کلر میں وائٹ اور بلیک شامل ہیں۔ ساوگی پسند ہوں، کھانے میں میٹھا پسند ہے، ٹمگن میں فٹ، کڑا ہی اور اچار گوشت پسند ہے۔ میری خواہش طواف کعبہ ہے، سرویوں میں ڈھیر ساری آٹکس کریم اور یہ کہ پاکیزہ کے توسط سے میری کوئی فرینڈ بنے۔ میرے نزدیک دوستی کی بہت اہمیت ہے اور میں ہر ممکن حد تک بھاتی ہوں۔ میں نے کبھی سالگرہ نہیں منائی۔ پردہ کرتی ہوں، قرآن پڑھ کر سکون ملتا ہے، جھوٹ اور غرور سے سخت نفرت ہے جو چیز اچھی لگے اس کی فوراً تعریف کرتی ہوں خواہ وہ کسی کی بھی ہو..... اپنی تعریف سننا اچھا نہیں لگتا، چوڑیوں کے بجائے بریلیٹ پسند ہیں۔ میرا پیغام تمام بھائیوں کے نام۔ بہنیں آپ کی عزت ہیں تو آپ بھائی ہم بہنوں کا مان ہوتے ہیں اسے کبھی مت توڑیے گا۔ میری التجا ہے مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

ایشل شادیان شاو، تعلقہ گولارچی

اداریہ تو ادبی شے پارہ نظر آرہا ہے، ادب کے حوالے سے سنجیدہ گفتگو اچھی لگی۔ محترمہ عذرا رسول نے آپ کو بالکل صحیح خراج تحسین پیش کیا ہے مگر آپ کیپٹن نہیں بلکہ جنرل ہیں..... ہر تحریر بہترین رہی مگر بہنوں کی محفل میں چٹانیں ایسا کیا تھا کہ جب بھی میگزین کھولا اسی کو پڑھنے لگی تھی۔“ (فیروزہ بہن میں نہ کیپٹن ہوں، نہ جنرل..... بلکہ آپ کی خادم ہوں..... اور میری یہ ہمہ وقت خواہش اور کوشش رہتی ہے کہ ہر شمارہ پہلے سے بڑھ کر ہو..... اور اس کو پڑھ کر بہنوں کو آگاہی ہو..... اور ہم سب کو اللہ کی خوشنودی بھی حاصل ہو..... اور ہم سب بدعت سے بچیں..... اور مجبورِ برحق کے سوا کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں..... ہاں آپ کی بھیجی ہوئی دعائیں میں وقتاً فوقتاً روحانی مشوروں میں شامل کر لوں گی، اس کے لیے جزاک اللہ)

سے رخصانہ رضوی، لندن سے۔ ”مارچ کا پاکیزہ پڑھا، پورا سال واقعی بہت اچھا تھا مگر سب سے بہترین آپ کا ادارہ یہ تھا جسے میں نے یہاں لوگوں کو پڑھ، پڑھ کر سنایا۔۔۔۔۔ انجم آپ بہت ہی اچھا ادارہ لکھتی ہیں۔“ (اس محفل میں خوش آمدید اور پسندیدگی کا شکریہ)

بہر ڈاکٹر ممتاز ضیا، ضیا الدین اسپتال کراچی سے۔ ”تم نے بیمار پڑ کر سب کو ہلادیا تھا اللہ کا شکر ہے کہ اب تم صحت مند ہو۔۔۔۔۔ بے ادبی کے اس دور میں تم نے ادب کی اہمیت کو اجاگر کیا۔۔۔۔۔ تم نے بہت اچھا لکھا۔۔۔۔۔ امانت میں ستارہ کا کردار دلچسپی کا باعث تھا۔۔۔۔۔ مگر وہ بے چاری تو جان سے ہی گئی اور اب پھر لی بی جان ہی رہ گئی ہیں۔ یہ قسط گوارا تھی، ترکہ و فاقہ میں جزمین زبان کے الفاظ تحریر کی دلچسپی کم کر رہے ہیں، تاہم قاطعہ کی مولیٰ ناک اچھی تحریر ہے۔۔۔۔۔ شام شہریار اس کی یہ قسط پھینکی رہی۔۔۔۔۔ شہناز و نسیم کی کم سن ہیروئن کی محبت عجیب لگی۔ اب کہانیوں جیسی محبت بھی کہانیوں جیسی لگ رہی ہے۔ رضوانہ کے ہیرو تو بہت ہی دل پھینک ہیں اب چہرہ منظر عام پر آیا ہے، حالات بگاڑنے میں فاران نے تو حد ہی کر دی۔ فرحت احمد نے اچھا لکھا، نگہت سیما کی بولڈ ہیروئن نے اتنی آسانی سے جان کیوں دے دی اس کو اپنی ماں سے اپنا حق مانگنا چاہیے تھا۔ ہل صراط اچھی تحریر لگی۔۔۔۔۔ مگر اولڈ انداز حیران کن لگا، سیکینہ فرخ کی تحریر پر محفل ہونے پر تبصرہ کریں گے۔ بہنوں کی محفل میں محترمہ عبدالرسول کا پیغام پڑھا۔۔۔۔۔ کبھی کبھی تو یاد کرتی ہوا چھا لگا۔۔۔۔۔ اور ایسے پیغامات آتے رہتے چائیں کہ مجھے اچھے لگتے ہیں، یہ حقیقت سو فی صد ہے کہ پاکیزہ کی اس محفل میں محبت عطا نہیں ہے۔۔۔۔۔ اور اس میں انجم کا کردار بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے، سالگرہ نمبر کا سر پرانز۔۔۔۔۔ با اثر شخصیات و ادا بہت اچھا لگا۔۔۔۔۔ تعارف مختصر ہی سہی۔۔۔۔۔ مگر بہت بہت اچھے لگے۔۔۔۔۔ اتنے بڑے، بڑے ناموں میں مجھ ناچیز کو جگہ دینا۔۔۔۔۔ میرے لیے واقعی حیران کن اور مسرت آمیز بھی تھا۔۔۔۔۔ ویسے اپنی بیماری میں تمہیں یہ اچھوتا ایڈیٹر خوب آیا۔ شکر ہے کہ تم نے اس مرتبہ عظمیٰ کو اپنی احتیاطی تدابیر کی نذر نہیں کیا۔ عظمیٰ کا مزاحیہ قطعہ پسند آیا۔ پاکیزہ ڈاکڑی اچھی رہی جلتے رنگ کے تو رنگ ہی نرالے ہیں مزہ آگیا۔۔۔۔۔“ (بھر پور تبصرے کا شکریہ)

”ذکیہ الیوب، کراچی سے۔“ سالگرہ نمبر بہت شاعرانہ رہا۔۔۔۔۔ ہر تحریر بہترین تھی۔۔۔۔۔ تینوں ناول بڑی مستانی چال سے آگے بڑھ رہے ہیں، رضوانہ پرنس کے ناول کا اختتام ہونے کو ہے۔ امانت میں چونکا دینے والے انکشافات شروع ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ اس مرتبہ تمام افسانے بہت اچھے تھے۔۔۔۔۔ روشنائی عبدالقیوم کا مختصر سا افسانہ بہترین رہا۔ نگہت اعظمی نے بہت ہی اچھا لکھا کہ واقعی طحانی ہی نہیں ہو سکتی۔ شہناز دسم نے انڈیا، پاکستان کے تناظر پر لکھا اور خوب لکھا۔ اسلوب بیان بہت اچھا تھا۔۔۔۔۔ نوشین ناز اختر تو بہت ہی خوب صورت مھنتی ہیں۔ اللہ پر بھروسہ سب راستے کھول دیتا ہے، (بے شک) نایاب کا ترکہ وفا بھی برا نہیں ہے، نگہت سیما کا موضوع پراانا تھا مگر اسلوب نیا تھا۔۔۔۔۔ سیکرٹ فرخ کی کہانیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔۔۔۔۔ جلیترنگ کی معمولی بات بالکل بھی معمولی نہیں ہے۔ بیس ہزار کی سائیکل پر تو لیے کا سوکھنا۔۔۔۔۔ واقعی پڑھ کر مزہ آ گیا۔ اب ذکر خیر ہے ہماری اپنی محفل کا۔۔۔۔۔ عذرا رسول کا پیغام اے دن لگا۔۔۔۔۔ پھر پاکیزہ کی بااثر شخصیات کا تعارف پاکیزہ کی سالگرہ کا سب سے بڑا اور سب سے خوب صورت تحفہ تھا۔۔۔۔۔ آج پہلی مرتبہ بتا چلا کہ ہماری بہنوں کا تعلق کہاں، کہاں سے ہے، مجھے بتا داتی ریسرچ تم آخر کس وقت کرتی ہو۔۔۔۔۔ شکر ہے کہ اس مرتبہ تم نے عقلی کوشاں کر لیا ورنہ سال گزشتہ ہم سب کو بہت غصہ تھا کہ تم نے اسے کیوں نہیں شامل کیا تھا۔۔۔۔۔ عظیم اور آرزو سے گزارش ہے کہ مدینے والوں کو ہمارا سلام پہنچادیں اور اپنی دعاؤں میں ہم سب کو یاد رکھیں۔۔۔۔۔ امینہ عندلیب کو اللہ صحت اور زعمگی دے۔۔۔۔۔ آمین۔“ (تبرے کا شکریہ، آپ کو دوسو سے زیادہ بااثر شخصیات سے مل کر اچھا لگا۔۔۔۔۔ نوازش۔۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔۔۔ یہ چند صفحات لکھنے میں مجھے اتنا ہنم لگا تھا۔۔۔۔۔ کہ اگر میں چاہتی تو اتنے وقت میں ایک مکمل ناول لکھ سکتی تھی۔ جبکہ آمنہ حماد نے پورے سال کے شماروں کا ایک، ایک حساب کتاب مجھے بنا کر بھیجا تھا۔۔۔۔۔ اور اس لڑکی نے بھی یہ کام پورے دس دن میں کیا ہوگا۔ بہر حال یہ ایک

یہ شتر نہیں کہتی ہیں کہ پاکیزہ میں شامل تر اشے اور کوششز وغیرہ بھی قابل ذکر ہوتی ہیں۔ اب میں وہ آئے بزم میں کی بات کرنا چاہوں گی ان تمام قارئین کرام کا بے حد شکریہ جنہوں نے اس سلسلے کو سراہا اور اس کے متعلق گراں قدر آراء سے نوازا..... ہماری نظر میں ایک پوری فہرست ہے کہ جن سے آپ کا مکمل تعارف اور بھرپور ملاقات کروائی جائے گی، ساتھ ساتھ ہمیں انسانوں کی زیادہ سے زیادہ شمولیت کا بھی خیال رہتا ہے اسی باعث وہ آئے بزم میں ایک مہینے کا وقفہ آجاتا ہے پوری کوشش ہوتی ہے کہ مقررہ صفحات میں بھی آپ کے ادبی ذوق کی مکمل تسکین ہو سکے۔ آپ کا تعاون، محبت، پُر مغز تبصرے اور تنقید برائے اصلاح شامل حال ہو تو یہ سلسلہ مزید دلچسپ اور پُر روح ہوگا۔ میں تمام مصنفات، بہنوں، تبصرہ نگار اور دیگر خاموش قارئین کرام کا پاکیزہ سے از حد تعاون پر شکریہ ادا کرتی ہوں۔ (بیادری نزہت، محل ذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور صرف وہی تعریف کے لائق ہے مگر تنقید کے ساتھ تعریف بھی لکھنے والوں کے لیے آکسیجن کی حیثیت رکھتی ہے، وہ آئے بزم میں پاکیزہ کا مقبول ترین سلسلہ ہے جس کا سارا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے)

✉ صیالحہ کوثر، پنجاب۔ آپ سمیت وہ تمام بہنیں جو قرآن پاک کی کتابت کرنے کی خواہش مند ہیں اس ضمن میں، میری ڈاکٹر ذکیہ بلکرای سے تفصیلی بات ہوئی ہے۔ انہوں نے تمام بہنوں کے لیے یہ کہا ہے کہ پہلے وہ قرآن پاک خوب پڑھیں اتنا پڑھیں کہ اس میں پوری طرح انوالو ہو جائیں کہ آپ جب لکھنا شروع کریں تو اس کو درمیان میں نہ چھوڑیں کیونکہ بہت سی بہنوں نے لکھنا شروع کیا تھا..... اور ایک آدھ پارے کے بعد وہ مکمل نہیں لکھ سکی تھیں اور جب پورا ارادہ باندھ لیں تو وہ قرآن پاک لیں جس کے ہر صفحے پر پندرہ سطریں ہوں..... پندرہ سطروں والے قرآن پاک کی آیت مکمل ہو جاتی ہے اور پھر اس قرآن پاک کے حساب سے کاغذ پر سطریں لگوائیں (لائیں) کاغذ اچھی قسم کا لیں جہاں سے آپ کاغذ اور قرآن پاک لیں گی وہی لوگ لائیں بھی ڈال کر دے دیں گے، لکھنے کے لیے کالے رنگ کا پوائسٹر لے لیں جو پچاس یا ساٹھ روپے میں اچھا سا مل جاتا ہے۔ کاغذ ایک مرتبہ ہی پورے حساب کتاب سے لے لیں اور جب لکھنا شروع کریں تو ہمیشہ با وضو لکھیں..... اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ سعادت عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

ایک ایسے عندلیب، سلاوالی سے۔ ”ان دنوں میری طبیعت بہت خراب ہے پتا نہیں کیا ہو رہا ہے، طبیعت کچھ سنبھلتی ہے اور پھر خراب ہو جاتی ہے آپ سب ہمیں اپنی دعاؤں میں مجھے ہمیشہ یاد رکھنا..... مجھے پاکیزہ، انجم باقی اور اس میں سب لکھنے والوں اور پڑھنے والوں تک سے محبت ہے۔ اس مرتبہ تو سا لنگرہ کا شمارہ لیتے، لیتے پڑھا ہے اور منہ سے بے اختیار واہ نکلا ہے، سب نے ہی بہت محنت کی ہے اور میری باقی نے تو بہت ہی کی ہے اور اللہ محنت کا صلہ جلد ہی دیا کرتا ہے۔“ (اللہ میری گڑیا کو صحت و زندگی عطا فرمائے، تم اپنی جانب سے ہرگز مایوس نہیں ہوتا، انشاء اللہ جلد ٹھیک ہو جاؤ گی)

✉ مکملی تاج، کراچی۔ اس محفل میں خوش آمدید بفضل اللہ تعالیٰ میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ کے سمیت مجھے پیٹ کے ٹیکشن کے 101 ایک نئے موصول ہو چکے ہیں جو میں خصوصی سپلیمنٹ کے طور پر نکالوں گی مگر ایک بات جو ہر دوسری بہن نے مجھے بتائی ہے کہ پیٹ سے متعلق کوئی بھی بیماری ہو اس میں پانی زیادہ پینا چاہیے اور اسپنول کی بھوسی کا استعمال کرنا چاہیے۔ اور میری انب سے اتنا اضافہ اور کر لیں کہ ہمیشہ پانی پر چلے جائے ایک بار علی۔ بسم اللہ سمیت پوری سورہ فاتحہ پڑھ لیا کریں۔

سعد یہ ہمارے سرگودھا ہے۔ ”ساگرہ نمبر زبردست تھا، پاکیزہ کی ہر طرف دھوم مچی ہوئی ہے، گزشتہ دنوں ڈگری کالج
انوالی میں، میں چیف گیسٹ بن کر گئی تھی۔ وہاں میری بہت سی بہنوں سے ملاقات ہوئی۔ بااثر شخصیات سے مل کر بہت سی
جان کا۔ مگر ساگرہ کے حوالے سے کوئی تقریب ضرور ہونی چاہیے۔ عذرا باجی کا خصوصی پیغام محبت سے بھرا ہوا تھا۔ ان کی
سچ کتنی بیماری اور مثبت ہے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ پاکیزہ میری پہچان ہے اس لیے مجھے پاکیزہ سے بہت محبت ہے۔“ (سعد یہ
اس بھی آپ سے بہت محبت ہے)

کچھ فرزانہ قادر، میانوالی سے۔ "انجم باہمی میں پاکیزہ کی خاموش قاری ہوں مگر سالگرہ نمبر بڑھ کر..... چپ نہیں رہ سکی۔
پنے کتنی محبت اور عزت کے ساتھ اپنی رائے زور بہنوں کا تذکرہ کیا ہے اور عبدالرسول باہمی نے کتنی اچھی باتیں کی ہیں..... آپ
ن کریں، بہنوں کی محفل میں نے بار بار پڑھی ہے، تینوں ناول اچھے جا رہے ہیں اور جلت رنگ تو ہمیشہ ہی ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ
آتا ہے، ہمیں عظمی آفاق کے افسانے اور سفر نامے پڑھنے ہیں، ان سے لکھوائیں ناں آپ۔" (جی ضرور)
کچھ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ "سالگرہ نمبر بہترین تھا، اس سال تو آپ نے سال گزشتہ سے بھی اچھا میگزین نکالا ہے،

سکھانے کے کام آتی تھی..... بعض سائیکس تو صافیاں سکھانے کے کام آتی ہیں..... یقین کریں میں نے بعض جگہ خود دیکھا ہے اس بار بہنوں کی محفل بھی بہت زیروست تھی، ہر بہن کو آپ نے اس قدر عزت دی ہے کہ جس کی حد نہیں..... اس بار کا سالگرہ نمبر پڑھ کر ہر بہن اترائے گی اور ہر کسی کی عزت خود اپنی ہی نظروں میں دوچند ہوگی..... امانت بس سو سو گئی..... زیادہ مزہ نہیں آیا..... معلوم نہیں کیوں..... حالانکہ رفعت سراج بلند پائے کی رائٹر ہیں۔“ (تبرے کا شکریہ)

بھ شائستہ زریں، کراچی سے۔ ”سالگرہ کا بھرپور تاثر دیتا سرورق خوب تھا، غباروں اور موم بتیوں کی کمی یوں بھی محسوس نہیں ہوئی کہ سرورق پر موجود پنچ پیڑی ہوگئی اور صنف نازک اپنی سالگرہ پر موم بتیوں سے افشائے راز کے ڈر سے جلد ہی ترک و فاکر جانی ہیں۔ ادارہ جو کسی بھی رسالے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، بلاشبہ نہ صرف پُر مغز بلکہ ادبی شہ پارہ تھا ادب کی تخلیق کا بنیادی مقصد اور تخلیقی ادب کا اصل جوہر کیا ہے یہ مدیر نے مختصر مگر جامع انداز سے واضح کر دیا..... اس کے ساتھ ساتھ ادب کی آبیاری میں پاکیزہ ڈائجسٹ کے کردار کی بھی وضاحت کر دی..... اگر پاکیزہ کی مصنفات کو سراہا تو قارئین پاکیزہ اور تبرہ نگار بہنوں کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا، بہت خوب..... ادارہ لکھنا ایک فن ہے اور بلاشبہ انجم باجی اس ہنر میں طاق ہیں۔ دین کی باتیں سبحان اللہ..... امانت، رفعت سراج کی ذہانت سے بھرپور تحریر جس کی ہر قسط کا اختتامی جملہ بے چینی سے اگلی قسط کا انتظار شروع کر دیتا ہے۔ نایاب جیلانی نے ہمیشہ کی طرح سے میدان مار لیا حقیقی اور تخلیقی کو ساتھ لے کر چلنا ان کی امتیازی صفت ہے۔ نرہت اصغر کہاں ہیں آپ.....؟ جلدی سے اپنے مخصوص انداز میں نایاب جیلانی کا انٹرویو تو کریں..... موٹی ناک، ناہید فاطمہ کی مختصر مگر سبق آموز تحریر تھی۔ روشنائی عبدالقیوم کا آگہی کا لمحہ عمدہ تحریر..... واقعی اللہ کے حضور توبہ اور اللہ کی طرف سے معافی ہی ہے جو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ثابت ہوتی ہے، بہت آرزو تھی گلی کی تیری کی مصنفہ کی شخصیت کی طرح ان کی تحریر بھی بہت پیاری تھی۔ لوشین ناز اختر نے ہمیشہ کی طرح لڑکیوں کو اثر انگیز پیغام دیا۔ بے شک اپنی آن کو عزت بڑھانے اور اپنے لیے اللہ کو کافی سمجھنے ہی میں عافیت ہے۔ رضوانہ پرنس ہر ماہ اپنے ناول کو ایک نئے موڑ پر چھوڑ کر قارئین کے تجسس کو خوب بڑھاتی ہیں، نگہت سیما کا ناول کمال کا تھا۔ نگہت اعظمی نے مل صراط کے ذریعے نہایت عمدہ پیغام دیا ہے لڑکیوں کی حریص ماؤں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ رشتوں اور تعلق کی بنیاد پر رکھنی چاہیے کسی بھی غلط کام میں صرف ایک مرتبہ اور کی خواہش کا انجام بہت بھانک ہوتا ہے، سیکرٹ فرخ کی اس صدی کی محبت کی داستان ابھی جاری ہے آغاز تو بہت عمدہ ہے، آگے، آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا..... سروے کے بارے میں کیا کہوں یہی کہ قارئین کی آرا کی منتظر ہوں جس کی روشنی میں اسے خوب سے خوب تر بنایا جاسکتا ہے، اب ذکر ہے اس بزم کا جہاں جہم مدد خاں ہوتا ہے اور گل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی۔ یعنی بہنوں کی محفل کا جہاں ہر سالگرہ نمبر میں کوئی نہ کوئی ندرت ہوتی ہے جیسے اس مرتبہ پاکیزہ ڈائجسٹ بلکہ ڈائجسٹوں کی دنیا کی بااثر شخصیات کو پاکیزہ کی سالگرہ کی سوغات مدیرہ انجم انصاری نے دی اور خوب دی..... یقیناً یہ انجم باجی کے لیے بڑے کٹھن لمحات ہوتے ہیں کہ کسے یاد رکھیں، کسے بھول جائیں.....؟ اور انجم باجی کبھی نہیں بھولتیں ان مصنفات کو جو آج ہمارے درمیان نہیں جزاک اللہ..... پاکیزہ ڈائری عظمیٰ محبت سے سجائی ہیں، عظمیٰ اپنے قلم کو رواں کر دو بہت ہوگئی اب..... جلت رنگ جس کے لیے میری روز اول سے ایک ہی رائے ہے۔ معمولی بات میں کیسے سادہ انداز میں انڈین ڈراموں کی پیشتر خواتین کے کردار کی نشاندہی کی ہے ان کے ڈراموں میں ہمیشہ کرمیل سی خواتین دکھائی جاتی ہیں۔ اسی خاکے میں انڈین خواتین آرٹسٹوں کے بلاؤز کے انداز کو ڈیکوریشن کی کرسیوں کے خلاف سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتی ہیں۔ مجھے تو اب وہاں کی خواتین کی سیال لگتی ہیں۔ کبھی کبھی کا یہ فقرہ بھی خوب ہے کہ وہ اتنی مکارانہ شناخت کی حامل ہیں کہ کسی کی بھی شاپنگ دیکھ کر بتا دیتی ہیں کہ وہ کہاں سے کیسے اور کیوں خریدے گئے؟ اس فقرے میں مکارانہ شناخت کی حامل کی اصلاح کا جواب نہیں..... مہر کے حوالے سے کیا خوب لکھا ہے کہ مہر کا وعدہ پانچ لاکھ سے ہوتا ہوا..... پچاس ہزار تک آگیا اور پھر صرف پانچ ہزار لکھوایا جیسے کہ آپ کے شیئرز، ڈوب کر کاغذ کے شیئر بن گئے ہیں۔ صغریٰ زیدی کے بعض منتخب اشعار قاری نہیں بھی گنگنا رہی ہوتی ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ اس سلسلے میں تھوڑی سی تبدیلی لے آئیں۔“ (افصی تبصرے کا شکریہ، آپ کی تجاویز نوٹ کر لی گئی ہیں)

بھ عطیہ زاہرہ، لاہور سے۔ ”سرورق بہت خوب صورت ہے، جس میں بہار کے رنگ بھی واضح نظر آ رہے ہیں اور بدلتی رُت ماڈل کے چہرے پر بھی نمایاں ہے اور اگر اب بات کہانیوں کی کروں تو سیکرٹ فرخ کا مکمل ناول بہت ہی زیروست ہے سلسلے وار ناول

نیم ورک ہوتا ہے..... اور بفضل اللہ تعالیٰ ہم سب لوگوں میں اتنی لچک ہے کہ ہم بہ آسانی ایک ساتھ یہ کام کر لیتے ہیں جو بظاہر خاصے مشکل بھی نظر آیا کرتے ہیں، اس لیے یہ صرف اور صرف اللہ کا کرم ہے)

بھ اختر شجاعت، کراچی سے۔ ”سب سے پہلے آپ کو عذر دار رسول صاحبہ کو اور پاکیزہ کی تمام ٹیم کو پاکیزہ کی سالگرہ کی بہت مبارک باد..... اللہ تعالیٰ اسے بے حد ترقی عطا فرمائے..... آمین۔ بہنوں کی محفل میں محترمہ عذر دار رسول کا پیغام بہنوں کے لیے بہت بھرپور مسج تھا۔ ان کی اس بات کی میں سو فیصد تائید کرتی ہوں کہ انجم نے پاکیزہ کی مصنفات کو قارئین بہنوں کو ایسی ڈور سے بانڈھا ہے جس کا تعلق ہر روز مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ ماشاء اللہ..... واقعی انجم آپ محبتوں کا سمندر ہیں۔ آپ نے اس بار بہنوں کی محفل بے حد خوب صورت سجائی..... اور اپنی مصنفات کے لیے جتنے خوب صورت الفاظ کے ساتھ لکھا ہے..... بس جی کیا بات ہے آپ کی۔ بہر حال آپ نے مجھے جن الفاظ میں یاد کیا جزاک اللہ..... اللہ تعالیٰ مجھے اتنے اچھے گمان رکھنے پر ایسا بنا دے..... آمین۔ بہر حال آپ کی محبت آپ کا خلوص کسی شکریہ کا امی نہیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد افسر سلطانہ نے یاد کیا..... بے حد شکریہ افسر..... خوش رہو..... ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی صاحبہ کا انٹرویو بے حد اچھا تھا..... ان کے لیے دل سے ڈھیروں دعاں اللہ تعالیٰ انہیں صحت کا ملہ عطا فرمائے۔ آمین شائستہ زریں کا سروے اچھا رہا..... پاکیزہ ڈائری ہمیشہ ہی بے حد اچھی ہوتی ہے، کافی اچھی چیزیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ محترمہ شیریں حیدر اور محترمہ غزالہ نگار کے والد کے انتقال پر بہت افسوس ہے، کبھی کبھی الفاظ کہیں کم ہو جاتے ہیں۔ بس کیا کہوں..... اس دکھ کو میں خود سمجھ سکتی ہوں کہ اس دکھ سے میں گزر چکی ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو بھرپور جمل عطا فرمائے..... اور مرحومین کی مغفرت فرمائے، آمین اور انجم آپ کے لیے اللہ سے دعا ہے وہ آپ کو محبت کا ملہ عطا فرمائے اور آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔“ (جزاک اللہ)

بھ عصمت بخاری، لاہور سے۔ ”سب سے پہلے ادارہ پڑھا بہت اچھا لکھا..... عزیزہ سید کا ناول تو سانس روک کر پڑھا ہے۔ بہت اچھا لکھ رہی ہیں، رفعت سراج کا امانت بھی بہت پسند آ رہا ہے۔ پاکیزہ کی بااثر شخصیات کے بارے میں پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ اب میں فاطمہ خان سے ایک بات کہنا چاہوں گی کہ میں مسلمان ہوں ان کا افسانہ بہت اچھا تھا..... مگر کچن اپنی فرسٹ کزن سے شادی نہیں کیا کرتے ہیں کہ وہ انہیں اپنی بہن اور بھائی سمجھا کرتے ہیں..... باقی آپ کا رسالہ بہترین ہے، بہنوں کی محفل پڑھ کر ہمیشہ خوشی سی ہوتی ہے۔ بااثر شخصیات میں میری ایک ہم نام نظر آئیں مگر وہ اوکاڑہ سے ہیں اور میں ہوں لاہور کی.....“ (انشاء اللہ اب آپ بھی ہمارے اس کارواں میں شامل تو ہوں گی، ہیں ناں..... تو بااثر شخصیت بننے میں دیر کیا لگے گی)

بھ شیریں سلیم، لاہور سے۔ ”سالگرہ نمبر..... واقعی خصوصی نمبر لگ رہا ہے، سرورق اچھا نہیں لگا..... مگر تحریریں بہترین رہیں..... اور ہمیشہ کی طرح ٹاپ کرنے والی تحریر بہنوں کی محفل رہی..... عذر دار رسول کی تصویر دیکھ کر جیسا میں نے اندازہ لگایا ہے کہ بے حد جیسے انداز میں بولتی ہوں گی..... ان کا پیغام بھی دیکھ کر بے حد متاثر انداز میں تھا جس کے ہر لفظ نے دل پر اثر کیا..... عذر رانی آپ واقعی محبت کرنے والی اور ٹینٹس کو عزت دینے والی ہیں..... بیٹوں ناول شاندار ہیں، مجھے تو سب پڑھ کر ہی مزہ آ رہا ہے، جلت رنگ نے تو میلا لوٹ لیا..... واہ جی..... کسی چیز کے طفیل تو ہم مسکرائیں..... اللہ آپ کو خوش رکھے، افسانے آہستہ آہستہ پڑھ رہی ہوں..... اور ذکیہ بلگرامی کو میرا سلام پہنچا دیں کہ بہترین انٹرویو تھا..... مگر مختصر لگا..... ہم آپ کی مزید باتیں سننا چاہتے ہیں، ایک بہن کی تجویز سے میں اتفاق کرتی ہوں کہ ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا کو دوبارہ شائع کیا جائے۔“ (آپ کی رائے پہنچانی جا رہی ہے)

بھ لالہ رخ، کراچی سے۔ ”میں پاکیزہ کی بیس سال سے خاموش قاری ہوں اور آج اتنا شاعر سالگرہ نمبر پڑھ کر..... اپنی خاموشی توڑ بیٹھی ہوں..... بہت اچھا لگا سطر، سطر پڑھ کر انجم آپ بہت اچھا لکھتی ہیں اور عظمیٰ آفاق کا انداز بھی بے ساختگی لیے ہوئے ہے۔ ناولوں میں مجھے امانت سب سے زیادہ پسند آیا ہے، جلت رنگ تو ہر گھر کی کہانی ہے، ذکیہ بلگرامی کا انٹرویو سب سے زیادہ پسند آیا۔ دیکر تحریریں بھی بہت اچھی لگیں مگر بااثر شخصیات کے بارے میں تو بار بار پڑھ رہی ہوں اور ہر دفعہ نیا مزہ آ رہا ہے۔“ (اس محفل میں خوش آمدید..... پسندیدگی کا شکریہ..... اب اس محفل میں آپ کا انتظار کیا کروں گی)

بھ نسیم فضل خالق، پشاور سے۔ ”نی الحال بہنوں کی محفل، جلت رنگ اور امانت پڑھی ہے، تفصیلی تبصرہ تو ممکن نہیں..... جلت رنگ میں معمولی بات، زیروست تھا..... واقعی ہم بہت سی قیمتی چیزوں کا استعمال غلط کرتے ہیں، دینا باجی کی سائیکل تو پھر بھی تو لیا

بہنوں کی محفل

میں کراچی رابطہ نمبر پر بات کر کے آپ بتا سکتی ہیں ناں کہ ہم بھی شریک بزم ہو جائیں ہاں افسانوں میں عارفہ مسعود سب پر سبقت لے گئیں بے شک عورت کو ہر مقام پر دوسرے کے لیے ہی سوچنا اور جینا ہوتا ہے، خوب لکھا دیکھا ناں ڈے کے حوالے سے سحر کی تحریر کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ ہالا احمد کا حسب نسب بھی بس گوار تھا کہانی اگر شروع میں مکمل جائے تو اپنا تاثر کھودتی ہے۔ مکافات عمل کا بھی یہی حال ہوا نام سے انجام کی خبر ہو گئی..... عروس نے عورت کی اپنا پراچھا لکھا..... بندھنی میں شوہر اپنی پرانی چاہت کا دیوانہ رہا..... مگر انجام بہت سبق آموز رہا..... لوہے کی نیکی ذرا ہٹ کر لکھا گیا..... اور خوب لکھا..... میں مسلمان ہوں ایک عام ی کامی کہانی تھی مگر طرزِ تحریر نے اس کو خاص بنا دیا۔“ (تبرے کا شکریہ)

کچھ صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ سے۔ ”ذکیہ بگڑی کا انٹرویو دیکھ کر خوشی ہوئی اللہ کرے ہوز و قلم اور زیادہ اچھا لکھتی رہیں۔ نئی رائٹرز بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ وردانہ نوشین کا چشمِ عم آشنائی تحریر بھی ایک سیلف میڈ انسان کی کہانی بس اینڈ بھی کچھ خوشگوار کرتے تو اچھا تھا۔ فاطمہ خان کا میں مسلمان ہوں بہت اچھا لگا، آج نوجو جرنیشن کی دوستی عیسائی مذہب رکھنے والوں سے بہت ہے اور عیسائی ہر طرح سے عیسائیت کا پرچار کر رہے ہیں اور ہمارے مسلمان ان کے لیے مرتد ہونے کو بھی تیار ہیں، بجائے اس کے کہ ان کو ہم اسلام کا بیج دیں، ہم نے اسلام کو اپنی جڑوں میں بٹھایا ہی نہیں اگر ہم بچوں میں اسلام کی بنیادیں مضبوط کرتے تو شاید ریشٹن بھی اچھا ملتا۔ بہر حال اس کا اینڈ پڑھ کر دل دھکی ہوا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ عقیدہ حق نے بھی اپنے موضوع پر لکھا شادی شدہ زندگی واقعی مسلسل امتحان ہے، ہر روز نیا پرچہ اور استاد بھی نئے روز زندگی ایک نیا سبق دیتی ہے، بس ہمیں اپنے آپ کو مضبوط رکھنا ہوتا ہے، ثابت قدم اور ہر نئے چیلنج کے لیے تیار..... رضوانہ پرنس کا اک نئے موڑ پر اچھا جا رہا ہے فاران کا رویہ قسم نہیں ہو رہا آخر یہی کہیں کے مرد ہوتے ہی تو تا چشم ہیں، کیا کہا جائے۔“ (خواتین بھی تو ہوتی ہیں اس بارے میں کیا خیال ہے)

کچھ اتم شامہ سندھ سے۔ ”انجم آیا آپ سے جب، جب بات کی سر تا پا اک ماں سے بات کرنے کا احساس ہوا۔ آپ اپنے لیے اور محبت سے انسان کو اپنے ساتھ جوڑ سکتی ہیں تقریباً ہر رسالے کی ایڈیٹر سے میری بات چیت ہے مگر آپ سے بات ہوتی..... صرف اک چیز حادی راتی ہے اور وہ ہے آپ کی حد درجہ شفقت..... میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو جلد از جلد شفا کے کاملہ عطا کرے اور آپ کا سایہ اپنے بچوں اور ہم سب پر تادیر قائم و دائم رکھے۔ (آمین) چند باتیں اور سلسلے ایسے ہیں جو پاکیزہ کو سب رسائل سے ایک الگ مقام دیتے ہیں جن کی وجہ سے وہ واقعی پاکیزہ لگنے لگتا ہے۔ ایک تو ادارہ اس قدر جامع اور خوب صورت ہوتا ہے کہ کیا کہنے پھر دین کی باتیں اور سب سے بڑی بات بہنوں کی محفل جس طرح خدا اور رسول پاک کے ذکر سے شروع ہوتی ہے اور پھر ہر چھوٹی بڑی رائٹر، ریڈر سب کے خوشی، غم میں شریک ہوا جاتا ہے یہ باتیں دل کو چھو جاتی ہیں۔ آپ ا دو سال پہلے میرے اکلوتے جوان بھائی آفتاب لودھی کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا تب سے رسالے پڑھنے چھوڑ دیے ہیں مارچ کا رسالہ اپنے افسانے کی وجہ سے منگوایا تھا تو پو پوئی آگے پیچھے سے دیکھا اور چند ایک افسانے بھی پڑھ لیے بس اب جو فارغ وقت ملتا ہے تو اس میں تلاوت قرآن پاک کرتی ہوں اور نوافل پڑھ کر بھائی کو ایصالِ ثواب کرتی ہوں..... آپ سے اور پاکیزہ سے اور پاکیزہ سے بڑے ہر انسان سے میری دلی درخواست ہے کہ ان کے ایصالِ ثواب کے لیے دعا کر دے اور یہ کہ ان اللہ تعالیٰ ان کے دونوں بیٹوں ایان لودھی اور ارسلان لودھی کو نیک زندگی، صحت اور خوشیاں دے اور انہیں اپنے باپ، دادا کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ (آمین) سب سے پہلے ایک اہم شے کی طرف توجہ دلا نا چاہوں گی پاکیزہ میں اک سلسلہ ہے شوابے ہومیو پیتھک، یہ ٹھیک ہے کہ یہ ایک طرح کا کارنر ہے کافی لوگ گھر بیٹھے اپنے مسائل بتاتے ہیں اور انہیں دوا کا پتا چل جاتا ہے وہ استعمال کرتے ہوں گے تو انہیں شفا بھی ملتی ہوگی مگر یہ رسائل چندہ سے تیس سال تک کی لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں اور پھر حال بتانے کے لیے اس قدر تفصیل بتانا بلا ضرورت ہے کم سے کم طریقے سے بھی بتایا جاسکتا ہے کیونکہ یہ تو آپ کسی سے بھی معلوم کروالیں تو اتنی تفصیلات کسی کے بھی ذوق پر گراں گزرتی ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ جلد از جلد اس مسئلے کی طرف توجہ دی جائے گی۔ افسانوں میں آم طیفور کے گھر نے رُلا دیا بہت خوب لکھا واقعی یہ ایک اچھا افسانہ تھا۔ شیریں حیدر نے والد صاحب کی وفات پر جو مضمون لکھا تھا وہ پڑھ کر بہت دیر تک روتی رہی بھائی جان یاد آتے رہے پھر ان کے والد کے لیے دعائے مغفرت کی باپ بھائی کے دم سے میکا قائم ہوتا ہے یہ ہر لڑکی کا مان ہوتے ہیں اللہ پاک سب کا یہ مان قائم رکھے۔ اک اور چیز جو اس ماہ کے پاکیزہ کی پائیزگی میں چار چاند لگا رہی تھی جو حج معنوں میں ماہ مارچ کے پاکیزہ کی جان تھا وہ تھا ڈاکٹر

بھی اچھے جار ہے ہیں، افسانے اس بار سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، بہنوں کی محفل مجھے ہمیشہ سے ہی بہت پسند ہے۔ سب کے بارے میں پتا چلتا رہتا ہے۔ اس دفعہ پاکیزہ کی بااثر شخصیات کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا، آپ نے جس طرح ان سب کے بارے میں لکھا ہے یہ بہت عزت کی بات ہے۔ نئے لکھنے والوں کے نام بھی شامل ہیں، مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پراچھا ہے اور آپ لوگوں کی محنت کو ظاہر کر رہا ہے۔“ (شکریہ)

کچھ شاہروند علی، پنجاب سے۔ ”بہت پرانی قاری یہ ہوں یہ مجھے آپ کی وجہ سے پسند ہے کیونکہ میں آپ کی فین ہوں۔ اس میں تمام لکھاری، بینش موتیوں کی لڑی کی طرح ہیں ایک سے بڑھ کر ایک..... نہ جانے آپ نے یہ موتی کہاں سے اکٹھے کیے ہیں، آج میں کچھ مسائل لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ بالوں میں جو بھی ڈائی لگاتی ہوں مجھے الرجی کر دیتا ہے حالانکہ میں لگانے سے پہلے الرجی کی گولیاں بھی کھاتی ہوں، سرخ مہندی لگاتی ہوں جو مجھے سخت نا پسند ہے اگر کسی بہن کو کوئی بالوں کو کالا کرنے کا طریقہ آتا ہو پلیز بتائیں۔ تاہم شکر گزار ہوں گی۔ (پتھر بھی لگایا بلکہ کافی ڈائی لگائے ہیں) اگر کسی بچی کو ماہواری کم آتی ہو تو کوئی دسی نوٹکا ہوتا ہے، باجی انجم اس رسالے میں اگر ہر ماہ کسی نہ کسی رائٹر جو پاکیزہ کی ہوں کا انٹرویو بھی شائع کریں تو اچھا لگے گا۔ اس ماہ مارچ میں سب افسانے اچھے تھے مگر مجھے بندھنی بہت پسند آیا ہے اس کے لیے عقیدہ حق مبارک باد کی مستحق ہیں۔ باجی انجم صاحبہ بھی آپ بھی اپنا انٹرویو دیں، انتظار رہے گا۔“ (آپ کے مسائل ہماری قاری بہن حل کریں گی۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ)

کچھ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ”اپریل کا سالگرہ نمبر بڑی ہی شان و شوکت کے ساتھ جلوہ افروز ہوا..... پاکیزہ کو 42 سالگرہ بہت بہت مبارک ہو، خدا کرے ہمارا پاکیزہ روز بروز ترقی کے جس اونچے پیمانہ پر ہے اس پر ہمیشہ قائم رہے۔ آمین۔ بہنوں کی محفل میں اس دفعہ اتنے رنگ تھے کہ ہم رنگوں میں نہا سے گئے۔ ساری مشہور رائٹرز سے ملاقات دل کو دک نئی ترنگ دے گئی۔ باجی آپ کا ایک عظیم وصف یہ ہے کہ آپ سب کو ساتھ لے کر چلتی ہیں کبھی کسی کو بھولتی نہیں ہیں جو رائٹرز آج ہم میں نہیں آپ انہیں بھی نہیں بھولیں۔ قسط وار ناول بڑی آن بان اور شان سے آگے بڑھ رہے ہیں، اس کے علاوہ کہانیوں میں آگہی کا لمحہ، کہانیوں جیسی محبت اور بل صراط بہت ہی خوب صورت موتیوں کا گلدستہ تھیں۔ شائستہ زریں کا سروے بہت ہی اچھا اور سالگرہ کی مناسبت سے تھا۔“ (شکریہ)

کچھ طاہرہ کنول، اورنگی ٹاؤن سے۔ ”اپنا.....! میں آپ کے ماہنامہ پاکیزہ کی عرصہ دراز سے قاری ہوں بلکہ یوں کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے اور کتابوں کے مطالعے کا احساس ہوا تب سے ہی پاکیزہ سے تعارف رہا ہے اور اس کے ذریعے ہی اتنے بڑے اور عظیم لوگوں سے شرفِ تعارف حاصل ہوا، عرصے سے میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ آپ کو خط لکھوں اور بہنوں کی محفل میں شامل ہوں اور آپ میرے بھی خط کا جواب دیں لیکن میں کبھی قلم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکی لیکن اپنا آج میں نے آپ کو خط لکھ دیا ہے اس امید پر کہ آپ اسے ردی کی ٹوکری کی غذا نہیں بنائیں گی۔ اپنا یہ میرا کسی بھی ماہنامے بلکہ کسی بھی ادارے یا شخص کو پہلا خط ہے جسے لکھنے میں میرے احساسات کے ساتھ ساتھ ایک مجبوری بھی شامل ہے۔“ (اس محفل میں خوش آمدید دیگر باتوں کے لیے آپ مجھے فون کر لیں۔ میرا نمبر ہے 021.36981952)

کچھ اسماء صدیقہ، کراچی سے۔ ”آپ کا مجھے کچھ کہنا ہے۔ بہنوں کی محفل اور پھر دعا میں بڑی اپنائیت ہے سارے سلسلے اور افسانے دل کو چھو لیتے ہیں، ہاں ذرا سا انداز کہیں کسی کہانی میں مصنوعی قسم کے ماحول میں ڈوبا نظر آتا ہے متاثر کرنے کے لیے انگلیں (بے وجہ) پڑھتے ہوئے عجیب سی لگتی ہے۔“ (ہاں یہ تو ہے)

کچھ محکمہ ضیاء بخش، کراچی سے۔ ”مجھے معلوم ہے مئی کا شمارہ سالگرہ نمبر دو ہے، اس لیے میری جانب سے اور بہبود و تحفہ کی سہولت سے وابستہ میڈم شاہینہ اور میڈم تنویر کی جانب سے بھی پاکیزہ کی سالگرہ کی مبارکباد قبول کریں۔ پاکیزہ ہر جگہ اور ہر اسکول میں پڑھا جاتا ہے کیا میں پچھڑے متعلقہ نوز بھی پاکیزہ میں لکھوا سکتی ہوں؟“ (جی ہاں، پاکیزہ سب کے لیے ہے۔ ہر بہن کی نند لگ سکتی ہے ہمارے لیے ہمارے قارئین بے حد اہم ہیں)

کچھ نسیم منیر علوی، دہلی سے۔ ”مارچ کا شمارہ اپنی گونا گوں دلچسپیوں کے ساتھ سامنے ہے، ذکیہ بگڑی سے پُر کیف ملاقات بڑی پُراثر رہی..... شائستہ زریں نے میری کامیابی میں تیرا بھی حصہ اچھا ترتیب دیا، حصہ لینے والی شخصیات نے بھی متاثر کیا۔ واقعی ماں دنیا کے کسی حصے میں بھی ہو عظیم ہے اگر اسی طرح کے پروگرام آئندہ بھی ہوتے رہیں تو دلچسپ رہے گا اور اس سلسلے

بہنوں کی محفل

اولاد بکڑے پروا نہیں ہوتی آنکھ اس وقت کھلتی ہے جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ حسب نسب میں ہالا احمد کو ایسا لبا کہاں سے لیا۔۔۔ جس کے ساتھ واوا ای چنکی ہوئی۔۔۔“ (بہت اچھی ہوئی)

کے رضوانہ آفتاب، کراچی سے۔ ”پاکیزہ میں دو بہنوں نے آپ سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے متعلق استفسار کیا تھا..... مجھے اس یونیورسٹی کے متعلق کچھ معلومات ہے جو میں تحریر کر رہی ہوں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے ملک کے مختلف حصوں میں 32 علاقائی دفاتر قائم کر رکھے ہیں تاکہ جامعہ کے غیر مرکزی نظام تعلیم کو آپس میں مربوط کر دیا جائے۔ ان کے تمام تر مسائل کے لیے جڑوقتی اساتذہ کا تقرر کیا جاتا ہے، ان کے پاس اپنا نام نیل ہوتا ہے، طالب علم جب اپنا اسائنمنٹ مکمل کر لیتے ہیں تو وہ اپنے ٹیوٹر کو روانہ کر دیتے ہیں، ٹیوٹر ان کا مشاہدہ کرنے کے بعد اسائنمنٹ لوٹا دیتے ہیں۔ یونیورسٹی سیمینار کے انعقاد کا انتظام کرتی ہے اور اپنے علاقوں میں امتحانات کا بندوبست کرتے ہیں تاکہ پاکستان کے کونے، کونے میں موجود طالب علموں سے رابطے میں رہیں، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میٹرک، انٹر میڈیٹ، بی اے، آرٹس، سائنس، بی ایڈ، ایم ایڈ پوسٹ گریجویٹ، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے پروگرام پیش کرتی ہے اس کے علاوہ سرٹیفکیٹ ڈپلوما اور ڈگری پر محیط پروگرام پیش کرتی ہے شارت کورسز پر مشتمل پروگرام، کمپیوٹر، literacy اور بھود آبادی کے پروگرام خاص طور پر شامل ہیں۔ جو لوگ خواہش مند ہیں وہ درج ذیل نمبر اور ایڈریس پر رابطہ کر سکتے ہیں۔

syed tariq hussain uni,s deputy regional director karachi; phone 02199246098.101 email address aiou.edu.pk

بھ سروردی ارشد، گوجرانوالہ سے۔ ”میں آپ کے رسالے کی چھٹی جماعت سے قاری ہوں، اب تو عرصہ ہو گیا پڑھتے ہوئے، مجھے اس میں چھپنے والی تمام چیزیں یاد نہیں..... آپ کی تحریر آیا ہے بلاوا میری سرکار کا جسے آپ نے بہت اچھے لفظوں میں بیان کیا ہے۔ سیماسراج، شازیہ چوہدری (مرحومہ) صاحبہ اکرم، سیماسیمین مجبلی، سیماغزل، نزہت حبیب، عظمیٰ آفاق سعید، عالیہ حراء، شیریں حیدران سب کو بہت سلام، سدرہ کلثوم مروت دوستی کی خواہش رکھتی ہیں آپ ان کو کہیں کہ مجھ سے دوستی کریں سچا دوست کیا ہوتا ہے میں بن کے دکھاؤں گی وہ مجھے خط لکھ سکتی ہیں ان کا خط آنے پر ان کو گفٹ کے طور پر اپنی تصویر بھیجوں گی۔“ (آپ کی تصویر ان کے لیے واقعی گفٹ ہوگی یہ تو ان سے پوچھنا پڑے گا)

یہ شادی ایک عظیم الشان اور تاریخی واقعہ تھی۔ اس موقع پر ہندوؤں کا مولیٰ پوتلا، جس کی تصویر ایک گائے کی طرح بنائی جاتی ہے، مندر پر لایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑا سا ڈھول بجاتا رہتا تھا۔ ہندوؤں کے عقیدے میں گائے کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اس دن ساری رات سوئے ہوئے لوگ صبح تک سوئے ہوئے رہتے تھے۔

اس دن کے بعد چار ماہ تک ہر روز شادی کی تقریبیں منعقد ہوتی ہیں۔ پہلے توپا کیزہ سے رابطہ کبھی نہیں ٹوٹتا، ہر ماہ ہر خبر سے آگاہی ہوتی جاتی ہے مگر اس بار دو باتوں نے ساری سستی اور مصروفیت بہت پیچھے دھکیل دی۔ ایک تو آپ کی علالت اور دوسری عمیرہ احمد کی شادی..... ان دونوں خبروں نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا..... آپ!..... یقین کریں آپ کی بیماری کی خبر نے پریشان کر دیا۔ خدا آپ کو ہر مصیبت اور پریشانی سے دور رکھے، آمین۔ اور دوسری بات..... عمیرہ احمد کو شادی بے حد وبے حساب مبارک ہو، خدا کرے عمیرہ کا نیا سفر تاحیات خوشگوار رہے، عمیرہ کی شادی کی تصاویر پاکیزہ کے سالگرہ نمبر میں ضرور دیجیے گا اور شادی کا احوال بھی۔ امینہ عندلیب کے بارے میں ہر ماہ پڑھ کر پریشان ہو جاتے ہیں، خدا اسے تندرستی اور صحت دے۔ میں امینہ کو ایک لمبے عرصے سے جانتی ہوں جب اسٹوڈنٹ دور میں ریڈیو سننے کے انتہائی شوقین تھے تب سے امینہ عندلیب سے شناسائی ہے۔ سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھتی ہوں، جس میں اب نئی، نئی کہانیاں آرہی ہیں اور چھاپی ہوئی ہیں، ہمارے دور کی کہانیاں اب پانا نہیں میری طرح کہاں اور کس حال میں مصروف ہیں۔ مجھے فیصحا آصف کے تبصرے بہت اچھے لگتے ہیں اور اس کے علاوہ اس بار سنگنی اعوان کا خط بہت دیر بعد پڑھنے کو ملا اور یقین کریں بہت زبردست خط تھا۔ سب دل کی باتیں تھیں اور بھرپور تبصرہ تھا، اس کے علاوہ وہ اکثر ممتاز ضیا کے تبصرے بہت اچھے لگتے ہیں۔ کہانیوں میں مسلسل ناول شام شہر پاراں بہت پسند آرہا ہے، امانت، رفعت سرانج کا الجھٹائی جا رہا ہے۔ چلیں دیکھتے ہیں آگے، آگے ہوتا ہے کیا رضوانہ پرنس کے ناول اک نئے موڑ پر نہ گیا موڑ لے لیا ہے، اب شہزادی کی قسمت کہاں تک اڑان بھرتی ہے دیکھتے ہیں، زمینرا سے دلی لگاؤ ہے۔ ویسے آپ!، پاکیزہ میں شہزادیاں زیادہ ہی ہو گئی ہیں۔ ہر کہانی میں شہزادی نام ہی چل رہا ہے۔ ویسے بشری گوئیل کا طرزِ تحریر اچھا لگا۔ اُمّ طیور، عروسہ عالم، اور دروازہ نوشین نے متاثر کیا۔ ترکہ وفا، تایاب جیلانی کا ناول کسی اور ہی زبان کا اردو ترجمہ لگ رہا ہے خیر کہانی، اچھی ہے سپنس سے بھرپور..... مستقل سلسلے سارے اچھے ہیں، سندھیے ذرا مزاحیہ ٹاپ ہونے چاہئیں جیسے آج کل بہت مزے کے ایس ایم ایس موصول ہوتے ہیں۔“ (اب تم مزے،

ذکیہ بکرا کی کا انٹرویو..... ان کی زندگی کا اک، اک اور ہر عمل قابلِ تحسین ہے انہوں نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ قرآن پاک کو ترجمے کے ساتھ پڑھیے آپ پر حیرتوں اور مسرتوں کا اک، انوکھا درواہا ہو جائے گا۔ میں گزشتہ دو سال سے قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھ رہی ہوں اور آپ یقین کریں ہر دن ہر بار کی پڑھی ہوئی بات بالکل نئی لگتی ہے اور میرے ساتھ ایک اور بات بھی ہے رات یا سارا دن جو مسئلہ یا جو مشکل میرے ساتھ چلتی ہے صبح جب میں قرآن پاک پڑھتی ہوں تو اس کے ترجمے میں اس کا ذکر ضرور ہوتا ہے اور میری مشکل آسان ہو جاتی ہے حیرت انگیز بات ہے مگر آپ لوگ آزما کر دیکھ لیں، یہ سچ ہے اس عظیم کتاب کی طرح جو دنیا اور دین کے ہر مسئلے کا حل ہے۔ مجھے ذکیہ جی سے یہ پوچھنا ہے کہ انہوں نے قرآن پاک کیسے لکھا شروع کیا میرا مطلب ہے کاغذوں پر یا کسی بڑے جرتل میں مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی۔“ (اس بارے میں ذکیہ بکرا کی تفصیل سے بتا دیں گی جسے ہم جلد از جلد شائع کر دیں گے کچھ میں نے ایک بہن کے خط کے جواب میں بھی لکھا ہے)

✉ عبد العزیز جی آنہ، چکوال۔ برادر مہمانہ پاکیزہ گھر کے ہر فرد کے لیے ہے، آپ اس کی سطر سطر پڑھیں مگر اس میں صرف بہنوں کی تحریریں شائع ہوتی ہیں..... پاکیزہ کی پسندیدگی کے لیے منظور ہوں..... جی میری اب تک ٹوٹل 20 کتب شائع ہو چکی ہیں جو ہر شہر کے اردو بازار سے مل سکتی ہیں۔

✉ سینگم کنول، گاؤں پاپاگری۔ آپ کو اپنی بہن اور اپنے کزن کی شادی مبارک ہو، اپنی تحریریں اور مراسلات ہمیں ضرور بھجوائیں، ہم آپ کی حوصلہ افزائی کرنے کی پوری کوشش کریں گے..... مگر آپ نے جو نظم ہمیں بھیجی ہے وہ شائع کرنے کی ہماری سکت نہیں ہے آپ کی خوشی کے لیے اس کا ایک شعر شائع کر رہی ہوں۔ جب دیکھا تجھے تو دل بس میں نہ رہا۔ میں جس بس میں بیٹھی تھی اس کا پیٹائی نہ رہا..... اب تو خوش ہونا!

✉ سارہ ملک، راول پنڈی، خوش آمدید، تم افسانہ نگار بھی اچھی ہو اور شاعرہ بھی..... تمہارا افسانہ قابلِ اشاعت ہے، حوصلہ افزائی ضرور ہوگی..... اب تو خوش ہونا.....

کے نسیم کریم، ذوالفقار، فیصل آباد سے۔ ”بہنوں کی محفل کی رونق دوبالا کرنے پہنچ گئی۔ یہ محفل ایک مکمل محفل ہے کیونکہ اس میں ہمیں اپنے دکھ سکھ شہسز کرتی ہیں۔ مرخو میں کے لیے دعائے مغفرت ہوتی ہے اور بیماروں کے لیے صحت یابی کی دعا مانگی جاتی ہے سب سے پہلے آپ آئی انجم کوئی اچھی بات بتاتی ہیں درودِ ابراہیمی اور آیت کریمہ پڑھواتی ہیں اور اینڈ میں مکمل دعا کرواتی ہیں۔ اس بار ذکیہ بلگرامی صاحبہ جیسی نیک شخصیت سے ملاقات کی بہت کچھ سیکھا۔ عاصمہ مسعود کو سب سے آخر میں پڑھا مگر تبصرہ سب سے پہلے لکھ رہی ہوں۔ عاصمہ صاحبہ کے کریلوں کا جو حال ہوا وہی میرے محنت سے بنائے شای کبابوں کا ہوتا ہے۔ امانت میں ابھی ڈاکٹر صاحبہ کی وہی حرکتیں ہیں جنہی مرض کے باعث مکمل جان سے رابی کے سامنے راز فاش ہونے لگا تھا کہ جلدی میں بات سنبھال لی۔ آخری قسط تک تمام قصہ رابی کو معلوم تو ہوتا ہی ہے جو ہمیں ابھی سمجھ میں آنے لگا ہے۔ درودانہ نوشین کی چشم غم آشنا میں رجب بیک کا کہانی سنانے کا انداز بالکل ایسے لگا جیسے ہم بچپن میں کہانی سنا کرتے تھے یہ انداز اچھا لگا۔ رشاج نے نہایت سچائی سے اپنی ذات کا محاسبہ کیا خود کو اغراض کا غلام قرار دیا اور بے غرض ہو کر سیماں کی سوچ بدل کر رجب کی زندگی میں خوشیاں لانے کا بیڑا اٹھایا۔ یہ بات اس کی عمدہ سوچ کی عکاسی کرتی ہے جبکہ اس کی آنکھ سے گرنے والے موتی کچھ اور ہی کہانی سنا رہے تھے۔ میں مسلمان ہوں فاطمہ خان نے اپنے مذہب اسلام سے متعلق کہانی لکھی۔ میری یعنی سیکڑ نے تو ایک پیدائشی مسلمان کو بھی مات دے دی۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد نبھانے میں بیٹے کی تربیت بھی اسلامی اصولوں پر کی۔ لوہے کی نیکی واقعی انتہائی مضبوط تھی سب سے مشکل کام چودہ سالہ عمرہ نے کیا۔ جو ہم چاہنے کے باوجود نہیں کرتے اور غیبت کرتے وقت بالکل خیال نہیں کرتے کہ ہماری گئی جہنی نیکیاں لوہے کی نہیں ہیں۔ بشری گوئدل نے تو ہیرا رانجے کا وہ تصور دیا کہ اگر کید و درمیان میں نہ آتا تو انجام ایسا ہوتا..... جہاں پاؤں کے کھڑکنے اور ہیرا رانجے کی حریدار لڑائی نے لطف دیا وہاں مرد مار شہزادی کے سوتلوں، ڈنڈوں نے بھی مسکراہٹ بکھیر دی آخر کار ایک شہزادہ آیا اور ایک نہ سدھرنے والی لڑکی کو محبت کی زبان میں سدھار گیا یعنی سچی محبت میں اس قدر طاقت ہوتی ہے۔ عقیدہ حق نے تو شادی شدہ عورت کی زندگی کو کھول کر بیان کیا ہے کہ کامیاب عورت کہلانے کے لیے ہمیں کس، کس امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ مکافات عمل ام شامہ کی میں خالہ بی بی سی جیسی عورتیں ہر گلی اور محلے میں ملتی ہیں جن پر ہر آئے گئے پر تبصرہ کرنا فرض ہوتا ہے ان کے اپنے گھر خواہ کھپاں بھٹکیں یا

ہیں۔ شیریں حیدر کے والد کا پڑھ کر دکھ ہوا خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین) میرے ہو کے رہو..... سحر نے ٹھیک لکھا۔ کہاں ہیر لڑکی کو گفٹ بھیجتا ہے اور کہاں شادی بھی ہو جاتی ہے۔ (ہاں بھئی اب الٹا پلٹا ہی چل رہا ہے)

سحر زینیا حسن، کراچی سے۔ ”عام طور پر خواتین کے جرائم کے سرورق مجھے متاثر نہیں کرتے مگر پاکیزہ کے سرورق منفرد ہوتے ہیں کچھ ہاتھ کیپوٹر گرافکس کا بھی ہوتا ہے۔ اپریل کے سالگرہ نمبر کا سرورق بے حد پسند آیا۔ میری عادت ہے میں ہر رسالہ آخری صفحے سے دیکھنا شروع کرتی ہوں لہذا تبصرہ بھی اسی لحاظ سے ہے، مستقل سلسلے تمام ہی مفید اور دلچسپ ہیں۔ جلتنگ کے کیا کہنے..... پڑھتے ہوئے ارد گرد جلتنگ سے بچتے ہیں اسی لیے بہنوں کی محفل کے تقریباً ہر تبصرے میں آپ کے قلم کے جادو اور مزاح کی تعریف میں بھی جلتنگ بچتے ہیں۔ سندیسے میں ساریہ چوہدری، مہجرات، ماہ زیب، لاریب، چونیاں اور عظمیٰ محمود راول پٹری کے سندیسے بے حد پسند آئے۔ پاکیزہ ڈائری میں عظمیٰ کے انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔ یہ لڑکی اتنی مصروفیت میں بھی اتنی محنت اور مستقل مزاجی سے پاکیزہ ڈائری کو سجاتی، سنوارتی ہے۔ آخر بیٹی کس کی ہے۔ بہنوں کی محفل تو ایک، ایک لفظ بغور پڑھتی ہوں، اب تو تبصرہ نگار نہیں بہت اپنی، اپنی ہی لگتی ہیں۔ میں آپ کے خلوص اور محبت کا کیا کہوں..... ایسے ہی تو لاکھوں دلوں کو آپ نے محبت سے نہیں جیتا۔ خلوص اور محبت وہ بھی الفاظ کے ذریعے جیتنا قابل رشک اور قابل فخر ہے۔ میری طویل غیر حاضری کے باوجود پچھلے سال بھی سالگرہ نمبر میں اپنا نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی اور اس سال بھی..... فون پر بات کر کے آپ کی آواز اور محبت بھرے الفاظ میرے لیے آسجمن کا کام دیتے ہیں۔ عذر با عذر نے بھی جس طرح میری بیٹی کے انتقال پر میری ہمت بندھائی وہ میں بھول نہیں سکتی۔ یہاں کچھ لوگوں کا ذکر کرنا چاہوں گی سب سے پہلے میری پیاری ہا کو کب بخاری آواز دے کہاں ہے لڑکی تم کہاں ہو؟ تمہارے خطوط آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں مسجد شاہ اور ساجدہ حبیب میرے دل کے بے حد قریب ہیں۔ جنہوں نے پاکیزہ میں شائع ہونے والے میرے پہلے افسانے کو بے حد سراہا تھا اور لکھا تھا کہ میرا انداز تحریر عصمت چٹاکی سے ملتا ہے۔ اتنی بڑی مصنفات کی تعریف میرے لیے بے حد اعزاز کی بات ہے۔ سیما پابین جتئی رضوانہ پرنس اور بہت سے نام ہیں جن کی بے حد یاد آتی ہے۔ رضوانہ پرنس میری پسندیدہ افسانہ نگار ہیں، تحریر میں روانی ہے، لفظوں کا انتخاب عمدہ اور مشاہدہ زبردست ہے۔ زنگی کی چھوٹی، چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر خوب صورت کہانی بنتی ہیں۔ انجم انصار کے افسانے بے حد اچھے موضوع پر، منفرد انداز تحریر کے ساتھ بہت پسند آتے ہیں مگر شاید مدیرہ پاکیزہ کو اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ قارئین ہر ماہ ان کے افسانے کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ وہ کیوں اپنے افسانوں کی اشاعت میں کنجش کرتی ہیں۔ سالگرہ نمبر میں سالگرہ کے حوالے سے کیا گیا سروے مختلف نوعیت کا تھا جو بے حد پسند آیا۔ ویل ڈن شائستہ زریں..... نگہت اعظمی، نگہت سیما، فرحت احمد، روشانہ عبدالقیوم سب نے اچھا لکھا مگر شہناز دسیم سب پر ہازی لے گئیں“ (بے حد بر محبت تبصرے کا شکریہ)

قارئین، بہنوں! پاکیزہ کا آئندہ شمارہ ناول نمبر ہوگا ہم پہلے بھی آپ سے یہ کہہ چکے ہیں کہ پاکیزہ پڑھنے والی ہر بہن ہمارے لیے خاص الخاص کا درجہ رکھتی ہے اگر آپ پاکیزہ کے صفحات میں اپنا اندر پوشا لکھ کر دانا چاہتی ہیں تو تصویر کے ساتھ یا بغیر تصویر کے..... آپ اپنے بارے میں ایک صفحے پر لکھ دیجیں..... اسے ہم ضرور شائع کریں گے۔ اب آئیں ہم سب مل کر دعا مانگتے ہیں مگر اول آخر درود ابراہیمی پڑھنا مت بھولیں۔ یا اللہ بارشیں یا رحیم میرے جسم کو شفا دل کو اپنی ذات کا یقین کامل اور آنکھوں کو نور بصیرت عطا فرما اور جنب تک زمرہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین تو مجھ سے، میری آل اولاد سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا..... ہر گناہ ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور دونوں جہانوں میں مجھے خیر عطا فرمانا کہ تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے..... بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے.....

یا مجیب یا مجیب یا مجیب

دعا گو
آپ کی باجی
انجم انصار

حرے کے سندیسے بھیجنا.....)

سحر زینت عبدالصمد، میرپور ساکرو سے۔ ”مارچ کا شمارہ جب ہاتھ میں آیا تو اس کی سب سے خاص بات مختصر ذکیہ بلکرائی صاحبہ کا انٹرویو رہا..... بے شک وہ ایسی ہستیوں میں سے ہیں جن کا نام سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے، اللہ سبحان تعالیٰ نے انہیں بہت بڑے اعزاز سے نوازا ہے۔ قرآن پاک کی کتابت اللہ پاک کی بہت بڑی نوازش ہے پھر ان کی گفتگو میں کوئی فخر کوئی غرور نہیں اللہ پاک انہیں صحت، طاقت اور لمبی عمر عطا فرمائے تاکہ وہ اس عظیم کام کو اسی طرح جاری رکھیں۔ بہت سی دعائیں ان کے لیے، شیریں حیدر نے اپنے والد صاحب کی یاد میں لکھا ہے شک والدین ایسی ہستیاں ہیں جن کے لیے جتنا کہا جائے کم ہے اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے..... (آمین) ایک نئے موڈ پر آہستہ، آہستہ دلچسپ ہوتی چلی جا رہی ہے جبکہ شام شہریار کی شطرنج کی بساط کی صورت سامنے آئی ہے۔ ترک و فاق میں تابیاب جیلانی جرمن کچر سے متعارف کروا رہی ہیں۔ ماضی اور حال کو ایک ساتھ لے کر چلنا اچھا لگ رہا ہے، لوہے کی نیکی کے لیے صرف یہ کہوں گی مختصر مگر پُر اثر چشمِ غم آشنا میں دردناک نوٹیشن نے عدم رجب بیک صاحب کی صورت ایک آئینہ دل سے متعارف کروایا جبکہ حسبِ نسب میں بڑے بول اور تکبر کی جھلک نظر آئی۔ نہ جانے کیوں ہمارے معاشرے میں حسبِ نسب، ذات پات کو انسانیت پر فوقیت دی جاتی ہے دیکھتے ہیں سالگرہ نمبر میں اس بار کیا سر پرانز ہے۔“ (تبصرے کا شکریہ..... ہاں دوسو سے زائد با اثر شخصیات سے مل کر کیا لگا۔)

سحر لاریب ماہ زیب، چونیاں سے۔ ”ناٹش اچھا تھا۔ عیسرہ احمد کو شادی کی بہت، بہت مبارک ہو..... اللہ ان پر ہمیشہ اپنی رحمت کا سایہ رکھے۔ (آمین) رفعت سراج نے بے قصور ستارہ کو ناحق مار دیا۔ اب امانت میں وہ جان نہیں رہی جو ستارہ کی ذہانت آمیز گفتگو کاٹ دار جلوں کے ذریعے کہانی میں پڑتی تھی۔ شام شہریار میں ہمیشہ کی طرح زبردست تھا لیکن میرال کا مہر زاد سے بدگمان ہونا ہمیں اچھا نہیں لگے گا یہ نہیں ہونا چاہیے، زوکی اور نادر کو خوش باش دیکھ کر ہمیں بھی خوشی ہوتی ہے، عروسہ عالم کا افسانہ اس لحاظ سے بہت اچھا لگا کہ ایک لڑکی کو اپنے حق کے لیے کمزور واقعی نہیں پڑنا چاہیے۔ اک معصوم خواہش نے بہت دلایا۔ مکافاتِ عمل کی خالہ بی بی سی جیسی عوتیں ہر جگہ پائی جاتی ہیں جو بتا پر کے ہی پرندہ بناتی ہیں۔ اللہ اس طرح کی عورتوں کے شر سے بچائے۔ بند بچی میں عائشہ کا کردار بہت بھایا۔ مشرقی معاشرے کی تقریباً ہر قسم کی جوشی عورت کو ان ہی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے پر بھی عائشہ جیسی اعلیٰ ظرف نہیں ہوتیں۔ اس دفعہ اسٹوری آف دی منٹھ دردناک نوٹیشن خان کی چشمِ غم آشنا ٹھہری۔ عدم رجب بیک جیسے ہمدرد اور ایثار پسند لوگ بہت تابیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ جو انفرادی نہیں اجتماعی مفاد کی سوچ رکھتے ہوں۔ یہ کہانی مدتوں یاد رہے گی۔ جلتنگ اس دفعہ بہت اچھا تھا۔ میں اکثر نگشتانی ہوں میں ارم کمال اور فاطمہ کے شعر بہت پسند آئے۔ وہ آئے بزم میں ذکیہ بلکرائی سے ملنا بے حد اچھا لگا۔ اللہ ان جیسا حوصلہ اور قرآن پاک سے محبت ہمیں بھی عطا فرمائے، آمین۔ پلیز یہ درخواست ہے کہ شوہر کے لوگوں کو بزم سے دور ہی رکھیے گا۔ وہ تو ہر طرف چھائے رہتے ہیں لیکن ادبی لوگوں سے ملنے کا کبھی، کبھی ہی موقع ملتا ہے سو اس سلسلے کو مصنفین اور اویسوں کے لیے مختص رہنے دیجیے اور بزم کے آئندہ مہمانوں کو عزیزہ سید، عیسرہ احمد، نگہت سیما، ستارہ رضا یا شیریں حیدر میں سے کسی کو ہونا چاہیے۔“ (بجی ضرور)

سحر نسیم سلیمہ صدف، پنجاب سے۔ ”پاکیزہ کا تازہ شمارہ موصول ہوا تو ایک مبہوت کن اور بے حد خوش آمد میر شادی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ سبحان اللہ کسی بچی اور سادہ اور دلولہ (بلکہ تھلکہ) آفرین دستاویز آپ نے مرتب کر دی۔“ (پاکیزہ کی خوب صورتی، کامیابی اور کامرانی کی اصل وجہ..... عمدہ ٹیم ورک ہے)

سحر شاجالا، بھلولال سے۔ ”مارچ کے پاکیزہ کی ٹائٹل گرل بس ٹھیک تھی۔ مجھے کچھ کہنا ہے زبردست آپ نے منزل کے بارے میں بات کی ہماری منزل ابھی بہت دور ہے..... اس کے بعد ترک و فاق پڑ گئی جیسا میں نے سوچا تھا ویسا ہی ہوا مطلب اس قسط میں ہیر وسائے آئی گیا۔ ام طیفور کے قلم سے معصوم سی خواہش پڑی۔ حیرت کا زبردست جھٹکا لگا کہانی پڑھ کر ثانیہ بے چاری مر گئی بہت دھمی اسٹوری تھی۔ بشری گویدل کے کیا کہنے کہانی کے دوران میں، ہنس کے پاگل ہو گئی ایسی کہانی لکھ کر آپ نے چند لمحے دنیا کے دکھ درد ہمیں بھلا دیے۔ مکافاتِ عمل بی بی سی اینڈ پھوٹ، پھوٹ کے رودی کہ ہمایوں کے گمر کی خیر خیر کشتی تھی اپنے بچوں کی بھی دیکھ بھال کرتی تو نوبت ایسی نہ آتی، ڈاکٹر ذکیہ سے ملاقات بہترین رہی ڈاکٹر صاحبہ کتنی نیک فطرت ہیں ان کے خیالات بہت اعلیٰ

پاکستان سوسائٹی



عظیمی سہیل

حمد باری تعالیٰ

سب رشتے کٹ جائیں مولا، تیرا رشتہ باقی
میرے مولا! تو ہے سب کا سچا سوہنا ساتھی
تو ہے ایسا راز جو اب تک جان سکا نہ کوئی
جس نے تجھ کو جانا پرکھا، بس اک بشر نوری
جتنے بھی تو فیض دلانے، جتنے کرم دکھائے
تیرے سامنے تھر تھر کانپے، ہر اک بشر خاکی
شر ہو یا کہ خیر ہو سارے، تیرے ہی جلوے ہیں
شر مسلط کر ڈالا جب دل کی حالت بدلی
جس کو دے توفیق تو رہا، کرے محاسبہ اپنا
ایسے لوگوں نے ہی مولا، جنگ اکبر جیتی
مجھ کو بھی تو شامل کر لے، ایسے ہی لوگوں میں
ہدایت کی تو شمع تھما دے، اپنی ازلی، ابدی
تاحال تو نے کرم نوازا یونہی کرم دکھانا
تیرا کرم تلاشتے گزری، اپنی سلور جوہلی
حمدوں اور نعتوں سے بھر دوں دنیا کا چٹا چٹا
ہو ہو کرتے عمر گزاروں بقیہ رہ گئی جتنی
ہونہ پائے پھر بھی تیری اور تیرے محبوب کی مدح
چاہے بازی ہم لگا دیں، اپنے سر اور دھڑکی
ہم سے دور ہو کر بھی تو شہ رگ سے نزدیک
جب بھی تجھ کو جس نے پکارا تو نے سن لی اس کی
از: کوثر خالد، جزا نوالہ

نعت رسول مقبول ﷺ

آؤ فرشتوں مجھ کو سناؤ پیارے نبی کی نوری بتیاں
پل، پل سوؤں، پل، پل جاگوں کیسے کیں جیون کی ریتیاں
پھول کھلاؤ خوشبو پھیلے مہک اٹھے سنسار
بوٹا، بوٹا نعت سنائے کھل جائیں سب کلیاں

خوشنودی کا باعث ہو سکتی ہے۔
(حضرت امام جعفر صادق)
مرسلہ: عنبر و سم، گوجرانوالہ

ارشادات نبوی ﷺ

☆ ثابت مسور کی دال کھاؤ یہ دل کو نرم کرتی
ہے اور آنسوؤں میں اضافہ کرتی ہے۔
☆ شہد بہترین غذا ہے جو دل کی حفاظت کرتا
ہے۔ شہد میں ہر بیماری کی شفا ہے۔
☆ زرد گاجر کھانے سے گردوں میں گری آتی ہے۔
☆ انجیر چاہے تازہ ہو یا خشک اسے کھایا کرو یہ
اعصاب کو مضبوط کرتی ہے۔ یواسیر کو جڑ سے اکھاڑ
پھینکتی ہے۔

مرسلہ: جبین ہاشمی، بھیرہ

آج

آج تیرے جنم دن پر
ٹوٹے ہوئے کواڑ پر
ایک ننھا سا دیا
ہم نے قصداً
جلتا رہنے دیا

شاعرہ: صائمہ سجاد بگٹش، کوہاٹ

ماں

تو میری سانسوں کی دھڑکن، تو میری خوشبو کا نام
تجھ سے ہے عزت میری، تجھ سے ملا ہے احترام
تیرے لب سے جو نکلتی ہے، دعا مقبول ہے
مانگتا ہوں تجھ سے میں تیری خوشی کا التزام
جس کو ملی تیری دعا، جنت کا وہ حق دار ہے
جس کو ملی ہے بد دعا، دوزخ اسی کا ہے مقام
بیت جائے عمر میری، تیری خدمت میں تمام
مانگتا ہوں تجھ سے ممتا کا جلو میں صبح شام
میری ہر تکلیف میں بے چین ہو جانا تیرا
میں ادا کیسے کروں کلمات میں تیرا مقام
دیکھ لے جو میری آنکھوں میں جھلک تکلیف کی

تجھ جن کو خدائے بزرگ و برتر نے پیغمبری اور کلام
کے لیے منتخب فرمایا اور معجزات عطا کیے۔ جب آپ
کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے کلام کے لیے جاتے تو ان کی
سلامتی کی دعا ان کی ماں کے مقدس لبوں پر ہوتی۔
والدہ محترمہ کے انتقال کے بعد جب آپ ایک مرتبہ
کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے جا رہے تھے تو
غیب سے آواز آئی۔ ”اے موسیٰ! سنبھل کے اب
تمہارے لیے دعا کرنے والی تمہاری ماں نہیں۔“
مرسلہ: تسنیم قریشی، کوہاٹ

ماں

ایک رات حضرت بایزید بسطامی کی والدہ نے
پانی طلب کیا۔ آپ نہر سے جا کر پانی لائے تو والدہ
سوچیں تھیں۔ موسم سرما تھا آپ پانی لیے والدہ کے
پاس کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ ہاتھ سن ہو گیا۔
جب وہ جاگیں تو پانی پیا اور دعا کی سہل فرماتے ہیں کہ
جو مقصد میں ریاضت و عبادات، جہاد اور دیگر امور
میں ڈھونڈتا تھا وہ اس رات پالیا۔

مرسلہ: صدف نورین، لاہور

دل سے نکلے لفظ

☆ اللہ کی رحمت سے گمراہوں کے علاوہ کوئی
مایوس نہیں ہوتا۔

(حضرت ابراہیم)

☆ خوب صورتی کپڑوں سے نہیں علم و ادب
سے ہوتی ہے۔

☆ کسی کے منہ پر تعریف کرنا اسے قتل کرنے
کے مترادف ہے۔

☆ دنیا کی سب سے بڑی غریبی بے عقلی ہے۔
(حضرت علی)

☆ ظالموں کے ساتھ خاموشی سے زندہ رہنا
خود ایک جرم ہے۔

(حضرت امام حسین)

☆ کسی نیکی کو معمولی خیال نہ کرو۔ وہی اللہ کی

دردِ جدائی سہہ نہ پاؤں دل کی باتیں کہہ نہ پاؤں
کس سے کہوں اور کس کو بتاؤں رونی ہیں کیوں انگلیاں
آپ کی جالی پکڑے، پکڑے صبح سے کردوں شام
خوش ہو جاؤں چین سے بیٹھوں تھک جائیں جب تھکیاں
بارہ ربیع الاول آئی سب نے مل کر عید منائی
ہم بھی ان کی شان میں گائیں مل بیٹھیں سب سکھیاں
کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

مرسلہ: یمن عباس، کراچی

ماں

☆ کسی نے پوچھا..... ماں کیا ہے؟
☆ قدرت نے کہا..... میری طرف سے قیمتی
اور نایاب تحفہ.....!
☆ استاد نے کہا..... ایک ایسی ہستی جو اولین و
بہترین درس گاہ ہے۔

☆ جنت نے کہا..... اتنی عظیم ہستی کہ میں اس
کے قدموں تلے ہوں۔

☆ زندگی بولی..... وہ انمول نعمت جو فقط
زندگی دینا جانتی ہے۔

☆ شاعر بولا..... ماں ایک ایسی غزل جو سننے
والے کو رلا دیتی ہے۔

☆ دل نے کہا..... ایک ایسی راز دار ہستی جس
کا دل محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے۔

☆ اولاد نے کہا..... ایسی پناہ گاہ، چھپر
چھاؤں جو آغوش میں لے لے تو مصیبتیں ڈر کر دور
بھاگ جائیں۔

مرسلہ: جبین نیاز، ملتان

ماں کا مقام

حضرت موسیٰ علیہ السلام وہ جلیل القدر پیغمبر

ماں

ماں ایک صدی ہوئی ہے۔ ایک نسل ہوتی ہے۔ ایک خاندان ہوتی ہے۔ بچے اپنی استعداد کے مطابق اس درس گاہ سے کچھ نہ کچھ سیکھتے رہتے ہیں۔
مرسلہ: پروین عذرا تھنہ، کراچی

غزل

آپ سے مل کے تو عام بات بھی اچھی لگی
دھوپ بھی اچھی لگی برسات بھی اچھی لگی
بھاگتا آٹکھوں کو دلکش سا سراپا آپ کا
گفتگو کی دلشیں سوغات بھی اچھی لگی
کیا بتاؤں آپ میں کیا بات ہے جس کے سبب
مجھ کو اپنی بے بضاعت ذات بھی اچھی لگی
خورد، شیریں سخن اور تم ہی جان انجمن
آپ کے صدقے میں تو کائنات بھی اچھی لگی
دن تو خیر تھا ہی اجلا چاند چہرے کی طرح
طرفہ تماشا یہ ہوا کہ رات بھی اچھی لگی
میں کیا، میرے حرف کیا، ناز کیا، انداز کیا
ایسے ہم کو عشق کی شروعات بھی اچھی لگی
شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

کیسے کیسے لوگ

شہاب نے اپنی کلاس فیلوئین سے موبائل پر
پوچھا۔ ”کہاں جا رہی ہو؟“
”میں اپنے ڈیڑی کی بی ایم ڈبلیو کار میں کلب
جا رہی ہوں۔ ابھی ڈرائیور مجھے کلب چھوڑ دے گا۔
اس کے بعد شاپنگ کرنے جاؤں گی پھر تمہیں کال
کروں گی، تم کہاں پر ہو شہاب؟“ ٹیکسٹ نے کہا۔
”وٹکین میں تمہاری سیٹ کے پیچھے بیٹھا ہوں۔
تم کراہی مت دینا، میں نے دے دیا ہے۔“ شہاب نے
چمک کر جواب دیا۔

مرسلہ: منور شہزادی، گوجرانوالہ

☆☆☆

لڑکیوں کے لیے بس یہ ہے کہ اُس شخص سے شادی
کر لیں آپ کا خواب پورا ہو جائے گا۔

مرسلہ: نعل شاہین، ڈی آئی جی خان

شہر قائد

امن درہم ہے شہر قائد میں
لوگ برہم ہیں شہر قائد میں
سکون، امن اور اطمینان
خواب و خیال ہیں شہر قائد میں
اے الہی رحم فرما حالات پر ہمارے
ہو امن کا بول بالا پھر سے شہر قائد میں

مرسلہ: خولہ بنت حوا، کراچی

دوستی ایسا نانا

ایک لڑکے نے مرنے سے چند منٹ پہلے دوست
کے ایک گرل فرینڈ کو دوسرا ایک دوست کو کہہ میں
جار ہا ہوں جلدی جواب دینا۔ پہلا جواب گرل فرینڈ
کا آیا۔ ”میں مصروف ہوں تم جاؤ ہم بعد میں ملیں
گے۔“ یہ جان کر اسے بہت دکھ ہوا۔ دوسرا بیچ
دوست کا آیا۔ ”کہاں جا رہا ہے؟ رک جا میں ابھی
آتا ہوں ساتھ چلتے ہیں۔“ یہ پڑھ کر لڑکا مسکرایا اور
بولاً۔ ”آج پھر پیار، دوستی سے ہار گیا۔“

مرسلہ: انیلا ناہید، لیہ

دیکھو

ذرا تم نگاہیں اٹھا کر تو دیکھو
ان آنکھوں سے آنکھیں ملا کر تو دیکھو
لٹا دیں گے سارے زمانے کی خوشیاں
ہمیں اپنا غم تم بتا کر تو دیکھو
تم ہو گے تھا کسی محفل میں کبھی تم
گلے سے ہمیں تم لگا کر تو دیکھو
لٹا دیں گے تم پر جان جاں اپنا سب کچھ
کبھی تم ہمیں آزما کر تو دیکھو
مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

قابلیت پر نہیں۔

☆ طنز وہ تیر ہے جو شہد میں بھی بھگو کر مارا
جائے تو اس کی چھین کم نہ ہوگی۔

☆ زیادہ امیدوں والا دراز زندگی کا مالک
ہوتا ہے۔

☆ سخاوت یہ ہے کہ اپنی استطاعت سے
زیادہ دو۔

☆ جو شخص خود میں چھوٹا کام کرنے کی
صلاحیت اور حوصلہ نہیں پاتا وہ کبھی بڑا کام بھی انجام
نہیں دے سکتا۔

مرسلہ: زریں زبیر کوٹھاری، کراچی

ہار جیت

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
مرسلہ: نایمین کنول، پسرور

بیرون ملک رہائش کا آسان طریقہ

آج کل بیرون ملک جا کر رہنے کی خواہش کسی
بیماری کی طرح بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا ایک آسان
طریقہ ہم آپ کو بتاتے ہیں تاکہ آپ کا خواب پورا
ہو جائے۔ لڑکوں کے لیے سب سے پہلے سخت
پڑھائی، اچھے نمبرز، اچھے گریڈز حاصل کریں اور اس
کے بعد کچھ IELTS میں پیش قدمی کریں اور پھر
TOEFL بھی کر ڈالیں پھر اسٹوڈنٹ ویزا کے
لیے درخواست دیں۔ اس درخواست کے ساتھ
باپ کے بینک کی ایک بھاری اکاؤنٹ کی سلیپ جمع
کروائیں تب جا کر کسی یونیورسٹی میں داخلہ ملتا ہے
پھر امتحان میں شاندار نمبر حاصل کریں اور قابلیت اتنی
بڑھائیں کہ آپ کو جواب آسانی سے مل جائے پھر کئی
سال تک سخت محنت سے اپنا مقام بنائیں پھر کہیں
جا کر آپ رہائش اختیار کرنے کے قابل بنیں گے اور

نیند اڑ جائے تیری اور ختم ہو جائے آرام
کاش میں پورا کر دوں تو مجھ سے جو خواہش کرے
تجھ تک آنے نہ دوں میں تمام لوں تیرے آلام
یا الہی! مجھ کو رہے حاصل میری ماں کی دعا
میرے سر پر اس کی شفقت کا رہے سایہ دوام
مرسلہ: انیقہ انا، چکوال

میری پیاری ماں

ایک چھ سال کے بچے کی ماں انتقال کر گئی تو کچھ
عرصے کے بعد اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی۔
ایک دن باپ نے بچے سے پوچھا۔ ”تمہیں پہلی ماں
اور نئی ماں میں کیا فرق لگا؟“ بچہ نے مصہومیت سے
کہا۔ ”پہلی ماں جھوٹی تھی جبکہ نئی دالی ماں سچی ہیں۔“
باپ نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ کیسے بیٹا؟“ بچہ نے کہا۔
”جب میں شرارت کرتا تھا تو پہلے دالی ماں کہتی تھی اب
شرارت کی تو کھانا نہیں دوں گی مگر جب کھانے کا وقت
ہوتا تھا تو وہ مجھے ہر طرف ڈھونڈ کر پکڑ کر پیار سے کھانا
کھلاتی تھیں لیکن جب نئی ماں کہتی ہے کہ شرارت کی تو
کھانا نہیں دوں گی تو وہ اپنا کھا پورا کرتی ہیں۔ آج دو
دن ہو گئے انہوں نے مجھے کھانا نہیں دیا۔“

مرسلہ: نجمہ اصغر، کراچی

غزل

ہر گل ہو اشک بار گوارا نہیں ہمیں
یوں آئے اب بہار گوارا نہیں ہمیں
ایک اور انقلاب کے ہم منتظر ہیں آج
اے دوست یہ بہار گوارا نہیں ہمیں
مل جائے گا سکون تیرے قرب سے مگر
حالات سے فرار گوارا نہیں ہمیں
کس موڑ پر حیات کا غم لے کے آگیا
تیرا بھی انتظار گوارا نہیں ہمیں
شاعرہ: فریدہ فری یوسف زئی، لاہور

یاد رکھیں

☆ لوگ اپنی ضروریات پر غور کرتے ہیں،



بڑے لوگ

گھر میں افراتفری سی مچی ہوئی تھی..... اور بات بھی معمولی نہیں تھی..... ثنا انٹر پرائزر کی سربراہ مسز ثنا احمد..... ثاقب کے گھر میں خود آنا چاہ رہی تھیں۔ کتنی دفعہ تو ثاقب کی بیوی عمرانہ یہ بات ثاقب سے خود پوچھ چکی تھی۔

”کیا میڈم نے خود کہا تھا..... وہ ہمارے گھر آئیں گی؟“

”ہاں، خود کہا تھا..... جب میں نے بیٹا ہونے کی مٹھائی ان کے کمرے میں بھجوائی..... تو وہ باہر آ کر بولیں۔“ ثاقب! مبارک ہو..... تمہارے بیٹے کو دیکھنے ہم تمہارے گھر آئیں گے۔“

”ارے..... وہ بے چاری کہاں زحمت کریں گی..... تم کہہ دیتے کہ میں بیٹا لے کر آفس آ جاؤں گا آپ دیکھ لیجئے گا..... اللہ اللہ خیر صلا.....“ اماں نے اپنی پریشانی کا حل خود ہی ڈھونڈ لیا۔

”اماں..... ابھی بچہ صرف دس دن کا ہے..... اتنے سے بچے کو لے کر میں کیسے آفس جاسکتا ہوں؟“

”ارے، عمرانہ کو ساتھ لے جاؤ..... اچھا ہے وہ میڈم کو سلام کرائے گی۔“

”اماں کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ..... ابھی اس کا سوا مہینہ بھی پورا نہیں ہوا..... میں زچہ کو لے کر آفس چلا جاؤں۔“ ثاقب نے اچھے ہوئے لہجے میں ماں سے کہا۔

”اچھا..... ابھی برسوں اپنے بھائی، بھادج کی شادی کی سالگرہ میں تو ٹھکتی ہوئی اپنے میکے چلی گئی تھی..... اس وقت کیا زچہ ختم ہو چکی تھی؟“

”کہاں کی بات کہاں لے جاتی ہیں آپ..... وہ تو

اس کے اپنے گھر کی تقریب تھی۔“ ثاقب کھسیا کر بولا..... کہ اماں کو پرانے حساب بے باق کرنے کی عادت بھی تو تھی۔

”ٹھیک ہے میڈم کو اس اتوار کو بلا لو.....“ اماں نے تمباکو پھاٹکتے ہوئے کہا۔

”ان سے پہلے پوچھیں گے کہ وہ اتوار کو فارغ ہیں یا نہیں..... اپنا پروگرام ان پر تو نہیں تھوپ سکتے۔“

”چلو ان سے ہی پوچھ لو..... کہ وہ کب ہمارے گھر آئیں گی؟“ اماں نے خوش ہو کر کہا۔

ثاقب نے آفس جا کر ڈرے، ڈرے سے لہجے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔ ”جمعہ کے دن شام کو آئیں گی۔“ ثاقب نے گہرا کر بتایا تو اماں دور کی کوڑی لائیں۔

اماں نے کہلوا لیا..... ”میڈم جی سے کہہ دو کہ دوپہر کو کھانا ہمارے گھر کھالیں۔“ ثاقب اگلے دن پھر میڈم کے کمرے میں ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے تھے۔

میڈم نے ہنس کر کہا۔ وہ دوپہر کا کھانا کھاتی ہی نہیں ہیں۔ وہ شام کو آ کر صرف چائے پیئیں گی..... وہ بھی ہلکی پھلکی سی..... بھاری بھر کم لوازمات ہرگز نہ کیے جائیں۔

”جب ہی یہ میڈم اتنی دہلی چلی سی ہیں اپنا خیال جو رکھتی ہوں گی.....“ اماں نے رائے دی۔

”آپ نے کب آفس آ کر ہماری میڈم کو دیکھ لیا؟“ ثاقب نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

”ارے بیٹا..... تمہارے آفس تو نہیں آئی..... ایک مرتبہ ٹی وی پر ان کا انٹرویو تو دیکھا تھا..... کیا منہ سے پھول جھڑپے تھے..... ماشاء اللہ..... اور دہلی چلی تو اتنی دکھائی دے رہی تھیں کہ تو لا جائے تو پانچ کے بعد چھٹا پھول نہ چڑھے۔“

”ارے واہ اماں..... تعریف کرنے کا سلیقہ تو

کوئی آپ سے سیکھے۔“

جمعہ آنے میں ابھی چارون تھے گھر میں ایسی صفائیاں ہو رہی تھیں..... جیسے اس دفعہ 29 تاریخ کو چاند ضرور نکل آئے گا چھوٹی بیوی کی چیز کی اچھی، اچھی چادریں تمام بستروں پر بچھادی گئیں..... اور ہر بہو کے پورشن سے سجاوٹ کی اشیا بھی لے کر ڈرائنگ روم میں سجادی گئیں۔

اب اپنے آپ کو سجانے سنوارنے کے مسائل تھے..... اس زمانے میں اونچی قمیص اور خوب گھیردار شلواریں فیشن میں تھیں۔ بڑی آپا نے اپنی گھیردار شلواروں کے ساتھ اماں کے غراووں کا چمپر پھین لیا..... چھوٹی بھابی نے پڑوس سے اپنا میک اپ کروایا..... اس کے ساتھ بڑا سا بالوں کا مصنوعی جوڑا بھی تھا جو اس نے بھابی کی کھوپڑی پر دو درجن بال پنوں کی مدد سے فٹ کر دیا جس سے ان کی خوب صورتی میں اضافہ کتنے فیصد ہوا تھا..... وہ تو پتا نہیں چل رہا تھا..... ہاں ان کی مسکراہٹ کچھ تکلیف دہ سی ضرور دکھائی دے رہی تھی۔

چھوٹی باجی جو کسی شو سے میک اپ کی بڑی کٹ جیت کر لائی تھیں..... انہوں نے گھر میں سب خواتین کا میک اپ بڑی فراخ دلی سے کیا تھا..... حد تو یہ تھی کہ اماں تک کے چہرے پر روج تک لگا دیا تھا..... جس سے صاف لگ رہا تھا کہ بائیں گال پر چوٹ کا نشان ہے۔

میڈم ثنا احمد نے پانچ بجے آنے کو کہا تھا..... مگر گھر کی سب خواتین دو بجے سے تیار تھیں۔ دروازے پر کسی کی پوں، پوں بھی سنائی دیتی تو گھر کے بچے لپک کر دروازہ کھول دیتے۔

بالآخر شام کے پانچ بجے..... اور سوا پانچ بجے میڈم ثنا احمد ان کے گھر آ گئیں..... دو بھادجوں، چار نندوں..... اماں اور دادی جان نے ان کا استقبال کیا..... مگر یہ کیا..... وہ تو لائٹ پنک پر مٹھ لان کے سوٹ میں تھیں..... جس میں لائٹ پر پل کلیاں سی بنی ہوئی تھیں..... نہ میک اپ نہ منڈکار.....

میڈم ثنا نے سب خواتین کو یوں میک اپ میں لت پت دیکھا تو حیران سے لہجے میں بولیں۔

جلترنگ

”آپ کے ہاں آج کوئی تقریب ہے کیا.....؟“

”نہیں..... نہیں کچھ بھی تو نہیں..... بس آپ کے آنے کا انتظار تھا اور آپ سے ملنے کا.....“

”ارے بیٹا..... کیا تم اتنی سادگی سے رہتی ہو..... میرا مطلب ہے کہ میک اپ وغیرہ سے کوئی شوق نہیں.....؟“ آخر اماں نے پوچھ ہی لیا تھا۔

”کہیں شادی واڈی میں جانا ہوتا..... میک اپ بھی کر لیتی ہوں مگر لائٹ سا..... زیورات بھی شوق سے پہن لیتی ہوں..... مگر کپڑے میں آرام کے حساب سے پہنتی ہوں کہ کن کپڑوں میں مجھے آرام ملے گا۔“ وہ مسکرا کر بولیں۔

اب بھادجیں اپنی دست پر کھیا سی رہی تھیں۔ عمرانہ ذہین تھی..... جھٹ منہ دھو کر آگئی اور آرٹی فیشل جیولری بھی اتار آئی۔

بہنوں نے دوپٹے سے منہ پونچھ لیا تھا مگر سارا مسکارا..... ان کے چہروں پر آگیا تھا دیگر بھابیاں بھی گولا گنڈ اسی بنی ہوئی بیٹھی تھیں۔

اور اماں..... حیران ہو کر سوچ رہی تھیں کہ یہ میڈم جی اتنی سیدھی سادی بھی ہو سکتی ہیں جو بچے کو گود میں لیے یوں پیار کر رہی تھیں جیسے وہ ان کا اپنا بھانجا یا بھتیجا ہو..... یہ بڑے لوگ بھی کس، کس رنگ کے ہوتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

خوشی کی تصویر

رضیہ کا پھوپھو پرن دیکھ کر مجھے ہمیشہ طمانیت کا احساس ہوتا ہے کہ میں اس دنیا میں اکیلی نہیں ہوں جو اپنے آپ کو کسی غم میں ہلکان نہیں کرتے۔

مجھے ہمیشہ ایسے افسانے اور ناول اچھے لگتے ہیں جس میں کسی پھوپھو عورت کو ایک اچھی عورت سمجھا جائے۔ اس کے پھوپھو پرنے میں بھی اس کے ہنر ڈھونڈے جائیں بلکہ اس کے طفیل اسے معصوم، اللہ، نیک، شریف اور سب سے محبت کرنے والی کے خطابات دیے جائیں۔

سلیقہ مند، ماہر کام کاج اور چلتر قسم کی خواتین سے مجھے ازلی بیر ہے..... وہ عورتیں جو اپنے سلیقے کی

291 ماہنامہ پاکیزہ مئی 2014ء

جلد نمبر

اپنے پیر دھو کر گئیں..... بلکہ مجھ پر اچانک ہی گرم ہو کر بولیں..... میرے پیر تم فوراً دھلوادے..... میں نے مہمان سمجھ کر لوٹے سے ان کے پیر دھلوادے.....“ (میں اصل معما گول کر گئی کہ ان کے پیر میرے چھوٹے بلو کے پیشاب میں اچانک سن گئے تھے۔ دراصل بلو..... تین سال کا تو ہو گیا ہے مگر شوشو بتاتا ہی نہیں)

”ہاں دیکھا تو تھا میں نے..... مگر مجھے معلوم نہیں ہوا کہ ان کے پاگل پن کا کوئی چکر ہوگا.....“ میاں جی حیران سے ہو کر بول رہے تھے۔

”ان کے سسرال والے تو ان کے پاگل پن کی وجہ سے بھاگ گئے۔“ (جبکہ وہ لوگ باہر شفٹ ہو گئے تھے..... اپنے دوسرے بیٹے کے پاس)

”اچھا ہوا، یہ سب پہلے سے ہی پتا چل گیا.....“ ورنہ مجھے یہ لوگ اچھے لگنے لگے تھے.....“ میاں جی کا چہرہ ہنوز صدمے سے پیلا تھا۔

اب وہ تاج صاحب کو فون کر کے کہہ رہے تھے کہ وہ کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر جا رہے ہیں..... واپس آ کر خود رابطہ کریں گے اور میں نہال، نہال سی اپنے کمرے میں ناچ رہی تھی۔

”شوشو گویا بدنام آج میرے لیے۔“

”حقیقت تو یہ تھی کہ مسز تاج کی عزیزہ نے مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ بے حد صفائی پسند، سلیقہ مند ہیں اور نفاست تو ان پر ختم ہے۔ کسی وقت بھی ان کے گھر چلے جاؤ، مگر شیشے کی طرح چمکا نظر آتا ہے۔“ اب ایسے لوگوں سے مل کر مجھے احساس کمتری کا شکار تھوڑی ناں ہونا تھا اور جب ایسے لوگوں سے مل کر مجھے وحشت ہوتی ہے تو میں کیوں ملوں۔

”اللہ میری نسرین، رضیہ، اور عنبرین کو سلامت رکھے۔ جو خوشی مجھے ان سے مل کر ہوئی ہے اس کی تصویر نہیں کھینچی جاسکتی..... جی ہاں..... اور آپ کی بھی یقیناً ایسی کوئی نہ کوئی سہیلی تو ضرور ہوگی..... جس کے ساتھ بیٹھ کر ایسا قہقہہ لگایا جائے کہ یوں لگے کہ اس نے چھت پھاڑ دی ہو.....“

تک آنے کی سکت ہی نہیں رکھتی تھی۔

ہر ساس کی بیٹی تو کمزوری ہوتی ہے کہ اسے ہمیشہ دوسرے کی بہو اچھی لگتی ہے۔ ٹھیک ہے، میں ان کی طرح حسین نہ تھی مگر سال چھ مہینے میں کبھی تو کوئی کپڑا مجھ پر کھلا ہوگا..... مگر بڑھیا نے ہماری تو کبھی نظر نہیں اتاری تھی بلکہ میری شکل دیکھ کر ان کے لبوں سے ٹھنڈی آہیں آزاد ہو جایا کرتی تھیں۔ اور وہ اکثر آسمان کی طرف شکوہ بار نگاہیں ڈال کر قسمت اپنی کا گیت گنگنا کر کرتی تھیں۔

”سنیے.....! آپ اپنے نئے دوست تاج صاحب سے میل ملاپ کم کر لیجیے، مجھے ان کی چھمک چھوٹنا بیوی کا آنا پسند نہیں ہے۔“ ایک دن میں نے میاں جی سے کہا۔

”کیوں بھئی، اتنے پیارے سے لوگ ہیں۔“ لفظ ”پیارے سے“ کو انہوں نے کچھ زیادہ ہی پیار سے ادا کیا اور چند لمحوں کے لیے جھوم گئے۔ شاید تصورات کی اڑان کے ناتے ایسا ہوا ہو۔

”ہوں گے پیارے..... مگر مجھے ایسے نہیں لگتے.....“ مگر مجھے اس گھر کی بہتری ہمیشہ عزیز تھی اور رہے گی۔

”بات کیا ہے آخر.....؟“ وہ چونک کر بولے..... کہ کہیں ان کی چوری تو نہیں پکڑی گئی..... حالانکہ شادی شدہ مرد کو چور قرار دینا بے حد مشکل کام ہوتا ہے..... وہ چور ہوتے ہوئے بھی چور بننے کو تیار نہیں ہوتے۔ (حد ہے بے غیرتی کی)

”مجھے مسز تاج کی ایک عزیزہ ملی تھیں، انہوں نے بتایا کہ تاج صاحب کی بیگم شامکہ نفسیاتی مریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیریس مرض میں بھی گرفتار ہیں جس میں اگر انہیں غصہ آجائے تو سامنے والے کا سر بھی توڑ سکتی ہیں۔ ابھی پچھلے ماہ انہوں نے تاج صاحب کے دو دوستوں پر خواہ مخواہ چھری سے وار کر دیا..... جبکہ کوئی بات بھی نہیں تھی۔“

”اچھا وہ تو نفسیاتی مریضہ کے بجائے پاگل ہی ہوئیں۔“ میاں جی صدمے سے پہلے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”کل آپ نے دیکھا نہیں کہ اچانک چلتے وقت

بنیان پہن کر بھی آجاتی ہے۔

اسے رنگوں کا بھی اتنا خیال نہیں رہتا..... اس لیے کہیں تعزیت پر جاتے وقت اگر وہ شوخ رنگ کے جھلمل کپڑے پہن جائے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مرنے والے سے اس کی دشمنی تھی..... جو وہ یوں خوشی کا اظہار کر رہی ہے..... اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کو ان کپڑوں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آیا۔

اپنی دوست عنبرین کے گھر میں جب بھی جاؤں وہ الٹا پڑا ہوتا ہے..... مگر وہ مزے سے رضائی میں دبکی ٹی وی دیکھ رہی ہوتی ہے..... مجھے دیکھ کر وہ ڈرائنگ روم میں نہیں بھاگتی..... بلکہ وہیں اپنی رضائی میں مجھے جگہ دیتی ہے۔ چائے، کھانا، کافی سب وہیں پر بیٹھے، بیٹھے مل جاتا ہے۔

رضیہ، نسرین، عنبرین میں کسی کے گھر بھی چلی جاؤں ہمیشہ دلی طمانیت حاصل ہوتی ہے مگر کچھ عرصے سے ہمارے میاں جی کے ایک نئے دوست اپنی بیگم کے ساتھ ہمارے گھر آنے لگے تھے جنہیں دیکھ کر ہی مجھے وحشت سی ہوا کرتی۔

ان کی بیگم کا نام ہی مجھے پسند نہیں آیا تھا۔ شامکہ..... یعنی خویوں والی، صفات کا مجموعہ..... اس پر ان کا سبک سانا نقشہ، متوازن، جسم اور بلا کی ویدہ زیب..... جو پھنٹیں کپڑا کھل اٹھتا۔

وہ ساڑی تو نفاست سے باندھا کرتی تھیں مگر جب وہ اس کی قال چنگی میں پکڑ کر چلتیں تو میاں صاحب کے ساتھ ساس بھی اترایا کرتیں..... واقعی قیامت کی چال تھی۔

ہماری ساس ان کو دیکھ کر ہمیشہ آپے سے باہر ہو جاتیں۔ ان کی بلا میں اتارتیں اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی کٹپٹی پر جٹا لیتیں۔

”اماں جان آپ ایسا کیوں کرتی ہیں؟“ میں بوکھلا کر پوچھا کرتی۔

”بلا میں لیتی ہوں شامکہ کی.....“

”آپ کی اپنی بلا میں کم ہیں جو دوسروں کی بلا میں بھی سمیٹا کرتی ہیں۔“ میرے دل کی آواز لیوں

کہانیاں سناتی ہیں..... وہ انتہائی بری لگا کرتی ہیں..... یہی وجہ ہے کہ میرے حلقہ احباب میں اس قسم کی کوئی عورت آپ کو نظر نہیں آئے گی۔

نجمہ میری خاص سہیلی ہے اور جب بھی وہ میرے گھر آتی ہے، عموماً دورنگی چپل پہن کر آتی ہے وہ بھی چپل دیکھ کر نہیں پہنتی اس لیے اس کے ایک پاؤں میں اپنی بھانج کی چپل اور دوسرے پیر میں اپنی بہن کی چپل ہوتی ہے اور جب ہمارے گھر سے جاتی ہے تو اس کے ایک پیر میں میری چپل اور دوسرے میں اس کی اپنی چپل ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے جانے کے بعد میری ساس خاصا واویلا مچاتی ہیں مگر میں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتی ہوں..... کہ بھلا اپنے مہمانوں پر بھی کسی قسم کی کوئی ردک ٹوک کی جاسکتی ہے؟ نسرین کے پیرا تے پھٹے ہوئے ہوتے ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ جب وہ آئے تو اس کی کٹی پھٹی ایڑیوں پر مرہم لگاؤں، جس طرح میں اپنی ایڑیوں پر لگاتی ہوں، میرے اس انداز پر اس کی آنکھیں بھر آتی ہیں مگر ہم دونوں سہیلیاں اپنے پیروں پر مرہم لگائے، صوفوں پر چڑھ کر اپنی پسند کی مووی دیکھتے رہتے ہیں اور اس پر ریمارکس پاس کرتے رہتے ہیں۔

مجھے فلموں کا شوق کچھ اتنا زیادہ ہے کہ فلم دیکھنے کے دوران اسے یہاں تک بتا دیتی ہوں کہ اب وہ دوسرا ڈائلاگ کیا بولے گی اور اس پر سامنے والا کیا ایکشن لے گا، میری سہیلی میری ذہانت سے بہت متاثر ہوتی ہے کہ یوں بھی میں ذہین تو خیر ہوں ہی مگر مذکورہ فلمیں میری کم از کم دس بار کی دیکھی ہوئی ہیں۔

میری دوست ثریا تو اتنی سادہ لوح ہے کہ کپڑے بھی دیکھ کر نہیں پہنتی..... اس کی شیز ہمیشہ قمیص سے تنگی ہوتی ہے اور قمیص کے اوپر شیز کا گلا قمیص سے باہر نظر آتا ہے، یوں تو ہائی کلاس کی خواتین میں یہ فیشن بھی ہے مگر میری یہ دوست تو تن آسان سی ہے کہ جو جیسا اور جہاں ہاتھ آیا..... پہن لیتی ہے اگر اسے شیز نہ ملے تو مردانہ بنیان پہن لیتی ہے جبکہ اپنی جلد بازی میں اکثر اگلے

☆ جبین نیاز..... ملتان
معترف ہے مگر اظہار سے گھبراتا ہے
کیا غضب ہے، وہ مرے پیار سے گھبراتا ہے
☆ عصمت فاطمہ..... شجاع آباد
یہ بھی دنیا ہے وہی آؤ کہیں اور چلیں
آئے تھے ہم تو اسی درد سے ڈرتے بچتے
سسکیاں گیت کی لے سے ہیں گلوگیر یہاں
گرم اشکوں میں شرابور ہیں رعنا چہرے
☆ رضوانہ سمیع..... کراچی
لوٹ آیا ہے جو آواز نہ اس کی پائی
جانے کس در پہ کسے جا کے رکھنا ہوگا
یاں تو ہر روز کی باتیں ہیں یہ جیتیں مائیں
یہ بھی چاہت کے کسی کھیل میں ہارا ہوگا
☆ در شہوار..... گوجران
بہت عزیز سہی اس کو میری دلداری
مگر یہ ہے کہ کبھی دل میرا دکھا بھی گیا
اب ان در پچوں پہ گہرے دبیز پردے ہیں
وہ تاک جھانک کا معصوم سلسلہ بھی گیا
عشرت حسین..... رحیم یار خان
آپ کا اب بھی ہر اک ظلم گوارا ہے مگر
بے وفا کی کا نہ الزام لگایا جائے
☆ فریدہ جعفر..... لاہور
کل راستے میں جس سے ملاقات ہوگئی
رہتا تھا دل کے پاس مگر اجنبی لگا
برسوں ہمارا عکس رہا جس کے روبرو
وہ آئینہ بھی پیش نظر اجنبی لگا
☆ زریں زبیر..... کراچی
ستم کے دور میں ہم اہل دل ہی کام آئے
زباں پہ ناز تھا جن کو وہ بے زباں نکلے
☆ ڈاکٹر نفیسہ نہال..... لاہور
مجھ کو ترے فراق نے بخشی ہے زندگی
موتی مثال کر گیا غم کا صدف مجھے

☆ مخبرین خالد..... حیدر آباد
یہ کون لوگ اندھیروں کی بات کرتے ہیں
ابھی تو چاند تری یاد کے ڈھلے بھی نہیں
ابھی سے میرے رنو گر کے ہاتھ جھکنے لگے
ابھی تو چاک مرے زخم کے سسلے بھی نہیں
☆ بختا وریلوچ..... لوی بلوچستان
بادل کو کیا خبر ہے کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر چاک ہو گئے
جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے
☆ سعیدہ بانو..... مری
کہیں تم اپنی قسمت کا لکھا تبدیل کر لیتے
تو شاید ہم بھی اپنا راستہ تبدیل کر لیتے
اگر ہم واقعی کم حوصلہ ہوتے محبت میں
مرض بڑھنے سے پہلے ہی دوا تبدیل کر لیتے
☆ محبت آصف..... اسلام آباد
ہم تو دشمن کو بھی پاکیزہ سزا دیتے ہیں
ہاتھ اٹھاتے نہیں نظروں سے گرا دیتے ہیں
☆ غزالہ طارق..... سرگودھا
ہمیں خبر ہے ہوا کا مزاج رکھتے ہو
مگر یہ کیا کہ ذرا دیر کو رکے بھی نہیں
☆ بشری رضا..... کوہاٹ
اک شب غم کے اندھیرے پہ نہیں ہے موقوف
تو نے جو زخم لگایا ہے وہ گہرا اترا
☆ شہلا محمود..... واہ کینٹ
چھو کر ہی آئیں منزل امید ہاتھ سے
کیا راستے سے لوٹا جب پاؤں پھل چکا
☆ کائنات عبدالحلیم..... میرپور خاص
دل اسے چاہے جسے عقل نہیں چاہتی ہے
خانہ جنگی ہے عجب ذہن و بدن میں اب کے
جی یہ چاہے، کوئی پھر توڑ کے رکھ دے مجھ کو
لذتیں ایسی کہاں ہوں گی تھکن میں اب کے

☆ عنبر وسیم..... گوجرانوالہ
منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
کچھ بڑی بات بھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
☆ عالیہ بشیر..... اسلام آباد
ہیں رنگ کئی ان کے پر پختہ نہیں ہوتے
یہ لوگ بھی کیا شے ہیں شرمندہ نہیں ہوتے
گل کے ربخ رنگیں پہ بھی آنسو ہیں صبح دم
یہ کس نے کہا ہنستے ہوئے چہرے نہیں روتے
☆ ارم کمال..... فیصل آباد
اس عرصہ قتل میں میرے عہد کی مائیں
کیوں دیتی ہیں بچوں کو جوانی کی دعائیں
☆ سمر نسیم..... جہلم
ساحل قریب دیکھ کر یوں مطمئن نہ ہو
اکثر سفینے ڈوبتے ہیں ساحل کے پاس ہی
☆ نگینہ ضیائش..... کیاڑی
کسی کے ظرف سے بڑھ کر نہ کر مہر و وفا ہرگز
کہ اس بے جا شرافت سے بڑا نقصان ہوتا ہے
☆ فیصلہ آصف خان..... ملتان
پاتے ہیں کچھ گلاب چٹانوں میں پرورش
آتی ہے پتھروں سے بھی خوشبو بھی بھی
☆ عرشہ جنید..... کراچی
ہم اوس کے قطرے ہیں کہ نکھرے ہوئے موتی
دھوکا نظر آئے تو ہمیں رول کے دیکھو
☆ نزہت جمیل ضیا..... کراچی
فقط ایک بل کے فراق میں کئی خواب کرچاں ہو گئے
جو پلٹ کے آئے تو یوں لگا یہاں سلسلہ کوئی اور ہے
کئی عمر اک اسی چاہ میں اسے دیکھتے کسی راہ میں
مگر اک زمانے کے بعد جو ہوا آشنا کوئی اور ہے
☆ راجہ صابر..... کراچی
ایسی خالی نسل کے خواب ہی کیا ہوں گے
جن کی نیند کا سرچشمہ تک چرس میں ہے



میں اکثر گنگنائی ہوں

معنری زیدی

☆ ماہ زیب..... چوئیاں
بھگتے رہے بارشوں میں اکثر
کبھی مانگی کسی سے پناہ نہیں
حسرتیں پوری نہ ہوں تو نہ سہی
خواب دیکھنا تو کوئی گناہ نہیں
☆ لاریب..... چوئیاں
جو ہو سکے تو بھلا دینا رجشیں دل کی
کہ محبت کا تقاضا ہے درگزر کرنا
تیرے طرز تغافل سے کیا گلہ ہمیں
شاید ہمیں ہی آتا نہیں دلوں میں گھر کرنا
☆ صائمہ سجاد شش..... کوہاٹ
یہ پھول مجھے کوئی وراثت ملے ہیں
تم نے میرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا
☆ ماریہ فراز..... لاہور
ابر کی طرح ہے وہ، یوں نہ چھو سکوں لیکن
ہاتھ جب بھی پھیلائے آگیا دعاؤں میں
☆ ارم ناز..... کراچی
دو چار دن کی بات نہیں یہ منصب جنوں
برسوں میں جا کے رابطہ سنگ و سر ہوا

کھانے کے بارے میں احادیث مبارکہ

آپ نے ارشاد فرمایا ہے انبیاء کا سالن سرکہ رہا ہے اور سرکہ کیسا اچھا سالن ہے۔ (شمائل ترمذی)

☆ ایک حدیث میں ہے کہ جس گھر میں سرکہ ہو وہ محتاج نہیں یعنی سالن کی احتیاج باقی نہیں۔ (ابن ماجہ)

☆ آپ نے فرمایا۔ ”زیتون کا تیل کھانے میں استعمال کرو اور مالش میں بھی اس لیے کہ یہ ایک بابرکت درخت کا تیل ہے۔“ (شمائل ترمذی)

☆ آپ رات کا کھانا بھی تناول فرمایا کرتے تھے اگرچہ کھانے کے چند لقمے ہی کیوں نہ ہوں۔ فرمایا کرتے تھے۔ ”عشا کا کھانا چھوڑ دینا بڑھاپا لاتا ہے۔“ (ترمذی۔ ابن ماجہ)

☆ ایک حدیث میں ہے جو دسترخوان پر گری ہوئی چیز اٹھا کر کھا لیتا ہے اس کی اولاد حسین و جمیل پیدا ہوتی ہے اور اس کی محتاجی دور ہو جاتی ہے۔ (مدارج النبوة)

مرسلہ: لاریب، ماہ زریب، چونیاں

کیلے، آئسنگ شوگر اور پیر ڈال کر آمیزہ کر بی کر لیں۔ اب انناس بھی اسی آمیزے میں بلیٹ کر لیں۔ سارا آمیزہ ایک پیالے میں انڈیل دیں۔ جیلٹن پاؤڈر کو چار ٹیمبل اسپون انناس کے رس میں اچھی طرح حل کریں اور اس مخلول کو پیالے میں انڈیلے گئے آمیزے پر پھیلا دیں۔ ایک الگ پیالے میں انڈے کی سفیدی خوب اچھی طرح پھینٹیں کہ سفید سخت جھاگ بن جائے اب اس جھاگ کو بھی اسی آمیزے پر ڈال دیں۔ اب اس آمیزے کو کیک کے سانچے میں انڈیل لیں اور سانچے کو ہلا، ہلا کر آمیزے کی سطح ہموار کر لیں اور اسے آدھے گھنٹے کے لیے فریژر میں رکھ کر پھر فریج میں رکھ دیں جب خوب ٹھنڈا ہو جائے تو کسی سردنگ ڈش میں احتیاط سے سانچے سے نکال کر پیر الگ کر لیں اوپر کیلے اور انناس کے چند ٹکڑوں سے سجا کر پیش کریں۔

اور ک لہسن پیسٹ ایک، ایک چائے کا چمچ۔ پس سرخ مرچ، نمک، حسب ذائقہ۔ لیموں کا رس، چار کھانے کے چمچ۔ دہی 1/2 پیالی۔ زروے کا رنگ، ایک چائے کا چمچ۔ سرکہ 1/2 پیالی۔ پیا گرم مسالا، ایک چائے کا چمچ۔ کوئلہ دم کے لیے۔

ترکیب: مرغی کے ٹکڑوں پر چھری کی مدد سے ہلکے، ہلکے کٹ لگا لیں۔ ایک پیالے میں سرکہ اور زروے کا رنگ ملا کر مرغی ڈال کر رکھ دیں۔ ایک برتن میں دہی کے ساتھ دیگر مسالے (علاوہ سرکہ اور رنگ) مکس کر دیں اور اب سرکہ لگی مرغی کو دہی کے آمیزے میں میرینٹ کر کے رکھ دیں کم از کم دو سے تین گھنٹے کافی ہوں گے اب ایک دہی میں یہ مسالا لگی چکن پھیلا کر رکھ دیں اور اتنا پانی ڈال دیں کہ یہ ہلکے، ہلکے ڈوب جائیں اب ہلکی آگ پر چڑھا دیں۔

..... آدھے گھنٹے بعد ہلکے ہاتھ سے انہیں ہلٹ دیں اور پانی سوکھنے تک ہلکی آگ پر رکھیں جب مکمل چائیں تو کوئلہ دھکا کر پیاز یا روٹی کے ٹکڑے پر رکھ کر دہی میں رکھ دیں ذرا سا گھی کوئلے پر ڈالیں اور ڈھکن بند کر دیں۔ مزید ارنکے تیار ہیں۔ کچھ افراد کوئلے کی دھونی پسند نہیں کرتے توئلے کو گرم توے پر الٹ لٹ کر کے باری کیو کا حرہ لے لیں۔ گوشت اتنا بھی نہ کھلے کہ یہ سب کرنے میں ٹوٹ جائے۔ پودینے کی چٹنی اور پیاز کے لچھوں کے ساتھ پیش کریں۔

راجعہ شاہد..... یو اے ای

کیلے اور انناس کی کریمی جیلی

اشیا: کیلے چار عدد۔ انناس، 425 گرام فریش یاٹن کچھ بھی۔ کالج چیز (پیر) 225 گرام یا ایک کپ۔ انناس کا رس صرف 1/2 پیالی جیلٹن پاؤڈر ایک چائے کا چمچ، انڈے کی سفیدی، دو عدد۔ آئسنگ شوگر، دو ٹیمبل اسپون۔

ترکیب: گول کیک کے سانچے میں نان اسٹک بیکلک پیر یا بٹر پیر چپکا میں اتنا بڑا ہو کہ سانچے سے دو انچ باہر اور اوپر کوئلے آئے۔ نوڈ پروسیسریا مکسر میں

فرائڈ چانپیں

اشیا: چانپیں، 1/2 کلو۔ میدہ، 3 یا 4 کھانے کے چمچ۔ انڈے، 2 عدد۔ نمک، مرچ، حسب ذائقہ۔ لونگ، 6 عدد۔ پیا ہوا گرم مسالا، 1 چائے کا چمچ۔ لہسن، 6 جوئے۔ تیل، تلنے کے لیے۔

ترکیب: چانپوں کو نمک، لونگ اور لہسن ڈال کر ابال لیں۔ جب پانی بالکل خشک ہو جائے تو چانپیں ٹھنڈی کر لیں۔ انڈوں کو پھینٹ کر نمک، سرخ مرچ، میدہ اور گرم مسالا ملا کر خوب اچھی طرح پھینٹ کر مناسب گاڑھا آمیزہ بنائیں۔ ایک، ایک چانپ لے کر اس آمیزے میں ڈبو، ڈبو کر گرم تیل میں تل کر سنہری کر لیں۔ ڈش میں سلاو کے پتے دھو کر سجائیں، ٹماٹر یا گاجر کے پھول بنا کر سجائیں، پیاز کے گول، گول لچھے پھر درمیان میں تلی ہوئی گرما گرم چانپیں رکھیں اور لطف اندوز ہوں۔

عرشیہ جنید..... کراچی

نکاکباب

اشیا: بیف، پسندے، دو کلو۔ دہی، ایک پاؤ۔ پیا ہوا سفید زیرہ، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ گرم مسالا (پیا ہوا)، دو چائے کے چمچ۔ پیٹا (پیا ہوا)..... دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب: دہی میں... تمام اشیا مکس کر لیں پھر پسندے دھو کر دہی میں اچھی طرح ملا دیں اور چار گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ اب کوئلوں کو گرم کر لیں اور پسندے سینوں میں پرو کر کوئلے کی آگ پر سرخ کر لیں سب کو گھمائی جائیں تاکہ تمام اطراف سے سرخ ہوں۔ تھوڑا گھی یا تیل صاف کپڑے کی دھجی میں لگا کر کبابوں پر لگاتی جائیں تاکہ چمک پیدا ہو جائے۔ پودینے کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔ جنیں نیاز..... ملتان

جٹ پٹے چکن نکے

اشیا: گھر میں ہی بازاری سینوں پر بنے نکے کا لطف اٹھائیں) مرغی کے بڑے پیر چار عدد۔ ایک مرغی میں چار ہی بڑے نکے بنتے ہیں۔

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



زعفرانی قورمہ

اشیا: بکرے یا گائے کا گوشت، آدھا کلو۔ پیاز، درمیان میں تین عدد (گولڈن کر لیں)۔ دہی، آدھی پیالی۔ لہسن، آدھی پوتھی۔ اورک، ایک انچ کا ٹکڑا۔ دھنیا پیا ہوا، ایک چائے کا چمچ۔ چھوٹی الائچی، چار عدد۔ پیا ہوا گرم مسالا، 1/2 چائے کا چمچ۔ زعفران، 1/2 چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ مرچ، حسب ضرورت۔ تیل، حسب ضرورت۔

ترکیب: اورک، لہسن اور پیاز پیاز پیس کر دھنیا اس میں ملا دیجیے اور ایک دہی میں پیچھی میں تیل کڑکڑانے کے بعد پہلے اس میں گوشت بھونیں پھر باقی مسالا مع دہی ڈال کر بھونیں اور دہی کا پانی خشک کرنے کے بعد مرچ اور نمک ڈال کر بھوننا جاری رکھیے پھر تھوڑا پانی ڈال کر گوشت گلائیں۔ گوشت گل جانے پر آخر میں پس ہوئی الائچی اور زعفران ڈال دیجیے۔ چند منٹ تک دم پر رکھنے کے بعد اتار لیجیے۔ لذیذ اور خوش ذائقہ زعفرانی قورمہ تیار ہے۔ تندرستی روٹی کے ساتھ تناول فرمائیں۔

حنا کاشف..... حیدرآباد

سندیس

پاکیزہ
بہنیں



شکر کرو اور خوشی حاصل کرو

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔
پریشانی تذکرہ کرنے سے بڑھ جاتی ہے
خاموش ہونے سے کم
صبر کرنے سے ختم
اور شکر کرنے سے خوشی میں بدل جاتی ہے۔
صبا نور، لہ

گم صم

جانمندی رات میں
گھنے درختوں کے نیچے بیٹھا ہے کوئی
سوچوں میں گم یا گونگا سا
جوا اپنے دل کی بات مجھ سے کہتا ہی نہیں
خولہ بنت جوا، کراچی

تم

تم ایسے مجھ کو..... لگتے ہو
جیسے چاند، ستارے
چمکتے ہیں
آسمان میں جھمک کرتے ہیں

آپس میں گھلتے ملتے ہیں
سنگ ہمیشہ رہتے ہیں
تم مجھے اتنے اچھے لگتے ہو

از..... افسانہ آفتاب کاوش، کراچی

اپنی پاکیزہ بہنوں کے نام

وہ جو دل میں تیرا مقام ہے
کسی اور کو وہ دیا نہیں
وہ جو رشتہ تجھ سے ہی بن گیا
کسی اور سے وہ بنا نہیں
وہ جو پیار تجھ سے ہو گیا
کسی اور سے وہ ہوا نہیں
وہ جو راز تجھ سے کہہ دیا
کسی اور سے وہ کہا نہیں
وہ سکون ملا تیری ذات سے
کسی اور سے وہ ملا نہیں
تو ہوا ہے جتنا قریب تر
کوئی اور اتنا ہوا نہیں
تیرا نام دل میں ہے جس طرح
کوئی اور ایسے بسا نہیں

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلاوالی

ویکھی

کے اکھ وچ میں وردگی دیکھی
کے اکھ وچ بھجدی میں زندگی دیکھی
حیرت نال میں کیوں نال مرگئی شاد
نفرت دے اگے جدوں میں محبت ہر دی دیکھی
خوشیاں دی سڑ کے سوا ہو گیان
ٹک دی اگ جدوں ہر پاسے بلدی دیکھی
اک امیر دے قدماں تھلے پیسہ لڑدا دیکھی
اک غریب دی اکھیاں وچ حسرت میں روئی دیکھی
پر اے سچ اے شاد کچھ رہنا نہیں اتھے سدا
اس حقیقت دی نشانی ارج جوانی میں ڈھک دی دیکھی
شاعرہ: ایشل شادیان شاد..... گولارچی

روحانی مشورے

صلوۃ التسبیح کے

فضائل و مسائل

سبحان اللہ والحمد للہ لا الہ الا اللہ واللہ اکبر
یہ تسبیح جس کا اور ذکر کیا گیا نہایت ہی اہم اور
دین و دنیا میں کارآمد اور مفید ہے جیسا کہ احادیث
میں مذکور ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے ان کے اہتمام
اور فضیلت کی وجہ سے ایک خاص نماز کی ترغیب بھی
فرمائی ہے جو صلوۃ السبح (تسبیح کی نماز) کے نام سے
مشہور ہے۔ اس کو صلوۃ السبح اس لیے کہا جاتا ہے کہ
اس میں تین سو مرتبہ یہ تسبیح پڑھی جاتی ہے۔ حضور ﷺ
نے بہت ہی اہتمام اور ترغیب کے ساتھ اس نماز کو
تعلیم فرمایا، چنانچہ حدیث میں وارد ہے۔

”حضور اقدس ﷺ نے ایک مرتبہ اپنے چچا
حضرت عباسؓ سے فرمایا، اے عباس میرے چچا کیا
میں تمہیں ایک عطیہ کروں؟ ایک بخشش کروں؟ ایک
چیز بتاؤں؟ تمہیں وہ چیزوں کا مالک بناؤں.....؟
جب تم اس کام کو کرو گے تو حق تعالیٰ شانہ تمہارے
تمام گناہ پرانے اور نئے، دانستہ یا نادانستہ کئے ہوئے
چھوٹے اور بڑے، چھپ کر کیے ہوئے یا کھلم کھلا کیے
ہوئے سب ہی معاف فرمائے گا۔ وہ کام یہ ہے کہ
چار رکعت نفل (صلوۃ السبح کی نیت باندھ کر) پڑھو
اور ہر رکعت میں جب الحمد اور سورہ پڑھ چکو تو رکوع
میں جانے سے پہلے سبحان اللہ والحمد للہ لا الہ الا اللہ
واللہ اکبر 15 مرتبہ پڑھو جب رکوع کرو تو 10 مرتبہ
رکوع میں یہی تسبیح پڑھو۔ پھر جب رکوع سے کھڑے
ہو تو 10 مرتبہ پڑھو پھر سجدہ کرو تو 10 مرتبہ اس میں
پڑھو پھر جب سجدے سے اٹھ کر بیٹھو تو 10 مرتبہ یہی



ادارہ

تسبیح پڑھو پھر دوسرے سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ
کہنے کے بعد 10 مرتبہ یہی تسبیح پڑھو پھر جب
دوسرے سجدے سے اٹھو تو (دوسری رکعت میں)
کھڑے ہونے سے پہلے بیٹھ کر 10 مرتبہ پڑھو۔ ان
سب کی میزان پختہ ہوئی۔ اسی طرح ہر رکعت میں
75 دفعہ ہوگا اور چوتھی رکعت میں التحيات سے پہلے
10 مرتبہ تسبیح پڑھیں پھر التحيات شروع کریں اگر ممکن
ہو سکے تو روزانہ ایک مرتبہ یہ عمل کر لیا کرو..... یہ بھی نہ
ہو سکے تو ہر مہینے میں ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو..... یہ بھی نہ
ہو سکے تو ہر سال میں ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو، یہ بھی نہ
ہو سکے تو عمر بھر میں ہی ایک مرتبہ پڑھ لو۔“

(ابوداؤد و جلد صفحہ 191)

پہلی رکعت میں نقشہ

تسبیحات کی تعداد

سورہ فاتحہ اور دیگر سورہ کے بعد رکوع سے پہلے.....
15 مرتبہ
پھر رکوع میں سبحان ربی الاعلیٰ کے بعد.....
10 مرتبہ
پھر قنوتہ میں..... 10 مرتبہ
پھر پہلے سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ کے بعد
10 مرتبہ
پھر جلسہ..... 10 مرتبہ
پھر دوسرے سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ کے
بعد 10 مرتبہ
پھر دوسرے سجدے سے واپس اگے..... 10 مرتبہ
پھر اسی ترتیب سے چاروں رکعات میں تسبیح
پڑھیں اس طرح چار رکعات میں کل تسبیحات تین سو

بچے کی ولادت پر ماں کی غذا

1۔ حضرت محمد ﷺ کا ارشاد ہے کہ بچے کی ولادت کے بعد ماں کے لیے کھجور سے بہتر کوئی غذا نہیں اور بیمار کے لیے شہد سے بہتر کوئی علاج نہیں ہے۔

2۔ بچے کی ولادت کے بعد ماں کی پہلی غذا کھجور ہونی چاہیے کیونکہ اللہ عزوجل نے حضرت مریم سے فرمایا درخت کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ تم پر تازہ کھجوریں گریں گی۔

کسی نے سوال کیا۔ یا رسول اللہ اگر کھجوروں کا موسم نہ ہو تو کیا کریں؟ آپ نے فرمایا۔ ”مدینے کی کھجوروں میں سات کھجوریں اور اگر وہ بھی نہ ہوں تو تمہارے اپنے شہر کی سات کھجوریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مجھے اپنی عزت و جلال کی عظمت کی قسم اگر زچہ، بچے کی ولادت کے بعد پہلی غذا اسی روز کھائے تو اگر بیٹا پیدا ہوا ہے تو وہ بچہ بربار، حلیم طبع ہوگا اور اگر بیٹی پیدا ہو تو وہ بیٹی بربار ہوگی۔“

مرسلہ: جنیں ہاشمی، بھیرہ

بخشش کی اور دیگر اچھے مقاصد میں کامیابی کی دعا مانگ سکتے ہیں لہذا اسی کو اپنے عمل میں لے لیں۔

(بشکریہ البلاغ)

نوٹ: چھوٹی صلوٰۃ التسبیح تسبیح بیماروں اور بزرگوں کو بطور خاص بتائیں اور خود بھی روزانہ پڑھیں اور دیگر لوگوں کو بھی بتا کر ثواب میں شامل ہو جائیں۔

میں کسی بھی وقت یا پھر رات کو۔
(فضائل اعمال صفحہ ۵۹۲)
مسئلہ (۷) بعض احادیث میں اس تسبیح کے ساتھ لاحول کو بھی ذکر کیا گیا ہے، اس لیے اگر کبھی اس کو بڑھالے تو اچھا ہے۔

(ماخوذ فضائل اعمال صفحہ ۵۹۲)

چھوٹی صلوٰۃ التسبیح

صلوٰۃ التسبیح مشہور تو یہی ہے کہ جس کی تفصیل لکھی گئی، بعض احادیث میں ایک اور صورت بھی مقبول ہے جو دینی اور دنیاوی مقاصد پورے ہونے کے لیے مجرب ہے اور مشائخ نے اس کا نام ”چھوٹی صلوٰۃ التسبیح“ رکھا ہے، اس کی صورت یہ ہے۔

حضرت ام سلیم فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو چند کلمات سکھائے جن کو وہ نماز کے اندر پڑھ لیں تو جو دعا مانگیں گی وہ قبول ہوگی، وہ کلمات یہ ہیں۔

”سبحان اللہ“ دس مرتبہ پڑھیں۔ ”الحمد للہ“ دس مرتبہ پڑھیں۔ ”اللہ اکبر“ دس مرتبہ پڑھیں۔

(ترمذی ۶۳/۱، مسند احمد واللفظ لہ)

فائدہ: علامہ منادی نے اس حدیث کو نقل کر کے فرمایا کہ اس کے فوائد جب ملیں گے جبکہ نماز میں ان کلمات کے معانی کا بھی وہ بیان رکھا جائے محض زبان کی حرکت نہ ہو۔ اس مختصر صلوٰۃ التسبیح میں دس مرتبہ جن کلمات کو پڑھنے کا ذکر ہے، نماز کے اندر ان کی کوئی خاص جگہ حدیث شریف میں مقرر نہیں ہے اور علما و مشائخ سے منقول ہونا بھی نظر سے نہیں گزرا، اس لیے نمازی کو اختیار ہے کہ نماز کے جس رکن میں چاہے ان کو پڑھے یا التیحات کے آخر میں پڑھ لے۔

(خلاصہ از نجات المسلمین مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) جو لوگ بڑی صلوٰۃ التسبیح پڑھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں یا اس کے پڑھنے کی فرصت نہ ہو آسانی سے چھوٹی صلوٰۃ التسبیح پڑھ سکتے ہیں بلکہ روزانہ پڑھ سکتے ہیں اور پھر اپنی مغفرت و

(بہشتی زیور مدلل صفحہ ۱۵۷)

مسئلہ (۲) ان تسبیحوں کو زبان سے ہرگز نہ گھسیں کیونکہ زبان سے گھسنے سے نماز ٹوٹ جائے گی۔ انگلیوں کو بند کر کے گنتا اور تسبیح ہاتھ میں لے کر اس پر گنتا جائز ہے۔ مگر مکروہ ہے، بہتر یہ ہے کہ انگلیاں جس طرح اپنی جگہ پر رکھی ہیں ویسی ہی رہیں اور ہر کلمہ پر ایک، ایک انگلی کو اسی جگہ دبا جائے۔

(فضائل اعمال صفحہ ۵۹۱)

مسئلہ (۳) اگر کسی تسبیح کو پڑھنا بھول جائے تو دوسرے رکن میں اس کو پورا کرے، البتہ بھولے ہوئے کی قضا رکوع سے اٹھ کر اور دو سجدوں کے درمیان نہ کرے اسی طرح پہلی اور تیسری رکعت کے بعد اگر بیٹھے تو ان میں بھی بھولے ہوئے قضا نہ کرے بلکہ صرف ان کی ہی تسبیح پڑھے اور ان کے بعد جو رکن ہو اس میں بھولی ہوئی بھی پڑھ لے۔ مثلاً اگر رکوع میں پڑھنا بھول گیا تو ان کو پہلے سجدے میں پڑھ لے۔ اسی طرح پہلے سجدے کی دوسرے سجدے میں اور دوسرے سجدے کی دوسری رکعت میں کھڑا ہو کر پڑھ لے اور اگر رہ جائے تو آخری قعدے میں التیحات سے پہلے پڑھ لے۔

(بہشتی زیور مدلل صفحہ ۱۵۷ مع الزیادہ از فضائل اعمال)

مسئلہ (۴) اگر سجدہ سہو کی وجہ سے پیش آجائے تو اس میں تسبیح نہیں پڑھنا چاہیے اس لیے کہ مقدار تین سو ہے وہ پوری ہو چکی، ہاں اگر کسی وجہ سے اس مقدار میں کمی رہی ہو تو سجدہ سہو میں پڑھ لے۔

(بہشتی زیور مدلل صفحہ ۱۵۷ مع الزیادہ از فضائل اعمال)

مسئلہ (۵) صلوٰۃ التسبیح کی نیت اس طرح ہے یا اللہ! میں تیری رضا کے لیے صلوٰۃ التسبیح کی چار رکعت نقل ادا کرتا ہوں کرتی ہوں۔

مسئلہ (۶) اس نماز کا اوقات مکروہ کے علاوہ باقی دن رات کے تمام اوقات میں پڑھنا جائز ہے۔ البتہ زوال کے بعد پڑھنا زیادہ بہتر ہے یا پھر دن

مرتبہ ہو جائیں گی۔

دوسری اور چوتھی رکعت میں تسبیحات دس مرتبہ التیحات شروع کرنے سے پہلے پڑھیں گے پھر التیحات پڑھیں گے، باقی رکعات میں کوئی فرق نہیں ہے۔
فائدہ: صلوٰۃ التسبیح بڑی اہم نماز ہے جس کا کچھ اندازہ احادیث بالا سے ہو سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کس قدر شفقت اور اہتمام سے اس کو تعلیم فرمایا ہے۔ علمائے امت، محدثین، فقہاء، صوفیاء ہر زمانے میں اس کا اہتمام فرماتے رہے ہیں۔

امام حدیث حاکم نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے صحیح ہونے پر یہ دلیل ہے کہ تبع تابعین کے زمانے سے ہمارے زمانے تک مقتدا حضرات اس پر مداومت کرتے اور لوگوں کو تعلیم دیتے رہے ہیں۔ جن میں عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔

☆ عبدالعزیز بن ابی رولہ و ابن حبسہ کہتے ہیں کہ جو جنت کا ارادہ کرے اس کو ضروری ہے کہ صلوٰۃ التسبیح کو مضبوط پکڑے۔

☆ ابو عثمان حیرتی جو بڑے زاہد ہیں کہتے ہیں کہ میں نے مصیبتوں اور غموں کے ازالے کے لیے صلوٰۃ التسبیح جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی۔

☆ علامہ تقی سبکی فرماتے ہیں کہ جو شخص اس نماز کے ثواب کو سن کر بھی غفلت کرے وہ دین کے بارے میں سستی کرنے والا ہے، صلحا کے کاموں سے دور ہے، اس کو پکا آدمی نہ سمجھنا چاہیے۔

☆ مرقاۃ میں لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس ہر جمعے کو صلوٰۃ التسبیح پڑھا کرتے تھے۔

(مرقاۃ جلد ۳ صفحہ ۱۲۷)

چونکہ یہ نماز عام طور پر رائج نہیں ہے اس لیے اس کے متعلق چند مسائل بھی لکھے جاتے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کو سہولت ہو۔

مسئلہ (۱) اس نماز کے لیے کوئی سورہ قرآن کی متعین نہیں جو سورہ دل چاہے پڑھے۔



بتادیں۔

جواب: بچوں کو متوازن غذا کے ساتھ ٹھیل کود بھی کرائیں کیونکہ نشوونما کے لیے ورزش بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

بچوں کے قد بڑھنے میں بہت وقت ہے۔ ماں، باپ، دادا اور نانا وغیرہ کے قد کے حساب سے ہی قد بڑھتا ہے۔ بچوں کو ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔ 6 ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔ Calc.phos-30 کے 5-5 قطرے 1/2 کپ پانی میں جبکہ Alfalfa-0 کے 7 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔

کالا رنگ سفید ہو جائے

فضہ۔ ضلع اٹک

میرا رنگ کالا ہے میں چاہتی ہوں کہ سفید ہو جائے۔ میرے منہ پر دانے بھی نکلتے ہیں کبھی کم تو کبھی زیادہ جو بعد میں داغ بن جاتے ہیں۔

جواب: رنگ کا کالا ہونا اس کی کئی وجوہات ہوتی ہیں اور خاندانی طور پر بھی رنگ کالا ہوتا ہے۔ داؤ، ایگزیم اور کچھ جلدی بیماریوں میں بھی رنگ کالا پڑ جاتا ہے۔ مختلف قسم کی کریموں اور لٹچ سے بھی چہرے کی رنگت کالی پڑ جاتی ہے کیونکہ یہ جلد کو جلاتی ہیں۔ رنگ نکھارنے کے ساتھ اپنے اوصاف میں نکھار پیدا کریں۔ بلوچ، سری لنکن، نیگرو افریقن، ریڈ انڈین بھی کالے ہوتے ہیں۔ ان کی بھی ایک بیوی ہوتی ہے جس کو بلیک بیوی کہتے ہیں اس لیے اشتہاری دواؤں سے بچیں یہ سب فراڈ ہیں۔ آپ کی جلد کو دیکھنے کے بعد ہی صحیح فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کو دوائی کی

مسئلہ یہ ہے کہ میری صحت بچوں کے بعد سے کمزور ہو گئی ہے۔ کمر اور ٹانگوں میں اکثر درد رہتا ہے۔ کام کروں تو جلد تھک جاتی ہوں۔ گال پچک گئے ہیں۔ حلقے پڑ گئے ہیں۔ بال کمزور ہو کر ختم ہی ہو گئے ہیں اور رنگ پیلا ہو گیا ہے۔

جواب: پہلی غلطی آپ نے یہ کی کہ بچے سیزرین ہوئے۔ ہومیو پیتھک ادویات کے استعمال کے بعد بچے نارمل پیدا ہو جاتے ہیں۔ دوسری غلطی یہ کہ کوئی وقفہ نہ رکھا اس سے یقیناً ماں کی صحت بھی اچھی نہیں رہے گی اور نہ بچوں کی، وہ بھی کمزور ہی ہوں گے۔ تیسری غلطی یہ کہ پہلے بچے کے بعد ہی دوا اور غذا اور آرام کا خیال رکھنا چاہیے تھا جو آپ نے نہیں کیا۔ کام، آرام اور طعام میں توازن رکھیں ساتھ میں ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔

Alfalfa-0 کے 11 قطرے دن میں 3 مرتبہ 1/2 گلاس پانی میں کھانے سے ایک گھنٹا پہلے لیں۔ Calc.phos-30، Ferr.phos-30 کے 5-5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں اور 3 ماہ بعد حال بتائیں۔

بچوں کا قد

عاصمہ خالد۔ وزیر آباد

میرے دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا سات سال کا ہے، اس کا قد 3 فٹ 8 انچ ہے اور چھوٹا 6 سال کا ہے اس کا قد 3 فٹ 3 انچ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان کا قد اچھا ہو وقت کے ساتھ اچھی رفتار سے بڑھے۔ ہمارے خاندان میں سب کے قد اچھے ہیں بچوں کی عمومی صحت اچھی ہے غذا بھی متوازن لیتے ہیں۔ مہربانی فرما کر آپ اچھی سی دوائی



نشوا بے
ہومیوکلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہرو تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، از دو اجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

ولما رشوا بے جرمنی کی 10 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں ایک ماہ بعد حالت بتائیں۔ نشہ چھڑانے کے لیے بھی یقیناً ادویات ہیں۔ مختلف قسم کے نشوں کی مختلف ادویات ہیں۔ حرا کوگی۔ سیالکوٹ

جواب: ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی Ova، Oleum Jec-30، Pulsatilla-30، testa-30 کے 5-5 قطرے 1/2 گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں اور اسی کمپنی کی Fucus ves-0 کے 10 قطرے 1/2 گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔

بچوں کی پیدائش کے بعد کمزوری

مسز ارم احسن
میری شادی کو 7 سال ہوئے ہیں۔ میرے تین بیٹے ہیں۔ 5، 6 اور 4 سال کے۔ تینوں سیزرین سے ہوئے ہیں۔ میری عمر 30 سال ہے۔

جوڑوں کا درد، ایڑی، نشہ

جیلہ بیگم۔ گلشن اقبال

جواب: بالکل استعمال کرتی رہیں اگر آ کر ملیں تو زیادہ اچھا ہے۔ پینے کے لیے 30 Ruta ڈاکٹر

ٹوکن

برانے شوا بے ہومیوکلینک

جون 2014

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: _____
پتا: _____



آپ اس کا رخیر کا حصہ ہیں جس سے لوگوں کو آسانی ہے۔ خاص طور پر ان خواتین کو جو کچھ فطری شرم کے باعث اپنی بیماریوں کے بارے میں زیادہ تفصیل سے ڈسکس نہیں کر سکتیں۔

میرا مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً ساڑھے چھ سال پہلے مجھے انٹرکورس کے دوران بلیڈنگ ہوئی تھی جس کے بہت علاج کرائے جس سے اب بلیڈنگ تو نہیں ہوتی لیکن پیریڈ ٹھیک نہیں ہوتے کیونکہ اس دوران مجھے بہت گھبراہٹ ہوتی ہے، چکر آتے ہیں اور ٹانگوں میں بہت درد ہوتا ہے، کمر میں شدید درد رہتا ہے، پیشاب کی بھی تکلیف ہو جاتی ہے، بار بار آتا ہے اور فوراً کرنا پڑتا ہے۔

جواب: اس عمر میں بچہ پیدا کرنے کا خیال بالکل دل سے نکال دیں۔ ہاں اپنے آپ کو فٹ ضرور رکھیں۔ قد اور وزن بھی لکھیں۔ خاندانی بیماریوں کے متعلق بھی لکھیں۔ شوہر کو کوئی بیماری ہے تو اس کا بھی ذکر کریں۔ لیکوریا ہوتا ہے؟ اگر ہاں! تو اس کی کیفیت لکھیں۔ متوازن غذا کھائیں۔ مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔ ہلکی ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ 7-7 Pulsatilla-30، Calc.carb-30 کے 1/2 قطرے 1/2 گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

بلغم کی شکایت

مہرلی۔ کوٹلی آزاد کشمیر

سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ خشک نزلہ رہتا ہے۔ گلا خراب رہتا ہے اور زبان میں کافی تکلیف رہتی ہے۔ مجھے الرجی بھی رہتی ہے

دوائیاں دی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میرے سر کے ٹاپ میں بہت تیز درد ہوتا ہے جو پھیلتا جاتا ہے۔ چہرے اور گردن کے سامنے والی رگوں میں اتنا تیز ہوتا ہے کہ مجھے سانس بند ہوتی ہوئی لگتی ہے۔ پھر نفاس ہوتا ہے، دل خراب اور سارے جسم میں تیز درد ہوتا ہے۔ کھانا نہیں کھاتی تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور اگر کھالوں تو اس سے زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ سارے جسم میں تیز درد شروع ہو جاتا ہے، نظر دھندلی لگتی ہے، بازو اور ٹانگیں سن لگتی ہیں اور پھر بھوک بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

جواب: اللہ پر واقعی یقین ہے تو پھر اٹھ جائے۔ جو زندگی ہے اس میں اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کیجئے شکر ادا کیجئے۔ رات کو جلد از جلد عشا کی نماز پڑھ کر سو جائیے اور صبح فجر میں اٹھیے۔ نماز پڑھ کر چہل قدمی کیجئے۔ سورہ۔ یسین کی تلاوت کر کے اور سورہ فاتحہ پڑھ کر اپنے ہاتھ پر دم کر کے پورے جسم پر پھیریے۔ کھانے میں نمک کم استعمال کیجئے اور بلڈ پریشر چیک کرائیے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کیجئے۔ Nux، Iris versciallar-30، Rhus، Calc.carb-30، vomica-30، Anacardium-30، tox-30 کے 5-5 قطرے 1/2 گلاس پانی میں ڈال کر پیئیں، ساتھ میں Cardus marianus-30 کے 10 قطرے 1/2 کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ ہر کیس کو الگ الگ صفحے پر تحریر کیا کریں۔

ڈسمینوریا

ثمینہ۔ پاکپتن شریف

سلام کے بعد عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور پاکیزہ کو جزائے خیر عطا فرمائے جس کے توسط سے

جواب: وزن نہیں بتایا کہ کتنا ہے؟ متوازن غذا استعمال کرائیں۔ تازہ ہوا میں ورزش کرایا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc. carb-30، Belladonna-30 اور Baryta carb-30 کے 5-5 قطرے 1/2 گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

دانہ/مسا

صبح خواب۔ ہری پور ہزارہ

سوال شائع نہ کریں۔

جواب: آپ کا خط پڑھ کر غصہ بھی آیا اور افسوس بھی ہوا کہ ہم کتنے جاہل ہیں۔ جب تک تین گواہ شرعی نہ ہوں الزام ثابت نہیں ہوتا اور پھر زنا کا بہتان لگانا انتہائی گناہ ہے اور وہ بھی اپنی بیٹی پر۔ سوئی ہے تو کیا ہوا؟ انسان تو ہے! مسا دراصل ایک قسم کے دائرس سے ہوتا ہے۔ بعض اوقات کسی جوہر تالاب یا کسی کے کپڑے پہننے سے بھی ہو سکتا ہے۔ خاندان میں کسی کو ہو تو بچوں میں منتقل ہو سکتا ہے۔ فضول باتیں کرنے کے بجائے علاج پر توجہ دینی چاہیے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Acid nitric-30 اور Thuja-30 کے 5-5 قطرے 1/2 کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں اور Thuja-30 کو متاثرہ جگہ براہ راست لگائیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت بتائیں۔

پست ہمتی

مسز احمد۔ فیصل آباد

ڈاکٹر صاحب، میں کافی عرصے سے میڈیسن کھا رہی ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ڈپریشن ہے اور ساتھ معدے کی تیزابیت اور گیس جلن وغیرہ کی

ضرورت ہے یا نہیں۔

لیکچوریا

خالد احسان۔ کراچی

مجھے عرصہ آٹھ سال سے لیکچوریا ہے۔ جب ماہواری آنے کا وقت قریب آتا ہے تو لیکچوریا بھی دودھیا گاڑھا اور کبھی دودھیا پتلا آتا ہے اور ناپاکی کے نہانے کے بعد پھر شروع ہو جاتا ہے۔ عام دنوں میں لیکچوریا آتا ہے تو جسم میں درد ہوتا ہے اور بستر سے اٹھنے کا دل نہیں چاہتا اور اٹھتے بیٹھتے گھٹنوں میں سے آواز آتی ہے۔ آپ میری کمزوری سے اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آنکھوں کے نیچے کی نیس تک نظر آتی ہیں اور میں بہت خوش شکل ہوں لیکن رونق نظر نہیں آتی۔

جواب: وزن آپ کا یقیناً کم ہے۔ متوازن غذا پر توجہ دیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ تک استعمال کریں اور اپنا حال بتائیں۔

Bovista-30، Borax-30، Calc.carb-30 کے 5-5 قطرے دن میں 3 مرتبہ 1/2 گلاس پانی ڈال کر استعمال کریں۔

جسمانی نشوونما کی کمی

ابن بنت عباسی۔ ڈیرہ اسماعیل خان

میری بھانجی کا مسئلہ یہ ہے کہ ہاتھ سانولے ہو گئے ہیں لیکن چہرہ بہتر ہے۔ چہرہ اور ہاتھ ملائے جائیں تو یہ لگتا ہی نہیں کہ یہ ہاتھ اور چہرہ اس کا ہے۔ اب بھی اسے اکثر کھٹی چیزوں سے نزلہ و زکام اور گلا خراب ہو جاتا ہے۔ اس کا جسم موٹاپے کی طرف مائل ہے اور پیٹ بڑھا ہوا ہے۔ ایک اور اہم مسئلہ قد کا بھی ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم حاصل کیوں ہیں؟

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڑیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلو ڈنگ
- ✧ پیریم وائٹی، نارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈ فزری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے ٹرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کرے جس میں آئرن اور کیلشیم زیادہ ہو۔ سیب، ٹماٹر، اسٹرابیری، چیری، لال گوشت، دودھ، دہی، پنیر وغیرہ۔ 2 ماہ تک ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔
Calc.carb-30، Pulsatilla-30، Chamomilla-30 کے 5-5 قطرے 1/2 کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں اور Alfalfa-0 کے 11 قطرے 1/2 کپ پانی میں ڈال کر استعمال کریں۔

اولاد کی نعمت / ہارمونز کی خرابی

مسز نعیم رضا۔ ڈیرہ غازی خان

میری شادی کو 3 سال 4 ماہ ہو گئے ہیں اور میں اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔

جواب: آپ کے ساتھ شروع سے مسئلہ ہارمونز کی خرابی ہے جو اب بھی ہے اسی وجہ سے چھاتیوں میں دودھ بھی ہے، اور سر کے بال بھی اسی وجہ سے ہیں۔ بالوں کے گرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ 3 ماہ تک ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں پھر کیفیت بتائیں۔
Calc carb-200 کے 5-5 قطرے ہر اتوار کو پیئیں۔ ہفتہ اور پیر کو کوئی دوا نہ لیں۔ منگل سے جمعہ تک Pulsatilla-30 اور Threoidinum-30 کے 5-5 قطرے 1/2 کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں جبکہ Fucus.ves-0 کے 13 قطرے 1/2 گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

اور ٹھنڈی چیزیں استعمال کرنے سے بہت پر ابلم ہوتی ہے۔ میں نے ٹھنڈی چیزیں کافی حد تک استعمال کرنا چھوڑ دی ہیں۔ چاول بھی بہت کم کھاتی ہوں۔ موسم ٹھنڈا ہو بارش وغیرہ ہو تو زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ یہاں سردیوں میں بہت ٹھنڈ ہوتی ہے جس میں بیماری بھی بڑھ جاتی ہے۔ رات بھر اس کی وجہ سے نیند نہیں آتی۔ سانس بند ہونے لگتی ہے اور دل کی ڈھکن تیز ہو جاتی ہے۔

جواب: یہ خاندانی جینٹک مسئلہ ہے۔ باقاعدگی سے علاج کریں تو ٹھیک ہو جائیں گی۔ ٹھنڈ سے بچیں اور گرم ٹھنڈا یا ٹھنڈا گرم نہ کیا کریں۔ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی ادویات Bacilinum-200 کے 5 قطرے 1/2 کپ پانی میں ڈال کر مہینے میں ایک دفعہ پیئیں۔ اس کے لینے کے بعد ایک دن کا وقفہ دیں۔ پھر Calc.carb-30 کے 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ 1/2 کپ پانی میں ڈال کر پیئیں۔ رات کو سونے سے پہلے Nux vomica-30 کے 5 قطرے اسی طرح پیئیں اور جب کھانسی یا نزلہ شدید ہو تو Ars.alb-30 کے 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ پی لیا کریں۔

ڈسمینوریا

دوسرا مسئلہ میری دوست کا ہے۔ اسے ماہواری کا مسئلہ ہے۔ ماہواری سے کئی دن پہلے اسے پیٹ میں درد رہتا ہے۔ رک رک کر پیشاب آتا ہے۔ جلن بھی ہوتی ہے۔

جواب: سہیلی سے کہیں کہ اپنی غذا کا خاص خیال رکھا کرے۔ ایسی غذاؤں کا استعمال زیادہ



Dr. Willmar Schwabe Germany

Available at All Medical & Homoeopathic Stores

شوا بے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی